سیرت مبارکہ
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
قرآن اور تاریخ کے آئینہ میں
تالیف
حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مؤلف علمائے حق، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کتب کثیرہ
مکتبہ محمودیہ
جمعیت المحمود، جامعہ مدنیہ، کریم پارک، لاہور ۲

سیرتِ مبارکہ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

قرآن اور تاریخ کے آئینہ میں

تالیف

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ
محدث، فقیہ، مورخ، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کتب کثیرہ

مکتبہ محمودیہ
بیت الحمد، جامعہ مدنیہ، کریم پارک، لاہور ۲

اشاعت جدید — ستمبر ۱۹۹۸ء

ناشر — محمد ریاض درانی

سرورق — انیس یعقوب

کتابت — یعقوب چوہان

مطبع — زاہد بشیر پرنٹرز ' ریٹی گن روڈ ' لاہور

قیمت — 250 روپے

به اہتمام

جمعیۃ پبلیکیشنز

متصل مسجد پائلٹ ہائی سکول ' وحدت روڈ ' لاہور

فون نمبر 7561025
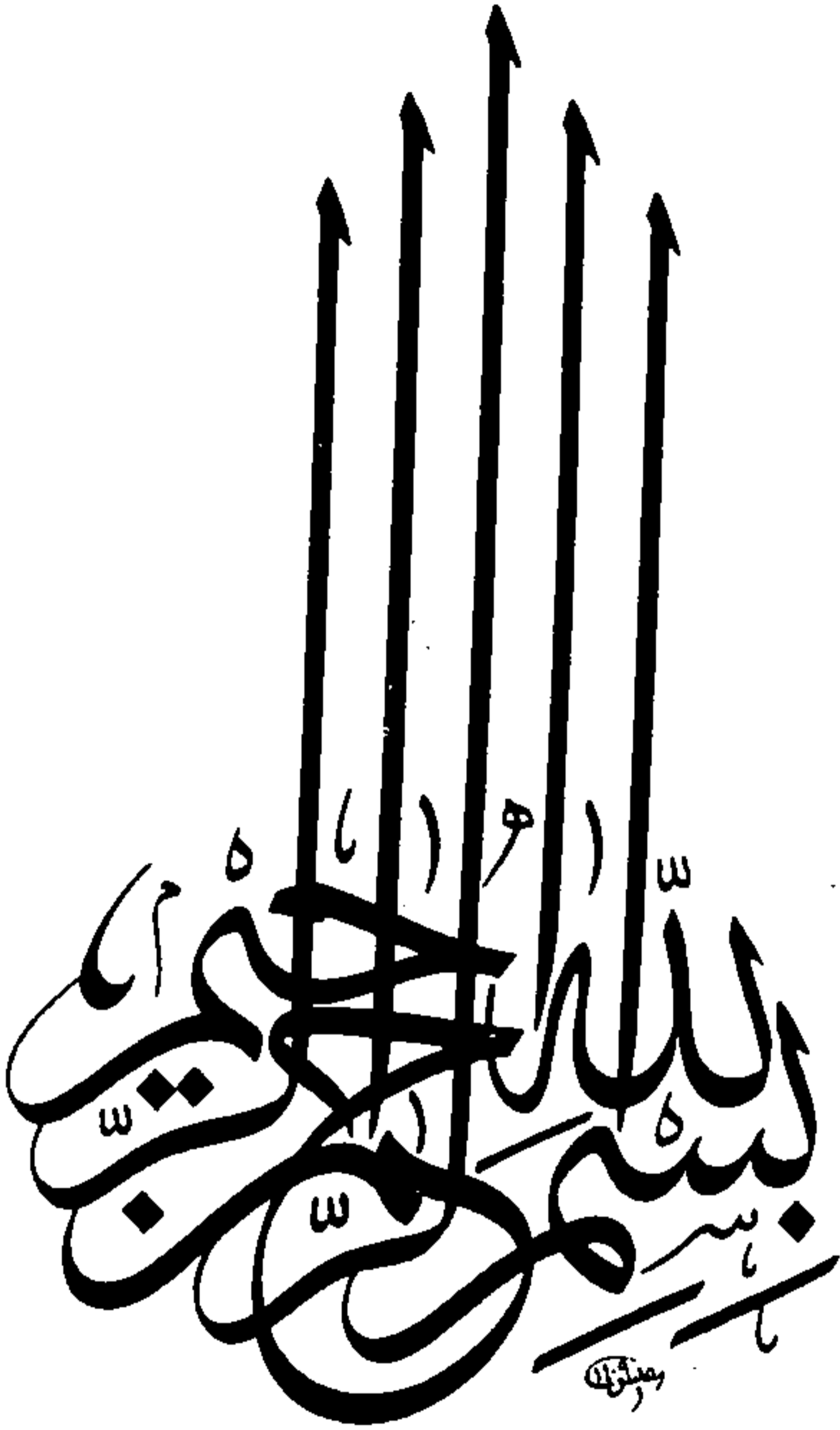
بسم الله الرحمن الرحيم
۱۲ شوال المکرم
سیالکوٹ

انتباہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرورکائنات فخر موجودات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ اور سیرت مبارکہ ایک ایسا مبارک عنوان ہے کہ اس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے' یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے سیرت نگاری کا سلسلہ جاری ہے اور تاقیامت جاری رہے گا۔

سیرت نگاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات سے تعلق اور عشق و محبت کو خاص دخل ہے جس کو جسقدر آپ کی ذات ستودہ صفات سے والہانہ لگاؤ اور تعلق ہوتا ہے اتنا ہی اس کی سیرت نگاری میں اثر اور اس کی تحریر میں وزن ہوتا ہے۔

سید الملۃ حضرت مولانا سید محمد میاں رحمہ اللہ (م ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء) کی شخصیت اس لحاظ سے ممتاز نظر آتی ہے کہ آپ نے اپنی تحریرات میں سب سے زیادہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک شخصیت کو موضوع بنایا اور سب سے زیادہ آپ کی شخصیت پر لکھا۔ آپ کی کتاب "سیرت مبارکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" سیرت طیبہ پر لکھی جانے والی کتابوں میں سے ایک ممتاز ترین کتاب ہے۔ جس میں آپ نے عام سیرت نگاروں کے اسلوب نگارش سے ہٹ کر ایک نیا اور اچھوتا انداز اپنایا ہے جو اپنے اندر اس قدر کشش رکھتا ہے کہ دل کھنچا چلا جاتا ہے۔ شاید اس میں آپ کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق و محبت کے ساتھ ساتھ آپ کی نسبی اولاد ہونے کو بھی دخل ہے۔

"سیرت مبارکہ" ہندوستان میں ان گنت مرتبہ شائع ہو چکی ہے' پاکستان میں

جمعیت پبلی کیشنز مکتبہ محمودیہ کی رفاقت میں اس کی طباعت کا اعزاز حاصل کر رہی ہے۔

جمعیت پبلی کیشنز نے مولانا موصوف کی کتاب "صحابہ کرام کا عہد زریں" شائع کرتے وقت اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ اگر قارئین کا تعاون اور نصرت خداوندی شامل حال رہی تو سلسلہ وار مولانا موصوف کی تمام کتب شائع کی جائیں گی۔

اراکین جمعیت اللہ تعالی کے حضور شکر گزار ہیں کہ اس کے فضل و کرم سے ہماری پہلی شائع کردہ کتاب "صحابہ کرام کا عہد زریں" کو قارئین میں پذیرائی حاصل ہوئی اور اس کا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ چنانچہ حسب وعدہ جمعیت پبلی کیشنز کی طرف سے مولانا محمد میاں صاحبؒ کی دوسری مایہ ناز کتاب "سیرت مبارکہ" نہایت آب و تاب کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے جس میں کتابت و طباعت اور جلد بندی کے جدید اصولوں کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور تصحیح اغلاط میں ممکنہ حد تک کوشش کی گئی ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس طباعت میں مصنف علیہ الرحمہ کے حالات بھی درج کیے گئے ہیں جو آپ کے صاحبزادہ محترم محدث کبیر حضرت مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ بانی و مؤسس جامعہ مدنیہ لاہور نے تحریر فرمائے ہیں

ہمیں امید ہے کہ پہلی کتاب کی طرح ہماری یہ دوسری کتاب بھی قارئین میں ضرور پذیرائی حاصل کرے گی اور یوں ہم آگے بڑھنے کے قابل ہو سکیں گے۔

محمد ریاض درانی

یکم جمادی الثانی ۱۴۱۹ھ

فہرستِ مضامین

سیرتِ مبارکہ محمد رسول اللہ ﷺ

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

مُقدّمہ سِیرتِ مُبارکہ

اِنسان اور اِنسانیّت

منزل بمنزل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

انسان

کیا ہے ؟ لوگ کہتے ہیں، مٹی کا پُتلا ہے، اس میں جان ڈال دی گئی، وہ بولنے لگا۔ منطق پڑھنے والے کہتے ہیں، انسان ایسا جان دار ہے جس کو عقل عطا کی گئی جس سے وہ بُرے بھلے کو پہچانتا ہے اور سوچ سمجھ کر نتیجے اخذ کرتا ہے۔ چیزیں ایجاد کرتا ہے۔ لیکن دنیا میں جاندار اور بھی ہیں، انسان کا درجہ ان سب سے اونچا کیوں ہے۔ کیا صرف عقل کی وجہ سے۔ ؟

اگر اس کی بڑائی صرف عقل کی وجہ سے ہے تو یہ جو تمام جانداروں پر قبضہ جماتا ہے، دنیا کی ہر ایک چیز کو اپنے تصرف میں لے آتا ہے، کسی کو کاٹتا ہے۔ کسی کو توڑتا ہے، کسی چیز کو جلاتا ہے، کسی چیز کو پگھلاتا ہے، سمندروں میں تیرتا ہے۔ فضا میں اڑتا ہے اور اب چاند تاروں پر بھی قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ تو اُس کا یہ قبضہ اور تصرف کہاں تک درست ہے۔ کیا یہ جبر و قہر اور ظلم نہیں ہے ؟ کیا یہ قبضہ غاصبانہ اور یہ تصرف ظالمانہ نہیں ہے ؟ کیا اس کو عقل اس لئے دی گئی ہے کہ وہ ظلم اور جبر و قہر کر سکے۔ اس عقل کو ہم نعمت اور رحمت مانیں یا عذاب اور مصیبت سمجھیں کہ ساری مخلوق کو اپنے شکنجہ میں کس رہی ہے منطق اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔

ہم نے قرآن شریف کا مطالعہ کیا۔ قرآن شریف میں اس کا جواب موجود ہے۔

قرآن حکیم بتاتا ہے کہ اس تمام مخلوق کا ایک پیدا کرنے والا ہے۔ اُس نے اپنی مرضی سے اس تمام مخلوق کو پیدا کیا۔ زمین، آسمان، چاند، سورج، سب اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں جس کو جیسا چاہا بنا دیا اور اپنے کام پر لگا دیا۔ اسی خدا نے انسان کو پیدا کیا' اس کو عقل و سمجھ دی۔ اس کو علم دیا اور اسی نے انسان کو پوری کائنات میں اپنا نائب بنا دیا (سورہ بقرہ ع ۴ آیت ۳۰) اسی نے اس کو ایسی صلاحیت اور ایسی طاقت بخش دی کہ زمین و آسمان کی کسی بھی چیز پر وہ قبضہ کر سکتا ہے! ور اس کو اپنے کام میں لا سکتا ہے۔ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اسی کے لئے مسخر کردیں (سورہ جاثیہ ع ۴۵ آیت ۱۲)

بس انسان کا یہ قبضہ غاصبانہ اور یہ تصرف جابرانہ نہیں ہے بلکہ یہ تصرف جائز اور یہ قبضہ ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی کارندہ اپنے مالک کی طرف سے قبضہ کیا کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ انسان کی حقیقت قرآن شریف نے یہ بتائی ہے کہ وہ اللہ کا خلیفہ (نائب) ہے۔ اس کی بڑائی صرف عقل کی وجہ سے نہیں ہے' بلکہ اس لئے ہے کہ اس کو نیابت کا منصب عطا ہوا ہے۔

یہ مٹی کا پتلا کیا ہے؟ یہ ہمارا بدن جس کو ہم مٹی کا پتلا کہتے ہیں، کیا یہی انسان ہے؟ ہر شخص جواب دیگا۔ یہ انسان نہیں ہے۔ یہ صرف قالب ہے انسان کچھ اور ہے۔

یہ قالب گھٹتا ہے' بڑھتا ہے' پرانا پڑجاتا ہے۔ کبھی اس کا کوئی حصہ کٹ جاتا ہے مگر "زید" جس کا یہ قالب ہے' وہ نہیں بدلتا۔ زید بچپن میں بھی زید تھا، جوانی میں بھی زید ہی رہا۔ بوڑھا ہو گیا تب بھی زید ہی ہے۔ وہ بیمار پڑا تب بھی زید ہی تھا۔ اس کی بینائی جاتی رہی تب بھی زید رہا۔ آنکھیں بنوالیں اور چشمہ لگا کر دیکھنے لگا تب بھی زید ہی ہے یہ زید انسان ہے۔ یہ جب بھی تھا جب یہ مٹی کا پتلا اُس کا قالب نہیں بنا تھا۔ اور جب بھی رہے گا۔ جب یہ مٹی کا قالب اس سے الگ ہو جائے گا۔

زندگی کیا ہے؟ لوگ کہتے ہیں۔ بہت خفیف سا قطرہ یا کیڑا تھا۔ ماں کے پیٹ میں اس نے بڑھنا شروع کیا۔ وہ بچہ بن گیا۔ پیدا ہوا۔ بڑھا۔ جوان ہوا۔ بوڑھا ہوا۔ یہ زندگی ہے مگر یہ تو اس قالب کی سرگذشت ہے۔ زید جس کو ہم انسان کہتے ہیں وہ تو کچھ اور ہے۔

جب یہ قالب ختم ہوا تو کیا زید بھی ختم ہو گیا۔ موت صرف قالب کی آئی فنا صرف قالب ہوا۔ یا انسان بھی فنا ہو گیا؟

خود ہمارے دل کی آواز یہی ہے اور دنیا میں جو بھی مذہب ہے وہ یہی کہتا ہے کہ زید فنا نہیں ہوا۔ موت کا مطلب ہے کہ زید اپنے خاکی قالب سے جدا ہو گیا۔ موت انتقال ہے۔ یعنی زید ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہو جاتا ہے۔ موت فنا نہیں ہے۔

مرنے کے بعد اچھا! اگر موت فنا نہیں ہے۔ زید مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے تو اس بقاء کا نام کیا ہے؟

مرنے کے بعد باقی رہے گا تو کہاں رہے گا؟ کس طرح رہے گا۔ آرام سے رہے گا یا تکلیف سے؟ آرام ملے گا تو کس طرح؟ تکلیف ہوگی تو کیوں ہوگی کیا ہوگی کس طرح ہوگی؟

موجودہ زندگی کا تعلق اس سے کیا ہوگا؟

اس زندگی میں جو کچھ کیا ہے اس کا کوئی اثر موت کے بعد ہوگا؟

اگر اثر ہوگا تو کس عمل کا اثر کیا ہوگا؟

کون سے عمل کرنے چاہئیں جن کے اثر اچھے ہوں۔ وہ عمل کس طرح کرنے چاہئیں کون سے عمل نہیں کرنے چاہئیں؟

اگر ہماری عقل اور سمجھ کا تقاضا ہے کہ جہاں ہمیں پہنچنا ہے وہاں کی باتیں معلوم کر لیں۔ اور رات کی اندھیری ختم ہونے کے بعد جو کل کا دن آنے والا ہے اس کا انتظام آج کر لیں۔ تو ہمارے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کریں اور سب سے پہلی فرصت میں اور فرصت نہ ہو تب بھی فرصت نکال کر ان سوالات کے جواب معلوم کر لیں۔

کس سے معلوم کریں؟ اگر کوئی شخص یورپ گیا ہو تو اس سے یورپ کی باتیں معلوم کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر یورپ کوئی نہ گیا ہو یا جو یورپ گیا ہو وہ کبھی واپس نہ آیا ہو تو کس سے معلوم کریں؟

یورپ کی باتیں معلوم کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ہمیں یورپ جانا نہ ہو۔ لیکن جب ہمیں جانا ہے اور ضرور جانا ہے اور وہاں جا کر رہنا ہے اور اتنا رہنا ہے کہ اس کی کوئی مدت معین نہیں، ساری عمر وہیں رہنا ہے تو ہم سے زیادہ کوئی نادان اور غافل نہ ہو گا اگر ہم یورپ کی باتیں معلوم نہ کریں اور تمام حالات کی پوری پوری تحقیق نہ کر لیں۔

ہماری دانشمندی یہی ہو گی کہ ہم جہاں تک معلوم کر سکیں ہر چیز کی تحقیق کر لیں۔ مگر یہ سوال پھر لوٹ آیا کہ کس سے معلوم کریں۔

عقل کی رہنمائی ہمیں عقل پر بہت ناز ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ عقل ایسی نعمت ہے کہ اس پر ناز کرنا چاہیئے مگر سب باتیں عقل سے نہیں معلوم کی جا سکتیں۔

اس شخص کو عقل مند نہیں بے وقوف کہا جائے گا جو یورپ کی باتیں عقل سے معلوم کرنا چاہے اور قصر بکنگھم کا نقشہ اپنی عقل سے کھینچنے لگے۔ عقل وہاں کام کرتی ہے۔ جہاں مشاہدہ یا تجربہ ہوتا ہے۔ تجربہ بھی مشاہدہ ہی سے ہوتا ہے۔ جہاں مشاہدے کچھ بھی نہ ہوں وہاں عقل کام نہیں کر سکتی۔ ٹرین کی گڑگڑاہٹ یا سیٹی کی آواز سنیں یا انجن کا دھواں دیکھ لیں تب تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ٹرین گذر رہی ہے۔ ورنہ سیکڑوں ٹرینیں آتی جاتی رہتی ہیں آپ کو احساس بھی نہیں ہوتا۔ عقل بے چاری غافل رہتی ہے۔ پھر عجیب بات ہے کہ مشاہدہ کے بعد بھی جو فیصلہ عقل سے کرتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً:

(۱) ٹیبل فین جب چلتا ہے تو ہمارا مشاہدہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں کوئی پنکھڑی نہیں ہے، حالانکہ یہ مشاہدہ غلط ہے۔

(۲) ہماری آنکھوں کے سامنے مشاہدہ کی سب سے بڑی چیز آفتاب ہے۔ آفتاب نکلتا ہے، چڑھتا ہے، غروب ہوتا ہے ہم روز بلا ناغہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ مگر آفتاب گھوم رہا ہے یا زمین۔ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ آفتاب گھوم رہا ہے۔ ہم چاند تاروں کو چھپتے نکلتے دیکھتے ہیں، مشاہدہ کرتے ہیں، دنیا کے بڑے بڑے عقل مند اسی مشاہدہ پر بھروسہ کرتے رہے اسی مشاہدہ کی بنا پر انھوں نے ہیئت اور نجوم جیسے فنون ایجاد کئے۔ ہزاروں برس تک ان فنون کی دھاک بیٹھی رہی۔ بڑے بڑے ذہین اور سمجھدار علماء نے اپنی ساری ساری عمریں ان فنون کے ایجاد کرنے پھر پڑھنے پڑھانے میں صرف کیں۔ ان فنون کی بنیاد پر اصطرلاب زائچے اور رصدگاہیں تیار کی گئیں۔ بڑی بڑی حکومتوں نے ان فنون کی سرپرستی کی۔ بیشمار دولت ان فنون کی ترقی پر صرف کی گئی۔ لیکن اب تحقیق یہ ہے کہ یہ جو کچھ تھا سب غلط تھا۔ جو مشاہدہ تھا وہ حقیقت نہیں تھا۔ فریب نظر تھا۔ کیونکہ آسمان کا تو وجود ہی نہیں ہے اور گھومنے والا آفتاب نہیں ہے۔ بلکہ زمین گھوم رہی ہے۔

(۳) ہماری عقل سب کچھ جانتی ہے۔ مگر یہ نہیں جانتی کہ خود عقل کیا ہے اور ہماری جان کی حقیقت کیا ہے؟

مطلب یہ ہے کہ سب سے قریب کی چیز جان ہے اور عالم مشاہدہ میں سب سے بڑا آفتاب ہے۔ ہماری عقل دونوں کے بارے میں درماندہ اور عاجز ہے اور اتنی بڑی غلطی کھا چکی ہے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

(۴) دنیا کے عقلمندوں کا فیصلہ تھا اور ہمارا مشاہدہ بھی یہی ہے کہ 'حرکت' کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ ہمارے الفاظ اور ہماری آواز بھی زبان اور گلے سے پٹھوں کی حرکت کا اثر ہے۔ یہ بھی فوراً ختم ہو جاتے ہیں ان کے باقی رہنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس شخص کو بے وقوف اور بے عقل سمجھا جاتا تھا جو ان کے باقی رہنے کی بات کہتا تھا مگر سائنس کی جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا کہ جس کو بے وقوفی سمجھا جاتا تھا وہ حماقت نہیں بلکہ حقیقت

ہے۔ ہمارے الفاظ باقی رہتے ہیں۔ ان کو ہم ریکارڈ کر سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن نے ہماری حرکت کے لئے بھی بقا، کا فیصلہ کر دیا ہے۔

ہمارے ہر ایک عمل کا ایک اثر ہے۔ ایک لفظ سے ہم کسی کو ناراض کر دیتے ہیں جسی کو خوش کر دیتے ہیں۔ ہمارا ایک ہی لفظ کبھی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے اور اگر ایک ہی لفظ باغیانہ ہو تو ایک لفظ کی بنا پر پھانسی بھی دی جاسکتی ہے۔

اب عقل کی رہنمائی ، کافی، ہر ایک عمل کی تاثیر لازمی۔ موت فنا نہیں۔ موت صرف ایک پُل ہے جس پر سے انسان گذرتا ہے تو دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ اس عالم میں پہنچ کر کیا ہو گا۔ اس کا جواب کون دے ؟۔

فطرت مددگار ہے

بچہ پیدا ہوا۔ وہ صرف رونا جانتا ہے اور کسی بات کی اس کو خبر نہیں۔ وہ بے بس ہے۔ بہت کمزور ہے۔ خود کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی زندگی غذا پر موقوف ہے۔ مگر یہ نکھا جانتا ہے، نہ کھا سکتا ہے اور اتنا کمزور ہے کہ بڑے آدمی کی غذا وہ برداشت بھی نہیں کر سکتا روٹی کا ٹکڑا جو بڑے آدمی کی زندگی کا سہارا ہوتا ہے اس کے لئے موت کا پیغام بن جاتا ہے۔

لیکن جس قدرت نے اس کو قطرہ سے بڑھا کر بچہ بنایا وہ یہاں بھی اس کی مدد کر رہی ہے ماں کی مامتا بے چین ہوتی ہے کہ اس ننھے سے بچے کو چھاتی سے لگائے تو خاص اس جگہ جہاں اس کا مونہہ رہتا ہے۔ قدرت نے ایک فوارہ بنا دیا ہے۔ جیسے ہی یہ بچہ پیدا ہوا اس فوارہ میں بچہ کی غذا اکٹھی ہو گئی۔ جو نہایت ہلکی، اس کی طاقت اور اس کی صحت کے لئے سب سے زیادہ بہتر اور سب سے زیادہ مناسب ہے۔

یہ بچہ کچھ نہیں جانتا۔ مگر یہ خوب جانتا ہے بلکہ اس کا ماہر ہے کہ وہ اس فوارہ کو کس طرح چوسے اور کس طرح اس لطیف غذا کو اپنے پیٹ تک پہنچائے۔

یہ اس کو کس نے سکھایا؟ یہ قدرت کی مدد ہے۔ اور اس کی فطری تعلیم۔ بچہ کو ہوا کی ضرورت ہے۔ سردیوں میں تگھاس کی ضرورت ہے۔ دھوپ کی ضرورت ہے۔ یہ اپنی حفاظت خود نہیں کر سکتا۔ اس کو محافظ اور نگران کی ضرورت ہے۔

قدرت نے ماں کی فطرت میں وہ محبت بھر دی کہ اس نے نہ صرف ایک خدمت گذار کی طرح بلکہ فدا کار اور جاں نثار بن کر ہنسی خوشی اس کی ہر ایک خدمت انجام دی۔ اپنا تمام چین اور آرام اس کی خدمت اور راحت پر قربان کر دیا۔

فطرت نے باپ کو شفقت اور محبت کا ایسا پُتلا بنا دیا کہ اس نے بچہ کی حفاظت، پرورش، اس کی تعلیم و تربیت اور ترقی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔

بہنوں اور بھائیوں میں وہ امنگ پیدا کردی کہ یہ بچہ ان کا محبوب مشغلہ اور بہت ہی پیارا کھلونا بن گیا۔ وہ ہر وقت اس میں مشغول رہتے ہیں اور اس کے رنج سے رنجیدہ اور خوشی سے خوش ہوتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کو خوش کرنے کے لئے اسی جیسے بچے بن جاتے ہیں۔

فطرت رہنما اور معلم ہوتی ہے

یہ فطرت کی رہنمائی تھی کہ بچہ کو دودھ چوسنا سکھایا، قدرت کی فطری رہنمائی سے بچہ نے غذا حاصل کی۔ بدن میں طاقت آئی تو یہ صرف قدرت کی مدد اور اس کی رہنمائی ہے کہ بچہ میں شناخت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ چلنا پھرنا تو درکنار بچہ خود سے اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ زبان ابھی خاموش ہے۔ صرف حلق سے ہوں ہوں کر لیتا ہے۔ مگر آنکھوں اور کانوں کی طاقت میں ایسی پختگی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ماں باپ کو دیکھتا ہے تو پہچان لیتا ہے۔ بہن بھائی جو اس سے محبت کرتے ہیں ان کو بھی پہچانتا ہے خوشی خوشی ان کی گود میں چلا جاتا ہے۔ جن کو نہیں پہچانتا ان سے وحشت کھاتا ہے۔ یہ بچہ کی حفاظت کے لئے قدرت کی رہنمائی ہے۔

ہم اگر عربی یا انگریزی بولنا چاہتے ہیں تو اس زبان کی گرامر یاد کرتے ہیں۔ ریڈر پڑھتے ہیں تب کچھ بول سکتے ہیں۔ مگر قدرت کی یہ رہنمائی ہے کہ ماں باپ کی زبان بچہ بغیر کسی گرامر کے سیکھ جاتا ہے۔

قدرت نے جب بچہ کو پہچاننے کی طاقت بخشی تو ساتھ ساتھ ایک بات کا شوق بھی دلا دیا۔ یہ ہے نقل اُتارنے کا شوق۔

زبان ابھی قابو میں نہیں ہے۔ مگر بچہ چاہتا ہے کہ جو سنے زبان سے اس کو ادا کرے۔ وہ پورا لفظ ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ کوئی ایک حرف ادا کر سکتا ہے تو اسی کو ادا کرتا ہے۔ پھر اس کی مشق کرتا ہے۔ اُس کے ادھورے لفظ کو اس کے ماں باپ سنتے ہیں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہنسنے لگتے ہیں۔ مگر بچہ ہمت نہیں ہارتا یہ برابر کوشش کرتا رہتا ہے، یہاں تک

کہ کچھ عرصہ میں کامیاب ہو جاتا ہے اور جس طرح اس کے ماں باپ اور مُربی و سرپرست بولتے ہیں یہ بھی بولنے لگتا ہے۔

یہ مدد اور تعلیم کی دوسری قسم ہے۔ جو فطرت اور قدرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تعلیم کا فطری طریقہ یہ ہے کہ فطرت نمونہ پیش کر دیتی ہے۔ اس نمونہ کی نقل اُتارنے کی مشق ہو جاتی ہے تو اس کو تعلّم اور سیکھنا کہتے ہیں۔

ترقی پذیر شہری زندگی

اور

فطرت کی مدد اور رہنمائی

اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی انسان رہتے ہیں۔ مگر کس طرح رہتے ہیں، کیا کھاتے ہیں کیا پہنتے ہیں۔ آپ کو اگر کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ آپ کے پالتو مویشی کی زندگی اور ان پہاڑی انسانوں کی زندگی میں فرق بہت ہی کم ہوتا ہے۔

یہ پہاڑی انسان پہاڑی کھوہ "جگی" یا چھوٹے سے چھپر میں رات گذارتے ہیں۔ جانوروں کی کھال جس پر بال موجود ہوتے ہیں یا ٹاٹ کی طرح اُون کے بُنے ہوئے کمبل اُن کی پوشاک ہوتی ہے۔ کرتے یا پائجامے بھی کمبل ہی جیسے کپڑے کے ہوتے ہیں۔ شکاری جانوروں کا گوشت۔ درختوں کے پھل۔ اُبلے ہوئے چاول، ادھ کچری سی موٹی روٹی اُن کی خوراک ہوتی ہے۔ خالی نمک یا پیاز یا گڑ جیسی کوئی میٹھی چیز یا سل پر رگڑی ہوئی لہسن پیاز کی چٹنی سالن کا کام دیتی ہے۔ کوئی مہمان آتا ہے تو اس کے لئے سبزی کی بھاجی بنا لیتے ہیں۔ یہ ان کا تکلف ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کی شروع زندگی ایسی ہی تھی بلکہ اس سے بھی پست تھی۔

روٹی سالن یا چٹنی تو کیا اُسے گیہوں، چاول اور آگ کی بھی خبر نہیں تھی۔ کاتنا اور بُننا بھی وہ نہیں جانتا تھا۔ پہلے پہل تو اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ اگر کوئی مر جائے تو اس کی لاش کو کس طرح سنگوانا چاہیئے۔

اس شروع کی زندگی کا اب صرف تصوّر ہی کیا جاسکتا ہے۔ کہیں اس کا نمونہ دیکھا نہیں جاسکتا۔

بہر حال آپ اس سب سے پہلی زندگی کا تصوّر کیجیے پھر اپنے زمانے کی دیہاتی زندگی قصباتی زندگی پھر شہری پھر ہندوستانی زندگی پھر کسی زیادہ ترقی یافتہ ملک کی شہری زندگی پر نظر ڈالیے۔ یہ بے شمار منزلیں کس طرح طے ہوئیں۔

جواب یہی ہو گا۔ انسانی دماغ کام کرتا رہا۔ ضرورتیں سامنے آتی رہیں۔ ایجادیں ہوتی رہیں اور دنیا ترقی کرتے کرتے اس منزل پر پہنچ گئی۔

یہ جواب درست ہے لیکن لفظ ایجاد تحقیق طلب ہے۔ ایجاد کیسے ہوتی ہے؟ آپ تحقیق فرمایئے۔ ایک اہم سوال ہے۔

ایجاد اور فطری الہام

(۱)

رات کی بے انتہا سردی کے بعد جب آفتاب کی کرنوں سے انسان کو نگھاس پہنچا تو جیسے ہی گرمی اور سردی کا اس کو احساس ہوا اسے یہ بھی شوق ہوا ہوگا کہ کوئی ایسی چیز اسے مل جائے جو دھوپ کی طرح گرم ہو۔ بہت ممکن ہے۔ پھر ایسا ہوا ہو کہ کسی پتھر پر اس نے زور سے پتھر مارا اور اس سے چنگاریاں نکلیں۔ یہ چنگاری اس کی ضرورت کی چیز تھی۔ اس نے فوراً کھوج شروع کر دی کہ چنگاری کیسے پیدا کی جا سکتی ہے۔ آخر کار اس نے چقماق دریافت کر لیا۔ نگھاس اور گرماہٹ کی ضرورت ہر ایک کو تھی مگر پتھر پر پتھر مار کر آگ نکالنے کا خیال کسی ایک ہی شخص کو آیا۔ اس نے اس کا تجربہ کیا۔ پھر لوگوں کو بتایا۔ چونکہ لوگوں کی ضرورت کی چیز تھی۔ سب نے اس کو فوراً قبول کر لیا۔ یہ آگ کی ایجاد ہے۔

(۲)

قدرت نے گھوڑے، خچر، اونٹ وغیرہ بہت سے جانور بنائے ہیں۔ ہزاروں سال پہلے سے انسان نے اُن کو اپنی سواری بنا رکھا تھا اور انہیں کے ذریعہ وہ سامان بھی منتقل کیا کرتا تھا لیکن انسانوں کی آبادی اتنی بڑھ چکی تھی کہ یہ سواریاں ناکافی ہو رہی تھیں۔

ضرورت تھی کہ جانوروں کے سوا، کوئی چیز ہو جو حرکت کرے اور سواری کا کام دے سکے۔ ایک شخص نے دیکھا کہ جب بند موںھ کی ہنڈیا میں جوش زیادہ آیا تو وہ حرکت کرنے لگی۔ یہاں تک کہ چولہے کے اوپر سے گر گئی۔ اس کا ذہن فوراً منتقل ہوا۔ اس نے تجربہ شروع کیا یہاں تک کہ اسٹیم کا موجد بن گیا۔ دنیا کو ایسی طاقت کی ضرورت تھی۔ لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ اس ایجاد کو لیا اور ترقی کے راستے پر چلنا شروع کر دیا۔ جس کی آخری منزل کا اب تک کوئی پتہ نہیں۔

ہنڈیا کا جوش مارنا انوکھی بات نہیں تھی ۔اس کو ہر شخص جانتا اور دیکھتا تھا مگر بھاپ سے متحرک کرنے اور کسی چیز کو چلانے کا خیال ایک ہی شخص کو آیا ۔ اس نے تجربہ کر کے اس کو ایجاد کا درجہ دیا ۔

(۳)

یہ خیال کیا ہے ؟ اس کے ذہن یا دماغ میں کیسے آیا ؟ کس نے ڈالا ؟ صرف عقل نے یہ خیال پیدا کیا تو عقل تو دوسرے انسانوں کے پاس بھی ہے ۔ اور بے شمار انسان موجود ہیں جن کے پاس اس موجد سے کہیں زیادہ عقل کے خزانے فطری طور پر محفوظ ہیں ۔

اچھا اگر اس کے ذہن میں یہ خیال عقل نے پیدا کیا تو اس طرح کی باتیں ان کو کس نے بتائیں جن میں عقل نہیں ہے ؟

مکڑی کو جالا تننا ۔ بھڑ کو چھتا بنانا اور چیونٹی کو بل بنانا کس نے سکھایا ۔ شہد کی مکھی کو کس نے بتایا کہ وہ پھول سونگھے ، ان سے عرق چوسے اور اپنے چھتے میں لا کر اس کو اس طرح اگلے کہ شہد بن جائے ۔ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ یہ قدرت کا فیض ہے ۔ وہی قدرت جس نے کیڑے کو بتایا کہ وہ شہتوت کے پتوں سے ریشم کس طرح بنائے ، ممولے کو بتایا کہ وہ اپنا حسین آشیانہ تنکوں سے کس طرح تعمیر کرے ۔ اسی نے آگ اور اسٹیم کا نسخہ انسان کے ذہن میں ڈالا ۔ اس طرح قدرت کی تعلیم کو "فطری الہام" کہا جاتا ہے ۔

جانور عقل و علم سے محروم ہوتے ہیں تو یہ فطری الہام ان کی فطرت کا جزو بن جاتا ہے انسان کو اللہ تعالیٰ نے علم و عقل سے نوازا ہے ۔ تو اس کے لئے یہ الہام ایک روشنی ایک کرن ، ایک چمک بن جاتا ہے ، جس سے اس کو راستہ کا ایک سرا معلوم ہو جاتا ہے

تشریعی الہام

(۱)

اچھا جس طرح تمدن اور سائنسی ایجادات کے سلسلہ میں ایسا ہوا کہ ضرورتیں سامنے آتی رہیں، مسائل پیدا ہوتے رہے، ماہرین کے ذہن اُن کے حل کی طرف متوجہ ہوتے رہے پھر کسی ماہر کے ذہن میں ایک بات آئی، اس نے اس سوال کو حل کر دیا اور اس طرح ایک نئی ایجاد دنیا کے سامنے آگئی۔ کیا خود انسان اور انسانیت کے سلسلے میں بھی ایسا ہوا ہے کہ سمجھ دار انسانوں نے غور کیا ہو کہ انسان کیا ہے؟ خالق ہے یا مخلوق؟ خود پیدا ہو گیا یا کسی نے پیدا کیا؟

کسی بھی مشین کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ یہ اپنے پورے کل پرزوں کے ساتھ خود بخود پیدا ہو گئی۔ تو ہم اس کو حماقت سمجھتے ہیں اور جس طرح دوپہر کے وقت ہمیں آفتاب کا یقین ہوتا ہے، اسی طرح اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس مشین کا کوئی بنانے والا ضرور ہے وہ صاحب علم و ارادہ اور صاحب قدرت ہے۔ تو یہ انسان جو ایسی مکمل مشین ہے کہ اُس نے ہزاروں لاکھوں مشینیں بنا ڈالیں، کیا کوئی صاحب عقل و انصاف ایک لمحہ کے لئے بھی تصور کر سکتا ہے کہ یہ خود بخود پیدا ہو گیا۔ یا اس کو کسی ایسی ہستی نے پیدا کر دیا جو صاحب علم و ارادہ اور صاحب قدرت نہیں ہے۔

لیکن وہ بنانے والا کون ہے؟ اس نے انسان کو کیوں بنایا؟ اس نے عقل و ہوش کے ساز و سامان سے کیوں نوازا؟

انسان کا تعلق اُس کے ساتھ کیا ہونا چاہیئے؟

انسان کو دُنیا میں کس طرح رہنا چاہیئے؟

تحقیق طلب بات یہ ہے کہ کیا ایسے ماہر پیدا ہوئے جنہوں نے اس طرح کے

سوالات پر غور کیا ہو۔ اور اُن کے ذہن میں وہ روشنی پیدا ہوئی ہو جس نے ان سوالات کو حل کیا ہو۔

(۲)

ابتداء میں انسان کے صرف قریبی رشتہ دار تھے پھر نسلیں بڑھیں، رشتے دُور کے ہو گئے، پھر آبادیاں بھی الگ الگ ہو گئیں، پھر نسلوں میں امتیاز پیدا ہونے لگا۔ پھر رنگوں میں بھی فرق ہو گیا۔

یعنی پہلے انسان اور اس کے قریبی رشتہ داروں کا مسئلہ تھا۔ اس سلسلہ میں ضرورتیں تھیں اور ایک طریقہ زندگی تھا۔ پھر رفتہ رفتہ رشتہ دار غیر رشتہ دار۔ اجنبی، پڑوسی، شہری غیر شہری۔ ملکی غیر ملکی۔ کالے۔ گورے وغیرہ کے سوالات سامنے آئے۔

(۳)

جس طرح انسانوں کی صورتیں مختلف ہیں، ان کے مزاج، ان کے ذہن بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے پیش آنے والے سوالات کے جواب بھی مختلف ہوتے ہیں دلائل بھی مختلف ہوتے ہیں جن کی بنا پر بحث مباحثہ کی نوبت بھی آتی ہے۔ جس کے نتیجے میں لڑائی جھگڑے بھی شروع ہو جاتے ہیں مگر اس بحث مباحثہ میں یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ غور و فکر کی صلاحیت بڑھتی ہے، ذہنی استعداد ترقی کرتی ہے۔

(۴)

عقل انسانی اور ذہنی استعداد جیسے جیسے بڑھتی رہی اپنے متعلق بھی سوالات پیدا ہوتے رہے۔ ہم کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟ زندگی اور موت کیا ہے۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا ہماری اس زندگی کا تعلق مابعد الموت سے کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اپنے پیدا کرنے والے کے متعلق بھی سوالات پیدا ہوتے رہے۔ وہ ایک ہے۔ یا کئی ہیں؟ وہ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ کب سے ہے؟ کب تک رہے گا؟ اُس کے

بیوی بچے اور اولاد ہے یا نہیں؟ کیا اس کے کچھ مددگار ہیں؟ مددگار کون ہیں؟ ان کا تعلق خدا سے کیا ہے؟ ہمارا تعلق ان مددگاروں سے کیا ہونا چاہیئے؟

یہ روشن آفتاب اور چمکدار تارے کیا ہیں؟ یہ بڑے بڑے دریا اور اونچے اونچے پہاڑ کیا ہیں؟ دنیا میں جو بڑے بڑے آدمی ہوتے ہیں ان کی حیثیت کیا ہوتی ہے۔ مرنے کے بعد ان کا مرتبہ کیا ہوتا ہے؟ ہم ان کو یاد رکھیں تو کس طرح وغیرہ وغیرہ۔

سوال یہ ہے کہ جس طرح سائنس اور تمدن کے سلسلے میں ترقی کے ہر ایک مرحلہ پر کسی ماہر کے ذہن میں کوئی خیال ڈالا گیا۔ جس نے گتھی سلجھا دی اور ایک ایجاد دنیا کے سامنے پیش کر دی۔ کیا ان سوالات کے متعلق جن کو ہم مختصر الفاظ میں اخلاق اور روحانیت کے مسائل کہتے ہیں، ایسا ہوا ہے کہ جو اخلاق اور روحانیت میں کمال رکھتے تھے اور جن کو ان مسائل کی لگن تھی ان میں کچھ ایسے ماہر ہوئے کہ ترقی کے ہر ایک مرحلہ پر ان کے ذہن روشن ہوتے اور انہوں نے وہ گتھیاں سلجھا دیں جو اس وقت انسانی زندگی کے رشتۂ ترقی میں پڑی ہوئی تھیں۔

عقل و قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ جو فطرت پوری فیاضی کے ساتھ ابتداء سے انسان کی رہنما رہی۔ جس نے اس کو آغوش مادر میں دودھ پینا سکھایا۔ بولنا۔ چلنا سکھایا۔ زندگی گذارنے اور افزائش نسل کے راستے بتائے۔ جس نے ترقی تمدن کے ہر ایک مرحلہ پر اس کی رہنمائی کی، اس نے یقیناً اس سلسلہ میں پوری فیاضی سے کام لیا اور اخلاقی، روحانی اور خود انسانیت سے متعلق مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں بھی اس کی ہدایت نشانِ راہ بنی۔

(۵)

اب یہ بات تو قطعاً بے معنی۔ حد درجہ غلط اور خلافِ فطرت ہے کہ اس رہنمائی کے لئے خود خالق مخلوق بن گیا اور کسی انسان کے روپ میں رونما ہو گیا۔ یہ تو وہی کہہ سکتا ہے جس کو خود خدا بننے کا شوق ہو۔

شہد کی مکھی کو جب شہد بنانا اور انسان کے بچّے کو جب بولنا سکھایا تو کیا خالق اور خدا اس وقت شہد کی مکھی یا انسان کا بچّہ بن گیا تھا۔؟ ہرگز نہیں۔ انسان فطری طور پر سیکھنے کا عادی ہے۔ پس فطرت کے مطابق بات یہ ہے کہ اس خالق و قادر نے کچھ ایسے نمونے سامنے رکھے۔ یعنی ایسے انسان پیدا کئے جن کو بچپن سے نیک بنایا۔ خدا کی باتوں میں ان کا دل لگتا تھا۔ انہیں باتوں کی ان کو لگن تھی۔ اسی لگن میں وہ مگن رہے۔ کسی اور طرف ان کا دھیان بھی نہیں گیا۔ گناہ کی کوئی بات ان سے ہو ہی نہ سکی۔ خدا نے ان کو اس لئے پیدا کیا کہ روحانی اور اخلاقی مسائل پر غور کریں۔ پھر جیسے کسی سائنس کے ماہر کو کوئی بات سمجھا دی۔ اسی طرح خدا نے ان نیک بندوں کو ان سوالات کے جوابات سمجھائے اور وہ روشنی بخشی جس نے روحانیت اور اخلاق سے متعلق مسائل کی گتھیوں کو سلجھایا۔ پھر بحث و مباحثہ سے نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاق اور بہترین کردار پیش کر کے اپنی سچائی کا ثبوت بھی دیا۔ اور انسانوں کے لئے اخلاقی اور روحانی ترقی کا راستہ بھی کھولا۔

(۶)

وہ روشنی جو اِن پاک رہنماؤں کو عطا فرمائی الہام ہی ہے مگر یہ الہام فطری الہام سے بہت اونچا درجہ رکھتا ہے۔ فطری الہام ایک دھیان یا خیال ہوتا ہے اور اس درجہ کا کہ یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ دھیان یا خیال خود پیدا ہو گیا ہے یا کسی نے دل میں ڈالا ہے بجلی سی کوندتی ہے اس کی جھلک سے ایک کنارہ سا نظر آجاتا ہے۔ پوری بات ذہن نشین نہیں ہوتی پوری بات کے لئے کد و کاوش کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ان پاک بندوں کو جو الہام ہوتا ہے وہ صرف جھلک نہیں ہوتا، وہ تڑکے کا نور ہوتا ہے۔ جو ذہن کے اُفق پر خود بخود پھیلتا اور چھا جاتا ہے۔ وہ ایک یقین ہوتا ہے۔ وہ کنارہ نہیں ہوتا بلکہ پورا سبق ہوتا ہے وہ راستہ کا پورا نقشہ اور زندگی کا ضابطہ ہوتا ہے۔ وہ شریعت یعنی قانون اور ضابطہ کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی لئے اسکو "تشریعی الہام" کہا جاتا ہے۔

(۷)

مگر جس طرح کسی فن کے ماہر کو جو دھیان یا خیال عطا ہوتا ہے وہ محض عطائی اور وہبی ہوتا ہے۔ ہزاروں ماہر عمریں لٹا دیتے ہیں مگر موجد نہیں بن سکتے۔ کوئی خوش نصیب ہوتا ہے جس کو ایجاد کی نعمت میسر آجاتی ہے۔ اسی طرح اخلاق اور روحانیت کے ماہرین کو بھی جو روشنی عطا ہوتی ہے وہ محض عطائی اور وہبی ہوتی ہے۔ وہ خالق کی طرف سے انتخاب ہوتا ہے۔ ماہر روحانیت و اخلاق کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتا۔

(۸)

تمدن اور سائنسی ترقیات کے کسی ماہر کے ذہن میں جو خیال ڈالا جاتا ہے وہ اخلاقی یا روحانی مسئلہ نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق کسی فن یا آرٹ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اس فن کی مہارت اور اس کی ترقی کی لگن تو ضروری ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ یہ ماہر، روحانیت اور اخلاق میں بھی کمال رکھتا ہو۔ مگر وہ مسائل جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا سارا تعلق اخلاق اور رُوحانیت سے ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جس کو الہام کی روشنی عطا ہو۔ وہ روحانیت میں سب سے بلند، اخلاقی کمالات میں سب سے اونچا ہو۔ بچپن سے اس کو یہی لگن رہی ہو۔ سچائی۔ پاکبازی۔ امانت داری جیسے اعلیٰ اخلاق کا بہترین نمونہ ہو۔ خالق ذوالجلال پر پورا یقین اور بھروسہ رکھتا ہو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا خدا پرست اور خدا ترس ہو۔

(۹)

ماہرین فن کی ایجاد چونکہ مشاہدہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کو دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی اس کی ایجاد خود دلیل بن جاتی ہے۔ لیکن ماہرین اخلاق و رُوحانیت جو پیش کرتے ہیں وہ ایک علمی اور روحانی سبق ہوتا ہے۔ جس کے نتائج اس وقت نہیں بلکہ بعد میں اور عموماً دوسرے عالم میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنی مہارت اور اپنی سچائی کی دلیل پیش کریں مگر ان کی سچائی اور امانتداری کی سب سے بڑی دلیل خود ان کی پاک اور بے داغ

زندگی ہوتی ہے۔
وہ ہمیشہ اللہ والے رہے ہر وقت اس کو یاد کرتے رہے اور اس سے ڈرتے رہے۔
انہوں نے کبھی انسان کے حق میں کوئی جھوٹ نہیں بولا کسی سے بددیانتی نہیں کی۔ کسی سے فریب اور دھوکے کی بات نہیں کہی۔ کسی کی امانت میں کبھی کوئی خیانت نہیں کی۔ تو جو اپنے جیسے انسانوں کے حق میں، تمام عمر سچا دیانت دار اور پاک وصاف رہا ہو۔ کیا عقل باور کر سکتی ہے کہ وہ اس خدا کے حق میں جھوٹ بولے گا۔ جس سے وہ ہمیشہ لو لگاتے رہا۔ اور بچپن سے اسی کے دھیان میں مگن رہا۔ اس کے غضب سے ڈرتا رہا اور اس کے قہر سے لرزتا رہا۔
مگر اس دلیل سے وہی متاثر ہو سکتے ہیں جو اس کو ہمیشہ سے جانتے رہے ہوں اور پرکھتے رہے ہوں۔ لہذا اس دلیل کے علاوہ وہ کوئی ایسی چیز بھی پیش کرتے ہیں جو اگرچہ مشاہدہ ہوتی ہے۔ مگر انسانوں کی طاقت سے خارج ہوتی ہے۔ تمام انسان مل کر ایسی چیز پیش کرنا چاہیں تو پیش نہیں کر سکتے۔ خود ان پیش کرنے والوں کی طاقت سے بھی وہ خارج ہوتی ہے وہ صرف خالق کی بخشش ہوتی ہے، جو خالص اسی کی طرف سے ہوتی ہے۔ لہذا انسانوں کی طاقت سے خارج ہوتی ہے۔ ایسی چیز کو "معجزہ" کہا جاتا ہے۔

(۱۰)

انسانیت کاملہ۔ اعلیٰ اخلاق اور روحانیت کے یہ کامل، مکمل ماہرین جن کو یہ روشنی عطا ہوتی نبی اور رسول کہلاتے ہیں۔ اونچے درجے کا الہام جو اُن کو ہوتا ہے۔ اس کو "وحی" کہا جاتا ہے۔ اور یہ رابطہ اور تعلق یا یہ منصب جو اُن کو عطا ہوتا ہے۔ نبوت کہلاتا ہے اور جو کوئی حیرت انگیز نشان ان کو دیا جاتا ہے جس کی مثال پیش کرنے سے دنیا عاجز رہتی ہے اس کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ الہام کی روشنی ان کے لئے یقینی ہوتی ہے۔
یہ کامل اور برگزیدہ رہنما جیسے خدا کا یقین رکھتے ہیں، اس کی صفات کا یقین

رکھتے ہیں اسی طرح اُن کو یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ ان کو بتایا جا رہا ہے وہ حق ہے سچ ہے۔
اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ان کو یہ باتیں خود یا اپنے خاص فرشتے کے ذریعے بتا رہا ہے۔
کوئی شک و شبہ ان کو اس تعلیم میں نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ اس پر اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ اپنا
سب کچھ اس پر قربان کر دیتے ہیں۔ سخت سے سخت مصیبت اور کڑی سے کڑی آزمائش
ان کے قدم میں کوئی جنبش نہیں پیدا کر سکتی کیونکہ وہ اپنے یقین اور مکمل اعتماد و اطمینان کو
نہیں بدل سکتے۔

نبیوں اور رسولوں کا سلسلہ

(۱)

انسان کا جب سے وجود ہوا۔ جیسے اس کو موجودہ مادی زندگی کے لئے رہنمائی کی ضرورت
تھی ایسے ہی اس کو دوسری (اُخروی) زندگی کے لئے بھی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ تو جیسے فطری
الہام کا سلسلہ شروع ہوا ایسے ہی نبوت کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اور نبی آنے شروع ہوئے جو
ہر پیدا ہونے والے سوال کا جواب دیتے رہے۔ اور ہر نئی گتھی کو سلجھاتے رہے، لیکن کبھی
ایسا بھی ہوا کہ ایسے سوالات اُبھر کر سامنے آئے جو آئندہ ترقی کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتے
تھے جہاں سے ایک شاہراہ متعین ہوتی تھی، جہاں یہ بتانا ہوتا تھا کہ اس تیراہے یا چوراہے میں
سے کون سا راستہ سیدھا ہے۔

ایسے موقع پر خاص خاص سبق دیئے گئے، جن کی پوری کتاب بن گئی۔ اور نبی نے وہ
کتاب دنیا کے سامنے پیش کر دی۔ ایسے نبی جن کو کتاب دی گئی، اُن کو رسول کہا جاتا ہے۔
انسانوں کے یہ کامل رہنما ہر قوم میں آئے، ہر ملک میں آئے۔ ان کی تعداد ہزاروں
سے بھی زیادہ ہے۔ مشہور یہ ہے کہ تقریباً سوا لاکھ نبی ہوئے۔

(۲)

مادی ترقیات اور سائنسی تحقیقات کا تعلق صرف موجودہ زندگی سے ہے۔ یہ پوری ہوں یا ادھوری۔ دوسری زندگی پر اُن کا اثر نہیں پڑتا بلکہ بہتر ہے کہ یہ ادھوری رہیں۔ تاکہ انسان کا دماغ بیکار نہ ہو۔ وہ ترقی کرتا رہے اور آگے بڑھتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسی تحقیقات جو ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ اُن کو آخری نہیں کہا جاتا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ کائنات کے کسی ایک کونہ کی بھی تحقیقات پُوری نہیں ہوسکی۔

لیکن جن مسائل کا تمامتر تعلق دوسری زندگی سے ہے اگر ان کی تعلیم ادھوری رہتی ہے اور اس کی وجہ سے عمل ناقص، اخلاق نامکمل اور ضابطۂ حیات ناتمام رہتا ہے، تو ظاہر ہے یہ انسانیت اور نوعِ انسان کے لئے بہت بڑا نقصان ہے کیونکہ اس سے وہ زندگی ناقص رہتی ہے۔ جو حقیقی زندگی ہے، جو دوسرے عالم میں ہمیشہ رہے گی۔

(۳)

وہ خدا جس نے نبوت کا سلسلہ قائم فرما کر دوسری زندگی سے متعلق مسائل میں رہنمائی فرمائی اور اس اُخروی زندگی میں سعادت اور کامیابی کا راستہ انسان کو بتایا۔ اس کی رحمت نے ضروری سمجھا کہ اس تعلیم کو مکمل کردے۔

لہٰذا جب تک انسان کے ذہن وفکر میں یہ صلاحیت نہیں پیدا ہوئی کہ وہ کورس کے آخری اور مکمل سبق سمجھ سکے۔ اس وقت تک اس کی ذہنی صلاحیت اور فکری استعداد کے بموجب درجہ بدرجہ تعلیم ہوتی رہی اور جب اس کے ذہن میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی تو اس کو ایک دو سبق ہی نہیں بلکہ مکمل کتاب دے دی گئی۔ اور عام اعلان کردیا گیا کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں سراسر صداقت، سچائی اور یقین ہی یقین ہے۔ شک وشبہ کا کوئی دھندلکا اس میں نہیں ہے۔

وہ پاکباز خداترس جو آگے قدم بڑھانا چاہتے تھے مگر ان کو راستہ نہیں مل رہا تھا، یہ

کتاب اُن کے لئے سراسر ہدایت اور رہنمائی ہے۔ جو پاکباز فلاح اور کامیابی کی آخری منزل پر پہنچنا چاہتا ہے، اس سے روشنی حاصل کرے اور قدم بڑھائے۔

دین ایک ہے

(۱)

حقیقت ایک ہی ہوسکتی ہے

دنیا خود بخود ہوگئی۔ یا اس کو کسی نے پیدا کیا؟

پیدا کرنے والا ایک ہے یا کئی ہیں؟

پیدا کرنے والے کو مددگاروں کی ضرورت ہے یا نہیں؟

وہ ہم جیسا ہے یا ہم جیسا نہیں ہے؟

اُس کے بیوی بچے اور اولاد ہے یا نہیں ہے؟

ان میں سے ایک ہی بات حق ہوسکتی ہے۔

وہی ایک بات اوّل سے آخر تک تمام نبیوں اور تمام رسولوں نے پیش کی اسی کا نام دین ہے۔

ان سب نبیوں نے یہی بتایا کہ:

دنیا اور دنیا کی ہر ایک چیز۔ جس میں انسان بھی ہے مخلوق ہے۔

صرف ایک ذات خالق ہے۔

وہ کامل و مکمل ازلی و ابدی ہے۔

وہ ہر ایک حاجت سے پاک ہے۔

وہ نرالا ہے، نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے، نہ اس کے کوئی مشابہ ہے۔ نہ اس کے بیوی بچے ہیں، نہ اس کا کوئی مددگار ہے نہ کسی مددگار کی اس کو ضرورت ہے۔

انسانی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک دنیاوی زندگی۔ دوسری وہ زندگی جو اس کے بعد آئے گی اصل زندگی وہ ہی ہے۔

ہر ایک عمل کی پاداش ہے۔ اس کا اچھا یا بُرا نتیجہ ہے۔ ہماری یہ زندگی کھیتی ہے۔ ہم جیسا بوئیں گے ویسا کاٹیں گے۔ خدا کی مخلوق صرف وہی نہیں جو ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی مخلوق ہے۔ جس کو ہم ان آنکھوں سے یا مادی آلات سے نہیں دیکھ سکتے۔ ایسی ہی ایک مخلوق ہے جس کو فرشتہ کہا جاتا ہے۔

تمام کائنات ختم ہونے والی ہے۔ صرف خدا کی ذات ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

قیامت برحق ہے:

جب موجودہ دنیا ختم ہو جائے گی۔ ایک دوسرا عالم سامنے آئے گا۔ اس میں انسان کے اعمال کا حساب ہوگا' جو اچھے ثابت ہوں گے ان کو جنت ملے گی۔ جو بُرے ثابت ہوں گے۔ ان کو دوزخ میں دھکیل دیا جائے گا۔

(۲)

یہ بنیادی حقیقتیں ہیں۔ تمام انبیاء (علیہم السلام) نے انہیں کو بتایا۔ انہیں کو عقائد کہا جاتا ہے۔

انبیاء (علیہم السلام) کو ماننے والے جو ان باتوں کو مانتے رہے ان کو 'مُسلم' کہا گیا مگر بہت سے لوگوں نے اپنی عقل کو رہنما بنایا اور عقل ان حقیقتوں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتی تھی، لہٰذا بھٹکتے رہے۔

اُنھوں نے کبھی خدا کی ذات وصفات میں، کبھی دُنیا یا انسان کے قدیم یا حادث ہونے میں، کبھی دوسری زندگی کے مسائل میں، کبھی انسان اور خدا کے درمیان تعلق میں عقلیں لڑائیں، طرح طرح کی باتیں نکالیں اور انہیں کو مذہب بنالیا۔

(۳)

کبھی ایسا ہوا کہ لوگوں نے اپنے ذاتی فائدے یا اپنے سماج کو رہنما بنا لیا اور نبی کی تعلیم کو اس پر ڈھال کر مذہب کی صورت بدل دی حقیقت کو فراموش کر دیا۔ رسم و رواج یا اپنے مفاد کو مذہب بنا لیا۔

کبھی خوش اعتقادی میں اپنے نبی یا دینی پیشواؤں کو ان کی حیثیت سے بڑھا دیا وہ ان کو خدا کا مددگار یا اس کی اولاد ماننے لگے۔

اللہ کے نبیوں اور رسولوں نے آکر اصلاح کی کوشش کی کبھی لوگوں نے اُن کی بات مانی اور ایسا بھی ہوا کہ نبی عمر بھر کوشش کرتے رہے مگر قوم کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔ بہرحال لوگوں خصوصاً ان کے سماجی رہنماؤں نے غلط راستے اختیار کر کے اپنے اپنے مذہبوں کی صورتیں بدل دیں۔ لیکن ان غلط کاریوں سے وہ حقیقت نہیں بدل سکتی جس کی تعلیم انبیاء علیہم السلام دیتے رہے۔ لہٰذا دین ایک ہی رہا۔

(۴)

البتہ قدرتی اور سماجی صلاحیتوں اور انسان کی ذہنی استعداد کے بموجب عبادت کے طریقوں اور ان چیزوں میں اختلاف ہوتا رہا جن کو نظامِ حیات اور زندگی گذارنے کا دستور العمل یا شریعت کہا جاتا ہے۔ پس انبیاء علیہم السّلام کی شریعتیں مختلف ہوتی رہیں۔ اصل دین ایک ہی رہا۔ کیونکہ حقیقتیں بہرحال حقیقتیں رہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

(۵)

آخر میں ایک مکمل کتاب دے دی گئی۔ وہ مکمل پیغام اور دینِ برحق کا مکمل دستور ہے یہ اعلان کر دیا گیا کہ یہ کتاب ہمیشہ ہمیشہ اسی طرح محفوظ رہے گی کبھی اس میں ایک نقطہ اور ایک شوشہ کا بھی فرق نہیں آئے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ لوگ کسی لفظ یا فقرہ کا مطلب غلط سمجھ جائیں مگر اس کے لفظوں میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور اسی بنیاد پر غلط سوچنے

والوں کی غلطی کی اصلاح کی جاتی رہے گی۔ چونکہ یہ کتاب ہمیشہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ دینِ حق کا پیغام مکمل لوگوں کے سامنے رہے گا۔ لہٰذا کسی نبی یا کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اب نہ کوئی نبی پیدا ہوگا اور نہ وحی کے ذریعہ کوئی اور کتاب نازل ہوگی۔ علماً کا کام ہوگا کہ اس کتاب کو سمجھیں، سمجھائیں اور اپنے اخلاق و کردار سے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیتے رہیں۔

نبی ہر ایک قوم میں آئے

وہ سوالات جو ابتدا ہی میں بیان کئے گئے تھے۔ ہر ایک سمجھ دار انسان کے سامنے آتے اور ہر ایک قوم کو خواہ وہ کہیں رہتی ہو۔ اس کا رنگ، اس کی نسل خواہ کچھ ہو۔ اُس کو ان سوالات کے جوابات کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ ہر ایک قوم میں نبی بھیجے گئے۔ یہی نبی انسانوں اور تمام دنیا میں پھیلی ہوئی اقوام کے سچے رہنما تھے۔ جنہوں نے دین کی باتیں بھی بتائیں اور دنیا کی بھی۔ روحانی مسائل میں بھی رہنمائی کی اور سماجی معاملات میں بھی! انہوں نے سیاسی سبق بھی دیئے اور اخلاقی اور مذہبی بھی بس یہی حضرات صحیح رہنما اور سچے ہادی تھے۔

لیکن دنیا کی قوموں نے جب اپنی زندگیاں خاص نظریات پر ڈھالنا شروع کیں تو کچھ قومیں وہ ہوئیں جنہوں نے سرے سے نبوت ہی کا انکار کر دیا۔ اور نبیوں کے بجائے اوتار ماننے لگیں یا سائنس اور فلسفہ کو یعنی عقلیت کو مذہب کی حیثیت دے دی یا رسم و رواج کو دھرم اور دین بنا لیا۔

قرآن پاک اور تذکرہ انبیاء۔ قرآن پاک کا انداز یہ ہے کہ وہ مشاہدات سے یا تاریخ اور قومی روایات کے مسلمہ شواہد سے استدلال کرتا ہے۔ اس نے یہ تو کہا کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے۔ جس میں "نذیر" (نبی) نہ گذرا ہو۔ یہ بھی فرمایا:

ہر ایک قوم کے لئے نبی ہوئے۔ (سورۃ رعد)

لیکن اس نے ان نبیوں کا تذکرہ نہیں کیا جو ان قوموں میں بھیجے گئے تھے: جو نبوت

کی منکر، اوتار پرست یا رسم و رواج اور فلسفہ و سائنس یعنی عقلیت کی پجاری ہوگئیں اور نبیوں کو بالکل بھلا دیا۔

کیونکہ قرآن حکیم کا موضوع تاریخ نہیں ہے اس کا موضوع ہدایت اور رہنمائی ہے پس تاریخ کی حیثیت سے توان فراموش کردہ نبیوں کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا گیا کہ تاریخ قرآن حکیم کا موضوع نہیں ہے اور نبی کی حیثیت سے ان کا تذکرہ اس لئے بے سود تھا کہ جن کے سامنے ان کے کردار کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا تھا وہ ان کو قطعاً بھلا چکی ہے یا اگر جانتی ہے تو نبیوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ اوتار یا فلسفی کی حیثیت سے۔

مثلاً کرشن جی یا رام چندر جی، ممکن ہے نبی ہوں مگر ان کو ماننے والے ان کو نبی کی حیثیت سے نہیں مانتے۔ لہٰذا کسی استدلال میں نبی کی حیثیت سے ان کا نام لینا بے سود تھا۔ البتہ عیسائی اور یہودی اگرچہ راہِ اعتدال سے بہت کچھ ہٹ چکے تھے اور اصل تعلیم کو تقریباً مسخ کر چکے تھے لیکن وہ سلسلۂ نبوت کے قائل تھے اور یہودی اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانتے تھے مگر عیسائی ان سب کو مانتے تھے۔ جن کا تذکرہ بائبل میں ہے۔ لہٰذا قرآن پاک میں انہیں انبیاء علیہم السّلام کی مثالیں پیش کی گئیں۔ اور انہیں کے تعلیم و کردار سے استدلال کیا جن کا تذکرہ توریت یا انجیل میں ہے۔

ہم بھی انہیں انبیاء علیہم السّلام میں سے چند کے تذکرہ سے اس کتابچہ کو آراستہ کرتے ہیں۔ (واللہ الموفق)

سب سے پہلا انسان سب سے پہلا نبی

وہ سب سے پہلا انسان جو دنیا میں آیا جس کو پوری روئے زمین کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنایا۔ قرآن حکیم اور بائبل دونوں کا متفقہ بیان یہ ہے کہ "وہ آدم" تھے۔ جن کو نبوت بھی عطا ہوئی تھی (علیہ السّلام)

آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے چیزوں کے نام بتا دیئے تھے (قرآن شریف سورۃ۲ آیت ۳۱)

آدم نے سب مواشیوں اور آسمان کے پرندوں اور ہر ایک جنگلی جانور کا نام رکھا۔ (بائبل ۲ فقرہ ۲۰)

آدم علیہ السلام جانتے تھے کہ اُن کا اور تمام کائنات کا پیدا کرنے والا ایک خدا ہے تن تنہا۔ وہ اسی کے پرستار تھے۔

آدم علیہ السلام کے بدن ہی کے حصّہ سے اس کا جوڑا خدا نے پیدا کیا یہ سب سے پہلی عورت تھی۔ (قرآن حکیم سورۃ نسار ۴ آیت ۱)

بائبل پیدائش باب دوم۔ فقرہ نمبر ۲۱، ۲۲، ۲۳)

آدم نے اپنی جورو کا نام حوّا رکھا، اس لئے کہ وہ سب زندوں کی ماں ہے اور خداوند خدا نے آدم اور اس کی جورو کے واسطے چمڑے کے کرتے بنا کر ان کو پہناتے (بائبل پیدائش ۳ فقرہ ۲۰،۲۱)

ان دونوں کے اولاد ہوئی بڑھی پھیلی آدم علیہ السلام جانتے تھے کہ ان کا اور تمام کائنات کا پیدا کرنے والا خدا ہے۔ جو اکیلا اور تنہا ہے۔ اس کا کوئی شریک یا ساجھی یا مددگار نہیں ہے وہ صرف خداء واحد کے عبادت گذار اور پرستار رہے۔

آدم علیہ السلام نے کچھ اپنی عقل اور سمجھ سے اور کچھ خدا کے بتانے (الہام) سے خدا کی عبادت کرنے اور دنیا میں زندگی گذارنے کے طریقے سیکھے اور اپنی اولاد کو بتائے۔ آدم علیہ السلام کی عمر ۹۳۰ برس ہوئی۔ (بائبل، پیدائش ۵ فقرہ ۵[۱])

صحیح تعداد تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ البتہ تقاضاء قیاس یہ ہے کہ نو صدیوں کے طویل عرصہ میں آدم علیہ السلام کی اولاد ہزاروں[۱] سے آگے بڑھ گئی ہوگی۔ اور باقاعدہ[۲] مکانات بھی تعمیر ہونے لگے ہوں گے اور بہت سی آبادیاں بھی ہوگئی ہوں گی۔

---

۱ اگر ہر لڑکے کے تین لڑکے مانے جائیں تو ایک آدمی کی اولاد بارھویں پشت میں پونے دو لاکھ ہو سکتی ہے۔
۲ جو تمدن بائبل کی تصریح کے بموجب چمڑے کے لباس سے شروع ہوا تھا وہ سوتی کپڑے تک یقیناً پہنچ گیا ہوگا۔

ناموراَفراد اولادِ آدم کی تعداد بڑھی آبادیاں قائم ہوئیں۔لین دین اور کاروبار شروع ہوا نئے نئے مسائل سامنے آتے رہے۔بڑے بڑے لوگوں نے ان کو حل کیا۔ان میں سے چند کے نام ہمیں مذہبی روایات کے ذریعہ معلوم ہوئے ہیں: ودّ۔ سواعؔ۔ یغوثؔ۔ یعوقؔ۔ نسرؔ۔

سب سے پہلی گمراہی یہ لوگ مرتے رہے تو ان کے کارناموں سے سبق لینے کے لئے لوگوں نے اُن کی برسیاں منانی شروع کیں۔ان کی تصویریں بھی بنالیں تاکہ اُن کا تصور قائم رہے اور ان کی زندگیوں سے سبق لیا جاتا رہے۔پھر جب تصویر کشی سے آگے بڑھ کر مورتی بنانے کا آرٹ شروع ہوا تو لوگوں نے ان کی مورتیاں بنالیں۔پھر اُن کی پوجا بھی شروع کردی۔رفتہ رفتہ انہیں کی پوجا رہ گئی۔آدم علیہ السلام کے بتلائے ہوئے طریقے ایک ایک کر کے سب ختم ہو گئے۔ذہنوں میں ان کا ہلکا سا خاکہ بھی نہیں رہا۔

حضرت نوح علیہ السلام اس گمراہی کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو نبوت کے لئے منتخب فرمایا۔حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ایک ہزار سال ہوئی۔یہ غیر معمولی طویل عمر تبلیغ اور اصلاح کی جدوجہد اور مصیبتیں اٹھانے میں صرف ہوئی مگر چند آدمیوں کے علاوہ ساری قوم ایک ہی ڈگر پہ چلتی رہی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی یہ طویل عمر دنیا کے مستثنیات میں سے ہے!اس زمانے میں بھی اتنی لمبی عمر نہیں ہوتی تھی۔اس لئے قدرتی بات ہے کہ کئی پشتیں حضرت نوح علیہ السلام کے سامنے گذریں مگر انسانی ذہن کچھ اس طرح ٹھٹھر گیا تھا کہ بات اُن کے دماغوں میں بیٹھ ہی نہیں سکی کہ ہم جیسے انسان خواہ کتنے ہی بڑے ہو جائیں پوجا کے لائق نہیں ہو سکتے۔

پرستش کا مستحق صرف خدا۔واحد ہے جس نے سارے عالم کو پیدا کیا۔

وہ حضرت نوح علیہ السلام کی تردید ہی کرتے رہے اور جو اذیتیں پہنچا سکتے تھے۔برابر پہنچاتے رہے۔

لہ بخاری شریف ص۲۳۲۔ تفسیر سورۂ نوح۔

حضرت نوح علیہ السّلام کو جب کئی پشتوں کے بعد یہ یقین ہوگیا کہ وہ پودے جو اچھے پھلوں کے لیئے لگائے گئے تھے، جھاڑ بن چکے ہیں، یہ اگر باقی رہے تو کانٹوں کا جنگل بڑھے گا باغ انسانیت پھول اور پھل نہیں لاسکے گا تو انھوں نے مجبوراً اور بے چین ہوکر بد دعا کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طوفان[1] آیا۔ جس نے تمام قوم کو غرق کر دیا۔ صرف حضرت نوح علیہ السّلام اور جو ان کے ساتھ جہاز پر سوار تھے وہ باقی رہ گئے۔

اس طوفان میں زمین سے بھی پانی اُبلا اور بائبل کی روایت ہے کہ چالیس روز تک دن رات بارش برستی رہی۔ زمین ہی نہیں۔ بلکہ پہاڑوں کی چوٹیاں بھی پانی میں ڈوب گئیں۔ پیدائش باب ۷

طوفان رُکا اور زمین خشک ہوئی تو جو جہاز میں پناہ لیئے ہوئے تھے، وہ زمین پر اُترے دوبارہ آبادی شروع ہوئی مگر تمدن کی رفتار اس مرتبہ تیز رہی۔ کیونکہ آباد ہونے والے وہ تھے جو تمدن کی بہت سی منزلیں پہلے ہی طے کر چکے تھے۔

یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السّلام نے اتنا بڑا جہاز بنالیا تھا جس میں وہ اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ، جن میں انسانوں کے علاوہ اور جانداروں کے جوڑے اور ان کے کھانے پینے کا سامان بھی تھا، کئی ماہ رہ سکے۔

طوفان کے بعد

زیادہ پشتیں حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سے چلیں۔ جن کے نام تھے۔ سام، حام، یافث

لیکن نئی آبادی ایک ہی صوبہ یا ایک ہی ملک میں بند ہوکر نہیں رہی مختلف علاقوں

---

[1] یہ زمانہ تاریخ سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ بائبل سے اس کی کچھ تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے مختصر طور پر اتنا ہی تذکرہ کیا ہے۔ جتنا تذکرہ نصیحت کرنے اور عبرت دلانے کے لیئے ضروری تھا۔ بائبل اور قرآن کے علاوہ دوسری قوموں کی مذہبی روایات میں بھی کسی نہ کسی عنوان سے اس کا تذکرہ ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ انسانی آبادی اس وقت محدود تھی۔ کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام سے چند پشتوں کے بعد ہی یہ طوفان آگیا تھا۔

میں پھیلی۔ مثلاً

سام کی اولاد زیادہ تر عرب (مشرق وسطیٰ) میں۔

حام کی اولاد زیادہ تر مصر اور افریقہ میں۔

یافث کی اولاد زیادہ تر الجزائر وغیرہ میں آباد ہوئی۔

یعنی انسانی دنیا جو پہلے ایک ملک میں تھی اب کئی ملکوں میں پھیل گئی۔ وسعت آبادی کے ساتھ ان کی ضرورتوں کا دائرہ بھی وسیع ہوا جس نے تبادلہ اور تجارت کا رواج ڈالا۔ نہریں نکالی گئیں، باغ لگائے گئے۔ پہاڑ کھود کر ان میں محل بنائے گئے۔ دیواروں میں مورتیاں اور طرح طرح کی تصویریں کھودی گئیں۔ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ اخلاق اور روحانیت کی روشنی بھی پھیلی۔ ملکی نظام بھی قائم ہوا۔ چھوٹی چھوٹی حکومتیں بھی بنیں۔ مگر تمدن کی ترقی کے ساتھ تمدنی امراض بھی پیدا ہوتے رہے۔ ان کی اصلاح کے لئے انبیاء علیہم السلام آتے رہے۔

مگر کبھی کبھی ان امراض نے ایسی وبائی صورت اختیار کی کہ پوری قوم کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

یہ امراض ان تمام قوموں میں پھیلے جن میں تمدن نے ترقی کی۔ ان سب کے نام بتلانے مشکل ہیں۔ مگر عربوں کو اپنی خاندانی اور ملکی روایات کے ذریعہ یہ معلوم تھا کہ عاد و ثمود جو بڑی طاقتور قومیں تھیں، کاروباری دھوکہ دینے کے امراض ان میں پیدا ہوئے اور اس طرح ان کی طبیعتوں میں رچ گئے کہ وہ اُن سے نفرت کرنے کے بجائے ان کو اپنا فن اور اپنا کمال سمجھنے لگے۔

حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام جیسے انبیاء علیہم السلام آئے انہوں نے خداشناسی اور خداپرستی کی دعوت دیتے ہوئے ان امراض کے ازالہ کی کوشش بھی کی۔ ان قوموں نے اگرچہ صدائے حق پر توجہ نہیں دی۔ جس کے نتیجہ میں وہ برباد ہوگئیں۔ مگر صدائے حق ختم نہیں ہوئی بلکہ وہ انسان کا علمی اور اخلاقی سرمایہ بن گئی۔

عجائب پرستی اور خود فراموشی

تمدن آگے بڑھ رہا تھا، انسانی دماغ کے گوشے کھل رہے تھے۔ نئی نئی تحقیقات سامنے آ رہی تھیں مگر خود اپنے بارے میں انسان کی ذہنیت پہلے سے بھی زیادہ پست ہو گئی تھی انسان خود اپنی حقیقت فراموش کر چکا تھا وہ کیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو سب سے زیادہ ذلیل اور ہر چیز کو اپنے سے زیادہ بلند اور لائق پرستش سمجھ لیا۔

آسمان کے تارے سب سے زیادہ عجیب تھے، اس نے اپنے ذہن و فکر کی تمام پونجی انہیں کے سمجھنے اور پہچاننے میں صرف کر دی۔ غور و فکر نے عجیب عجیب نتیجے اخذ کئے کچھ ان میں سے درست بھی ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ بہت سی باتیں جو اٹکل سے سمجھی تھیں ان کا عقیدہ اور یقین بن گئیں۔

ستاروں کے الگ الگ نام رکھے گئے۔ ان کی تاثیریں معلوم کی گئیں اور یقین کر لیا گیا کہ حالاتِ زمانہ کا اتار چڑھاؤ، موسموں کی تبدیلی، قوموں کا عروج و زوال۔ قسمت کا بگاڑ سنوار جو کچھ ہوتا ہے وہ ان کی تاثیروں ہی سے ہوتا ہے۔ یہ تاثیریں ان کی اپنی ہیں۔ ان کی خوشی یا ناراضگی سے ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اُن کی رضامندی حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خاص خاص موقعوں پر خاص خاص وقت میں اُن کی پُوجا کی جائے۔

اس طرح ایک لمبا چوڑا مذہب بن گیا جو انسان کے دماغوں پر حکومت کرنے لگا۔

چاند۔ جس پر بیسویں صدی عیسوی میں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تارے، جن تک موجودہ دنیا کے راکٹ پہنچ رہے ہیں۔ آفتاب جس کے متعلق نئی تحقیق یہ ہے کہ اس جیسے آفتاب اور اس جیسے نظامِ شمسی خدا جانے کائنات میں کتنے ہیں انہیں

لہ پہلے قوم نوح جن ناموروں کی پُوجا کرتی تھی وہ انسان تھے اور اب جن عجیب چیزوں کو معبود بنایا گیا ان کا درجہ انسان سے کم ہے۔

چاند تاروں کو معبود اور قابلِ پرستش سمجھ لیا گیا تھا۔

آفتاب سب سے بڑا تھا اس کو سب سے بڑا دیوتا مانا گیا۔ اور تاروں کو اور درجے دیئے گئے۔ اُن تک پہنچنا مشکل تھا تو ان کی تاثیر کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی مورتیاں بنائی گئیں۔ ان کے نام کے شوالے تعمیر کئے گئے اور یہ مورتیاں ان شوالوں میں رکھ کر انکی پوجا شروع کردی گئی۔

منطق اور فلسفہ اس وقت بھی تھا اور ہمارے زمانہ کے فلسفیوں سے زیادہ انکو اپنے فلسفہ پر ناز تھا

ہمارے زمانے میں تحقیقات کا قدم بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ مگر پھر بھی یقین کیا جاتا ہے کہ تحقیقات نامکمل ہے۔ اور خدا جانے کتنی منزلیں ہیں جہاں تک رسائی نہیں ہوئی۔ اور نہیں کہا جاسکتا کہ آخری منزل تک رسائی ہوسکے گی یا نہیں۔

لیکن اس زمانہ کے فلسفیوں کو اپنی تحقیق پر یہاں تک ناز اور غرور تھا کہ مخالفت برداشت نہیں کرسکتے تھے جو ان کو حقیقت کی راہ بتاتا اسکو گردن زدنی مجرم سمجھتے تھے۔

مار ڈالنا، سولی پر چڑھا دینا، آگ کی بھٹی میں جھونک دینا، سب کچھ اس کے لئے روا تھا، جو اِن کی بات نہ مانتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

ایران و عرب کے بیچ میں مملکتِ عراق ہے جس کے ایک جانب خلیج فارس ہے اور دوسری جانب شام و فلسطین۔

یہاں زیادہ تر "حامی" نسل کے لوگ آباد تھے۔ جو "کوش" پسرِ حام پسر نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ اسی خاندان کا بادشاہ بھی تھا، جس کا نام نمرود تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا بادشاہ تھا۔

کچھ آبادی ان کی بھی تھی جو سام پسر نوح علیہ السلام کی اولاد تھے۔

یہ ملک اس زمانہ میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اس کا دارالحکومت بابل تھا۔

جو اس زمانہ کے علوم و فنون کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ بابل کے قریب ایک "اور" شہر تھا جہاں زہرہ، چاند اور سورج کے مندر تھے۔ جہاں صبح و شام پوجا کے لئے یاتری پہنچا کرتے تھے۔

یہیں ایک شخص "تارح" رہا کرتا تھا، جس کا تعلق اولادِ سام سے تھا۔ مورتیاں بنانے اور گھڑنے کا کام اس کے یہاں ہوتا تھا اور اس میں اس کو کمال حاصل تھا۔ اسی وجہ سے اس کو آذر کہا جاتا تھا۔[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی کے بیٹے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو عقل سلیم عطا فرمائی تھی۔ انہوں نے وہ بات سوچی جو اس دور میں بالکل اوپری بات تھی۔ اگرچہ آج جانی پہچانی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس زمانہ کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی کی کرن کا نظر آجانا سب سے بڑے دیدہ ور اور صاحبِ بصیرت کا کام تھا۔

یہ چاند تارے جن کو دیوتا کہا جاتا ہے ان پر ہر دن زوال کیوں آتا رہتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے نکلتے ہیں پھر چھپ جاتے ہیں۔ آفتاب جس کو سب سے بڑا دیوتا کہا جاتا ہے اتنا پابند کیوں ہے۔ راستہ مقرر، گردش کا وقت مقرر۔ صدیاں گذر جاتی ہیں مگر جس مقام اور جس تاریخ پر اس کے طلوع و غروب ہونے کا جو وقت ہے، اس میں فرق نہیں آتا۔ اگر یہ دیوتا ہے تو ایسا جکڑ بند کیوں ہے اور اگر مجبور ہے تو دیوتا بننے کے قابل نہیں، اس کی پوجا غلط ہے۔

یقیناً یہ خدا نہیں ہے۔ خدا کوئی اور ہے جس نے پوری کائنات کا یہ کارخانہ قائم کیا جس کا ایک پرزہ یہ آفتاب ہے۔ مجھے اسی خدا کی عبادت کرنی چاہیئے اپنی پوری ہستی۔ اپنا مرنا اور جینا اور اپنا تمام کام اسی کے لئے کر دینا چاہیئے صرف اسی کا ہو جانا چاہیئے اور صرف اسی کا بن کر رہنا چاہیئے۔"

یہ فطری الہام کا نور تھا۔ جو ذہن ابراہیمؑ پر چمکا (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ نے اس کی

---

[1] تاج العروس (قاموس وغیرہ) اور آذر بت کا نام بھی تھا جس کا یہ پجاری تھا اور اس کے نام پر اپنا نام رکھ لیا تھا۔

تصدیق فرمائی۔ اُن کو نبوت و رسالت کے منصب عظیم سے نوازا۔ ان کے مسلک کو دین حق اور آنے والے تمام مذہبوں کا اساس اور بنیادی نقطۂ نظر قرار دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے تبلیغ شروع کی تو پوری قوم بھڑک اُٹھی۔ خود انکا باپ ان کا دشمن ہوگیا۔ بہت سے مناظرے اور مباحثے ہوئے۔ براہِ راست بادشاہِ وقت سے مناظرہ ہوا۔ اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پہاڑ سے بھی زیادہ ثابت قدم ثابت ہوئے تو طے کرلیا گیا کہ آگ کا جہنم بناکر ان کو اس میں جھونک دیا جائے۔

سرکاری طور پر قومی حیثیت میں اس سزا کو جاری کرنے کا انتظام کیا گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے دہکتے ہوئے جہنم میں جھونک دیا گیا۔ مگر جس خدا نے ان کو عظیم الشان خدمت کے لئے پیدا کیا تھا اُس نے اپنی قدرت کا نمونہ دکھایا۔ نارِ نمرود کو گلزارِ ابراہیمؑ بنادیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام صحیح سالم اس جہنم سے نکل آئے۔ اُن کے کسی ایک بال پر بھی آنچ نہیں آئی۔ لیکن جو قوم خود اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لے تو اس کو کون کھول سکتا ہے۔

اس کھُلے معجزے کے بعد بھی قوم کے انداز میں فرق نہیں آیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وطن اور قوم کو خیرباد کہا۔ کہ کسی جگہ پہنچ کر یادِ خدا کریں۔ ان کے ساتھ اُن کی بیوی "سارہؓ" تھیں۔ بھتیجا حضرت لوط علیہ السّلام اور ان کی بیویؓ۔

یہ قافلہ منزلیں طے کرتا ہوا فلسطین پہنچ گیا اور وہیں سکونت اختیار کرلی مصیبتیں اب بھی پیش آتی رہیں۔ ایک مرتبہ قحط سخت پڑا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور ان کی اہلیہ مصر پہنچے وہاں بھی اُن کی آزمائش ہوئی۔ مگر پھر بادشاہ ان سے متاثر ہوا۔ یہاں تک کہ اپنی لڑکی ہاجرؓ کو اُن کی زوجیت میں دے دیا اور بہت کچھ ہدیئے، تحفے دیکر اُن کو رُخصت کیا۔ ان

دونوں بیویوں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو لڑکے ہوتے۔ اسمٰعیل (علیہ السلام) حضرت ہاجرہ سے اور اسحاق (علیہ السلام) حضرت سارہ کے بطن سے۔

یہودیوں، عیسائیوں اور عربوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت مسلم تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مورثِ اعلیٰ بھی مانتے تھے اور اپنے دین و مذہب کا بانی بھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہی کو مانتے تھے۔

آریائی نسل میں "برھما" یا برہم کی شخصیت مسلم تھی لیکن یہ کون تھے اور آریا کہاں سے آئے۔ یہ تحقیق طلب ہے۔

اگر ان کا نشو و نما ایران سے ہوا ہے تو حضرت ابراہیم کا وطن بھی ایران کے قریب عراق میں تھا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور خانہ کعبہ

ستارہ پرستوں نے ستاروں کے نام پر شوالے اور مندر بنا رکھے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کے خالق اور تمام کائنات کے پروردگار خدا، واحد کے نام پر مسجدیں بنانی شروع کیں۔

پہلے اپنے فرزندِ ارجمند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ساتھ لیا اور اس مقام پر خانہ خدا کی تعمیر کی جہاں سب سے پہلے انسان (حضرت آدم علیہ السلام) نے خدا کا گھر بنایا تھا۔ جس کو کعبہ کہا جاتا ہے۔

آدم علیہ السلام کی بنائی ہوئی یہ مسجد اگرچہ خاص اس مقام پر تھی جس کا درجہ کائناتِ روحانیت میں بہت بلند مانا جاتا ہے، وہ تجلی گاہ رب العالمین ہے لیکن کئی صدی پہلے جب طوفانِ نوح آیا تھا تو یہ مسجد منہدم ہو کر ایک سرخ ٹیلے میں دب گئی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ٹیلے کو کاٹ کر یہ بنیادیں برآمد کیں اور ان پر خانہ کعبہ تعمیر کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب یہ تعمیر کر رہے تھے تو ساتھ ساتھ اپنے رب اور مالک کی بارگاہ میں گڑگڑا کر یہ دعا بھی کر رہے تھے۔

اے ہمارے رب ہماری یہ خدمت قبول فرما۔ خداوندا تو دعائیں سنتا ہے تو سب باتوں کو جانتا ہے (سب کے دلوں کا حال تجھے معلوم ہے)

اے ہمارے رب ہمیں اپنا حکم بردار بنا اور ہماری اولاد میں بھی ایک امّت پیدا کر جو تیری فرماں بردار ہو۔

اے ہمارے رب اے ہمارے پروردگار ہمیں عبادت کے طریقے بتا دے اور ہماری جو کوتاہیاں ہیں ان کو معاف فرما۔ بے شک تو ہی معاف کرنیوالا مہربان ہے۔

اے ہمارے رب ہماری اولاد (نسل) میں ایسا رسُول پیدا کر جو خود انہیں میں کا ہو (انہیں کے خاندان اور نسل کا ہو) جو اُن کے سامنے تیری آیتیں پڑھے اور ان کو سکھائے کتاب اور حکمت (دانش اور بصیرت کی باتیں) اور ان کو سنوارے (دیندار، مہذب اور با اخلاق بنائے) تو ہی ہے غالب اور زبردست حکمت والا۔ (سورۂ بقرہ ۱۵ آیات ۱۲۶ - ۱۲۹)

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بچپن ہی میں یہاں لے آئے تھے۔ حضرت ہاجرہ ساتھ تھیں۔ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو اسی جگہ آباد کر دیا تھا جہاں بعد میں خانہ کعبہ بنایا اور اس وقت دعا کی تھی۔

"اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد اس (بنجر) میدان میں جہاں کھیتی کا نام و نشان نہیں ہے تیرے واجب الاحترام گھر کے قریب آباد کر دی ہے، مقصد یہ ہے کہ وہ نماز قائم کریں۔ (سورہ ابراہیم رکوع ۶)

یہیں سے مکہ کی آبادی شروع ہوئی اور اسی کے قریب "منیٰ" مقام پر وہ واقعہ

پیش آیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے الہامی خواب کی بنا پر اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کو اللہ کے نام پر قربان کرنے کا ارادہ کیا باپ اور بیٹے دونوں نے آنکھیں بند کر کے ان کے اوپر پٹیاں کس لیں کہ فطری محبت کی تڑپ ہچکچاہٹ نہ پیدا کرے۔

بیٹا بخوشی راہِ خدا میں قربان ہونے کے لئے لیٹ گیا اور باپ نے گلے پر چھری چلائی مگر جب اپنی قربانی کو دیکھنے کے لئے آنکھوں سے پٹی کھولی تو قربان ہونے والا بیٹا الگ کھڑا تھا۔ سامنے ایک ذبح شدہ دنبا تھا اور یہ بشارت سنائی جارہی تھی کہ:

یہ بہت بڑا امتحان تھا جس میں تم دونوں کامیاب ہوئے تم پر ہمیشہ ہمیشہ سلام ہو، جو نیکوکار ہوتے ہیں ہم ان کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (سورہ صافات)

حضرت اسحاق علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السّلام کو شام میں آباد کیا۔ یہاں بھی خانہ خدا بنایا جس کو یروشلم کہا جاتا ہے۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کے مشہور فرزند حضرت یعقوب (علیہ السلام) ہوئے جن کا نام اسرائیل بھی تھا۔ انہیں کی اولاد بنو اسرائیل کہلاتی۔ کئی ہزار برس تک بنو اسرائیل وہ منتخب قوم رہی کہ جن میں نبیوں اور رسولوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ جو تبلیغ و اصلاح کے فرائض انجام دیتے رہے۔

حضرت یوسف۔ حضرت موسیٰ۔ حضرت ہارون۔ حضرت داؤد۔ حضرت سلیمان۔ حضرت ایوب۔ حضرت زکریا۔ حضرت یحیٰی۔ حضرت عیسیٰ (علیہم الصلوٰت والتسلیمات) انہیں میں سے ہوئے۔

بنو اسرائیل مصر میں

حضرت یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی اور بھی تھے۔ مگر باپ (حضرت یعقوب علیہ السّلام) کو حضرت یوسف علیہ السلام سے

زیادہ محبت تھی۔ بھائیوں کو اس پر رشک ہوا۔ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جنگل میں لے جاکر ایک اندھے کنویں میں ڈالدیا جس میں پانی نہیں تھا۔ اس طرف سے گذرنے والے قافلے کا ایک آدمی اس کنویں پر پانی بھرنے آیا۔ وہاں پانی کے بجائے یہ خوبصورت لڑکا مل گیا۔ اس نے اس کو غلام بنالیا اور مصر لے جاکر فروخت کردیا۔ جوان ہوئے تو مالک کی عورت ان پر فریفتہ ہوگئی۔ مگر جب یہ ہر طرح پاک دامن رہے تو سازش کر کے انکو جیل میں ڈلوادیا۔ بادشاہ نے خواب دیکھا جس کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دی کہ مصر میں سات سالہ قحط پڑیگا اور اس سے پہلے سات سال اچھی پیداوار ہوگی۔

قحط کی تباہی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ کاشت زیادہ سے زیادہ کی جائے اور جو غلہ پیدا ہو اس کو صاف کئے بغیر اسی طرح بالوں سمیت اسٹاک کیا جاتا رہے۔ اس طرح کیڑا نہیں لگے گا۔ پھر قحط کے زمانے میں احتیاط سے تقسیم کیا جائے۔ تو نہ صرف مصر بلکہ شام والوں کے لئے بھی کافی ہوجائے گا۔

بادشاہ اس تعبیر سے مطمئن ہوا۔ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل سے رہا کرکے بات چیت کی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی گفتگو سے بادشاہ یہاں تک متاثر ہوا کہ ان کو اپنا وزیر بنالیا اور یہ تمام معاملات ان کے سپرد کردیا۔ جس کو انہوں نے ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ یہ سات سالہ قحط کا ہولناک زمانہ اطمینان سے گذر گیا۔ اور مصر کے علاوہ شام کے باشندے بھی آسودہ رہے

اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد اور سب بھائیوں کو مصر میں بلالیا۔ یعقوب علیہ السلام کی اولاد (بنو اسرائیل) تقریباً چار سو سال تک یہاں رہی لاکھوں تک انکی تعداد پہنچ گئی۔ اول یہ امن اور اطمینان سے رہے پھر مصر کے اصل باشندوں نے انکو ستانا شروع کردیا اور انکو غلام بنالیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

اب ہم ایک نئے دور میں داخل ہورہے ہیں۔ تمدن کافی ترقی کرچکا ہے۔ بڑی بڑی

سلطنتیں قائم ہوگئی ہیں۔ ان میں ملوکیت اور بادشاہت کی پوری خو بو ہے۔ بادشاہوں کی کیبنٹ یا مجالس میں وزراء بھی ہیں، بڑے بڑے جاگیردار بھی ہیں جن کے نظام میں کاشتکار کی وہی حیثیت ہے جو ہل چلانے والے مویشی کی۔ کاشت کاروں کی قسمت گاؤں کی زمینوں کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔ گاؤں فروخت ہوتا ہے تو اس کے ساتھ کاشتکار بھی فروخت ہوتے ہیں بیگار لینے کا طریقہ بھی شباب پر ہے۔ بڑے بڑے پونجی پتی بھی ہیں جن کے یہاں بیشمار دولت ہے۔ بادشاہت کا عروج یہ ہے کہ کہیں بادشاہ کو خدا کا کہیں سب سے بڑے دیوتا کا اوتار اور مظہر سمجھا جاتا ہے۔

کاہنوں اور ساحروں کا یہ کام ہے کہ وہ بادشاہ کی پوجا کا فلسفہ ذہنوں میں بٹھاتے رہیں۔ ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے پیدا ہونے میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سال باقی ہیں۔ تاریخ نے قلم ہاتھ میں لے لیا ہے۔ مگر اسے کاغذ میسر نہیں آیا۔ پتھروں پر یا کچی دھات کی پلیٹ پر اہم اور غیر معمولی واقعات اور بادشاہوں کے حالات کندہ کر دیئے جاتے ہیں۔ مصر کے باشندے مختلف دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ بڑا دیوتا سورج تھا جسے اُ غ کہتے تھے اور چونکہ بادشاہ کو اس کا اوتار سمجھتے تھے اس لئے اس کا لقب فارع۔ عبرانی میں فارا عو اور عربی میں فرعون ہو گیا[1]

کہتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے زمانے میں جو مصر کا بادشاہ تھا۔ وہی سب سے پہلا فرعون تھا۔ پھر خاندان بدلتے رہے۔ مگر تقریباً ڈھائی ہزار برس تک شاہان مصر کا خطاب فرعون ہی رہا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی تبلیغ سے گھٹا ٹوپ اندھیری میں ایک روشنی نمودار ہوتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی اولاد اس روشنی میں چلتی رہی۔ مگر ستارہ پرستی جو جہو کا مذہب ہو گیا تھا وہ ختم نہیں ہوا۔

---

[1] ترجمان القرآن صفحہ ۲ جلد ۲

اس زمانہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ بنو اسرائیل پر فرعون کا ظلم انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ تمام بنی اسرائیل فرعون اور اس کی قوم کے غلام تھے۔ ان سے کاشت کرائی جاتی۔ سخت سخت بیگاریں لی جاتیں اور ان کی طاقت کو قابو میں رکھنے کے لئے جب ضرورت سمجھی جاتی نسل کشی بھی کرادی جاتی۔ یعنی لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کرا دیا جاتا اور لڑکیوں کو باندی بنانے کے لئے زندہ رکھ لیا جاتا تھا۔

اس لرزہ خیز جبر و قہر کے زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی والدہ کے دل میں ڈال دیا کہ جب وہ خطرہ محسوس کریں تو بچہ کو صندوق میں بند کر کے دریائے نیل کے بہاؤ پر ڈال دیں۔

ان کی والدہ نے ایسا ہی کیا۔ فرعون کا محل لب دریا تھا۔ جب صندوق بہتا ہوا محل کے قریب پہنچا تو اس کو نکال لیا گیا۔ فرعون کی بیوی کے سامنے یہ بچہ پیش ہوا تو اس کو محبت آئی اُس نے اپنی پرورش میں لے لیا۔

دودھ پلانے کے لئے ماما کی تلاش ہوئی تو حضرت موسیٰؑ کی بہن جو صندوق کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ گئی تھیں۔ انہوں نے اپنی ماں کا نام لے دیا جو حضرت موسیٰؑ کی والدہ تھیں۔ اس طرح شاہی نگرانی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش ہوئی اور خاص اس بادشاہ کے محل میں وہ جوانی تک پہنچے۔ جس کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے لئے ان کو پیدا کیا گیا تھا۔

مگر موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے قلب بیدار عطا فرمایا تھا۔ شعور کی پہلی ہی منزل میں جذبۂ خدا پرستی کے ساتھ ایک مظلوم مخلوق کی ہمدردی کا جذبہ بھی ابھرا۔

انہوں نے ستم رسیدہ بنی اسرائیل کی حمایت شروع کی، فرعون اور اس کی قوم کو خدا پرستی کی دعوت دی اور وہ تمام مصیبتیں جھیلیں جو ایک منظم سلطنت کے ایسے متکبر اور

جبار بادشاہ کی طرف سے پہنچ سکتی ہیں۔ جو ظلم و ستم اور جبر و قہر کی ایسی بدترین مثال ہو کہ اس کی وجہ سے لفظِ فرعون قابلِ نفرت بن گیا ہو۔

مطالبہ یہ نہیں تھا کہ سلطنتِ مصر موسیٰ یا ان کی قوم بنی اسرائیل کے حوالے کر دی جائے یا ملک مصر میں ان کے کچھ حقوق محفوظ کر دیئے جائیں۔ مطالبہ صرف یہ تھا کہ ان کی غلامی کی زنجیریں صرف اتنی ڈھیلی کر دی جائیں کہ وہ ملکِ مصر سے نکل کر اپنے پرانے وطن (شام) چلے جائیں۔ جہاں حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق علیہما السلام نے اپنی زندگیاں گذاری تھیں لیکن جن جاگیرداروں اور دولت مندوں کو ان بیگاریوں سے فائدہ پہنچ رہا تھا وہ اپنا مفاد خود اپنے ہاتھوں کس طرح تباہ کر سکتے تھے۔ مدت گذر گئی۔ سخت ترین کشمکش جاری رہی۔ بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ربِ موسیٰ کا حکم ہوا کہ ایسا انتظام کرو کہ پوری قوم ایک ہی رات میں سمندر کی طرف روانہ ہو جائے۔

بنو اسرائیل نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ لیکن جیسے ہی فرعون کو علم ہوا اس نے فوج کو تیاری کا حکم دیا اور تیزی سے ان کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

توریت کے بیان کے بموجب اس وقت بنو اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ تھی۔ مگر کئی پشتوں کی غلامی نے ان کی ہمتیں اتنی پست کر دی تھیں کہ جیسے ہی انہیں فرعون کی فوج نظر آئی، گھبرا گئے اور واویلا کرنے لگے۔ مگر وہ ارحم الراحمین جو اس مظلوم قوم کو نجات دلانے اور ظالم کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اُس نے اپنی قدرت کا عجیب نظارا کرایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ دریا پر اپنا عصا ماریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جیسے ہی اس حکم کی تعمیل کی دریا کا پانی کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا اور بیچ میں (بروایت توریت) بارہ راستے ہو گئے۔

بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے اپنے تمام سامان اور مویشیوں کے ساتھ ان راستوں سے گذر کر پار ہو گئے۔

فرعون پہنچا تو اُس نے اپنی فوجیں ان راستوں پر دوڑا دیں۔ لیکن جب یہ فوجیں بیچ دریا میں پہنچیں تو پانی کے ٹکڑے جو پہاڑ کے تودوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے جُڑ گئے، پوری فوج غرق ہو گئی۔

فرعون کی موت وہیں آئی مگر اس کی لاش کو دنیا کی عبرت کے لئے بچا لیا گیا۔ جو تقریباً ساڑھے تین ہزار سال گذر جانے کے بعد بھی اب تک مصر کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔

توریت کا نزول

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے علاوہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کو بھی، دستور العمل کے طور پر ہدایتیں دی گئیں۔ مگر ان کی حیثیت کتابچوں کی تھی۔ لیکن اب تمدن اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ہر میدان میں اسکی شاخیں پھیل گئی تھیں۔

اب ایسے دستور العمل کی ضرورت تھی۔ جو روحانی ترقی کا ضامن ہو تو دنیاوی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے بھی وہ رہنما ہو۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وہ کتاب نازل کی گئی۔ جس کو توریت یا بائبل کا عہدِ قدیم کہا جاتا ہے اور بنو اسرائیل کو ہدایت کی گئی کہ اس پر پورے استقلال اور مضبوطی سے عمل کریں اس میں ان کا دنیوی مفاد بھی ہے اور دینی فلاح بھی۔

بنو اسرائیل ایک عرصہ تک اس پر عمل کرتے رہے تو وہ دینی لحاظ سے بھی دنیا کی تمام قوموں میں سب سے افضل اور بہتر رہے اور دنیاوی لحاظ سے بھی یہاں تک ترقی کی کہ حضرت داؤد (۹۶۲ء ق م) اور حضرت سلیمان (۹۳۲ء ق م) علیہما السلام جیسے فرماں روا ان میں ہوئے جو نبی بھی تھے اور بہت کامیاب حکمران بھی۔

ان کا یہ دور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تقریباً نو سو برس پہلے تھا مگر پھر بنی اسرائیل میں حرص۔ طمع۔ خود غرضی۔ مکر و فریب جیسے امراض بڑھے مظالم کی کثرت ہوئی تو ان پر ایک تباہی آئی۔

کلدانی بادشاہ۔ بخت[۱] نصر (تاجدار بابل) نے حملہ کر کے ان کے ملک شام کو تباہ کر دیا یروشلم میں ہیکل سلیمانی کو شہید کیا۔ شہر میں آگ لگا دی۔ گھروں میں گھس گھس کر جان، مال، ناموس سب کو برباد کیا، توریت کے نسخے بھی جلا ڈالے۔

بنو اسرائیل خالی ہاتھ رہ گئے تو اس زمانہ کے نبی حضرت عزیر (عزرا) نے اپنی یاد سے توریت کو دوبارہ مرتب کیا۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً چھ سو برس پہلے کا واقعہ ہے۔ اس تباہی کے بعد بنو اسرائیل جو اب یہود کے نام سے مشہور ہو گئے تھے کچھ سنبھلے۔ مگر کچھ عرصہ بعد ہی ان میں وہ خرابیاں پھر لوٹ آئیں۔ ان کے علماء اور مفتی صاحبان بھی عوام کے رنگ میں رنگ گئے۔ اغراض پرستی ان کا دھرم ہو گیا۔

یہاں تک کہ توریت کے احکام میں بھی اپنی اغراض کے بموجب تبدیلی کر دی۔ ان کی سختی یہاں تک بڑھی کہ سمجھانے والوں کو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ جو نبی آتے رہے ان کو ستاتے رہے، یہاں تک کہ بعض کو شہید کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بطنِ مریم سے پیدا کیا۔ ان کا مقصد بنو اسرائیل کی اصلاح تھا۔ ان پر انجیل نازل ہوئی۔ جو گویا توریت کا تکملہ تھی جس میں کچھ احکام نئے تھے باقی پوری انجیل توریت کی وضاحت اور اس کے اصل احکام کی تصدیق و تائید تھی اور ان خرابیوں کی اصلاح تھی جن کو یہود جزو مذہب اور قومی خصلتیں بنا چکے تھے۔

مگر یہود نے کوئی اثر نہیں لیا۔ بلکہ اپنی قومی خصلتوں کے بموجب وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درپے ہو گئے۔ اور بغاوت کا الزام لگا کر ایک رومی عدالت سے ان کیلئے

---

[۱] اعلام القرآن ص ۱۳۰ (اعلام القرآن از مولانا عبدالماجد دریابادی)

سولی کا حکم دلوا دیا۔

عدالت کا فیصلہ جاری کیا گیا۔ سولی دی گئی۔ لیکن سولی پر کون چڑھا۔ یہودی پوری سینہ زوری سے یہی کہتے رہے کہ ہم نے حضرت مسیح بن مریم رسول اللہ کو قتل کرا دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی قدرت کا کرشمہ دکھایا۔ آیاتِ قرآنی کی روشنی میں مسلمانوں کا یقین یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اوپر اٹھا لیا اور صبح کے جھٹ پٹے میں سولی دینے والوں نے حضرت عیسیٰ کے دھوکے میں ایک یہودی کو سولی پر چڑھا دیا۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے بہت تھوڑے سے تھے۔ انہیں کے ذریعہ ان کے دین کی اشاعت ہوئی۔ مگر یہودیوں میں جو بُری خصلتیں پیدا ہو گئی تھیں، ان میں کمی نہیں آئی وہ دن بدن بڑھتی رہیں۔

نظریات میں تلاطم اور تصادم

توریت نے صرف خدا اور آخرت کے بارے میں عقائد کی تلقین نہیں کی تھی بلکہ دنیا کی معاشی، اقتصادی اور سیاسی زندگی کے متعلق بھی ضابطے بنائے تھے اور نظریات کی تلقین کی تھی۔ پھر بنو اسرائیل کی حکومتیں قائم ہوئیں اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام جیسے حکمران ہوئے تو ان نظریات پر بھی عمل ہوا۔ اور ان کی شہرت یہاں تک ہوئی کہ متمدن دنیا کے لئے بحث و نظر اور تحقیق و تفتیش کا موضوع بن گئے دوسری طرف فلسفہ بھی انسانی دماغوں پر حاوی ہوتا رہا۔

اور جس طرح داؤد اور سلیمان علیہما السلام بنو اسرائیل میں عظیم الشان فرمانروا تھے، دوسری قوموں اور ملکوں میں بھی بڑے بڑے بادشاہ اور راجہ ہوئے۔ انہوں نے دستور اور قانون بنائے ان میں سے رُوم کے قانون نے ہمہ گیر شہرت حاصل کی۔

برہمنوں کا فلسفہ ہندوستان میں پہلے سے موجود تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام سے چار یا پانچ سو سال پہلے بُودھ اور مہابیر جیسے مہاتما ہندوستان میں ہوئے جنہوں نے سیاسی اقتدار کے ساتھ اپنی قوم کو قانون اور فلسفہ بھی دیا۔

اس طرح یہ تو ہوا کہ انسان کی ذہنی اور فکری صلاحیت نقطۂ عروج پر پہونچ گئی مگر خرابی یہ تھی کہ ان تمام فلسفوں اور قانونوں کا مدار صرف عقل اور قیاس پر تھا۔

عقلی دلائل اور قیاسی نتائج دماغوں کو متاثر تو کر سکتے ہیں مگر دلوں کو مطمئن نہیں کر سکتے اور اگر یہ فلسفے ایک دوسرے سے مختلف اور متصادم بھی ہوں تو بے اطمینانی اور اضطراب اور بڑھ جاتا ہے اور ایک طالب حق حیران اور سرگردان ہو جاتا ہے کہ حق کس کو سمجھے، یا پھر اپنی عقل کی پرستش شروع کر دے کہ جو اچھا معلوم ہو وہ اختیار کرے۔ ان مختلف فلسفوں کا اثر بنو اسرائیل پر بھی ہوا۔

توریت کے ماننے والے پہلے ہی توریت کی تعلیم کو اپنی اغراض کے قالب میں ڈھال چکے تھے۔ کچھ عرصہ بعد انجیل کے ماننے والوں نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا۔ یہاں تک کہ توحید کی سیدھی تعلیم کو تثلیث کے تاروں میں اُلجھا دیا۔

بہت بڑی مصیبت یہ تھی کہ ہر ایک نے اپنا اپنا دائرہ الگ بنا لیا تھا وہ دائرہ ہی عظمت اور تقدس کا مستحق تھا۔ عمل خواہ کچھ ہو، عقیدہ خواہ کتنا ہی غلط ہو، لیکن جو اس دائرہ میں ہے وہ خدا کا چہیتا ہے، فرزند خدا ہے۔ پاکی اور بلندی اسی کا حصہ ہے، جو اس دائرہ سے باہر ہے وہ ناپاک ہے، پست اور ذلیل ہے۔ علم کا دریا جس کا کوئی کنارا نہیں، اس کو بھی انہی دائروں کی چھوٹی چھوٹی لکیوں اور تالابوں میں بند کر دیا تھا۔

اُس وقت دنیائے انسانیت حیرت زدہ تھی۔ انسان اپنا مقصد فراموش کر چکا تھا۔ کوئی اپنی پیشانی ذلیل سے ذلیل چیز کے سامنے رگڑتا اور کوئی اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگتا تھا۔ کہیں دہریت تھی جس میں خدا سے انکار تھا۔ کہیں عقل پرستی، کہیں مشتبہ تعلیم جس میں کھرے کھوٹے اور اصل بناوٹ کا پتہ چلنا مشکل تھا۔ ایک طالب حق ماہیٔ بے آب کی طرح بیتاب پھرتا تھا۔ مگر اطمینان کی سیرابی اس کو میسر نہیں آسکتی تھی یہ مصیبت پوری دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔

فطرتِ انسانی صحیح رہنمائی کے لئے مضطرب تھی وہ ایسے نور کی تمنا کر رہی تھی جس کی روشنی ایک ایک کونے کی تاریکی کو اُجالا بنا دے۔

وہ ارحم الراحمین کے سامنے گڑگڑا رہی تھی کہ ایسا دستور عطا فرما جس سے نوعِ انسان کا ہر طبقہ فیض پا سکے۔ اور جملہ اقوامِ عالم کے لئے وہ رحمت بن سکے۔

رحمۃ للعالمین کی آمد

ارحم الراحمین نے مضطرب فطرت کی التجا سنی اور نوعِ انسان کے تمام طبقات پر رحم کرنے کے لئے ایک ایسا نبی مبعوث فرمایا جس کی بعثت کا مقصد ہی یہ قرار دیا کہ تمام اقوامِ عالم پر رحمت ہو، سارے جہان اس کے لطف و کرم سے فیضیاب ہوں اس کو ایسا مکمل ضابطہ حیات دیا جو دینی اور دنیاوی کامیابیوں کا ضامن اور کفیل ہے اور یقین دلا دیا کہ یہ ضابطہ، یہ دستورِ اساسی ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا اور انسان کو ایسی مصیبت کبھی نہیں برداشت کرنی پڑے گی کہ طالبِ حق مضطرب ہو اور اس کو نورِ حق کی جھلک نظر نہ آئے۔

دلیلِ صداقت پہلی دلیل خود اس نبی کی زندگی تھی۔ کیا ایسا شخص جھوٹ بول سکتا ہے، دھوکا دے سکتا ہے۔ جس کی پوری زندگی پاکبازی، سچائی، امانت داری، نیک دلی، اعلیٰ اخلاق اور شریفانہ خصلتوں کی حسین تصویر اور نہایت صاف و شفاف آئینہ رہی ہو اور کیا اس خدا کے نام پر جھوٹ بول سکتا ہے۔ جس کی عظمت اور بڑائی اس کے دل میں بچپن سے گھسی ہوئی ہے اور جس کے جلال و جبروت سے وہ ہر وقت ڈرتا رہتا ہے۔

(۲)

دوسری دلیل قرآن شریف ہے جو صرف اس نبی کو دیکھنے والوں کے لئے نہیں

بلکہ دنیا کے ہر انصاف پسند طالب حق کے لئے ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی دلیل ہے۔
قرآن کسی انسان کا بنایا ہوا کلام نہیں ہے، یہ اللہ کا کلام ہے جو بلا کسی ردوبدل اور بلا کسی تبدیلی کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوا۔ اور جس طرح یہ یقینی بات ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں، ایسے ہی یہ بھی یقینی بات ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ کیونکہ یہ اگر اللہ کا کلام نہیں ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی انسان کا بنایا ہوا کلام ہے تو تمام دنیا کو چیلنج ہے کہ اس جیسا کلام بنا کر پیش کر دے۔
پورا قرآن شریف مقابلہ پر نہ پیش کر سکیں تو اس کا کوئی حصہ ہی پیش کر دیں۔ قرآن شریف میں ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ ایک سو چودہ نہیں صرف دس سورتیں پیش کر دیں، دس سورتیں نہ پیش کر سکیں صرف ایک سورت اس جیسی بنا کر پیش کر دیں۔ اور اگر نہ پیش کر سکیں تو یہ یقین کر لیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔
اور جو کچھ اس میں انسان کی موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کی فلاح و بہبود کے لئے کہا گیا ہے اور مخالفت کی صورت میں جس عذاب، بربادی اور تباہی کی خبر دی گئی ہے، وہ سب حق ہے، اس کی مخالفت حق کی مخالفت ہے۔ جس کی سزا تباہی، بربادی اور دائمی عذاب ہوتی ہے۔
جو کتابیں الہامی یا آسمانی مانی جاتی ہیں وہ اپنی اصلی زبان میں نہیں رہیں۔ یا اس زبان کے بولنے والے نہیں رہے۔ لیکن قرآن حکیم جس زبان میں نازل ہوا، بجنسہٖ اپنی اسی زبان میں انہیں لہجوں اور طرزِ تلاوت کے ساتھ موجود ہے اور جس زبان میں نازل ہوا، وہ بھی موجود ہے، اس کے بولنے والے مسلم اور غیر مسلم کروڑوں، اس کا ادب زندہ، اس کے ادیب ترقی پذیر، مگر قرآن پاک جس طرح زمانۂ نزول میں معجزہ تھا، آج بھی معجزہ ہے۔ عربی ادب میں اس کو آج بھی وہ مقام حاصل ہے کہ بڑے بڑے ادیب اس کے فقروں اور جملوں سے اپنے کلام آراستہ کرتے ہیں، کسی بھی ادبی مضمون میں اس کی کوئی آیت آجاتی ہے تو پورے

کلام میں جان ڈال دیتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کی تعلیم کو دیکھو۔ تعلیم خود اپنی صداقت اور سچائی کی دلیل آپ ہے، پوری تعلیم اس کتابچہ میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ صرف بنیادی تعلیمات کا خلاصہ چند نمبروں میں پیش کیا جا رہا ہے۔

غور کیجیے، کیا اس سے بہتر مقدس اس سے زیادہ سچی کوئی تعلیم ہو سکتی ہے اور کیا اس کے پیش کرنے والے کے تقدس پر کوئی شبہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱)

توحید

یہ مضامین جو ذیل کے نمبروں میں پیش کیے گئے ہیں، قرآن حکیم میں انکو بار بار دُہرایا گیا ہے۔ قدرتی مشاہدات تاریخ کے مسلمہ واقعات اور خود انسان کے فطری احساسات سے نہایت مؤثر اور بلیغ انداز میں استدلال کیا گیا ہے ہم نے تمام آیتوں کا حوالہ نہیں دیا بلکہ کسی آیت یا دو آیتوں کے حوالے کو کافی سمجھا ہے۔

اللہ ایک ہے وہ بے نیاز ہے۔ کسی کی اس کو ضرورت نہیں ہے۔ ہر ایک ضرورت اور احتیاج سے وہ پاک ہے، اس کے اولاد نہیں، نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ نہ کوئی اس کا ہمسر اور اس کے برابر ہے۔ (سورۂ اخلاص ۱۱۲)

اس کو کسی کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جا سکتی، کیونکہ اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ کوئی چیز اس کے مثل نہیں ہے۔ (سورۂ شوریٰ ۴۲)

نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں، وہ تمام نگاہوں کو پا رہا ہے۔ وہ بڑا ہی

لطیف اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔ (سورۃ الانعام ۶ آیت ۱۰۲)

اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمینوں پر، وہی حیات دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، وہی ہر چیز پر قادر ہے، وہی پہلے ہے اور وہی پیچھے وہ ہی ظاہر ہے اور وہی مخفی ہے اور وہی ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے

(سورۃ حدید ۵۷ آیت ۱، ۲)

(۲)

جتنے نبیؑ اور رسولؑ آئے اُن سب کی تصدیق کرو اور ایمان لاؤ

ہر قوم کے لئے رہنما ہوئے ہیں (سورۃ رعد ۱۳ آیت ۷)

ہر ایک اُمت (انسانی گروہ۔ قوم) میں نبی گذرے ہیں (سورۃ فاطر ۳۵ آیت ۲۴)

جتنے نبی گذرے ہیں، بلا تفریق سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔

(سورۃ بقرہ ۲ آیت ۱۳۶ (خلاصہ) آیت ۲۸۵ (خلاصہ)

قل اٰمنا باللّٰہ (سورۃ آل عمران ۳ آیت ۸۴ (خلاصہ)

وہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ (سورہ نساء ۴ آیت ۱۵۰ (خلاصہ)

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے جُدا نہیں کیا (کہ اس کو نہ مانا ہو) تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں (جو سچے مومن ہیں)۔ ہم عنقریب انہیں اُن کے اجر عطا فرمائیں گے۔

(سورہ نساء ۴ آیت ۱۵۱)

(۳)

انبیاء اور رسولوں کی حیثیت

تمام انبیاؑ اور رسولوں کا یہی قول رہا ہے" ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہاری طرح کے آدمی ہیں لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل اور احسان کیلئے چن لیتا ہے۔ (سورۃ ابراہیم ۱۴ آیت ۱۱)

محمد رسول اللہ ﷺ کی حیثیت

(اے پیغمبر) اعلان کر دیجئے میں تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں (البتہ) اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے۔ تمہارا معبود وہی ایک ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ (سورہ کہف ۱۸ آیت ۱۱۰)

(۴)

رواداری

جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں۔ تم ان کے معبودوں کو برا بھلا نہ کہو۔ (ان کے حق میں بدکلامی نہ کرو) کہ پھر وہ بھی حد سے بڑھ کر بے سمجھے بوجھے اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے لگیں۔

قدرت نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ فکر و عمل اور سب کے سوچنے کا ڈھنگ ایک نہیں ہوتا۔ ہر گروہ اپنی سمجھ کے موجب اپنی رائے رکھتا ہے۔ تمہاری نظر میں اس کی راہ کتنی ہی بُری ہو مگر اس کی نظر میں وہ راہ ایسی ہی اچھی ہے جیسی تمہاری نظر میں تمہاری راہ اچھی ہے بس ضروری

ہے کہ اس بارے میں برداشت اور رواداری سے کام لو جس بات کو تم اچھا سمجھتے ہو۔ اس کی دعوت دو مگر اس کی کُدْ نہ کرو کہ سب لوگ تمہاری بات مان ہی لیں۔ تم ان پر پاسبان نہیں بنائے گئے ہو۔ نہ تم پر اس کی ذمہ داری ہے کہ دوسرے کو ضرور ہی نیک بنا دو۔ (سورۂ انعام ۶ آیت ۱۰۴۔ ۱۰۸ اخلاصہ

سورۂ ہود ۱۱ آیت ۱۱۸

(۵)

دین و مذہب دل سے ہے زور زبردستی سے نہیں

دین کے معاملہ میں زور زبردستی کا کوئی موقع نہیں۔ کسی طرح کا جبر اکراہ دین کے بارے میں جائز نہیں۔ دین کی راہ دل کے اعتقاد اور یقین کی راہ ہے اور دل کی تبدیلی خیر خواہانہ نصیحت اور ہمدردانہ دعوت اور تفہیم سے ہوتی ہے۔ زور و ظلم سے نہیں ہوتی۔ (سورہ بقرہ ۲ آیت ۲۵۵ سورۂ یونس ۱۰ آیت ۹۹)

(۶)

انسان کا درجہ اور مقصد

تمام دنیا انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

(سورۂ بقرہ ۲ آیت ۲۸۔ سورہ جاثیہ ۴۵ آیت ۱۲، ۱۳)

انسان خدا کی عبادت کے لئے بنایا گیا ہے۔

(سورہ الذاریات ۵۱ آیت ۵۶)

اِنسان دنیا میں خدا کا خلیفہ اور نائب ہے (سورہ بقرہ ۲ آیت ۲۹)

جو انسان اپنی حقیقت اور خداداد حیثیت نہیں پہچانتے وہ اس گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ فرشتوں کو دیوتا مان کر ان کی پوجا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ رب العالمین اور خالق کائنات نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ وہ سجدہ کریں۔ چنانچہ سب نے سجدہ کیا۔ صرف ایک نے چوں چرا کی تو وہی راندہ درگاہ ہو گیا اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محروم (مردود و ملعون) ہو گیا۔

(سورہ بقرہ ۲ آیت ۳۴ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ تا مِنْ طِيْنٍ ○ سورہ اعراف ۷، آیت ۱۱ - ۱۲)
فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ تا رَجِيْمٌ (سورہ حجر ۱۵ آیت ۲۹-۳۴ وَاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ،
سورہ ص ۳۸ وغیرہ)

پس انسان کے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کسی کے سامنے ماتھا ٹیکے۔ یہ شرک ہے۔ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

(سورہ لقمان ۳۱ آیت ۱۳)

(خود اپنے اوپر ظلم ہے سب سے بڑی خود کشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ہر ایک مخلوق پر عزت بخشی اور یہ مخلوق کے سامنے پیشانی رگڑ کر اپنی عزت خاک میں ملا رہا ہے اور اپنی انسانیت کو فنا کے گھاٹ اتار رہا ہے) آفتاب اور چاند کو سجدہ مت کرو۔ سجدہ اس کو کرو جس نے آفتاب و ماہتاب کو پیدا کیا ہے۔ (سورہ سجدہ ۴۱ آیت ۳۷)

رب اور پروردگار صرف اللہ ہے اسی پر جمے رہو۔ (سورہ سجدہ ۴۱ آیت ۳۰)
آپس میں ایک دوسرے کو رب نہ بناؤ۔ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے گویا خدا کو چھوڑ کر اس نے اپنا پروردگار اس کو بنا لیا ہے۔
(سورہ آل عمران ۳ آیت ۶۴)

(۷)

انسانی بھائی چارہ

اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور

تم کو مختلف گوت اور مختلف خاندان اس لئے بنا دیا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم سب میں بڑی عزت والا بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔ (سورہ حجرات ۴۹ آیت ۱۳)

اے ایمان والو نہ تو مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہیئے۔ کیا عجب ہے کہ وہ ان سے (ہنسنے والوں سے) بہتر ہوں۔ اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہیئے۔ کیا عجب ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو۔ نہ ایک دوسرے کو بُرے لقب سے پکارو۔ سورہ حجرات ۴۹ آیت ۱۱

نہ ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے بُرائی کرو۔ سورہ حجرات ۴۹ آیت ۱۲

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی نازل کی ہے کہ تواضع اور عاجزی سے کام لو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مرد کسی مرد کے مقابلے میں فخر کرے اور بڑائی جتائے نہ یہ ہو کہ کوئی کسی پر ظلم کرے۔ (مسلم شریف)

یہ اسلامی تعلیم سے پہلے زمانۂ جاہلیت کی بات ہے کہ لوگ باپ دادوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نسل و خاندان کے فخر و غرور کو ختم کر دیا ہے اب انسان کی تقسیم اخلاق و کردار کے لحاظ سے ہے کہ کوئی صاحب ایمان اور پرہیزگار ہے اور کوئی بدکار و بدبخت (فاجر و شقی) تمام انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم کی سرشت مٹی سے ہوئی تھی۔

(ترمذی شریف ص ۲۲۴ ج ۲ وغیرہ)

(۸)

عورت

تم سب کو اکیلی جان سے پیدا کیا اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا۔ تاکہ اس

کی رفاقت میں چین پائے۔ (اعراف، آیت ۱۸۹)

عورتوں کے لئے بھی اسی طرح کے حقوق مردوں پر ہیں جس طرح کے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک خاص درجہ دیا گیا ہے۔ (سورہ بقرہ ۲ آیت ۲۲۸)

اور عورتوں کے ساتھ اچھی طرح زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں (تب بھی تمہارا سلوک اچھا رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ممکن ہے تمہیں ایک چیز پسند نہ آئے مگر اللہ نے اس میں بہت بھلائی رکھی ہو۔ (سورہ بقرہ ۲ آیت ۱۹)

(۹)

عدل و انصاف

ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر ابھار دے کہ تم انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو۔ (سورۂ مائدہ ۵ آیت ۷)

(۱۰)

نیکی کیا ہے

نیکی اور بھلائی یہ نہیں ہے کہ تم عبادت کے وقت اپنے منہ پورب کی طرف پھیر لو یا پچھم کی طرف (یا اسی طرح کی کوئی اور رسم و ریت پوری کر لو) نیکی یہ ہے کہ انسان (اپنی شخصیت کی تعمیر اور اپنی اصلاح کو نصب العین بنا کر) اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، آسمانی کتابوں اور خدا کے تمام نبیوں اور رسولوں پر ایمان لائے۔

جب خود اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے اس کا مال اس کو محبوب ہو، تو

ایثار سے کام لے اور اس مال کو، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دے (غلاموں یا مقروضوں کی) گردن چھڑانے میں خرچ کرے۔ نماز پوری پابندی کے ساتھ قائم رکھے۔ زکوٰۃ ادا کرے۔ اپنی بات کا سچا اور قول کا پابند رہے۔ جو قول و قرار کرے اس کو پوری طرح نبھائے۔ تنگی یا مصیبت کی گھڑی ہو، یا خوف و ہراس کا وقت ہر حال میں صبر اور (ضبط و تحمل) سے کام لے۔ (سورہ بقرہ ۲ آیت ۱۷۷)

(۱۱)

حرام کام

اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے کہہ دیجئے۔ میرے پروردگار نے جو کچھ حرام ٹھہرا دیا وہ تو یہ ہے:
بے حیائی کی باتیں جو کھلے طور پر کی جائیں اور جو چھپا کر کی جائیں۔ گناہ کی باتیں، ناحق کی زیادتی اور یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ، جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور یہ کہ خدا کے نام سے ایسی بات کہو کہ جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں۔ (سورہ اعراف، آیت ۳۲)

جہاد

ضرورتِ دفاع اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتا کہ انسانوں کے ایک گروہ کے ذریعہ دوسرے گروہ کو ہٹاتا رہتا ہے تو دنیا خراب ہو جاتی (امن و انصاف کا نام و نشان باقی نہ رہتا) لیکن اللہ تعالیٰ سب جہانوں کے لئے فضل رکھنے والا ہے۔ (سورہ بقرہ ۲ آیت ۲۵۱)

یعنی اگر لوگوں میں انقلاب کی روح نہ ہوتی اور جو جماعت کسی حالت میں ہے وہ سدا اسی حالت میں چھوڑ دی جاتی تو نتیجہ یہ نکلتا کہ دنیا ظلم و تشدد اور فتنہ و فساد سے بھر جاتی اور حق و انصاف کا نام و نشان نہ ملتا۔ پس اللہ کا بڑا ہی فضل ہے کہ جب کوئی ایک گروہ ظلم و فساد میں منہ چھوٹ ہو جاتا ہے۔ تو مزاحمت کے محرکات دوسرے گروہ کو مدافعت کے لئے کھڑا کر دیتے ہیں۔ اور اس کے اقدام کو روک دیتے ہیں۔ اور اس طرح ایک قوم کا ظلم دوسری قوم کی مقاومت سے دفع ہو جاتا ہے۔

مذہبی جنگ | اگر نہ ہوتا اللہ کا ہٹا دینا لوگوں کو بعض کو بعض کے ذریعہ تو منہدم کر دی جاتیں راہبوں کی خانقاہیں۔ عیسائیوں کے گرجے یہود کے عبادت خانے۔ اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ یقیناً مدد کریگا اس کی جو مدد کریگا اسکی (اللہ کی) سورۂ حج ۲۲ آیت ۳۹

یعنی بقاء باہم۔ امن و آشتی۔ مذہبی آزادی اور حریت فکر۔ بڑی اچھی چیزیں ہیں۔ انسان اور انسانیت کے بنیادی حقوق ہیں۔ مگر کسی قوم اور ملت کو یہ اسی وقت حاصل ہوتے ہیں اور اسی وقت تک باقی رہتے ہیں۔ جب اس قوم میں دفاع کی قوت اور طاقت ہو۔ پس مقصد جہاد یہ ہے کہ اگر بنیادی حقوق سلب ہونے لگیں تو قوت اور طاقت کے ذریعہ ان کو محفوظ رکھا جائے اور سلب ہو چکے ہوں تو طاقت کے ذریعہ ان کو بحال کر دیا جائے۔

خاتمہ جہاد | اور ان لوگوں سے لڑائی جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۔ (بقرہ آیت ۱۹۳)

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۔ (۸ الانفال آیت ۳۹)

فتنہ | مسلمانو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے حالانکہ

کتنے ہی بے بس مرد ہیں اور کتنی ہی عورتیں ہیں، کتنے ہی بچے ہیں جو فریاد کر رہے ہیں۔ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نجات دلا جہاں کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ لی ہے اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے اور کسی کو مددگاری کے لئے کھڑا کر دے۔ (سورہ ۴ نساء آیت ۷۵)

ملاحظہ ہو حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما، بخاری شریف ص۲۲۵ ص۶۴۵ ص۶۱ وغیرہ۔ جس میں فتنہ کی یہی تفسیر کی گئی ہے جو آیت کا مفہوم اور مضمون ہے یعنی کسی قوم کا ایسا بے بس ہونا کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر عمل نہ کر سکے اور جس کو وہ حق سمجھے اس کو اختیار نہ کر سکے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

روحانیت، شرافت اور مکارم اخلاق کا نقطۂ عروج

بیسویں صدی عیسوی کی موجودہ دنیا میں امریکہ اور یورپ سب سے زیادہ ترقی یافتہ متمدن اور مہذب مانے جاتے ہیں۔ مگر امریکہ تو نئی دنیا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی سے پہلے پرانی دنیا کو اس کے وجود کی بھی خبر نہیں تھی اور انگلینڈ، فرانس اور جرمنی وغیرہ یورپ کے مغربی ممالک اگرچہ پرانی دنیا کے نقشہ میں موجود تھے۔ مگر ساتویں صدی عیسوی میں جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ اس زمانہ میں سب سے زیادہ پس ماندہ تعلیم سے محروم ہی نہیں، بلکہ کلیسا کے حکم کے بموجب عمومی تعلیم ممنوع تھی۔ تہذیب و تمدن کی روشنی دُور دُور نہیں تھی۔ شہروں کی آبادیاں بھی خس پوش تھیں انسانوں کی جھونپڑیوں ہی میں مویشی بھی رات گذارا کرتے تھے۔ پرال کے بچھونے۔ کھال کے لحاف۔ چمڑے کے کپڑے۔

البتہ مشرقی یورپ بیشک تمدن سے آشنا تھا اور آشنا رہا تھا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے۔ تو روم ایک وسیع شہنشاہیت کا مرکز تھا۔ اسی کی ایک

عدالت تھی۔ جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے سولی کا فیصلہ کیا تھا۔

یونان میں سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے باکمال ہو چکے تھے۔ فیثاغورث جو زمین کی گردش کا قائل ہوا یونان ہی کا تھا۔ ان فلاسفروں اور دانشوروں کو اگرچہ اپنی زندگی میں آسودگی میسر نہیں آئی۔ مگر دنیا ان کے دانش و حکمت اور ان کے فلسفہ کی آج تک قائل ہے۔ عربوں نے ارسطو کو "معلم اول" کا خطاب دیا۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں اس کا فلسفہ آج بھی داخل کورس ہے اور انہیں یونانی فلاسفہ کے نظریات آج کی سائنس کا بنیادی سرمایہ ہیں۔

لیکن دوسری صدی عیسوی سے مشرقی یورپ کی ترقی بھی تنزل سے بدلنے لگی اور اس دورِ تنزل کی سب سے بڑی خصوصیت علم دشمنی تھی۔

اسکندریہ کا عظیم الشان کتب خانہ جو بطلیموسی دور کی یادگار تھا، جس میں کہتے ہیں سات لاکھ کتابیں تھیں[1]۔ اسی علم دشمنی کی نظر ہوا۔

قسطنطنیہ کے کتب خانوں کے متعلق مشہور فرانسیسی مورخ موسیو لیبان کی شہادت ہے کہ چمڑے کے اوراق پر جو کتابیں لکھی ہوئی ہیں ان کے حروف صاف کر کے چمڑا بیچ لیا کرتے تھے[2]۔ عام تعلیم کی ممانعت تھی۔ مخصوص حلقوں میں پوپ کی اجازت سے کچھ لکھنا پڑھنا سکھا دیا جاتا تھا۔ جو اس کے خلاف آواز اٹھاتا اس کے لئے کفر کا فتویٰ اور آگ کی دہکتی ہوئی بھٹی تیار رہتی تھی۔ خدا جانے کتنے ہزار یا لاکھ انسان ان بھٹیوں میں جھونکے گئے یا تہ تیغ کئے گئے۔

یہ دور جو چوتھی صدی عیسوی سے شروع ہوا اس کو قرونِ وسطیٰ کہا جاتا ہے۔ جو تاریخ یورپ کا سب سے زیادہ تاریک دور مانا جاتا ہے۔ جن کی نظر صرف یورپ کی تاریخ پر ہوتی ہے یہ بات ان کے تصور میں بھی نہیں آتی، کہ جب مغرب (یورپ) میں آدھی رات کی اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ مشرق وسطیٰ میں تہذیب و شرافت، روحانیت اور مکارم اخلاق

---

[1] العلم والعلماء - مولانا مسیح آبادی [2] تمدن عرب

کا آفتاب نصف النہار پر پہنچا ہوا تھا۔ اس کھلی ہوئی شہادت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ چند ہزار کی وہ جماعت جس نے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شمس منیر سے براہ راست نور سمیٹا تھا۔ وہ پوری کائنات کے لئے ایسی مثال گذری ہے۔ جس کی نظیر پوری دنیا کو نہ کبھی پہلے میسر آئی تھی اور نہ اس کے بعد میسر آسکی۔

یہ جماعت جس کو سراج انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا جو قرآن حکیم کی مخاطب اول تھی۔ جس کو قرآن حکیم نے خیر امۃ کہا جو ساتویں صدی عیسوی کی پیشانی کا جھومر تھی، انسانیت کی پوری تاریخ میں روحانی کمالات اور مکارم اخلاق کا نقطۂ عروج تھی۔

جو انسان اس وقت تاریکی میں تھے (مثلاً اہل یورپ) ان کے یہاں اگرچہ صدیوں بعد روشنی پہنچی مگر وہ روشنی مادیت کی تھی، جس کی نظر میں روحانیت کھوٹا سکہ تھی جس کا چلن ختم ہو چکا تھا اخلاق کے صرف وہ باب ان کی زندگی میں داخل ہو سکے جن کا تعلق صرف کاروباری ترقی سے تھا وہاں روحانیت اور اخلاق کے ترقی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جن ممالک میں قرون وسطیٰ کی وہ تاریکی نہیں تھی جو تمدن اور اخلاق سے آشنا تھے۔ وہ مشرق وسطیٰ کے اس نور سے منور ضرور ہوئے۔ لیکن ان کے حصہ میں صرف چھنی ہوئی کرنیں آئی تھیں جو دن بدن مدھم ہوتی رہیں اور ہو رہی ہیں۔

تاریخ کے اس نظارہ کے بعد کیا یہ حقیقت آفتاب کی طرح روشن نہیں ہو جاتی کہ روحانیت کا نقطۂ عروج وہ دور تھا جس کو اسلام کا قرن اول اور سب سے پہلا دور کہا جاتا ہے۔

چودہ سو برس گذر گئے، دنیا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ اس دور میں کوئی اور آفتاب روشن نہیں ہوا۔ جو روحانیت یا اخلاق کے چاند تاروں میں نئے نظریات کا نور بھرتا۔

اعلیٰ تہذیب۔ مکارم اخلاق اور روحانیت کے متعلق وہی مبادی اور وہی نظریات جو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مسعود میں زیر بحث تھے یا انسانی علم و فکر کا اثاثہ بن

چکے تھے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی اصلاح یا تکمیل کی، وہی آج بھی انسانی علم و فکر کا سرمایہ ہیں۔ انہیں کے طول و عرض میں تمام مذاہب کے فلسفے گھوم رہے ہیں۔ مادیات میں دنیا بہت آگے بڑھی، زمین سے پرواز کر کے آسمان کے تاروں تک پہنچ گئی اور اس سے بھی آگے بڑھنا چاہ رہی ہے مگر شرافت، انسانیت۔ اخلاق اور روحانیت کا قطب مینار جو حضرت خاتم الانبیاء علیہم السلام نے تعمیر کیا تھا، اس سے اونچا کوئی مینار تو کیا بنایا جاتا تہذیب و اخلاق کی دنیا کے لئے اس قطب مینار کے کنگروں کا چھونا بھی دن بدن مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

وہ بشارت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً تین ماہ پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر اُمتِ محمدیہ کو ربِّ محمد کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دی گئی تھی کہ

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے پسند کر لیا دین اسلام کو۔ (سورہ مائدہ ۵ آیت ۲)

چودہ صدیوں کے تجربہ کے بعد بھی کیا اس کی صداقت میں شک و شبہ کی گنجائش ہے۔ بیشک لوگوں کی نظر ہمارے کردار پر ہے (جو اس زمانہ میں اُمتِ محمدیہ ہیں) ہمارے کردار نے بے شک اس بشارت کو مشکوک و مشتبہ بنا دیا ہے۔ مگر خود بشارت شک و شبہ سے پاک ہے۔

فتعالی اللہ الملک الحق لا الٰہ الا ھو رب العرش الکریم

والحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی

دیباچہ سیرتِ مبارکہ

عرب قبلِ اسلام

مکّہ اور تمدّنِ مکّہ

دیباچہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

الحمد للّٰہ وکفٰی و سلامٌ علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

عرب قبل اسلام اپنے آئینے میں

چشمِ کائنات نے بے شمار انقلاب دیکھے۔ مگر کوئی انقلاب ایسا نہیں دیکھا کہ ایک قوم جو اپنی تہذیب اور اپنی روایات پر نازاں تھی، اپنی روشن خیالی اور سلیقہ مندی پر فخر کیا کرتی تھی۔ وہ اپنی خوشی سے اپنی مکمل آزادی اور خود مختاری کے باوجود بلا کسی جبر و اکراہ اور بلا کسی دباؤ کے خود اپنے احساس کی بناء پر اپنی تہذیب کو وحشت، اپنے تمدن کو جاہلیت اور اپنے علم کو جہل سمجھنے لگی ہو۔ یہ عجیب و غریب انقلاب اس قوم میں آیا تھا جو سرزمین حجاز میں آباد تھی۔ جو عرب کہلاتی تھی۔ جس کا مرکز مکہ تھا اور جس کو اپنی نسلی برتری اور اپنے ادب پر اتنا ناز تھا کہ وہ اپنے مقابلہ میں دنیا کی تمام قوموں کو تہذیب سے ناآشنا، خاندانی عظمت سے محروم ایسی جاہل اور نابلد سمجھتی تھی کہ ان کو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔

یہ قوم اپنے آپ کو "عرب" کہتی تھی یعنی خالص النسب، صاف اور واضح کلام کرنے والے۔ اور تمام دنیا کو "عجم" کہا کرتی تھی یعنی گونگے جو مافی الضمیر کو صفائی سے نہ بیان کر سکیں اور "عجماوات" یعنی مویشیوں کی طرح ہوں۔

پھر ایسا ہوا کہ اس مغرور اور متکبر قوم نے خود اپنی خوشی سے گردن جھکائی۔ گردنوں کے

ساتھ دل بھی جھک گئے اور ایسے جھکے کہ وہ خود بھی اپنے دورِ ماضی سے نفرت کرنے لگے
اور جس تہذیب، ادب اور علم پر وہ فخر کیا کرتے تھے اس کو وحشت اور جہل کہنے لگے۔
محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس قوم نے آزمایا اور تقریباً چالیس سال تک
اس کو دیکھتی۔ برتتی۔ پرکھتی اور آزماتی رہی۔ اور جب ہر طرح اس کو سچا، کھرا اور پکا ہی پایا
تو اس قوم کی انصاف پسندی اور عاقبت اندیشی نے یہ احساس پیدا کر دیا کہ اگر دوپہر کے وقت
آفتاب کا انکار کیا جا سکتا ہے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سچائی اور صداقت کا انکار کرنا بھی ممکن ہے۔
عرب قوم ایک متحرک۔ فعّال۔ باہمت۔ مضبوط ارادہ والی قوم تھی۔ جب محمد (رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے جھکی تو اس طرح جھکی کہ صرف اسی کی شخصیت کو شخصیت اور
اسی کے ارشاد کو ہدایت اور اسی کے علم کو علم سمجھنے لگی اور اس کے سوا جو کچھ اس کے پاس تھا
وہ خود اُس کی نظر میں ضلالت، ظلمت اور جہالت کا انبار معلوم ہونے لگا۔
یہاں تک کہ قرآنِ حکیم نے اس کے پچھلے دور کو جس پر اسے گھمنڈ تھا "جاھلیۃ اُولیٰ"
کہا تو ایک متنفس نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ پوری قوم اس کو "جاہلیت" کہنے لگی اس
سے نفرت کرنے لگی اور اس کا مذاق بنانے لگی۔

ایک غلط فہمی ابوبکر صدیق۔ عمر فاروق۔ عثمان غنی۔ سعد بن ابی وقاص۔ عبدالرحمٰن بن
عوف۔ ابوعبیدہ بن الجراح۔ عبداللہ بن سلام۔ عدی بن حاتم (رضی اللہ عنہم
اجمعین) جیسے اصحابِ علم و فضل اور اربابِ عزم و ہمت نے جب اپنے سابق دور کو "دورِ جاہلیت"
کہا تو عام تصور یہ ہو گیا کہ جاہلیت سے مُراد وحشت اور حیوانیت ہے۔ اور عرب قوم ایک
وحشی قوم تھی جو حیوانوں کی طرح تہذیب و تمدن سے ناآشنا اور علم و ہُنر سے بے بہرہ تھی اس
میں نہ سنجیدگی تھی نہ شرافت نہ اس کا کوئی خاص سلیقہ تھا نہ اس کا کوئی خاص ادب تھا۔
یہی تصور تھا جس کی بنا پر تاریخ نویسوں خصوصاً مصنفینِ سیرت نے عربوں کی صرف وہی
خصلتیں پیش کیں جن سے اس غلط تصور کی تصدیق ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ہندوستان کے ایک

مشہور قومی شاعر علامہ حالی نے عربوں کے اس دور کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا۔

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا ۔۔۔ جہاں سے الگ ایک جزیرہ نما تھا
زمانہ سے پیوند جس کا جدا تھا ۔۔۔ نہ کشورستاں تھا نہ کشور کشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایہ
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی ۔۔۔ نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی
وہی اپنی فطرت پہ طبع بشر تھی ۔۔۔ خدا کی زمیں بن جُتی سربسر تھی
پہاڑ اور صحرا میں ڈیرہ تھا سب کا
تلے آسمان کے بسیرا تھا سب کا

چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ ۔۔۔ ہر ایک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ ۔۔۔ نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بیباک جیسے

آئینہ عرب بدوی قبائل کے متعلق مولانا حالی کے یہ اشعار درست ہیں۔ لیکن ایسے پس ماندہ قبائل کسی ملک کی تہذیب کا معیار نہیں مانے جاتے چودہ سو سال کے بعد آج کی مہذب دنیا بھی ایسے قبائل سے اپنا دامن نہیں جھاڑ سکی۔ موجودہ دور میں جو ممالک دنیا بھر میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ مانے جاتے ہیں ان کے پس ماندہ گوشوں میں بھی ایسے قبائل موجود ہیں جو علامہ حالی کے ان اشعار کا مصداق ہیں۔ بدوی قبائل کے علاوہ مکہ۔ طائف۔ دومۃ الجندل۔ تیما دیار بجر۔ صحار جیسے شہروں کے متعلق یہ تصور سراسر ظلم ہے۔

جس زمانہ کا تذکرہ مولانا حالی نے ان اشعار میں کیا ہے اسی زمانہ کا ایک مکالمہ تاریخ کے

اوراق میں محفوظ ہے جو فی الحقیقت اس دور کے عربوں کی تہذیب کا آئینہ ہے۔ اس مکالمہ کے ضروری اقتباسات یہاں پیش کئے جا رہے ہیں۔

سلطنت ایران اس زمانہ میں کم از کم ایشیا کی سب سے بڑی منظم اور طاقتور شہنشاہیت تھی۔ جس کی شان و شوکت سے رومن شہنشاہیت بھی دم بخود رہتی تھی۔

چھٹی صدی عیسوی کا آخری ربع جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی کا دور ہے۔ اس شاہنشاہیت کا سب سے زیادہ کامیاب دور تھا جب اس کی فوجوں نے رومن شاہنشاہیت (بازنطینی ملوکیت) کی فوجوں کو شکست دیکر تقریباً تباہ کر دیا تھا۔ خسرو پرویز جس کو عرب کسریٰ[1] کہا کرتے تھے، اس سلطنت کا تاجدار تھا۔

یہ مکالمہ جس کو تاریخ نے پوری احتیاط سے محفوظ رکھا۔ جس کے ضروری اقتباسات یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔ اسی خسرو پرویز (شہنشاہِ ایران) اور عرب کے ایک رئیس "نعمانؓ بن منذر" کے درمیان ہوا تھا۔

---

[1] تاریخ طبری۔ یہی خسرو پرویز ہے۔ جس نے نامہ مبارک کو چاک کیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں اس کی پوری شہنشاہیت پارہ پارہ بلکہ بے نام و نشان ہو گئی۔ یہ نوشیروان عادل کا پوتا تھا۔ باپ کا نام ہرمز تھا۔

[2] نجف اشرف ہمارے زمانہ کا ایک مشہور شہر ہے۔ اسی مقام پر خلیج فارس کے ساحل پر کوفہ سے تین میل پر ایک شہر تھا جس کو حیرہ کہا جاتا تھا (معجم البلدان) یہ عربوں کی ایک خود مختار ریاست کا مرکز تھا۔ نعمان بن المنذر اسی ریاست کا حکمران تھا۔ یہ ریاستیں حبش کی یلغار سے تحفظ کے لئے شاہانِ ایران سے اپنا تعلق قائم کئے ہوئے تھیں۔ شاہانِ ایران بھی ان کے معاملات میں کافی دخیل رہتے تھے۔ یہاں تک کہ نعمان کے پردادا امرالقیس نے نوشیران بن قباذ (نوشیروان عادل) کی مدد سے ہی یہاں کی حکومت حاصل کی تھی (معارف ابن قتیبہ) نعمان کی کنیت ابو قابوس تھی۔ باپ اور دادا دونوں کا ایک ہی نام ہے المنذر۔ نعمان بن المنذر بن المنذر بن امرالقیس سلسلہ نسب ہے۔ عربی ادب سے دلچسپی رکھنے والے امرالقیس سے پوری طرح واقف ہیں۔ شعراء عرب میں استاذ الاساتذہ کا درجہ رکھتا تھا۔ عدی بن زید العبادی۔ بہترین ادیب اور بلند پایہ شاعر (باقی صفحہ آئندہ پر)

ایران کا شہنشاہی دربار پوری شان و شوکت کے ساتھ آراستہ ہے۔ خسرو پرویز تاجدارِ ایران، تختِ شاہنشاہیت پر جلوہ افروز ہے۔ روم۔ شام۔ ہندوستان اور چین وغیرہ ممالک کے سفراء دربار میں حاضر ہیں۔ عرب کا یہ رئیس نعمان بن المنذر بھی موجود ہے۔ سفراء نے خطابات شروع کئے۔ ہر ایک سفیر نے اپنے ملک کے کچھ حالات بیان کئے۔ نعمان بن منذر کھڑا ہوا اور اس نے اس شان سے تقریر کی کہ سب حیران رہ گئے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ عرب کا درجہ دنیا میں سب سے زیادہ بلند ہے۔ شہنشاہِ ایران اس جرأت کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے عرب پر سخت تنقید کی نعمان بن منذر سے کہا۔ تم ایسی قوم کو فوقیت دینا چاہتے ہو جس کی نہ دنیا درست ہے۔ نہ دین درست۔ جس کی نہ کوئی مملکت ہے نہ اس کے پاس کوئی دستور اور قانون ہے۔ نہ اس کی آبادی باضابطہ ہے جنگلوں اور پہاڑوں میں وحشی جانوروں کے ساتھ اُس کا گذران ہے۔ دنیا کی لذتوں سے ناواقف۔ لباس و پوشاک سے بے بہرہ۔ تمدّن سے ناآشنا۔ لوٹ مار ذریعہ معاش ہے۔ کھانے کو نہیں ملتا تو بچوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ زندہ لڑکیوں کو زمین

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) شہنشاہ ایران "خسرو پرویز" (کسریٰ) کا عربی ترجمان اور وزارتِ خارجہ میں عرب سے متعلق امور کا انچارج تھا۔ نعمان کا دوست تھا۔ اُس نے نعمان کی تعریف کسریٰ سے کی جس کی بنا پر نعمان کو دربارِ کسریٰ میں باریابی کا موقع ملا۔ پھر تعلقات خراب ہو گئے، یہاں تک کہ نعمان نے اپنے اس محسن عدی کو قتل کرا دیا۔ باپ کے بعد اس کا بیٹا زید بن عدیؔ دربارِ ایران میں باپ کے منصب پر فائز ہوا۔ اس نے نعمان سے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لیا، کسریٰ کو نعمان سے برہم کر دیا۔ یہاں تک کہ کسریٰ نے نعمان کو طلب کیا وہ کچھ دنوں کے لئے غائب ہو گیا۔ پھر آخر کار حاضر ہوا تو کسریٰ نے گرفتار کر کے ساباط کے جیل خانہ میں ڈلوا دیا۔ پھر ہاتھی کے پیروں سے کچلوا کر مروا دیا (معارف ابن قتیبہ) یہی نعمان بن المنذر ہے جس کے ایک تجارتی قافلہ کی بنا پر فجار کا معرکہ ہوا جس کو حرب فجار کہا جاتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے اعمام کے ساتھ تشریف لے گئے تھے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک دس بارہ سال تھی (ابن سعد ص۸۱ ج۱)

میں دفن کر دیتے ہیں۔ اونٹ کا گوشت ان کی محبوب غذا ہے، مہمانوں کی سب سے بڑی مدارات یہی ہے کہ اونٹ کا گوشت پیش کیا جائے جس کو درندے بھی نہیں کھاتے اور پھر قصائد اور اشعار میں اس پر فخر کیا جاتا ہے۔

نعمان بن منذر کا جواب :

شہنشاہِ عجم۔ آپ کی قوم کو جو عظمت حاصل ہے میں اس کا انکار نہیں کرتا بیشک وہ عقل و دانش اور ضبط و نظم میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ بحیثیت مجموعی دنیا کی کسی قوم کو وہ مقام حاصل نہیں ہے۔ جس کے عرب مالک ہیں۔

سیاسی عظمت بیشک آپ اور آپ کے بزرگ فاتح رہے ہیں، بہت سے ملک انھوں نے فتح کیے اور ان کے مضبوط قلعوں پر اپنی عظمت کے پرچم لہرائے۔ لیکن آپ یہ بھی خیال فرمائیں کہ عرب انہیں فاتح شہنشاہوں کے پڑوسی رہے ہیں مگر کیا کبھی کسی فاتح کی ہمت ہوئی کہ عرب کا رخ کر سکے۔ کیونکہ دنیا کی قوموں کی حفاظت اُن قلعوں پر موقوف ہے جو چونے کی گٹی اور پتھروں سے تعمیر کیے جاتے ہیں یا ان جزیروں پر جو سمندروں کی موجوں میں روپوش ہیں۔ مگر عرب کے قلعے گھوڑوں کی پیٹھ ہیں، فرش زمین اُن کا گہوارہ۔ آسمان چھت۔ اور ان کی محافظ ان کی تلوار ہے۔ ان کی رسد ان کا صبر و استقلال، پامردی اور استقامت، جفاکشی اور سخت کوشی۔

شکل و صورت اور ظاہری وجاہت عرب حسن ظاہری۔ تناسب اعضاء۔ رُو داری اور وجاہت کا معیار ہیں۔ نہ ان کی آنکھیں بھوری یا پتلی نہ ان کی ناک بھدی۔ نہ رخسار چوڑے۔ نہ ہونٹ موٹے۔ نہ چہرے جھلسے ہوئے۔ نہ سفید فاموں کی طرح کھرچے ہوئے۔ نہ بالشتی قد۔ نہ بے ڈول لانبے۔ نہ نازک بدن نہ مرجھائے ہوئے

نسب صرف عرب ہی کو حق ہے کہ خالص النسل اور محفوظ النسب ہونے کا دعویٰ کریں ہر ایک پشت میں ماہرین انساب چھان بین کرتے رہے۔ خاندانی یادداشتوں

میں اور شعراء کے قصیدوں میں ہر ایک دور کے نسب محفوظ ہوتے رہے۔ چنانچہ ہر ایک عرب کو اپنے مورث اعلیٰ تک کا نسب معلوم ہے۔ پورا نسب نامہ اس کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ لیکن دنیا کی دوسری قوموں سے اگر دریافت کیا جائے تو اکثر قومیں وہ ہیں کہ دو تین پشتوں سے آگے اپنے بزرگوں کے نام سے بھی وہ واقف نہیں ہیں۔

سخاوت اور حوصلہ ایک معمولی عرب جس کی کل ملکیت ایک اونٹنی ہو وہی اس کی مزدوری کا ذریعہ اور وہی اُس کی زندگی کا سہارا ہو۔ اگر اس کے یہاں مہمان آجائے تو اگرچہ گوشت کے چند پارچوں اور کسی مشروب سے وہ اس کی خاطر کرسکتا ہے مگر اس کا حوصلہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس معمولی مدارات پر کفایت کرے وہ اپنی اونٹنی ذبح کر ڈالتا ہے۔ گوشت کے بہترین پارچوں سے اس کی مدارات کرتا ہے اور اگرچہ وہ اپنا سب کچھ قربان کر چکا ہے مگر وہ خوش ہے کہ اُس نے مہمان کی خدمت کرنے میں حوصلہ سے کام لیا۔

ادب اور تہذیب نظم، نثر، قصیدہ گوئی، خطابت اور تقریر میں جو غیر معمولی امتیاز عرب کو حاصل ہے دنیا کی کوئی قوم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے تو عرب کا لباس سب سے بہتر، سب سے زیادہ شاندار۔ ان کی عورتیں باعصمت ان کی سواریاں وہ عربی گھوڑے جن کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ ان کے اونٹ گویا صحرا کے جہاز ہیں۔ سونے اور چاندی کی کانیں زمین کے سینہ میں اور قیمتی ہیرے جواہر ان کے پہاڑوں میں موجود ہیں۔ سمندر ان کی بغل میں ہے۔ جس کے سینہ پر ان کے جہاز رینگتے ہیں اور مشرق کی آخری سرحدوں تک ان کو پہنچاتے ہیں۔

دین اور مذہب : عرب کا مذہب جانا پہچانا ہے۔ اس کے فرائض اور مراسم معلوم

لہ جس قوم کے یہاں گھوڑوں اور اونٹوں کے نسب بھی محفوظ ہوں۔ ہر ایک کو اپنی گھوڑی اور اپنے اونٹ کا سلسلہ نسب یاد ہو، کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کو خود اپنا نسب نامہ یاد نہ ہو۔ محمد میاں۔

ہیں۔ عرب ان کے پابند ہیں۔ ان کا ایک بیت (کعبہ) ہے۔ جس کا وہ حج کرتے ہیں۔ وہاں قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ اس کعبہ کا وہ احترام کرتے ہیں۔ جس شہر میں یہ کعبہ ہے اس کا احترام کرتے ہیں۔ اس کی کچھ حدود ہیں جن کو حرم کہتے ہیں۔ اس حرم کا وہ احترام کرتے ہیں۔ اس کی مقررہ حدود ہیں۔ انسان تو کیا کسی جاندار کو بھی وہ ایذا نہیں پہنچا سکتے اس کے درخت نہیں کاٹ سکتے، سال میں چار مہینے مقرر ہیں جن کو اَشْہُرِ حُرُم کہتے ہیں۔ وہ ان کا احترام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک بہادر عرب اپنے باپ یا بھائی کے قاتل کو اپنے سامنے دیکھتا ہے وہ اس کے خون کا پیاسا ہے' اسے پوری قدرت ہے کہ وہ اس قاتل کا کام تمام کر کے اپنے باپ یا بھائی کا قصاص لے لے اور انتقام کی پیاس بجھا لے مگر اس کا دین و مذہب ہی ہے جو اس کے جذبات کو روکتا ہے۔ اس کے ہاتھ باندھ دیتا ہے۔ وہ خون کے گھونٹ پیتا ہے اور حرم مکہ یا حرم کے مہینوں میں اپنے باپ اور بھائی کے قاتل سے قصاص نہیں لے سکتا۔

قول وعہد کی پابندی

باقاعدہ عہد و پیمان تو درکنار، عہد کی قسم کا اشارہ بھی ہو جاتا ہے تو عرب اس کو اپنی گرہ سمجھتا ہے جو اسی وقت کھل سکتی ہے جب اس کی جان جاتی رہے۔

ایک عرب کو معلوم ہوتا ہے کہ کسی مصیبت زدہ نے جس کو اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں جو اس سے کوسوں دور ہے، اُس کے نام کی دہائی دی ہے۔ اب اس کی پوری قوت اور تمام وسائل اس کی امداد کے لئے اس عزم کے ساتھ وقف ہوتے ہیں کہ یا ظالم ختم ہو جائے گا یا وہ اور اس کا پورا قبیلہ فنا ہو جائے گا۔

ایک اجنبی شخص جس سے نہ تعارف ہے نہ کوئی تعلق پریشان حال پہنچتا ہے اور کسی قبیلہ کی پناہ لے لیتا ہے۔ تو اب اگر یہ اجنبی کوئی جرم کر کے آیا ہے تب بھی اس قبیلہ کی پناہ میں آنے کے بعد محفوظ ہو جاتا ہے۔ پناہ دینے والا قبیلہ اپنی جانیں قربان کر سکتا

ہے۔ مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کی موجودگی میں اس پناہ لینے والے کو آنچ آجائے۔

لڑکیوں کو قتل کردینا بیشک کچھ لوگ یہ جُرم کرتے ہیں۔ مگر اس لئے کہ ان کی غیرت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ان کے گھر پر داماد آتے یا لڑکی کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جو اُن کے لئے عار ہو۔

اُونٹ کا گوشت بیشک وہ اُونٹ کا گوشت کھاتے ہیں۔ مگر اس لئے کہ وہ سب سے گراں پڑتا ہے۔ مخصوص پارچے مثلاً کوہان کا گوشت ایسا عمدہ اور بہتر ہوتا ہے کہ کوئی گوشت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ خاص طور پر کوہان کا گوشت[1] ہی ضیافتوں میں پیش کیا جاتا ہے اور اسی پر فخر[2] کیا جاتا ہے۔

خانہ جنگی یہ درست ہے قبائل میں جنگ رہتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ان کے یہاں کوئی ایسا نظم نہیں ہے کہ سب قبائل کو منسلک کردے نہ ان کے یہاں کوئی شاہنشاہ ہے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ سیاسی نظم کا محرک یہ ہوتا ہے کہ ایک گروہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتا ہے۔ اس کو حملہ آوروں کا خطرہ بھی ہوتا ہے تو وہ دوسرے گروہ کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے، یا ایسا ہوتا ہے کہ کسی مملکت میں کوئی ایک خاندان اپنی قوت اور قابلیت سے ایسی عظمت حاصل کرلیتا ہے کہ اہلِ مملکت اس کا لوہا ماننے لگتے ہیں تو وہ اس کو بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ اور اپنی گردنیں اس کے سامنے جھکا دیتے ہیں۔

---

[1] ایک تصور یہ تھا کہ زندہ اونٹ کا کوہان پہلے کاٹ لیا جائے تو وہ زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ لہذا پہلے کوہان کاٹ کر مہمانوں کے لئے اس کے پارچے تل دیئے جاتے تھے یا کباب بنا لئے جاتے تھے باقی اونٹ کا گوشت فقرا، کا حصہ ہوتا تھا اسلام نے کسی زندہ جانور کے کسی حصہ کے کاٹ لینے کو ظلم اور اس طرح کے گوشت کو حرام اور ناپاک قرار دیا۔ [2] جنگِ بدر میں قریش کے جو سردار مارے گئے ان کے ہم مسلک شاعر نے ان کے مرثیہ میں ان کی مہمانداری کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ دعوت کے موقع پر کوہان کے پارچے اور کباب پیش کیا کرتے تھے جو آبنوس کی کشتیوں میں سجے ہوتے ہوتے تھے۔ (بخاری شریف ص۵۵۵)

لیکن عرب کی حالت یہ ہے کہ ہر ایک قبیلہ وہ قابلیت رکھتا ہے کہ بادشاہت کرسکے۔ وہ کسی سے مرعوب ہونا نہیں جانتا۔ اپنی قوت پر اس کو اعتماد ہوتا ہے۔ بس ہر قبیلہ اپنی جگہ بادشاہ ہے۔ نہ کسی کے سامنے گردن جھکانے کو تیار ہوتا ہے۔ نہ یہ برداشت کرسکتا ہے کہ کسی کو خراج یا ٹیکس دے۔ یا کسی کا بیگاری بنے۔ (ماخوذ از عقد الفرید لابن عبدربہ جلد اوّل۔ باب الوفود علی الملوک)

نعمان بن منذر کی تقریر کے کچھ حصوں سے اور اس کے بعض خیالات سے اختلاف ہوسکتا ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عربوں کا تصور اپنے متعلق یہی تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو خصلتیں اور جو خصوصیات بیان کیں وہ اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ عرب فی الواقع ان خصوصیات کے حامل تھے۔ کسی قدر تفصیل آئندہ باب میں ملاحظہ فرمایئے

خصوصیاتِ عرب

عرب قبل از اسلام۔ (عرب جاہلیت) کی قصیدہ خوانی مقصود نہیں ہے۔ لیکن ان حقائق سے گریز بھی درست نہیں ہے جو افقِ تاریخ پر صبح صادق کی طرح روشن ہیں۔ سیرۃ مبارکہ اور تاریخ اسلام کے بھی تمام گوشے اسی وقت اُجاگر ہو سکتے ہیں، جب ماحول کی صحیح تصویر سامنے ہو۔

تاریخ کا کوئی مبصر بھی انکار نہیں کر سکتا کہ عربی معاشرہ (سماج) میں سخاوت۔ بہادری خود اعتمادی۔ غیرت وحمیت۔ خودداری۔ روایات کی حفاظت۔ عہد اور قول کی پابندی۔ عہد شکنی اور غلط بیانی سے نفرت۔ ایسے اوصاف[1] تھے کہ کم از کم اس دور میں کوئی دوسری قوم ان کی نظیر نہیں پیش کر سکتی تھی۔ اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے تاریخ کا وسیع دفتر جو حقائق پیش کر سکتا ہے ان میں سے چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی جا رہی ہیں۔

سخاوت (جود وسخا) سخاوت کے یہ معنے نہیں تھے کہ پیٹ بھرنے پر کچھ نوالے کسی فقیر کو دے دیئے جائیں۔ بلکہ سخاوت کا مطلب یہ مانا جاتا تھا کہ جذبہ یہ ہو کہ خود بھوکا رہے اور دوسرے کو شکم سیر کرے۔ اور اسی کو وہ اپنی کامیابی سمجھے اور اس پر ایسا خوش ہو گویا اُس کی مراد پوری ہو گئی۔

نعمان بن منذر کی یہ بات صحیح تھی (جو اُس نے شہنشاہِ ایران کے دربار میں کہی تھی)

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی کس قدر معنی خیز ہے۔ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم) میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم (اخلاق عالیہ) کی تکمیل کر دوں۔ اس ارشادِ گرامی میں اخلاق کی نفی نہیں ہے بلکہ نہ صرف اخلاق بلکہ مکارمِ اخلاق (اعلیٰ اخلاق) کا اعتراف مضمر ہے البتہ ان میں افراط وتفریط ہے جس کی اصلاح کی ضرورت ہے یہی تکمیل ہے۔ (واللہ اعلم)

کہ معمولی عرب جس کا کل اثاثہ ایک اونٹنی ہے۔ اگر اس کے یہاں مہمان آجاتا ہے تو وہ اس میں بڑی خوشی محسوس کرتا ہے کہ اپنی زندگی کی پونجی (اس اونٹنی) کو ذبح کر دے اور دل کھول کر اپنے مہمان کی مدارات کرے۔ قبیلہ طے کا سردار "حاتم" سخاوت میں مشہور تھا۔ وہ صرف دو چیزیں محفوظ رکھتا تھا اور باقی سب کچھ بخش دیا کرتا تھا۔ گھوڑا[1] اور اسلحہ۔ مگر موسم سرما میں ایک روز ایسا ہوا کہ وہ تہی دست تھا۔ اس کے یہاں فاقہ تھا۔ رات ہوئی تو بچوں کو بھوکے پیٹ کسی طرح لوری دیکر اور تھپک تھپک کر سلا دیا مگر جب بچے سو چکے تو خیمہ کا ایک کنارا اٹھا۔ اور ایک عورت اپنے بچے ساتھ لئے ہوئے خیمہ میں داخل ہوئی اور حاتم سے فریاد کی کہ وہ خود بھی بھوکی ہے۔ بچے بھی بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔ رات آدھی ہو رہی ہے۔ مگر بھوک کی وجہ سے نہ اس کو نیند آتی ہے نہ بچوں کو۔

ابھی عورت کے یہ الفاظ پورے نہیں ہوئے تھے کہ حاتم اٹھا۔ چھری ہاتھ میں لی اور اپنے محبوب گھوڑے کو ذبح کر ڈالا۔ پھر آگ جلائی اور چھری اس عورت کو دیدی کہ گوشت کے پارچے کاٹے اور خود کھائے اور بچوں کا پیٹ بھرے۔ پھر حاتم اپنے خیمے سے نکلا اور قرب و جوار کے تمام غریب لوگوں میں گھوم آیا کہ گھوڑا ذبح ہوا ہے۔ چلو گوشت کھاؤ۔ چنانچہ آس پاس کے تمام لوگ آگئے۔

حاتم کی بیوی کا بیان ہے کہ تھوڑی دیر میں گوشت ختم ہو گیا صرف ہڈیاں باقی رہ گئیں اور حاتم اسکی بیوی اور بچے جیسے پہلے بھوکے تھے اب بھی بھوکے رہے۔ کسی کو ایک بوٹی بھی نصیب نہیں ہوئی[1] شیخ قبیلہ رات کو اونچی جگہ پر آگ جلوا دیا کرتا تھا۔ اس طرف سے گذرنے والے مسافر اور قافلے آگ کو دیکھ کر قبیلے میں پہنچتے، شیخ قبیلہ ان کا میزبان[2] ہوتا۔

---

[1] عقد الفرید ص۱۰۱ ج ۱ وغیرہ۔

[2] ۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف شمار کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ تقری الضیف۔ آپ مہمانوں کی ضیافت کیا کرتے ہیں۔ تو مہمانوں سے ایسے ہی مہمان مراد تھے۔ تفصیل نزول وحی کے تذکرہ میں آگے آئے گی۔ انشاء اللہ۔

لطف یہ ہے کہ آنے والے مُسافر اگر عرب ہوتے تو وہ اس کو اپنا حق[1] سمجھتے تھے کیونکہ وہ خود اپنے قبیلہ میں آنے والوں کی اسی طرح مدارات کیا کرتے تھے۔

ایسی ضیافتوں کے لئے ہر وقت سامان تیار رہتا تھا۔ ایک عورت نے اپنے شوہر کی یہ خصوصیت فخریہ بیان کی تھی۔

اس کے اونٹ زیادہ اصطبل ہی میں رہتے ہیں۔ تھوڑے
سے اونٹ چراگاہوں میں بھیج دیئے جاتے ہیں۔ یہ اونٹ جیسے
ہی باجے کی آواز سنتے ہیں۔ یقین کر لیتے ہیں کہ اب ذبح
ہو جائیں گے"۔[2]

اس خاتون کے ان مختصر الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے شوہر کا طریقہ یہ ہے کہ جب مہمانوں کے آنے کی اس کو اطلاع ملتی ہے تو وہ ان کے استقبال میں باجے بجواتا ہے اور جب وہ آجاتے ہیں تو اُونٹ ذبح کرا کے بڑے حوصلہ سے ان کی ضیافت کرتا ہے۔ یہ صورت گاہے گاہے نہیں ہوتی بلکہ اتنی کثرت سے ہوتی رہتی ہے کہ عقل و شعور سے محروم اونٹ بھی اس سے آشنا ہو گئے ہیں کہ جہاں وہ باجے کی آواز سنتے ہیں یقین کر لیتے ہیں کہ اب اُن کا نمبر آگیا۔ کیونکہ مہمان آئے ہیں جن کی مدارات کے لئے ان کو یقیناً ذبح کر دیا

---

[1] متعدد احادیث (مثلاً حدیث عقبۃ بن عامر جس میں یہ ہے۔ خذوا من حق الضیف الذی ینبغی لھم۔ بخاری شریف ص۹۰۹)۔ نیز حدیث ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ جس میں یہ ہے لھذا ستضفنا کم فلم تضیفونا۔ بخاری شریف ص۳۰۴) اس حق کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں نہ کوئی بازار ہو نہ مسافروں کی سرائے وہاں انسانی ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ مسافر کو مہمان مانا جائے۔ ہندوستان میں بھی یہ رواج ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہمارے یہاں اجنبی کو مسافر، سر پڑا مہمان سمجھا جاتا ہے اور عرب اس کو معزز مہمان سمجھتے تھے اور اس کی ویسی مدارات کیا کرتے تھے۔ جیسے مدعو مہمان کی۔ سنا ہے عرب قبائل میں اب بھی یہ جذبہ ہے۔ [2] بخاری شریف ص۷۸۰ حدیث ام زرع۔

جائے گا[۱] اور چونکہ مہمانوں کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں اس لئے وہ اپنے اونٹ چراگاہ نہیں بھیجتا کہ وہاں سے منگوانے میں دیر ہوگی۔ بلکہ مکان کے قریب ہی اصطبل (مُبرک) میں ان کو محفوظ رکھتا ہے اور ان کے چارے کا خرچ برداشت کرتا رہتا ہے۔

میزبانی اور مہمانی کی تقریب کے علاوہ بڑے آدمی کی شان یہ ہوتی تھی کہ اس کے ہاں خورد و نوش کی مجلسیں آباد رہیں۔ رقص و سرود بھی رہے اور غربا پروری بھی۔ قومی شعراء ایسی مجالس کی تعریفوں میں رطب اللسان رہتے تھے۔ سینکڑوں اشعار اس کی شہادت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہاں صرف ایک عورت کا بیان نقل کیا جا رہا ہے۔ جس سے عرب کے تمدن پر روشنی پڑتی ہے۔ اس عورت کا نام کبشہ بتایا گیا ہے۔

زوجی رفیع العماد۔ طویل النجاد۔ عظیم الرماد قریب البیت من الناد[۲]

اس باسلیقہ خاتون نے چار لفظ بولے ہیں۔ مگر ہر لفظ اس دور کے تہذیب و تمدن کے پورے پورے باب کا عنوان ہے۔

(الف) امراء اور رؤسا (شیوخ) اپنے محل کے لئے بلند مقام تجویز کرتے تھے[۳] مکان کی چوکی بھی اونچی رکھتے تھے۔ دروازے بڑے بڑے۔ دیوان خانوں کے ستون بہت اونچے اونچے۔ خوش منظر اور ہوادار ہونے کے علاوہ اس بلندی کا مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ باہر سے آنے والوں کو تلاش اور پوچھ گچھ کی ضرورت نہ پیش آئے۔

رات کے وقت بلند مکان کی کسی بلند جگہ پر آگ جلا دیا کرتے تھے تو رہنمائی کے علاوہ صاحبِ خانہ کی طرف سے سفر کرنے والوں کے لئے قیام و طعام کی خاموش پیشکش

---

[۱] مجمع البحار۔ تحت لفظ زھر [۲] بخاری شریف ص۷۷۹ حدیث ام زرع

[۳] ۔ بڑے لوگ اپنے محلات بلند مقام پر اس لئے بناتے تھے کہ باہر سے آنے والے وفود آسانی سے پہنچ سکیں۔ خصوصاً رات کی اندھیری میں ان کی روشنی رہنما ثابت ہو۔ (فتح الباری ص۲۱۶ ج۹)

بھی ہو جاتی تھی۔

کبشہ نے اپنے پہلے لفظ میں اس تمام تفصیل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میرے شوہر کے محل کے ستون بہت بلند ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ محل دُور سے نظر آتا ہے۔ اور آنے والے قافلے۔ وفود اور رات کو سفر کرنے والے آسانی سے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔[1]

(ب) دوسرے لفظ طویل النجاد سے اشارہ کیا ہے کہ وہ بہادر با وجاہت اور تلوار کا دھنی ہے۔

(ج) تیسرا لفظ عظیم الرماد یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس کے یہاں مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ہر وقت کھانے پکتے رہتے ہیں۔ پکانے والوں کو اتنی فرصت بھی نہیں ملتی کہ تنوروں اور چولھوں کی راکھ صاف کر دیں۔ اس لیئے راکھ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔

(د) چوتھے لفظ کا منشا یہ ہے کہ وہ عوامی لیڈر ہے۔ دانش مند اور صاحب الرائے ہے۔ نادی یعنی قبیلہ کی پنچایت گھر کے قریب ہی اس کو اپنی قیام گاہ اور آرام گاہ رکھنی پڑتی ہے۔ تاکہ لوگ آسانی سے مل سکیں اور یہ ان کو مشورہ دے سکے۔

اب یہ معلوم کر لینا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ بیرونی مہمانوں یا مقامی احباب کی دعوت میں بکری یا دنبے کا گوشت یا مرغ مسلم نہیں پیش کیا جاتا تھا۔ نہ ایسے گوشت کی کوئی اہمیت اور قدر تھی۔ صرف اونٹ کے کوہان کا گوشت ان کی نظر میں مخصوص طعام ہوتا تھا۔ بڑے لوگوں کی میزبانی یہی ہوتی تھی کہ اونٹ کے کوہان کا گوشت اس کے پسندے اور اس کے کباب پیش کریں۔ ظاہر ہے یہ اسراف اور فضول خرچی کی آخری حد تھی۔

قریش کے بڑے بڑے سردار اور رؤسا، عتبہ۔ اُمیہ بن خلف۔ ابو جہل وغیرہ جو جنگ بدر میں مارے گئے تھے اور جن کی لاشیں ایک پرانے کنویں میں جو اب بیکار ہو چکا تھا، ڈلوا دی گئی تھیں۔ ان کے ہم مشرب اور ہمدرد شاعر۔ ابو بکر بن شعوب نے

---

[1] فتح الباری ج ۹ صفحہ ۲۱۶

ان کے مرثیہ میں کہا تھا[1]

وماذا بالقلیب قلیب بدر　　من الشیزی تزین بالسنام
وماذا بالقلیب قلیب بدر　　من القینات والشرب الکرام[2]

یہ کیا ہے؟ اس کنوئیں میں جس کو قلیب بدر کہا جاتا ہے، وہ سردار پڑے ہوئے ہیں۔ جن کے یہاں آبنوس کی کشتیاں (طشت) (دعوت کے موقع پر) پیش کی جاتی تھیں جو کوہان کے گوشت سے آراستہ ہوتی تھیں (جن پر کوہان کے پارچے اور کباب چنے ہوتے ہوتے تھے)

اور یہ کیا ہے کہ بدر کے اس اندھے کنوئیں میں ان سرداروں کو دیکھ رہا ہوں۔ جن کے یہاں معززین کا اجتماع ہوتا تھا۔ گانے والیاں اپنا فن دکھاتی تھیں۔ شراب کا دور چلتا تھا۔ ان کی محفلیں خورد نوش اور رقص و سرود

---

[1] بخاری شریف صفحہ ۵۵ ۔ [2] ابن ہشام نے اس مرثیہ کے ۸ شعر نقل کئے ہیں مطلع یہ ہے۔ تحیی بالسلامۃ ام بکر وھل بعد قومی من سلام (ام بکر (بیوی کی کنیت) مجھے سلام کرتے ہوئے سلامتی کی دعا دیتی ہے۔ کیا سلامتی کی دعا کا کوئی موقع ہے جب میری قوم ختم ہو چکی۔ دلچسپی کے لئے آخری شعر ملاحظہ فرما لیجئے۔ یحدثنا الرسول بان سنحیا ؛ وکیف حیاۃ اصداء و ھام۔ یہ جو رسول ہیں ہم سے کہتے ہیں کہ ہم عنقریب زندہ کئے جائیں گے اور حالانکہ جبکہ مرنے والوں کی روحیں صدا اور ھام بن چکیں تو پھر وہ دوبارہ زندگی کیسے پا سکتے ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جس مقتول کا قصاص نہ لیا جائے تو اس کی روح الّو (بُوم) میں حلول کر جاتی ہے اور پکارتی پھرتی ہے کہ اسقونی اسقونی پیاسی ہوں مجھے پانی پلاؤ۔ جب قصاص لے لیا جاتا ہے تب یہ صوت ختم ہو جاتی ہے۔ اُلّو کو صدا اور اس قسم کی روح کو ھام کہا کرتے تھے۔ ھام کے معنی کھوپڑی کے بھی ہیں۔ اُن کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ یہ روح کھوپڑی کے راستہ سے نکلتی ہے اس لیئے روح کو ھام کہا کرتے تھے۔ بخاری نے صرف یہ چار شعر نقل کئے ہیں۔ قصیدے کی جان یہی ہیں۔ ہمارے موضوع سے متعلق یہ دو شعر تھے جو نقل کئے گئے۔

سے پُرکیف رہتی تھیں[1]

کوہان کا گوشت اگرچہ گراں پڑتا تھا۔ کیونکہ چند سیر گوشت کے لئے پورا اونٹ ختم کرنا ہوتا تھا۔ مگر من چلے سردار سخاوت کی جولانیوں کو اقتصاد کے پیمانے سے نہیں ناپتے تھے۔ معمولی سا اشارا ہوا اور کوہان حاضر۔

محفل مے میں مغنیہ نے حضرت حمزہ[2] کو مخاطب کرکے کہدیا۔ الایا حمز للشرف النواء۔ (ہاں ہاں حمزہ" یہ اونچے کوہان والی فربہ اونٹنیاں" حضرت حمزہ فوراً اٹھے۔ دو اونٹنیاں جو صحن میں کھڑی ہوئی تھیں ان کے کوہان تراش لیے۔ کوکھیں چاک کرکے ان کے جگر نکال لئے۔ یارانِ محفل کی مدارات کے لئے انہیں کی ضرورت تھی[3]

حجر بن خالد اپنی مہمان نوازی کی صورت یہ بیان کرتا ہے۔

یحلب ضرس الضیف فینا اذا شتی

سدیف السنام تستریه اصابعه

یعنی موسم سرما میں جب کہ عموماً قحط ہوا کرتا ہے ہم اپنے مہمان کی مدارات اس طرح کرتے ہیں کہ کوہان کے پارچے اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ وہ چربی دار بوٹیوں کو خود منتخب کرتا ہے۔ جن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ کھاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی داڑھ دودھ دوھ رہی ہے اور اس بوٹی سے دودھ کی دھاریں چھوٹ رہی ہیں۔

---

[1] فتح الباری ومجمع البحار۔ [2] یہ سید الشہداء حمزہ ہیں رضی اللہ عنہ۔ اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ اور جب حرمت شراب کا اعلان ہوا تو انہیں مے خواروں نے جن کی گھٹی میں شراب پڑی تھی وہ مستعدی دکھلائی جس کی نظیر نہیں مل سکتی جیسے ہی کانوں میں آواز پڑی کہ شراب حرام ہوگئی تو تحقیق کی ضرورت بھی نہیں سمجھی جو ہاتھ جام و سبو کی گردش میں مصروف تھے۔ مشکوں کی طرف بڑھے اور خمہا ہوئے ریزہ ریزہ کردیئے گئے۔ گلی کوچوں میں شراب کا سیلاب آگیا۔ چلنا پھرنا مشکل ہوگیا (بخاری شریف صـ۳۳۳ـ) [3] بخاری شریف صـ۳۱۹ و ۳۲۰

[4] دیوانِ حماسہ۔

سبرۃ بن عمر فقعسی[1] نے مندرجہ ذیل شعر میں اگرچہ قبیلہ کا بجٹ پیش کیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ عرب کے ہر ایک قبیلہ کا آمد و خرج یہی ہوا کرتا تھا۔

نحابی بھا اکفاءنا و نھینھا
ونشرب فی اثمانھا ونقامر

یعنی اونٹوں سے چار کام لئے جاتے ہیں۔
ہم سسرا اور ہم کفو (دوستوں اور رشتہ داروں) کو بخشش میں دیئے جاتے ہیں[2] جہانوں کے لئے ذبح کئے جاتے ہیں۔ ان کی جو قیمت وصول ہوتی ہے وہ شراب نوشی[3] اور قمار بازی (جوئے) میں خرچ کردی جاتی ہے۔

یہ سخاوت جو فضول خرچی کی حدود کو بھی پار کرجاتی تھی۔ اُن کے ضابطۂ اخلاق میں صحت مندی تھی۔ اس کے برخلاف کنجوسی کے متعلق یہ تصور تھا۔

ای داءٍ ادوأ من البخل[2]

کونسی بیماری بخل سے زیادہ خراب بیماری ہوسکتی ہے

چُستی مستعدی جفاکشی خود اعتمادی اور بہادری خشک و بے آب و گیاہ صحرا اور گرم پہاڑوں میں اُن کی قبائلی زندگی نے ان کو قدرتی طور پر جفاکش، محنتی اور چست بنادیا تھا۔ تھوڑی سی غذا پر قناعت اور ہر وقت چوکنا اور ہوشیار رہنا اُن کا مزاج بن گیا تھا۔

نوجوان کی تعریف یہ تھی۔

مضجعہ کمسل شطبۃ وتشبعہ ذراع الجفرۃ[3]

یعنی پیر پھیلا کر نہیں سوتا۔ کروٹ سے کچھ نیند لے لیتا ہے۔ مگر سونے کے وقت بھی

---

[1] دیوانِ حماسہ [2] بخاری شریف صفحہ ۲۲۲۔ [3] بخاری شریف صفحہ ۔۔

اس کی چستی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کروٹ بستر پر نہیں لگتی بلکہ بستر سے الگ اٹھی ہوئی رہتی ہے جیسے برہنہ تلوار زمین پر رکھ دی جائے تو اس کے بیچ کا خمدار حصہ زمین سے اٹھا رہیگا اور اس چستی، مستعدی اور کم خوابی کے ساتھ خوراک کی حالت یہ ہے کہ بکری کے بچے کے صرف ایک دست کا گوشت اس کو شکم سیر کر دیتا ہے۔

عرب میں کوئی سلطنت نہیں تھی۔ نہ پولیس یا فوج کا کوئی نظام تھا۔ ہر ایک قبیلہ اپنی جگہ آزاد مملکت تھا۔ وہ اپنی آزادی کا خود ذمہ دار اور محافظ ہوتا تھا۔ پھر جس طرح قبیلہ کو اپنے اوپر اعتماد کرنا پڑتا تھا۔ ایسے ہی اس کا ہر ایک فرد بھی خود اعتمادی کا پیکر ہوتا تھا۔ وہ اپنے اشعار اور قصائد میں انہیں اوصاف پر فخر کیا کرتے تھے۔

تأبّط شرًا اپنی حالت بیان کرتا ہے :

قلیل غرار النوم اکبر همه ــــــ دم الثار او یلقی کمیا مسقعا

قلیل ادخار الزاد الا تعلة ــــــ فقد نشز الشرسوف والتصق المعا

نیند کا تھوڑا سا جھپکا لے لیتا ہے (یہی اس کا معمول ہے) اس کی تمام توجہ اس میں مصروف رہتی ہے کہ دشمن سے قصاص کس طرح لے یا کسی ایسے مسلح بہادر سے جو لیا جفاکش اور جنگجو ہو کہ جنگ بازی سے اس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا ہو) مقابلہ کس طرح کرے۔

وہ صرف طبیعت کو بہلانے کے لئے تھوڑا سا توشہ اپنے ساتھ رکھتا ہے اور قلت غذا کے سبب سے وہ ایسا دبلا ہو گیا ہے کہ پسلیوں کی ہڈیوں کے سرے دیکھو ابھر آئے ہیں۔ اور انتڑیاں جڑ گئی ہیں (ایک دوسرے سے مل گئی ہیں)۔

مردوں کی طرح خود اعتمادی عورتوں میں بھی ہوتی تھی! ازدواجی تعلقات میں بھی خود اعتمادی کی پوری جھلک ہوتی تھی بظاہر یہی سبب تھا کہ رشتہ نکاح ایک دوسرے کو عمر بھر کے لئے جکڑ بند نہیں کر دیتا تھا۔ جب ضرورت ہوتی طلاق کے ذریعہ یہ رشتہ توڑ دیا جاتا تھا۔ پھر مطلقہ کے بھی طلبگار رہتے تھے۔ نکاح اور طلاق زندگی کے معمولی واقعات سمجھے جاتے تھے۔

پابندئ قول و عہد قول و پیمان کی پابندی۔ بدعہدی سے نفرت۔ اپنی روایات کو زندہ رکھنا اور ضرورت پڑے تو تحفظ روایات کے لیئے مر مٹنا، عرب کے جوہری اوصاف تھے وہ شخص عرب کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا تھا جو ان اوصاف کا حامل اور امین نہ ہو بڑے بڑے قومی شعرائے کے قصائد کا موضوع یہی اوصاف ہوا کرتے تھے اور انہیں اوصاف کے معیار پر قبائل کی عظمت و شرافت کے مراتب قائم کیئے جاتے تھے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) سید البشر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سفر ہجرت قریش مکہ کے علی الرغم ایک انقلاب انگیز مگر نہایت پر خطر اور حد درجہ رازدارانہ اقدام تھا اس سفر کا پورا انتظام سب سے زیادہ فداکار اور رازدار مخلص رفیق ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس رازداری کے ساتھ کیا کہ اپنے والد ماجد ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کو بھی اس کی خبر نہیں ہونے دی۔

خفیہ راستوں سے سفر کی کامیابی کا مدار، رہنما سفر کی مہارت اور اس کی خیر خواہی اور دیانتداری پر ہوتا تھا ایسے ماہرین سفر کو خریت کہا جاتا تھا۔

سب سے زیادہ عجیب بات جو اس موقع پر عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ اس نہایت پر خطر اور رازدارانہ سفر کا خریت کوئی مسلمان نہیں تھا۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو منتخب کیا تھا جو کفار قریش[1] کا ہم مذہب تھا۔ وہ اونٹنیاں جن پر یہ خطرناک سفر طے کرنا تھا۔ اسی خریت کے حوالے کر دی گئی تھیں جس کا نام عبداللہ بن اریقط تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ رات کی اندھیری میں مکہ سے روانہ ہوئے غار ثور میں روپوش ہو گئے، تین روز وہاں قیام فرمایا۔ قریش مکہ نے ان کو گرفتار کرنے والے کے لیئے بڑے بڑے انعام کا اعلان کر دیا۔ اور خدا جانے اس انعام کے لالچ میں کتنے لوگ دوڑے لیکن عبداللہ بن اریقط کو کوئی بھی لالچ متاثر نہیں کر سکا۔ وہ طے کردہ پروگرام کے مطابق تیسرے روز ٹھیک وقت پر دونوں اونٹنیاں لے کر "غار ثور" پر پہنچا اور ہجرت کرنے والے رفقاء کو لے کر غیر معروف راستہ سے روانہ ہو گیا اور تقریباً تین سو میل لمبی مسافت کو چار روز

[1] علی دین کفار قریش۔ بخاری شریف ص ۵۵۳

میں طے کراکر مدینہ طیبہ پہنچا دیا۔ کفار قریش کے ہم مذہب عبداللہ بن اریقط کی یہ وفاداری کیا اس لئے تھی کہ وہ اپنے پیشہ خریتی (رہنمائی) میں دیانتدار تھا یا اس لئے تھی کہ وہ درپردہ اسلام کا خیر خواہ تھا؟

اس واقعہ کی روایت کرنے والی حضرت عائشہؓ ابن اریقط کی وفاداری اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اعتماد کی وجہ یہ بیان فرماتی ہیں۔

قد غمس حلفا فی آل العاص بن وائل السہمی... فامناہ

اُس نے عاص بن وائل السہمی کے خاندان سے وہ معاہدہ کر رکھا تھا۔ جس کو یمین غموسؒ کہا کرتے تھے۔ اس پر یہ دونوں مقدس بزرگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ) مطمئن ہو گئے تھے۔

عاص بن وائل سہمی وہی رئیس ہے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حلیف تھا جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

(۲) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو پورا مکہ برافروختہ ہو گیا۔ ایک بہت بڑا ہجوم ان کے مکان پر چڑھ دوڑا۔ آپ کے صاحبزادے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) بیان فرماتے ہیں۔ میں مکان کی چھت پر کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا پورا میدان برافروختہ ہجوم سے پٹا ہوا تھا۔ سب طرف یہی شور تھا۔

صبا عمر۔ عمر دین سے پھر گیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ایک شخص آیا۔ بڑی شان و شوکت کا آدمی تھا۔ منی ازار اور چادر جو حبرہ کہلاتی تھیں زیب تن تھیں۔ قمیص میں ریشمی کپڑے

لہ بڑے پیالہ یا بادیہ میں خون یا خاص قسم کا خوشبودار سیال جس کو خلوق کہا کرتے تھے۔ یا رنگ دار پانی بھر کر اس میں معاہدہ کرنے والے ہاتھ ڈال کر عہد کیا کرتے تھے اس کو یمین غموس کہا کرتے تھے ہندوستان میں بھی پانی میں نمک ڈال کر معاہدہ کیا کرتے تھے کہ اگر ہم اسکی خلاف ورزی کریں تو نمک کی طرح گھل کر فنا ہو جائیں۔

کی کفنیں لگی ہوئی تھیں، وہ مجمع کو چیرتا ہوا مکان کے اندر والد صاحب (حضرت عمرؓ) کے پاس پہنچا۔ اُن سے دریافت کیا کیا بات ہے۔ یہ ہجوم کیسا ہے؟ آپ کی قوم کے آدمی کہہ رہے ہیں کہ عمر کو مار ڈالیں گے اس جرم میں کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔

اس رئیس نے برجستہ کہا ہرگز ایسا نہیں کر سکتے، میں نے تم کو امن دے دیا۔

یہ رئیس حضرت عمر فاروق سے یہ گفتگو کر کے باہر آیا۔ لوگوں کو مخاطب کیا۔ یہ ہجوم کیسا ہے۔ کیا چاہتے ہو۔ ہجوم نے جواب دیا۔ عمر اپنے دین سے برگشتہ ہو گیا ہے۔ ہم اسکو قتل کریں گے

رئیس۔ عمر میری پناہ میں ہیں تم اُن کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔

عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں، جیسے ہی اس شخص کی زبان سے امن اور پناہ کے الفاظ نکلے سارا مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ یہ شخص کون ہے۔ مجھے بتایا گیا یہ عاص[1] بن وائل ہے۔ قبیلہ بنو سہم کا سردار۔ جو ہمارے قبیلہ کا حلیف[2] ہے۔

---

[1] تاریخ اسلام کے مشہور سیاستدان حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دست راست حضرت عمرو بن العاص کے والد (قسطلانی ص۲۲ ج۴) اور مشہور عابد زاہد صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے دادا۔ یہ عاص بن وائل جس کو عاصی بن وائل بھی کہتے ہیں مسلمان نہیں ہوا ہجرت سے پہلے اس کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بیٹے عمرو بن العاص واقعہ ہجرت سے چھ سال بعد مسلمان ہوئے۔ مگر جو معاہدات تھے وہ عاص بن وائل کے مرنے سے ختم نہیں ہوتے۔ عبداللہ بن اریقط اسی خاندان کا حلیف تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ عاص بن وائل ان چار مشہور افراد میں سے ایک تھا جو دہریہ اور زندیق مشہور تھے۔ معاذ اللہ خدا کو بھی نہیں مانتے تھے۔ یہ چار یہ تھے۔ عاصی بن وائل۔ عقبہ بن ابی معیط۔ ولید بن مغیرہ۔ ابی بن خلف۔ عینی شرح بخاری ص۲۳۳ ج۴۔ یہی عاص بن وائل ہے کہ حضرت خباب بن ارتؓ کے کچھ دام اس پر واجب تھے انہوں نے تقاضا کیا تو عاص نے جواب دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ دو تو میں دام ادا کروں گا۔ حضرت خبابؓ نے جواب دیا تو مر جائے، اور زندہ ہو تب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ عاص کو اب مذاق سوجھا۔ اُس نے کہا جب میں مر کر زندہ ہوں گا تو میری دولت اور میری اولاد بھی مجھے ملے گی بس تمہارے دام وہاں ادا کر دوں گا (باقی بر صفحہ آئندہ)

(۳) ابوسفیان۔ قریش مکہ کا سربراہ۔ اسلام اور مسلمانوں کا سخت دشمن۔ جنگ اُحد کا بانی جو غزوۂ احزاب میں مسلمانوں سے بُری طرح شکست کھا چکا تھا جس کے بعد اس کی قیادت کا آفتاب بھی ڈھلنے لگا تھا۔ وہ قریش کے تاجروں کے ساتھ شام پہنچا ہوا ہے۔ شہنشاہِ روم "ہرقل" بھی یروشلم کی زیارت کے لئے شام آیا ہوا ہے۔ اسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی ہرقل "عظیم الروم" کے نام پہنچتا ہے۔ ہرقل اس "مدعی نبوت" (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق تحقیق کرنا چاہتا ہے اور جب اُسے معلوم ہوتا ہے عمائدین مکہ بسلسلۂ تجارت یہاں آئے ہوئے ہیں تو انہیں دربار میں طلب کرتا ہے۔ ابُوسفیان امیرِ قافلہ تھے۔ لہذا اُن سے سوالات کرتا ہے۔

ہرقل نے اپنے طور پر ایسا انتظام کر لیا تھا کہ ابوسفیان اس پر مجبور ہوں کہ وہ ہر ایک سوال کا جواب صحیح صحیح دیں اور واقعہ یہ ہے کہ ابوسفیان نے ہر ایک سوال کا جواب نہایت معقول اور نہایت صحیح دیا مگر اس بنا پر نہیں کہ وہ ہرقل کے انتظام سے متاثر تھا۔ بلکہ خود ابُوسفیان کے الفاظ میں اس کی وجہ یہ تھی۔

فو اللّٰہ لولا الحیاء یومئذٍ من ان یاثرا صحابی عنی الکذب لحدثتہ عنی حین سألنی عنہ[1]

یعنی مجھے اس سے شرم آئی کہ میرے ساتھی یہ کہیں گے کہ میں نے غلط بیانی کی قسم بخدا اگر یہ شرم نہ ہوتی کہ میرے ساتھی میری غلط بیانی نقل کریں گے تو میں اپنی طرف سے کچھ باتیں کہہ دیتا۔ جب وہ مجھ سے سوال کر رہا تھا۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بخاری شریف صہ۳۰۲ لیکن معاہدات کا معاملہ عقائد سے جُدا تھا۔ ایک طرف اسلام کا سخت مخالف دوسری جانب حضرت عمرؓ کو پناہ دیئے ہا ہے۔ لقد صدق رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ یوید ھذا الدین برجل فاسق۔ ۱۲ [2] بخاری شریف صہ۵۴۵۔

[1] بخاری شریف صہ۱۲۱ و صہ۲۔

معاہداتی حکومت

عرب کے آزاد خود مختار قبائل جن کی گردنیں کسی بادشاہت یا ہنشاہیت کے سامنے کبھی نہیں جھکیں عجیب بات یہ ہے کہ قول و قرار اور عہد و پیمان کی شوکت و حشمت کے سامنے ان کی گردنیں ہمیشہ خم رہتی تھیں۔

جب پورے ملک میں حکومت کا کوئی نظام نہیں تھا تو ظاہر ہے پولیس یا فوج کا بھی کوئی سلسلہ سرزمین عرب میں نہیں تھا البتہ پابندی عہد کے اصول نے پورے عرب میں ایک ایسا نظام قائم کر دیا تھا جو باضابطہ حکومت کی طاقت اپنے اندر رکھتا تھا۔ اس کی موجودگی میں ان کو پولیس یا فوج کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ افراد کے جان و مال کی حفاظت جو پولیس کا کام ہوتا ہے اور بیرونی حملہ آوروں کا دفاع جو فوج کا فرض ہے یہ معاہداتی نظام ان تحفظات کا ذمہ دار تھا۔

قبائل کے معاہداتی گروپ تھے۔ جو فرد کسی گروپ سے تعلق رکھتا تھا تو پورا گروپ اس کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ اگر اس کا بال بیکا ہوتا تو پورے گروپ کی ہزاروں تلواریں اس کا انتقام لینے کے لئے برہنہ ہو جاتیں۔ کسی فریاد کرنے والے کی فریاد پورے گروپ کے جذباتِ حمایت کے لئے چنگاری کا کام کرتی تھی۔ یہ فریاد اور دہائی ہی دعوٰی ہوتی تھی اور یہی دلیل! اب تحقیق و تفتیش بھی پہلو تہی اور بزدلی سمجھی جاتی تھی۔ قریط بن انیف شاعر قبیلہ بنی مازن کی خوبی یہ بیان کرتا ہے۔[1]

(۱) قوم اذا الشر ابدیٰ ناجذیہ لھم   طاروا الیہ زرافات ووحدانا

(۲) لا یسئالون اخاھم حین یندبھم   فی النائبات علی ما قال برھانا

ترجمہ (۱) بنی مازن ایسی قوم ہے کہ جب جنگ اُن کے سامنے دانت نکالتی ہے تو وہ اُڑ کر اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ ٹولی بن کر گروہ در گروہ یا اکیلے اکیلے۔ جیسا موقع ہوتا ہے دوڑ پڑتے ہیں اس کا نہیں خیال کرتے کہ تنہا جا رہے ہیں یا جماعت اور گروہ میں۔

---

[1] دیوان حماسہ۔

(۲) جب ان کا بھائی (ان کے گروپ کا آدمی) ہنگاموں میں اُن کو پکارتا ہے (کوئی فریاد کرتا ہے) تو پھر اُس کے دعوے اور قول کے لئے کوئی دلیل نہیں مانگتے ۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

انی من معشر افنی اوائلھم　　　قول الکماۃ الا این المحامونا[1]

میں ایسے معاشرہ (سماج) کا فرد ہوں جس کے متقدمین ختم ہو چکے ہیں اور ان کے ختم ہونے کا سبب بہادروں کی یہ پکار ہوا کرتی تھی ۔

الا این المحامونا　　　کہاں ہیں ہمارے حمایتی

یعنی جہاں انہوں نے یہ پکار سنی ۔ وہ فوراً حمایت کے لئے میدانِ جنگ میں پہنچ جاتے تھے اور وہیں ختم ہو جاتے تھے ۔

ودّاک بن ثمیل مازنی نے اپنے بہادروں کی تعریف یہ کی ہے

اذا ستنجدوالم یسئالوامن دعاھم　　　لایۃ حرب ام بای مکان

جب اُن سے مدد مانگی جاتی ہے تو یہ نہیں دریافت کرتے کہ طالب کون ہے کس لڑائی کے لئے کس مقام پر لڑنے کے لئے دعوت دے رہا ہے ۔ نہ یہ تحقیق کرتے ہیں کہ کس جنگ کے لئے ۔

بیشک لڑائیوں کے طویل سلسلوں نے اس دور کی تاریخ کو وحشت ناک بنا رکھا ہے لیکن جنگ کی بنیاد عموماً یہی معاہداتی حمیت ہوتی تھی ۔ یعنی گروپ کے کسی فرد کو کسی نے جانی یا مالی نقصان پہنچا دیا ہے تو یا تو اس کے نقصان کی تلافی کی جائے ورنہ اعلانِ جنگ ۔

جنگ کے شعلے پہلے دو قبیلوں میں بھڑکتے تھے پھر رفتہ رفتہ پورے پورے گروپ ان کی لپیٹ میں آجاتے تھے ۔

اس تصادم اور تقابل میں پناہ کا ذریعہ صرف وہ مہینے ہوتے تھے جو بالاتفاق عرب

---

[1] دیوان حماسہ ص۱۱ ۔

اشہر حرم کہلاتے تھے۔ جن میں اسلحہ اتار دیئے جاتے تھے اور قتل و خون، ظلم و فساد ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ یہ بین القبائلی رواج عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

ان میں ایک مہینہ رجب کا ہوتا تھا جس کو منصل الاسنہ کہا کرتے تھے یعنی نیزوں سے بھال اُتار دینے والا مہینہ۔[1]

قبائلی پاسپورٹ اور ویزا

یہ معاہداتی گروپ جس طرح جنگ یا طوالت جنگ کا ذریعہ بن جاتے تھے یہ تحفظ کا ذریعہ بھی ہوا کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ معاہدات کی غیر معمولی پابندی صرف اخلاقی قدر نہیں تھی بلکہ اقتصادی ضرورتوں اور معاشی و سماجی مصلحتوں کا بھی تقاضا تھا کہ معاہدات کی پوری پابندی کی جاتے۔ ہر ایک قبیلہ پھر ہر ایک معاہداتی گروپ کا ایک حلقہ ہوتا تھا۔ اس حلقہ کے حدود میں کوئی شخص بلا اجازت داخل نہیں ہو سکتا تھا لیکن اگر کسی نے اجازت حاصل کرلی ہے تو جہاں تک اس گروپ کے حلقہ کی حدود میں اس کی حفاظت اس گروپ کے ذمہ ہوتی تھی۔ تجارتی قافلے اسی طرح کی اجازتوں کی پناہ میں منزلیں طے کرتے تھے۔

حرب فجار[2] کا چوتھا دور جس کے معرکوں میں ابو طالب وغیرہ[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمام۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی لے گئے تھے اور اس وقت عمر مبارک تقریباً چودہ سال[4] تھی۔ اس دورِ چہارم کا محرک بھی اسی قسم کا اجازت نامہ تھا۔

---

[1] بخاری شریف ص۶۲۳ [2] ابن قتیبہ نے فجار اوّل و ثانی کی تفصیل بیان کی ہے (معارف ص۲۰۱) مزید تفصیل شیخ محمود سید الطہطاوی نے بیان کی ہے۔ (سیرۃ ابن ہشام مطبوعہ بمطبع محمد علی بمصرا حاشیہ ص۱۱۱) اموی نے اور تفصیل سے ایام جاہلیت کا تذکرہ کیا ہے۔ [3] ابن ہشام۔ دوسری روایت یہ بھی ہے کہ عمر مبارک ۲۰ سال تھی۔ مگر جو کام اس جنگ میں آپ کے سپرد کیا گیا تھا کہ انبل علی عمومتی (مجمع البحار) کہ اپنے چچا صاحبان کو تیر اٹھا اٹھا کر دے رہا تھا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عمر چودہ سال ہوگی بحوالہ ابن سعد میں یہ بھی ہے ورمیت فیہ السھم وما احب انی لمراکن فعلتہ ص۱۲۸ ج۱

حیرہ کا راجہ (ملک حیرہ) نعمان بن منذر جس نے شہنشاہ ایران کے دربار میں عرب کے فضائل بیان کئے تھے اس کا تجارتی قافلہ مکہ کے مشہور میلہ سوق عکاظ میں جانا چاہتا تھا عروہ بن عتبہ نے جس کا تعلق ہوازن سے تھا، اس کو اجازت دے دی۔ یہ جرأت براض بن قیس کو ناگوار گذری اس نے عروہ کو قتل کر دیا۔[1]

بنو کنانہ اور قریش کو خطرہ ہوا کہ مقتول کا قبیلہ (ہوازن) اپنے مقتول کی حمایت میں ان پر حملہ کر دے گا۔ اشہر حرم شروع ہونے والے تھے انھوں نے چاہا کہ وہ فی الحال حرم مکہ میں داخل ہو جائیں تو حملہ سے بچ جائیں گے اس کے بعد اشہر حرم شروع ہو جائیں گے تو سرست جنگ ٹل جائیگی لیکن قریش اور بنو کنانہ ابھی حرم میں داخل نہیں ہونے پائے تھے کہ مقتول کے قبیلہ والوں نے انکو گھیر لیا اور حملہ کر دیا۔[2] بہر حال چار روز تک جنگ ہوتی رہی! اول قیس کو غلبہ ہا پھر قریش غالب رہے[3]

---

[1] براض بن قیس کا تعلق بنو کنانہ اور قریش سے تھا۔ اس علاقہ میں اجازت دینا کنانہ اور قریش کا حق تھا، ہوازن کا حق نہیں تھا براض نے عروہ کے اجازت نامہ کو اپنے قبیلہ کے حق میں مداخلت سمجھا۔ چنانچہ اول زبانی گفتگو کی اور اس کے اس فعل کو ناجائز قرار دیا اور جب عروہ نے پرواہ نہیں کی تو براض نے موقع پاکر عروہ کو قتل کر دیا اور مکہ سے بھاگ کر خیبر چلا گیا۔ تجارتی قافلہ بہر حال محفوظ رہا (ابن سعد ج۱ ص۱۲۶۔ ابن ہشام ج۱ ص۱۱۷)

[2] اگرچہ قاتل کا معاہداتی تعلق قریش سے تھا مگر جہاں تک عدل و انصاف کا تعلق ہے مجرم صرف قاتل تھا اور قبیلہ قریش و کنانہ مجرم نہیں تھا اور جب مقتول کے قبیلہ نے اُن پر حملہ کیا تو انکی حیثیت مدافع کی تھی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دفاع میں مدد کی جو قبیلہ کے ہر ایک فرد کا مشترک فریضہ تھا۔

[3] غلبہ کے باوجود قریش کے ایک سردار عتبہ بن ربیعہ نے صلح کی تجویز پیش کی جس کو طرفین نے منظور کیا۔ اور طے یہ ہوا کہ جس فریق کے زیادہ آدمی مارے گئے ہیں اس کو ان زیادہ مقتولین کی دیت دی جائے۔ مقتول کے قبیلہ یعنی قیس بن عیلان کے چالیس آدمی زیادہ مارے گئے تھے قریش نے ان کی دیت ادا کی اور عتبہ بن ربیعہ نے اس کی ذمہ داری لی (ابن ہشام و ابن سعد وغیرہ) یہ عتبہ بن ربیعہ وہی ہے جو اس وقت سے تقریباً چالیس بعد جنگ بدر میں ابو جہل کے ساتھ مارا گیا۔ ابو سفیان اس کے داماد ہوئے اور حضرت معاویہؓ اس کے نواسے۔

شہریت (تمدن) اور شہری تہذیب

عرب میں اب بھی ایک بڑی تعداد ان کی ہے جن کو "بدو" کہا جاتا ہے۔ یہ خانہ بدوش (بدی) زندگی بسر کرتے ہیں۔ عرب کا ایک حصہ جس کو "ربع خالی" کہا جاتا ہے۔ اب بھی غیر آباد ہے لیکن اس کے باوجود، بہت بڑی تعداد وہ تھی جن کو "حضری" کہا جاتا تھا۔ یعنی جو شہری زندگی کے عادی تھے اور اپنی شہری تہذیب میں دیگر ممالک کی تہذیب سے نہ صرف ہمسری اور مساوات بلکہ برتری کا دعویٰ رکھتے تھے۔

شہر : مختلف صوبوں کے مشہور شہروں کے نام ملاحظہ فرمایئے۔

حجاز میں۔ مکہ، مدینہ، طائف، ینبوع۔

یمن میں۔ جُرش، صنعاء، عدن۔

عمان میں۔ صحار، دبا۔

بحرین میں۔ ھجر۔

نجد میں۔ یمامہ، فید۔

شمالی عرب میں۔ دومۃ الجندل، خیبر، فدک، وادی القری۔

صحرا سینا کے مشرقی ساحل پر۔ ایلہ، مقنا۔

محل : عالیشان محل بنانے کے متعلق امرا اور رؤسا کے مذاق کا اندازہ کبشہ کے بیان سے ہوتا ہے جو "رفیع العماد" کی تشریح میں پہلے گذر چکا ہے۔

یمن کا وہ عمرانی دور تو اب رہا نہیں تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں تھا یا ان تبابعہ کے دور میں تھا، جنہوں نے مارب کا عظیم الشان بند بنوایا تھا اور نہریں نکلوا کر پورے یمن کو چمن زار بنا دیا تھا۔ مگر اب بھی یمن کے راجاؤں (ملوک) کے بعض محل ایسے تھے

ــــہ عہد نبوی میں نظام حکمرانی از ڈاکٹر محمد حمید اللہ ص۲۳۳ ــــہ بفتح اول والقصر معجم البلدان ۱۲۔

کہ شہنشاہِ ایران بھی ان پر رشک کرتا تھا۔

نعمان بن منذر جس کا ذکر پہلے گذرا ہے۔ اس کے دادا نعمان[1] بن امرء القیس کا بنوایا ہوا محل خورنق اور اسی طرح کا دوسرا محل سدیر[2] ضرب المثل تھے۔

---

[1] اس کو نعمان اکبر بھی کہتے ہیں۔ یہ یک چشم تھا۔ نوشیرواں کا ہمعصر تھا۔ بہت شان وشوکت کا امیر تھا۔ شام پر کئی مرتبہ حملے کر چکا تھا۔ آخر میں تارک الدنیا ہو گیا اور سلطنت کے بجائے فقیری لباس میں سیاحت شروع کر دی۔ سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک روز قصر خورنق کی سب سے اونچی منزل پر پہنچا ہوا تھا۔ وہیں وزراء اور مصاحبین حاضر تھے۔ خوش عیشی اور شادکامی کے تمام اسباب فراہم تھے۔ یہ سب سے اونچی منزل عجیب وغریب تفریح گاہ تھی ایک طرف جانب غرب میں نجف کا سرسبز اور شاداب علاقہ تھا جہاں باغوں کی قطاریں اور انکے بیچ میں نہریں بہہ رہی تھیں۔ مشرق کی جانب دریائے فرات تھا جو پیچ وخم کھاتے ہوئے قصر خورنق کے گرد گھوم رہا تھا۔ اسکی لہریں خورنق کی بنیادوں کو سجدہ کر رہی تھیں۔ نعمان کی نظر اس عجیب وغریب منظر پر پڑی۔ اس نے اپنے معتمد علیہ وزیر سے دریافت کیا۔ کیا اس جیسا منظر تم نے دیکھا ہے؟ کوئی نہیں دیکھا بےنظیر منظر ہے۔ کاش یہ پائیدار ہوتا؟ وزیر نے جواب دیا۔

نعمان اگرچہ ایک آنکھ کی لصارت سے محروم تھا مگر بصیرت سے محروم نہیں تھا۔ وزیر کے جواب نے چشم بصیرت میں چمک پیدا کر دی۔ اس نے وزیر سے دریافت کیا۔ پائیدار کیا ہے؟

وزیر۔ آخرت کی نعمتیں۔ نعمان ـــ وہ کیسے حاصل ہوتی ہیں؟

وزیر۔ اس دنیا کو چھوڑ کر یادِ خدا میں مشغول ہو جانے سے۔

وزیر کی اس گفتگو نے نعمان کی دنیا بدل دی۔ وہ لب خاموش ہو گیا۔ مگر جب رات ہوئی تو شاہانہ لباس اتار ٹاٹ کا کرتہ پہنا راہبانہ زندگی اختیار کی اور ایسا غائب ہوا کہ پھر پتہ ہی نہیں چلا کہ کہاں گیا۔ کیا ہوا (معارف ابن قتیبہ ص۲۱ و معجم البلدان ص۴۸۴ ج۵)

[2] سدیر۔ فارسی لفظ سہ دلہ کا معرب ہے۔ سہ دل۔ تین دل والا۔ اس محل کا گنبد اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس میں تین دل یعنی اوپر تلے تین گنبد تھے۔ یعنی ایک گنبد پھر کچھ خلا چھوڑ کر اسکے اوپر دوسرا دل (یا گنبد) پھر کچھ خلا چھوڑ کر تیسرا گنبد (معجم البلدان) ظاہر ہے وہ بہترین ائرکنڈیشنڈ ہو جاتا ہوگا۔ تاج محل کے گنبد کے متعلق تو معلوم نہیں ہو سکا۔ باقی دیواروں کے متعلق معلوم ہے کہ دوہری ہیں۔ باہر کی دیوار الگ ہے اندر کی دیوار الگ ہے اور بیچ میں خلا ہے۔ ڈاکٹر اشرف صاحب مرحوم جو محکمہ آثارِ قدیمہ کے ڈائریکٹر تھے انہوں نے تحقیق کرنی چاہی کہ اس خلا کو کس چیز سے پُر کیا گیا تھا۔ انہوں نے اس خلا میں ایک آدمی کو اتارا تو سطح زمین کے قریب لکڑی کے برادے جیسی چیز ملی۔

دیوان حماسہ کا مطالعہ کرنے والے "منخل بن حارث یشکری" کو خوب پہچانتے ہیں اور اس کی بدمستی سے بھی واقف ہیں۔ اسی بدمست شاعر کے قصیدہ کے یہ شعر ہیں۔

ولقد شربت من المدا مۃ بالصغیر و بالکبیر

فاذا انتشیت فاننی رب الخورنق والسدیر

(۱) بلاشبہ میں چھوٹے جام اور کبھی قدح (بڑے بادیئے) کو منہ سے لگا کر شراب پینے کا عادی ہوں

(۲) اور جب میں نشہ میں چور ہو جاتا ہوں تو مجھ میں وہ شاہانہ شان پیدا ہو جاتی ہے کہ گویا قصر خورنق[1] اور قصر سدیر کا مالک میں ہی ہوں[2]۔

منخل کے خلاف۔ اسود بن یعفر، دنیا کی بے ثباتی کے سلسلہ میں ان کا ذکر کرتا ہے۔

ماذا اؤمل بعد ال محرق ترکوا منازلھم وبعد ایاد

اھل[3] الخورنق والسدیر وبارق والقصر ذی الشرفات من سنداد

---

[1] اس قصر کے متعلق ایک عجیب لطیفہ مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ اس کو روم (اٹلی) کے ایک انجینئر نے جس کا نام "سنمار" تھا، بنایا تھا۔ یہ کچھ عرصہ کام کرتا پھر غائب ہو جاتا۔ اس کو تلاش کرایا جاتا تو کئی سال بعد کہیں ملتا تو پھر تعمیر کا باقی سلسلہ شروع ہوتا۔ اس طرح کئی مرتبہ ایسا ہوا اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ محل نصف صدی میں تیار ہوا جب تعمیر مکمل ہو چکی اور نعمان نے ملاحظہ بھی کر لیا تو "سنمار" نے اپنی قابلیت اور مہارت پر فخر کرتے ہوئے کہا کہ عظیم الشان قلعہ نما محل میں صنعت یہ رکھی گئی ہے کہ یہ ایک اینٹ پر قائم ہے اگر وہ اینٹ نکال لی جائے تو سارا محل گر جائے۔ نعمان اس عجیب و غریب صنعت کو سن کر چونکا! اس نے دریافت کیا۔ کیا اس اینٹ کی خبر تمہارے سوا کسی اور کو بھی ہے سنمار نے کہا میرے سوا کسی کو خبر نہیں۔ نعمان نے جب معلوم کر لیا کہ اس اینٹ کی خبر کسی اور کو نہیں ہے تو سنمار کو محل کی سب سے اونچی منزل سے نیچے پھنکوا کر ختم کرا دیا (معجم البلدان ص۴۰۲ ج۳)۔

[2] حافظ شیرازی صاحب نے منخل سے بھی آگے بڑھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

چو بے خود گشت حافظ کے شمارد بیک جو ملک کیکاؤس و کے را

[3] معجم البلدان جلد ۵ اور معارف میں اہل کے بجائے لفظ ارض ہے، جو بظاہر غلط ہے۔

آل مُحرّق جنہوں نے اپنے محلات چھوڑ دیئے اور ایادی سبا کے بعد میں کیا اُمید لگاؤں (آل محرّق[1] قصر خورنق، قصر سدیر اور چشمۂ بارق اور ان عالیشان بلند کنگروں والے محلات کے مالک تھے جو سنداد[2] کے نام سے مشہور تھے۔)

خورنق، اور سدیر کے علاوہ اور بھی شاندار محل اور کوہ نما قلعے تھے جن پر اہلِ قبائل فخر کیا کرتے تھے۔ مثلاً

(۱) نعمان بن المنذر کے فریق مقابل کا مشہور شاعر المتلمس اپنے قلعہ پر فخر کرتا ہے۔

العم تران الجون اصبح راسیا　　تطیف بھا الایام ما یتأ یس

عصی تبعا ایام اھلکت القری　　یطان علیہ بالصفیح ویکلس

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ قلعہ "جون" اپنی جگہ جما کھڑا ہے۔ کتنے ہی حوادث اس کے چکر کاٹتے رہتے ہیں مگر وہ کسی حادثہ کے سامنے نرم نہیں پڑتا۔ اس نے یمن کے مشہور فاتح تبع کی اطاعت قبول نہیں کی، اس کے حکم کو ٹھکرا دیا (جبکہ تبع نے بہت سی آبادیوں کو برباد کر ڈالا تھا) اس پر پتھر کی چوڑی چوڑی سلیں پلستر کی طرح لگائی جاتی ہیں اور چونے سے جوڑی جاتی ہیں۔

دارالقوار یعنی شیش محل خود مکہ معظمہ میں جہاں کی عورتوں کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمارے قدم زمین پر نہیں رکھے جاتے۔ ہم قالینوں پر چلا کرتے ہیں[3] اس کہنے والی کے باپ

---

[1] محرّق۔ آگ لگا دینے والا نعمان بن منذر کے پیشرو ملوک میں سے حارث بن عمرو بن عدی بھی تھا اسی کو محرّق کہا کرتے تھے کہ اس نے مخالف آبادیوں کو آگ لگا دی تھی (معارف ابن قتیبہ)۔ [2] السنداد منازل لا یاد نزلتھا لما قاربت الریف۔ معجم البلدان ص ۱۴۹ ج ۵۔

[3] جب یہ شعر پڑھ رہی تھیں اس وقت ان کا عقیدہ اور مذہب کچھ بھی ہو۔ مگر اب تو ہم ان کا نام ادب سے لیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اسلام لانے کے بعد عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ پہلے میرے نزدیک آپ اور آپ کے اہل خانہ اور آپ کے دولت کدہ سے زیادہ قابلِ نفرت اور مبغوض چیز کوئی نہیں تھی اور اب ان سے زیادہ محبوب کوئی نہیں ہے۔ یہ حضرت ہندہ ہیں حضرت ابوسفیان کی اہلیہ محترمہ جضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت ہندہ کے والد عتبہ بن ربیعہ تھے جو غزوہ بدر میں سب سے پہلے مارے گئے یہ شیش محل انہیں عتبہ بن ربیعہ نے بنایا تھا۔ فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ مصر ص ۶۳ و ص ۶۴۔

نے ایک شیش محل بنایا تھا جس کو دارالقواریر کہا جاتا تھا۔

آرائش منزل خورنق کی فلک بوس بلندی اور سدیر کے سہ درگنبد آپ نے باہر سے دیکھے اب اندر تشریف لایئے۔ سب سے پہلے فرش پر نظر ڈالئے۔ چودہ صدی پہلا فرش آپ اپنی نظر سے نہیں دیکھ سکتے تو بیگمات قریش کے بیان کا اعتبار کیجیئے۔ تو سا مکہ کی بیگمات کا ایک ترانہ بہت مشہور ہے جو وہ نوجوانوں میں جوش پیدا کرنے کیلئے اُحد کے میدانِ جنگ میں گا رہی تھیں۔ پورے ترانے کی ضرورت نہیں اس کا پہلا شعر ملاحظہ فرمایئے۔

نحن بنات طارق   نمشی علی النمارق

(ترجمہ) ہم آسمان کے تارے کی بیٹیاں ہیں   ہم قالینوں پر چلا کرتی ہیں

پہلا مصرع خاندانی فخر و غرور کی غمازی کر رہا ہے جو اپنے آپ کو چندر بنسی یا سورج بنسی کہا کرتے تھے ان کا تصور بھی یہی ہوتا تھا۔ دوسرا مصرع تمدن کی نشاندہی کر رہا ہے۔ یعنی ان کے پاؤں زمین پر نہیں رکھے جاتے۔ ان کے محلوں میں قالین کے فرش ہیں جن پر وہ چلا کرتی ہیں۔

زمین پر قالین کا فرش۔ فرش پر گدے اور تکیئے۔ جن کو وسادہ کہا جاتا تھا، یہ گدے مخمل کے بھی ہوتے تھے جن کو" زرابی" اور نمارق کہا جاتا تھا۔

مسہری دہلی اور اطراف دہلی میں ہی نہیں بلکہ اس طرح کے جتنے بھی شہر ہیں ان کے عالیشان مکانات میں مسہری کو خوش حالی اور پر تکلف زندگی کی علامت مانا جاتا ہے۔

ہندی بھاشا میں اس کا نام چھپر کھٹ ہے کیونکہ اس کے چاروں پایوں پر حسین اور نازک ڈنڈے ہوتے ہیں جن کے اوپر خوبصورت چھتری ہوتی ہے۔ چھتری کے ساتھ چاروں طرف پردے ہوتے ہیں جن کے جھالر پٹیوں سے نیچے تک لٹکے رہتے ہیں۔ چھتری اور پردے اکثر ریشم کے ہوتے ہیں جن پر سنہری کشیدہ کاری ہوتی ہے۔ یہ پردے روئے عروس کے لئے نقاب بھی ہوتے ہیں اور مچھر دانی کا کام بھی دیتے ہیں۔

مسہری پر دری یا قالین خالی نہیں چھوڑی جاتی بلکہ اس پر خوبصورت چادر ہوتی ہے

جس کے چاروں کنارے سیج بند سے کس دیئے جاتے ہیں۔ ریشم کی ڈوریاں جو موباف کی طرح ہوتی ہیں سیج بند کہلاتی ہیں ان میں کبوتر کے انڈے کی برابر ریشم کی گھنڈیاں ہوتی ہیں۔

اس مسہری کی قدر و منزلت اور اس کے تکلفات آج بھی یورپ کے صوفا سیٹ سے کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ آرائش منزل کے کم از کم اس باب میں ہمارا تمدن عرب جاہلیت کے تمدن سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا۔ کیونکہ نہ صرف امراء اور رؤسا بلکہ متوسط درجہ کے خوش حال عرب کے گھر میں بھی مسہری ہوتی تھی جس کو وہ حجُلہ اور سیج بند کی گھنڈی کو زر الحجلہ[1] کہتے تھے۔ اور امرا القیس کی ناز پروردہ محبوبہ کے بستر پر تو مشک کے ریزے بھی بکھرے ہوئے ہوا کرتے تھے[2]۔

چلمن کا رواج عام تھا۔ اسلام نے تو ایک حد تک چلمن یعنی دروازے پر پردہ کو ضروری قرار[3] دیا ہے۔ لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اور ایسے ہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بھی ایک مرتبہ یہ تکلف کیا کہ دروازہ پر عمدہ کپڑے کا پردہ آویزاں کر لیا۔ جس پر پھول بوٹے تھے اور تصویریں بھی تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے طاق کو جو حجرہ کے ایک کونہ میں تھا

---

[1] شمائل نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ ایک عام لفظ ہے کیونکہ خاتم نبوت کو زر الحجلہ سے تشبیہ دی گئی ہے [2] کما قال۔ وتضحی فتیت المسك فوق فراشها۔ نؤومُ الضحیٰ لم تنتطق عن تفضل۔ یعنی اس قدر بے پرواہ اور فارغ البال ہے کہ سوتے سوتے دوپہر کر دیتی ہے اور جب سو کر اٹھتی ہے تو اس کے بستر پر مشک کے ریزے بکھرے ہوتے ہیں اور جب کپڑے پہن لیتی ہے تو کپڑے بھی ڈھیلے ڈھالے رہتے ہیں کسی نوکر چاکر کی طرح کمر پر پٹکا نہیں باندھتی (المعلقات السبعہ) [3] کیونکہ کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے اجازت لینے کی یہ اہمیت ہے کہ قرآن شریف میں اس کے متعلق ایک آیت نہیں بلکہ کئی آیتیں نازل ہوئیں۔ مگر یہ اذن لینا اسی وقت ضروری ہے جب کمرے کے دروازہ پر پردہ ہو یعنی چلمن پڑا ہو۔ یا کمرے کا دروازہ بند ہو البتہ مکان کا مسئلہ جدا ہے۔ مکان میں داخل ہونے کے لئے بہر صورت اذن لینا ضروری ہے۔ واللہ اعلم بالصواب [4] بخاری شریف ص۸۸۰۔ [5] ابو داؤد شریف باب اتخاذ الستور کتاب اللباس۔

ایک خوبصورت باتصویر طاق پوش سے سجالیا؎ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو اتروادیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پردے کو ایک غریب گھرانے میں بھجوادیا کہ وہ پہننے کا کوئی کپڑا بنالیں

ان واقعات کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں تصویر کی ممانعت فرمائی یہ تعلیم بھی دی کہ کپڑا انسانوں کے پہننے کے لئے ہے' دیواروں کو پہنانے یا دروازوں اور طاقوں کے سجانے کے لئے نہیں ہے۔

عائشہ صدیقہ یا سیدتنا فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا دولتمند نہیں تھیں۔ جن کی زینت فقر و فاقہ ہو ان کو خوش حال کہنا بھی مشکل ہے۔ خود عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ دو دو مہینے گذر جاتے تھے اور چولھا ٹھنڈا پڑا رہتا تھا۔ چند کھجوًر اور پانی سد رمق کا ذریعہ ہوتا تھا مگر یہ صرف ان کی سلیقہ مندی اور خودداری تھی کہ آلِ رسُول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نشیمن کو خوش حال گھرانوں کی طرح ستھرا اور آراستہ رکھنا چاہتی تھیں۔ خانہ داری کے سلسلہ میں یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف" کی عملی صورت یہی ہوسکتی تھی؎ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسراف کو پسند نہیں فرمایا۔ مگر ان دونوں محترمہ کا یہ عمل اس دَور کے عام رواج کی غمازی کرتا ہے۔

مذکورہ بالا چند تفصیلات کے تحت عرب کی آرام گاہ کی شان ملاحظہ فرمایئے:

فرش پر قالین۔ بیٹھنے کے لئے غالیچے اور مخملی گدے۔ کمر لگانے کے لئے تکیے آرام کرنے کے لئے مسہری۔ دروازوں اور کمرے کے طاقوں پر پھولدار باتصاویر کپڑے کے پردے یا موتیوں یا مونگوں کی لڑیاں جن کو "حجال" کہا جاتا تھا۔

قرآنی اشارات ترغیب اور ترہیب کے موقع پر انہیں چیزوں کے نام لئے جاتے ہیں۔

؎ بخاری شریف ص۸۸۰ ؎ یعنی ان کے رکھ رکھاؤ کی شان یہ ہوتی ہے کہ جو شخص ان کے پوست کندہ حالات سے واقف نہیں ہوتا وہ ان کو دولت مند اور غنی سمجھتا ہے۔ ؎ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جذبہ کی تردید نہیں فرمائی البتہ اس میں اسراف کی ممانعت فرمائی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا پردہ ایک غریب گھرانے میں بھجوادیا۔ نیز تصویر کی ممانعت فرمائی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والا پردہ اتروادیا۔

جو عام طور پر مشہور اور رائج ہوتی ہیں اس بنا پر ہمیں قرآن حکیم سے بھی استدلال کا حق پہنچتا ہے۔ اب آپ ذیل کی چند آیتیں ملاحظہ فرمائیے اور عربوں کے تمدنی ذوق کا اندازہ لگائیے:

یلبسون ثیابا خضرا من سندس واستبرق متکئین فیھا علی الارائک۔ (سورۂ کہف ۱۸ آیت ۳۱)

متکئین علی فرش بطائنھا من استبرق (سورۂ رحمٰن ۵۵ آیت ۵۴)

متکئین علی رفرف خضر و عبقری حسان (سورۂ رحمٰن ۵۵ آیت ۷۶)

چند نام اور ملاحظہ فرمائیے جو مختلف آیتوں میں وارد ہوئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کا بھی رواج تھا۔

مشکوٰۃ۔	(طاق، شمع دان)	اکواب۔	آب خورے
مصباح۔	چراغ	قرطاس۔	کاغذ
زجاج۔	شیشہ	سجل۔	دستاویز۔ کھاتہ
کافور۔	کافور	صحف۔	جمع صحیفہ۔ کتابچہ
قواریر۔	شیشے کے گلاس	قلم۔	مداد روشنائی۔

دسترخوان مغربی یورپ کا تو اس وقت ذکر ہی ۱؎ بے موقع ہے۔ وہ تو اس وقت تہذیب در کنار انسانیت کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھا۔ مشرقی یورپ میں بےشک

۱؎ ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں یہ چھٹی صدی عیسوی کا دور ہے یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور قدسی کا دور۔ اس سے تقریباً آٹھ سو برس بعد ۱۴۳۰ء میں اینیس سوئس نے (جو آگے چل کر پائیس دوم کے نام سے پوپ ہوا) جزائر برطانیہ کی سیاحت کی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ کسانوں کے مکان خشک چنائی کے پتھروں کے تھے جن میں چونا نہیں لگایا گیا تھا۔ چھتیں گھاس پھونس کی تھیں اور بیل کی ایک اینٹھی ہوئی کھال دروازے کا کام دیتی تھی۔ خوراک کی قسم سے وہ ساگ پات۔ موٹھ مٹر یہاں تک کہ درختوں کی چھال تک استعمال کرتے تھے بعض مقامات کے باشندے روٹی کے نام تک سے واقف نہیں تھے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

رومۃ الکبریٰ کا اقتدار سر بفلک تھا۔ وہ ایک تہذیب کا بھی مالک تھا۔ ممکن ہے اس کی تہذیب میں اس وقت بھی میز اور کرسی داخل ہو مگر عرب اس سے متاثر نہیں ہوتے۔ دوسری جانب ایران کی تہذیب تھی۔ یہاں کرسیاں نہیں تھیں۔ البتہ تقریباً ایک بالشت اونچی چھوٹی چوکیاں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: گارے سے ٹھسے ہوئے سرکنڈوں کی کوٹھریاں۔ بھدّے اور بے ڈھنگے نشوں کے گھر، بے دُود کش کی بے رونق دھواں دار انگیٹھیاں، جوؤں، کھٹملوں اور پسوؤں سے بھرے ہوئے، جسمانی، اخلاقی غلاظتستان کے بھٹ۔ سردی سے بچنے کیلئے بدن کے گرد پیال کے لپیٹے ہوئے مٹھے۔ بخار سے سکنے والے کسانوں کیلئے عاملوں اور سیانوں کے جھاڑ پھونک کے سوا اور کسی تدبیر کا نہ ہونا۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے کیسے ممکن تھا کہ آبادی ترقی کر سکے۔ مرد، عورت اور بچے ایک ہی کوٹھری میں سوتے تھے اور گھر کے جانور بھی اس میں ٹھونس دیے جاتے تھے۔ (معیار العلم لا تعلیم ص ۱۴۳ و ۱۴۲)

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ نے غالباً عرب کے تہذیب و تمدن پر تفصیلی نظر نہیں ڈالی اور عام خیال کے بموجب آپ نے بھی عرب کو پسماندہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ آپ نے تین دلیلیں پیش فرمائی ہیں (۱) تمدن اور اسباب معاشرت سے تعلق رکھنے والے الفاظ عربوں کے پاس نہیں تھے تو انھوں نے ایران وغیرہ سے لئے تھے مثلاً سراویل (پاجامہ، شلوار سے۔ چراغ سے سراج۔ آب ریز سے ابریق (یعنی لوٹا) مگر اس سے ایرانی تہذیب کا تقدم تو ثابت ہو سکتا ہے عربوں کی پسماندگی ثابت نہیں ہوتی، پس ماندگی جب بھی کہ یہ چیزیں عرب میں رائج نہ ہوتیں۔

دوسری دلیل یہ کہ مدینہ منورہ میں چراغ کا رواج نہیں تھا۔ لوگ چھلنی بھی نہیں جانتے تھے مگر جب اسی مدینہ میں گدّے، تکیے، مسہری، چارپائی، دروازوں پر پردوں کا رواج تھا تو صرف چراغ کا عام رواج نہ ہونے کو پیش کرنا قرین انصاف نہیں۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ تیل اتنا آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ سرسوں کا تیل اب بھی عرب میں کمیاب ہے، ہم اسکے علاوہ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ مدینہ تمدن میں مکہ کے ہم پلہ نہیں تھا۔ یہاں کاشتکار اور زمیندار رہتے تھے اور مکہ کے باشندے تاجر تھے۔

تیسری دلیل آپ نے یہ دی ہے کہ حشرات الارض کھائے جاتے تھے تو اس طرح کے پسماندہ آج کے دور میں ہندوستان میں بھی موجود ہیں جو گھوہ وغیرہ کھاتے ہیں۔ ایک مرتبہ بھنا ہوا گوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان پر رکھ دیا گیا۔ آپ نے تناول نہیں فرمایا اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ ہمارے یہاں (مکہ) میں یہ نہیں کھائی جاتی۔

بہر حال حضری یعنی شہری لوگ حشرات الارض کو قابلِ نفرت ہی سمجھتے تھے۔

ہوتی تھیں جن پر کھانا رکھا جاتا تھا۔ ان کو خوان کہا جاتا تھا۔ پیچھے گاؤ تکیہ، آگے خوان پر کھانا یہ ایرانی تہذیب تھی۔ چھوٹی تشتریوں اور پیالوں میں مختلف قسم کے سالن اور چٹنیاں ہوتی تھیں مگر عربوں کا مذاق اس سے مختلف تھا۔ یہ چمڑے کا بڑا دسترخوان زمین پر پھیلاتے اور بڑے طشت یا قاب میں کھانا رکھتے اور سب ساتھ کھاتے تھے جو برتن ایشائی ممالک میں آج رائج ہیں وہ اس وقت بھی تھے! ایسے بڑے بڑے ٹب بھی ہوتے تھے جن میں بیٹھ کر غسل کیا جاتا ہے۔ آفتابہ کا بھی استعمال عام تھا! البتہ ٹونٹی دار لوٹے نہیں ہوتے تھے۔

لباس و پوشاک

پہلے گذر چکا ہے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو لوگ آپ کے گھر پر چڑھ دوڑے۔ سامنے کے میدان میں بہت بڑا ہجوم ہو گیا۔ اس وقت مکہ کا ایک رئیس۔ عاص بن وائل سہمی پہنچ گیا تھا۔ اس نے پناہ کا اعلان کیا تھا جس کے بعد مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا تھا۔ آپ اس رئیس کے لباس پر نظر ڈالئے۔ قمیص کی آستینوں میں ریشم کی کفیں ہیں۔ اوپر ریشمی قبا[1]۔ یمن کا دھاری دار خاص کپڑا جس کو حبرہ کہا کرتے تھے اس کی چادر ہے اور اسی کپڑے کا تہبند ہے۔

عرب کا تقریباً یہی لباس آج بھی ہے۔ سر پر رومال یا عمامہ کا طریقہ بھی تھا۔ رومال کو قناع کہا جاتا تھا۔ رومال پر "عقال" کا دستور غالباً اس وقت نہیں تھا۔

سردیوں میں برنس کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ جو بران کوٹ کی طرح ہوتا تھا۔ ہاتھوں میں قفازین (دستانے) اور پیروں میں خفین۔ چمڑے کے موزے بکثرت استعمال ہوتے تھے۔

عورتوں کے لباس میں نطاق بھی تھا۔ اس کو دوہرا تہ بند کہا جا سکتا ہے۔ مگر دوہرا کرنے کی شکل یہ ہوتی تھی کہ چوڑائی میں دوہرا ہو جاتا تھا۔ یعنی اس کا عرض اتنا ہوتا تھا کہ ٹخنوں سے لیکر سر تک پہنچ جاتا تھا، بیچ میں کمر بند باندھ لیا کرتی تھیں۔ پھر اوپر کا حصہ جو سر تک پہنچا ہوا تھا نیچے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس میں کنی اور حاشیہ بھی ہوتا تھا۔ جو ٹخنوں اور پنڈلیوں

---

[1] قبا من دیبا ج بخاری شریف ص ۵۴۵

پر رہتا تھا اور اس سے خاص زیبائش ہو جاتی تھی۔

سنگھار چاندی سونے کے علاوہ ہاتھی دانت۔ مونگا۔ موتی۔ سیپ وغیرہ کے زیورات بھی استعمال کئے جاتے تھے۔ ان کی تفصیل طویل بھی ہے اور بے سود بھی خاص بات یہ ہے کہ معرکوں میں بھی عورتیں زیورات پہن کر جاتی تھیں۔

رؤسا قریش کی بیگمات جب گھبرا کر بدحواس بھاگیں تو ازاریں سمیٹ رکھی تھیں۔ پنڈلیوں میں ٹخنوں سے اوپر جو پازیب (خلخال) تھے وہ کھل گئے تھے۔[1]

دانتوں اور موتھ کی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا شعراء اشعار تشبیب میں اس کا ذکر مزے لے لیکر کیا کرتے تھے۔ "عدیل بن فرج عجلی" کے چند اشعار سے آپ بھی لطف اندوز ہو لیجئے۔

(۱) الا یا اسلمی ذات الدمالج والعقد به وذات الثنایا الغرّ والفاحم الجعد

وذات اللثات الحمر والعارض الذی: به ابرقت عمدًا ابیض کالشهد

کان ثنایاھن اغتبقن مدامة ثوت حججًا فی راس ذی قنة فرد

(دیوانِ حماسہ)

(۱) ہاں ہاں، زندہ باش جس کی دیوی جو بازو بند اور ہار سے آراستہ ہے دانت آبدار بال بہت سیاہ گھونگریالے۔

(۲) مسوڑھے مستی سے سیاہ سامنے کے دانت صاف شفاف چمکدار جن میں خاص طور سے سفید رنگ کے لعاب دہن نے چمک پیدا کر دی ہے جو شہد کی طرح شیریں ہے۔

(۳) سامنے کے دانتوں میں ایسی ہلکی سرخی ہے۔ جیسے شراب کہنہ نوش جان کی ہو۔ اور وہ شراب بھی ایسی ہو کہ اونچے پہاڑ کی اکیلی چوٹی پر جس کی برابر کوئی دوسری چوٹی نہ ہو رکھی رہی ہو جس کی وجہ سے نشہ اور اس کا ارغوانی رنگ پختہ ہو گیا ہو۔

خوشبو خوشبو سے گویا عرب کو عشق تھا۔ مشک، عنبر اور زعفران تو عام تھا۔ زعفران

---

[1] قد بدت خلاخلهن۔ بخاری شریف صفحہ ۵۶۹

کپڑے بھی رنگا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی خوشبوئیں تھیں جن کو غازہ کی طرح غسل میں یا غسل کے بعد استعمال کیا کرتے تھے۔

امرء القیس کا یہ طرب انگیز شعر محض شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔

اذا قامتا تضوّع المسک منہما نسیم الصبا جاءت بریا القرنفل

(پہلی بیوی اور دوسری بیوی) دونوں کی شان یہ تھی کہ جب کھڑی ہوتی تھیں تو مشک کی ایسی تیز خوشبو مہکتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا قرنفل (لونگوں) کے باغیچہ سے نسیم صبا کا جھونکا آگیا ہے۔

مدینہ کے ایک یہودی رئیس نے بڑے فخر سے کہا تھا عندی اعطر سید العرب[1]۔

کچھ زیور ایسے ہوتے تھے جن میں مشک وغیرہ کے سفوف بھر دیئے جاتے تھے[2]۔ ان سے خوشبو مہکتی رہتی تھی۔

یہ تھی عام عرب کی تہذیب اور ان کا تمدن۔ مگر ہمارے پیش نظر خاص طور پر مکّہ معظمہ ہے جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد پاک آفتاب اسلام کا مشرق ہے۔ آئندہ ابواب میں مکّہ کے حالات ملاحظہ فرمایئے۔

مکّہ

محلّ وقوع ــــ اہمیّت

دنیا کے وہ مقام جن کو بین الاقوامی تعلقات کے بارہ میں درمیانی کڑی (جنکشن) کی حیثیت حاصل تھی، مکہ ایسے ہی مقامات میں ایک ممتاز مقام تھا۔

مکہ شہر بعد میں آباد ہوا۔ مگر اس کے محل وقوع کی یہ حیثیت اس وقت سے تھی جب سے

---

[1] بخاری شریف ص۵ ای اعطر سادات العرب (مجمع البحار)
[2] مثلاً قسط اظفار یا جزع اظفار (مجمع البحار لفظ ظفر)

ہند سندھ۔ افغانستان۔ ایران۔ یمن اور شام کے ممالک تمدن سے آشنا ہوتے تھے اور ابنائے آدم کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے اجناس و مصنوعات کے تبادلہ کا سلسلہ ایجاد کیا تھا۔

عرب کا یہ صوبہ جس میں مکہ شہر ہے اس کو "حجاز" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ صحرا اعظم کے ریگ و بالو اور دو سمندروں (بحر احمر و بحر قلزم) کی موجوں کے درمیان قدرتی آڑ (حجاب)[1] ہے۔

حجاز نے بے شک سمندر کو صحرا عرب اور اس کے شمال مشرقی شہروں سے کئی سو میل دور ہٹا دیا۔ مگر سمندر کا یہ قدرتی احسان ہے کہ اس نے حجاز کے ساتھ علیحدگی پسندی کا سلوک نہیں کیا۔ بلکہ پہلے تو عربوں کو جہاز رانی سکھائی پھر ان کے جہازوں کو اپنے سینہ پر چڑھا کر نہ صرف یمن۔ سندھ۔ مصر۔ افریقہ اور ایران بلکہ دنیا کے مشرقی کناروں (جزائر شرق الہند) تک پہنچایا حجاز جس کا قلب "مکہ" ہے اس کی یہی اہمیت تھی (جس کی وجہ سے اس پر قبضہ کے لئے تین ہم عصر سلطنتوں میں رقابت چلی آتی تھی (رومی۔ ایرانی اور حبشی) یہ تینوں اس پر قبضہ کے لئے خواہشمند رہیں۔

روایت ہے کہ سکندر ذوالقرنین نے ضروری خیال کیا تھا کہ اس شہر کے معبد "خانہ کعبہ" کی زیارت[2] کرے۔ جدہ جو مکہ سے صرف پچاس میل کے فاصلہ پر حجاز کی بندرگاہ ہے۔ جو فی زمانہ حجاج ہند کے استقبال کا عادی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب نوع انسان کا گروہ وجود و حیات کی پہلی منزل میں تھا تو جدہ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ محترمہ (حضرت حوا) کا استقبال بھی اسی شان سے کیا تھا جب وہ لنکا سے روانہ ہو کر ہندوستان سے گذرتے ہوئے سرزمین حجاز میں فروکش ہونے کے لئے مکہ جا رہے تھے۔ جہاں انہوں نے پہلی بار خانہ خدا "کعبہ[3]" کی بنیاد رکھی۔

---

[1] حجاز کے معنی آڑ ہیں۔ [2] البدایہ والنہایہ صفحہ ۱۰۵ ج ۲۔ [3] جو طوفان نوح میں اٹھا لیا گیا تھا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ (تفصیل کے لئے عہد زریں جلد اول ملاحظہ فرمائیے)۔

بنا مکہ - بانی مکہ اور کعبہ[1]

تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام[2] نے شام سے آکر علاقہ حجاز کی ایک وادی غیر ذی زرع (بنجر میدان) میں اپنے جگر گوشہ اسمٰعیل (علیہ السلام) کو آباد[3] کیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد خدا کے گھر کی مٹی ہوئی بنیادیں ابھاریں۔

اس خانہ خدا کا نام کعبہ ہے اور جو شہر یہاں آباد ہوا وہ مکہ ہے۔

اس نونہال (حضرت اسمٰعیل) کے ساتھ صرف اس کی ماں تھی۔ وہی اس چشمہ کی مالک تھی جو یہاں اُن کی سکونت کے ساتھ ساتھ[3] برآمد ہوا تھا۔

یہ چشمہ برآمد ہوا تو حضرت ہاجرہ سے اجازت لے کر قبیلہ جرہم[4] بھی یہاں آباد ہو گیا تھا حضرت اسمٰعیل جوان ہوتے تو ان کی شادی بھی اسی قبیلہ میں ہو گئی۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے اولاد ہوئی تو عرب قدیم میں ایک نئی نسل کا اضافہ

---

[1] ہندوستان کی جنتا برہم کو پوری عظمت کے ساتھ مانتی ہے۔ مگر یہ نہیں بتا سکتی کہ "برہم" کون تھے۔ کوئی انسان تھے تو کہاں کے رہنے والے تھے اور ان کا مذہب و مسلک کیا تھا۔ مگر بائبل برہام اور ابرہام کو موجودہ نسل انسانی کا باعظمت انسان، توحید کا علم بردار اول اور ان مذاہب کا ہادی اعظم مانتی ہے جو الہام، وحی اور نبوت و رسالت کے قائل ہیں قرآن حکیم نے بھی حضرت ابراہیم کو یہی حیثیت دی ہے [2] پوری تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو عہد زریں جلد اول۔ [3] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی اور لخت جگر کو یہاں آباد کیا تو تھوڑے سے کھجور اور پانی کا ایک مشکیزہ توشہ میں دیا تھا۔ چند روز بعد پانی ختم ہو گیا۔ ماں سے پہلے بچہ پیاس کی وجہ سے لب دم ہو گیا تو قدرتی طور پر ایک چشمہ برآمد ہو گیا۔ اسی کا نام "زمزم" ہے جو اب خانہ کعبہ کے قریب کنوئیں کی شکل میں ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے عہد زریں جلد اول) [4] اس قبیلہ کا اصل وطن یمن تھا اب وہ الگ سرزمین اپنی آبادی کے لئے چاہتا تھا۔ یہ میدان اور چشمہ اس کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا جس نے اس قبیلہ کی مراد پوری کر دی۔

ہو گیا۔ جس کو عرب[1] مستعربہ اور بنو اسمٰعیل کہا گیا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام یہاں تنہا تھے۔ ایک ماں کے علاوہ نہ ان کا کوئی دادھیالی رشتہ دار تھا نہ ناھنیالی۔ بنو جرہم سے ان کو مدد ملی۔ ادھر بنو جرہم پر حضرت اسمٰعیل[2] کے اخلاق کا یہ اثر ہوا کہ وہ ان کے معتقد ہو گئے، پھر ان کا مسلک قبول کر لیا۔ توریت کی روایت کے بموجب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر ایک سو سینتیس[137] سال ہوئی[3]۔ اس عرصہ میں مکہ چند گھر کی آبادی کے بجائے پورا شہر بن چکا تھا اور کعبہ نے بھی مرکزی عبادت گاہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اپنی قوم کے مقتدا بھی تھے اور کعبہ کے متولی بھی۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ لڑکے ہوئے[4]۔ اگر وہ سب مکہ میں رہتے تو بہت ممکن تھا مکہ میں ان کی اکثریت ہو جاتی۔ مگر یہ صاحبزادگان جو اولوالعزم نبی کی اولاد تھے اُن کا مطمعِ نظر اور نصب العین دعوت الی اللہ اور اصلاحِ خلق تھا۔ وہ اسی مقصد کو لے کر مکہ سے نکلے اور ملک کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے۔ جہاں جہاں وہ پہنچے وہاں اس زمانہ کی گمراہیوں یعنی کواکب پرستی اور اصنام پرستی وغیرہ کے مقابلہ میں خدا پرستی کا علم بلند ہو گیا[5]۔

مکہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے صرف ایک فرزند قیدار قیام پذیر رہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد وہی خانہ کعبہ کے متولی ہوئے پھر ان کی اولاد متولی ہوتی رہی اور سیاسی اقتدار ان کے ناھنیال "بنو جرہم" کو حاصل رہا۔ کئی صدی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر

---

[1] یعنی جو پہلے عرب نہیں تھے اب عرب بن گئے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم اگرچہ عربوں کی طرح اولادِ سام میں سے تھے مگر ان کا اصل وطن عراق تھا۔ [2] حضرت اسمٰعیل علیہ السلام خدا کے نبی تھے۔ نبی کی اخلاقی اور روحانی تربیت خود قدرت کی جانب سے ہوتی ہے اور نظر بظاہر حضرت ابراہیم علیہ السلام مربی تھے وہ یہاں آتے رہتے تھے۔ [3] توریت (بائبل قدیم) باب پیدائش ۲۵ فقرہ ۱۶، ۱۷ [4] ایضاً [5] فلما ضاقت مکۃ علی ولد اسمٰعیل انتشروا فی البلاد فلا یناوئون قوما الا اظہرہم اللہ علیہ بدینہم فوطئوہم (سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۰)

وہ وقت آیا کہ بنو جرہم اپنے اقتدار کے نشہ میں ایسے مست ہوئے کہ ان کو اولادِ اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اتنی مداخلت بھی گوارا نہ ہوئی کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی رہیں۔ چنانچہ ان کو مکہ سے نکال دیا۔ اور اب مرکزِ توحید یعنی خانہ کعبہ پر بھی انہیں کا اقتدار ہوگیا۔

مگر جس قوت اور اقتدار کے نشہ میں وہ اپنے مخدوم زادوں کا احترام نہ کر سکے وہ دوسروں کے حقوق کا احترام کب کر سکتے تھے۔ چنانچہ زائرین کعبہ کے حق میں بھی ان کا یہ نشہ ستم پرور رہی رہا۔ انتہا یہ کہ سرزمین پاک (مکہ معظمہ) کا ذرہ ذرہ ان کے مظالم سے نالاں ہوگیا۔

بنو جرہم اگرچہ اب بھی توحید پرست اور دینِ ابراہیمی کے دعوے دار تھے۔ مگر صحتِ عقیدہ، اوراد و وظائف یا پوجا پاٹ کے منتر سے حکومت اور اقتدار کی حفاظت نہیں کی جا سکتی۔ خصوصاً حرمِ مکہ کے متعلق عرب کا عقیدہ یہ تھا۔

انما سمیت ببکۃ الا انھا کانت تبث اعناق الجبابرۃ اذا احدثوا فیھا شیئًا۔ [۱]

(اس کا بکہ نام اسی لئے ہوا کہ وہ جابر حکمرانوں کی گردنیں توڑ دیتا ہے جب وہ اس سرزمین پر ظلم کرتے ہیں۔)

چنانچہ قدرت کے "کید متین [۲]" نے قبیلہ بنو خزاعہ کے مورث کو ان کی سرکوبی کے لئے ان پر مسلط کر دیا۔

عَمرو بن لُحَیّ [۳] - جو یمن کا ایک چالاک سردار تھا آگے بڑھا۔ اُس نے بنو جرہم کو مکہ سے نکال باہر کیا اور در و بست کا مالک خود بن گیا۔ اسی کے اَخلاف بنو خزاعہ تھے۔ جو تقریباً تین سَو [۴] برس تک مکہ پر حکمراں رہے۔

یہی عَمرو بن لُحَیّ ہے جو شام گیا تو وہاں ایک بُت ہُبُل کا گرویدہ ہوگیا جس کی صفت یہ بیان کی گئی تھی کہ وہ بارش کا دیوتا ہے اور لڑائیوں میں بھی مدد کرتا ہے [۵]۔ عَمرو بن لُحَیّ ایسے دیوتا

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ص ج ۱ [۲] خفیہ تدبیر سنجیدہ اور مستحکم [۳] بضم لام فتح حا و تشدید یا بصیغہ تصغیر۔ فتح الباری ص ج ۶ [۴] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے عہدِ نذریں جلد اول [۵] یعنی گنیش اور کالی دیوی دونوں کے پورٹ فولیو کا انچارج ہے۔

کو کب چھوڑ سکتا تھا۔ وہ خوشامد کر کے یا کچھ نذرانہ دے کر اس بُت کو مکہ معظمہ لے آیا اور خانہ کعبہ[1] کے وسط میں جو خزانہ کا کنواں تھا اس کے اوپر نصب کر دیا۔

قریش اور قُصَیّ بن کلاب مصلحِ قریش

قریش کا تعارف

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں تقریباً بیس پشت کے بعد ایک شخص مُضَر ہوا ہے۔ باپ کا نام "کنانہ" اس کی اولاد کو "قریش" کہا جاتا ہے[2]۔

مُضَر کی آٹھویں پُشت میں ایک شخص ہوا جس کا عرفی نام قصیؔ[3] تھا اصل نام زید۔ باپ کا نام کلاب۔ ماں کا نام فاطمہ بنتِ سعد۔ قُصَیؔ[4] بن کلاب کو قوم نے مُجَمِّع کا خطاب دیا۔ اب پورا نام مع القاب[5] خطاب یہ ہوگیا: "زید بن کلاب معروف قصی۔ مخاطب بخطاب مجمع۔"

قصی اور تولیت کعبہ

قصی بچپن ہی میں باپ کے سایہ سے محروم ہوگیا تھا۔ ماں نے قبیلہ بنی عذرہ کے ایک شخص سے جس کا نام ربیعہ بن حرام تھا دوسرا نکاح کر لیا۔ بنو عذرہ۔ شمال عرب کے حدود میں شام کے قریب سُرغ میں آباد تھے۔ قصی نے ماں کی آغوش میں یہیں پرورش پائی۔ ہوش سنبھالا تو وطن اور نسل کی جستجو ہوئی۔ کچھ سراغ لگا تو یہ مکہ پہنچا۔ وہاں بڑے بھائی سے ملاقات ہوئی جس کا نام زہرہ تھا۔ جو بوڑھا ہو

---

[1] اس زمانہ میں خانہ کعبہ پر چھت نہیں تھی۔ چاروں طرف صرف دیواریں تھیں اور ان کے بیچ میں کنواں تھا یعنی گڑھا اس میں نذرانے ڈالے جاتے تھے [2] معارف ابن قتیبہ [3] جس کی پانچویں پشت میں فخر موجودات۔ سید الانبیاء۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور اقدس ہوا۔ سلسلہ نسب یہ ہے: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی [4] سمی قصی لتقصیھا بہ الی الشام ابن سعد ج ۱ ص ۳۶۔ یعنی چونکہ اس بچہ کو اس کی ماں عرب کے آخری کنارہ میں لے گئی تھی۔ اس لئے اس کو قصی کہا جانے لگا۔ یعنی آخری کنارہ والا چھوٹا سا بچہ۔

[5] ابن سعد ج ۱ ص ۳۷۔

چکا تھا۔ اس کی بصارت بھی جاتی رہی تھی [1]

مکہ پر قبیلہ خزاعہ کا قبضہ تھا۔ قصی نے یہیں بود و باش شروع کردی اور یہاں تک تعلقات بڑھائے کہ خانہ کعبہ کے متولی [2] نے اپنی لڑکی کا نکاح قصی سے کر دیا۔

اب ایک روایت یہ ہے کہ حلیل نے اپنی وفات کے وقت قصی کو خانہ کعبہ کا متولی بنا دیا مگر مشہور روایت یہ ہے کہ حلیل نے لڑکی کو متولی اور ایک شخص ابو غبشان [3] کو اس کا نائب بنا دیا اور کاروبار اس کے سپرد کر دیا۔

ابو غبشان شراب کا دھنی تھا۔ شراب کی مستی میں قصی نے اس سے نیابت تولیت منتقل کرنے کا معاملہ کیا اور شراب کے ایک مشکیزہ پر معاملہ طے ہو گیا۔

ابو غبشان کو مشکیزہ شراب ملا اور قصی بن کلاب کو سند نیابت اور وہ جملہ اختیارات جو ابو غبشان کو حاصل تھے۔ اس واقعہ سے ایک مثل مشہور ہو گئی۔ گھاٹے کے سودے کے متعلق کہا جانے لگا۔ "اخسر من صفقہ ابی غبشان" ابو غبشان کے سودے سے بھی زیادہ خسارہ مند۔

قصی کی کامیابی اور قریش کا مکہ پر تسلط

واقعہ کچھ بھی ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ خزاعہ کے دوسرے سرداروں نے اس کو برداشت نہیں کیا کہ ایک قریشی نوجوان خانہ کعبہ کا متولی ہو۔ انہوں نے اس تولیت نامہ کو بجبر منسوخ کرنا چاہا مگر قصی اس کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ وہ قریش کے منتشر اجزاء کو جمع کر کے بنو خزاعہ سے مقابلہ کی تیاری کر چکا تھا۔ اس نے مزید کمک اپنے ننھیالی قبیلہ

---

[1] کہتے ہیں زہرہ نے دو علامتوں سے چھوٹے بھائی کو پہچانا۔ ایک تو آواز سے پہچانا۔ دوسرے یہ کہ جس طرح زہرہ کے بدن پر بہت بال تھے ایسے ہی قصی کے بدن پر بھی بال تھے۔ ابن سعد ص ۲ ج ۱۔

[2] حلیل بن حبشیہ۔ خزاعی لڑکی کا نام حبی۔ البدایہ والنہایہ ص ۲۰۱ ج ۲

[3] اصل نام سلیم بن عمرو

بنو قضاعہ سے حاصل کی۔ اپنے حلیف قبائل سے بھی امداد طلب کی اور اس طرح "بنو خزاعہ" کے مقابلہ پر ایک مضبوط محاذ قائم کرلیا۔ چند بار خونریز معرکے ہوئے فریقین کا کافی نقصان ہوا معاملہ خانہ کعبہ کی تولیت کا تھا، جس سے ہر ایک عرب کو دلی تعلق تھا۔ کچھ امن پسند عناصر بھی تھے۔ وہ بیچ میں پڑے اور فریقین کو اس پر راضی کرلیا کہ یہ پورا معاملہ ثالث کے سپرد کر دیں۔

یعمر بن عوف ایک مشہور دانش مند اور صاحب الرائے تھا، فریقین نے اس کو ثالث تسلیم کرلیا۔ اس نے تمام واقعات کی چھان بین کی۔ فریقین کے دلائل کو پرکھا۔ اس کا فیصلہ یہ ہوا:

"تولیتِ کعبہ اور مکہ کے نظم ونسق کا مستحق قصی ہے۔ بنو خزاعہ کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ لہذا کعبہ اور مکہ کا نظم ونسق قصی کے حوالہ کیا جائے۔ بنو خزاعہ مکہ کو خالی کردیں بنو خزاعہ حملہ آور تھے۔ ان کا یہ اقدام غلط تھا۔ لہذا جتنے آدمی اُن کے اور ان کے حلیفوں کے مارے گئے ان کا کوئی معاوضہ نہیں ہے البتہ قصی اور قصی کے حامیوں کے جتنے آدمی ہلاک ہوئے ہیں انکی دیت بنو خزاعہ ادا کریں"[1]

یعمر بن عوف نے اپنے فیصلہ میں بنو خزاعہ کے مقتولین کا شدخ کیا۔ یعنی اُن کا کوئی تاوان لازم نہیں کیا اس بنا پر یعمر کا لقب[2] شدّاخ پڑ گیا (معاوضۂ خون کو ساقط کرنے والا)۔

قصی نے قریش کے انتشار کو ختم کرکے اُن کو ایک مرکز پر جمع کیا اس لئے اس کا لقب[3] مُجمِّع ہو گیا۔

قریش کا مکہ پر تسلط ہوا تو کئی ہزار سال کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ بنو اسمٰعیل کو مکہ پر سیاسی اقتدار حاصل ہوا۔

سیاسی رابطہ: شام کے قریب جو عربی قبائل آباد تھے اگرچہ وہ خود مختار تھے۔ مگر

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص۸۴ ج ۱ [2] معارف ابن قتیبہ ص۲۲ [3] حذافہ بن غانم عدی نے ابو جہل کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا

ابوکم قصی کان یدعی مجمعا بہ جمع اللہ القبائل من فہر (ابن سعد ص۴۲ ج ۱)

بازنطینی شہنشاہیت (سلطنت روم) کے زیر اثر تھے۔ کچھ قبیلوں نے عیسائی مذہب بھی قبول کر لیا تھا۔ قصی اس علاقہ میں بڑھ کر جوان ہوا تو اس کی بلند پرواز فطرت نے اس کو شاہنشاہ روم تک پہنچا دیا۔ بنو خزاعہ کی اس جنگ میں قیصر روم (بازنطینی شہنشاہ) کی حمایت بھی قصی کو حاصل تھی اور بقول ابن قتیبہ قیصر روم نے اسکو کمک بھی پہنچائی تھی[1] یہ بھی ایک گٹھ جوڑ تھا بین الاقوامی سیاست کبھی بھی پھندوں سے آزاد نہیں رہی ہے بظاہر منشا یہ بھی تھا کہ عرب کے اندر اپنے اثرات بڑھائے اور ہندوستان سے خشکی کی راہ سے ہونے والی تجارت کے گذر گاہ کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لے[2]

قصی اور تعمیر مکہ

مکہ کے باشندے اس کو بے ادبی سمجھتے تھے کہ خانہ کعبہ کے قریب رات کو آرام کریں یا اللہ کے گھر کی برابر اپنا گھر بنائیں۔ ضرورت کے وقت وہ خیمے یا چھولداریاں لگا لیتے تھے مکان یہاں نہیں بناتے تھے اس لئے شہر کی آبادی کعبہ سے کچھ فاصلہ پر نشیبی حصہ میں تھی[3] کعبہ کے قریب جب آبادی نہیں تھی اور اس علاقہ (حرم) میں خود رو درخت کا کاٹنا ممنوع تھا تو قدرتی بات تھی کہ انسانوں کے بجائے درختوں کے ہجوم نے خانہ کعبہ کے احاطہ کو گھیر رکھا تھا۔ سب طرف کیکر کے درخت تھے یا بیروں کی جھاڑیاں۔ خود انسانوں کے رہنے کا علاقہ (شہر مکہ) تنگ ہو گیا تھا۔ اس کو توسیع کی ضرورت تھی۔

---

[1] واعانہ قیصر علیہا۔ معارف ابن قتیبہ صفحہ ۲۱۵ ملوک الشام [2] عہد نبوی میں نظام حکمرانی صفحہ ۳

[3] مسفلہ یہی حصہ ہے اس کے بالمقابل بلند حصہ کو "معلاۃ" کہتے تھے۔ کعبہ اسی حصہ میں تھا۔ مورخین نے مکہ اور بکہ میں یہ فرق کیا ہے کہ بکہ وہ بلند حصہ جس میں "کعبہ" ہے اور مکہ پورا شہر یا مکہ کا وہ مقابل حصہ جس میں شہر آباد تھا (معجم البلدان لفظ بکہ) اس حصہ کو بکہ اس لئے کہتے تھے کہ یہاں زائرین کا ہجوم رہتا تھا۔ نیز اس لئے کہ عقیدہ یہ تھا کہ یہ جابر اور ظالم طاقتوں کی گردن توڑ دیتا ہے۔ ج ۱ ص ۲ سیرۃ ابن ہشام)

قصی نے مکہ پر قبضہ کیا تو شہر مکہ کی تعمیر جدید کا منصوبہ بھی تیار کیا۔ اس جنگل کو صاف کرایا لوگوں کے وہم کو دُور کرنے کے لئے سب سے پہلے خود کلہاڑا چلایا۔ اور اعتراض کا جواب یہ دیا کہ ہمارا مقصد آبادی ہے۔ بربادی مقصود ہو تو بے شک درخت کاٹنے ممنوع ہیں[1]

پھر ایک نقشہ کے ساتھ مکہ کو آباد کرنا شروع کیا۔ خالی اراضی کے پلاٹ بناتے اور قریش کے ہر ایک خاندان کو ایک پلاٹ دے دیا۔ یعنی ہر قبیلہ کی الگ کالونی آباد کر دی[2]۔ انہیں کالونیوں کے محل وقوع کے لحاظ سے قریش ظواہر اور قریش بطاح کی اصطلاحیں ایجاد ہوئیں[3]

اس عقیدے کو بھی ختم کیا کہ خانہ کعبہ کے قریب مکان نہ بنائے جائیں بلکہ قریش کے کچھ خاندان یہاں آباد کئے اور کچھ خاندان شہر کے بیرونی حصہ میں! البتہ یہ ہدایت کر دی کہ کعبہ کے قریب دوسری منزل تعمیر نہ کی جائے[4]۔

اس جدید نقشہ میں خانہ کعبہ وسط میں رہا۔ خانہ کعبہ کے گرد بہت وسیع میدان چھوڑ دیا گیا۔ محلوں (کالونیوں) کے بیچ میں راستے رکھے گئے۔ یہ راستے (سڑکیں) خانہ کعبہ کے میدان پر آکر ختم ہوتے تھے۔ ان میں وہ سڑک بھی تھی جس کو "طریق ابی شیبہ" کہا جاتا تھا۔ یہ سڑک بہت وسیع اور سب سے زیادہ چالو تھی۔

---

[1] وضاق البلد وکان کثیر الشجر العضاۃ والسلم فہابت قریش قطع ذالک فی الحرم فامرھم قصی بقطعہ وقال انما تقطعونہ لمنازلکم ولخططکم وبھلۃ اللہ علی من اراد فسادًا وقطع ھو بیدہ واعوانہ ابن سعد ص۴۰ ج۱ [2] قطع قصی مکۃ ارباعًا بین قومہ فانزل کل قوم من قریش منازلھم التی اصبحوا فیھا الیوم۔ ابن سعد ص۴۰ ج۱ ابن سعد و ابن ہشام نے قبیلوں اور کالونیوں کو نام بنام بیان کیا ہے۔ ابن سعد ص۴۰ و ص۴۱ ج۱۔ سیرۃ ابن ہشام ص۹۱ ج۱ [3] ادخل قصی بطون قریش کلھا الابطح فسموا قریش البطاح واقام بنو معیص بن عامر بن لوی وبنو تیم وبنو محارب وبنو الحارث بظھر مکۃ فھؤلاء ظواھر ص۴۱ ابن سعد۔ [4] کما امریان لایرفعوا بیوتھم عن الکعبۃ فتظل مشرفۃ علیھا تاریخ مکہ احمد السباعی ص۲۲

ایک سڑک[1] باب صفا سے شروع ہو کر جنوب کی جانب باب اجیاد تک جاتی تھی اسی راستہ پر بزازہ تھا۔ سقیفہ بنی عائذہ بھی اسی راستہ پر تھا۔ اسی سڑک کے قریب وہ مکان تھا جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کرایہ پر لیا تھا۔ جب آپ نے بعثت سے پہلے سائب بن ابی سائب کی شرکت میں تجارت شروع کی تھی۔[2] آباد ہونے والوں کو اجازت دے دی کہ وہ کعبہ کے میدان میں اپنی نشست رکھیں۔ چنانچہ اسی میدان میں الگ الگ محلہ (قبیلہ) والوں کی الگ الگ مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔

دَارُ النَّدْوَہ۔ کعبہ کے سامنے قصی نے اپنا مکان بنوایا۔ اس کا صدر دروازہ کعبہ کی طرف تھا۔ اس کو قومی کاموں کیلئے عام کر دیا۔ اور دار الندوہ اس کا نام رکھا[3] (کمیٹی گھر)

مُحِبّ قوم قصیّ کا سیاسی اور مذہبی مسلک

وہی قصی جس کا بچپن یتیمی میں گذرا تھا' اس انقلاب کے بعد اپنی قوم کا سب سے بڑا شخص تھا۔ وہ گویا پوری قوم کا مالک تھا۔ جس کی عظمت دلوں کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ لوگ اس سے برکت حاصل کیا کرتے تھے[4]

قوم کے پاس پہلے سے کوئی دستور العمل یا قانون نہیں تھا تو اسی کا قول قانون ہوتا تھا اور نہ صرف زندگی میں بلکہ بقول ابن سعد اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے قول کی ایسی ہی تعظیم کی جاتی تھی جیسے کسی مذہبی حکم کی[5]۔ مگر

---

[1] بظاہر پرانی آبادی کو نئی آبادی سے طریق ابی شیبہ ملاتا تھا [2] تاریخ مکہ لاحمد السباعی ص۱۶ [3] ابن سعد ص۳۹ ج۱ سیرۃ ابن ہشام ص۹۰ ج۱ [4] تیمنت بہ ریامرہ وشرفتہ قریش وملکتہ ابن سعد ص۴۰ ج۱ تملک علی قومہ واھل مکۃ فملکوہ (ابن ہشام ص۸۰ ج۱) فحاز شرف مکہ کلہ (ابن ہشام ص۹۰ ج۱) [5] ویتبعون امرہ کالدین المتبع لا یعمل بغیرہ فی حیاتہ وبعد موتہ۔ ابن سعد ص۳۹ ج۱۔

(۱) نہایت عجیب اور دورِ حاضر کے سیاست دانوں کے لئے بہت زیادہ قابل قدر اور سبق آموز بات یہ ہے کہ اس تمام عظمت اور اقتدار کے باوجود قصی نے نہ تاج شاہی سر پر رکھا۔ نہ اپنے آپ کو بادشاہ کہلوانا پسند کیا۔ اس نے اپنے رسمی اعزاز اور اپنی وجاہت و عظمت کے مقابلہ میں قوم کی روایات اور ان کے مذاق کا احترام کیا حریت اور آزادی اس قوم کا وہ جوہر تھا جس نے کبھی بھی کسی شاہ یا شاہنشاہ کے سامنے اس قوم کی گردن نہیں جھکنے دی تھی، قصی نے تخت سلطنت اور تاج شاہی کے مقابلہ میں اس جوہر کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کی کوشش کی۔ اس سے بڑھ کر اپنی قوم کے ساتھ اخلاص کیا ہوسکتا ہے کہ اس نے دربار شاہی کے بجائے دارالندوہ تعمیر کیا اور اس کا ایسا نظام بنایا جس کے لئے جمہوری کے علاوہ اور کوئی لفظ مناسب نہیں ہوسکتا۔ جس میں فرد یا شخص کی نہیں بلکہ نظام کی تعظیم تھی اور ملوکیت یا شخصی اقتدار سے یہاں تک اجنبیت تھی کہ نہ دارالندوہ کا کوئی صدر (چیئرمین) تھا نہ اس جمہوری نظام میں صدر کا کوئی عہدہ تھا۔ بہت سے فرائض۔ پورٹ فولیو تھے۔ جو مختلف قبائل پر تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ قبیلہ کا سربراہ اس فریضہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ تفصیل آگے آئے گی۔ (انشاء اللہ)

یہ قصی کا سیاسی ذوق اور سیاسی مسلک تھا۔

(۲) سیاسی رہنما عموماً مذہب کو سیاست کی حد تک مانا کرتے ہیں قصی کا مذہب بھی تابع سیاست تھا۔ قریش میں اب تک بت پرستی عام نہیں ہوئی تھی مگر توحید پرستی کا جذبہ بھی ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ بنوخزاعہ نے جو بت اور مورتیاں خانہ کعبہ میں رکھ دی تھیں قریش نے بھی ان کو بنوخزاعہ کی نظر سے دیکھا اور قصی جیسا فاتح جس کو دین ابراہیمی کا علمبردار ہونا چاہیئے تھا۔ وہ مفتوح قوم (بنوخزاعہ) کا جانشین بن گیا۔ بقول حافظ عماد الدین ابن کثیر:۔

"بیت عتیق" "خانہ کعبہ" اس کی تحویل اور تولیت میں آگیا۔ مگر مورتیوں کی پوجا خانہ کعبہ کے گرد نئی نئی مورتیاں استھاپت کرنے، بتوں کے نام پر قربانیاں دینے اور چڑھاوا چڑھانے وغیرہ وغیرہ کی ان تمام قبیح رسموں اور بدعتوں کے ساتھ جو بنو خزاعہ۔ یہاں جاری کر چکے تھے[1]

اس وقت تقاضا سیاست یہی تھا۔ کیونکہ بنو خزاعہ کے کئی سو سال کے اقتدار نے عرب کا مذاق یہی بنا دیا تھا۔

قصی بنو خزاعہ کو شکست دے سکتا تھا۔ مگر پورے عرب سے مقابلہ کے لئے اس کو پیغمبرانہ عزم کی ضرورت تھی جس سے وہ محروم تھا۔

(۳) حج۔ جس کی ابتداء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم سے ہوئی تھی بنو خزاعہ نے اگرچہ اس میں شرک کی آمیزش کر دی تھی اور اللہ رب العالمین کے بجائے اس کا رخ غیر اللہ کی طرف پھیر دیا تھا مگر اس کی ٹیپ ٹاپ اور شان و شوکت میں فرق نہیں آنے دیا تھا۔ بنو خزاعہ نے خانہ کعبہ کی مختلف خدمات اور حج کے انتظامات مختلف قبائل کے سپرد کر رکھے تھے

قصی کی یہ فراخ حوصلگی اور دانش مندی تھی کہ اُس نے ان انتظامات کو بحال رکھا جو خدمت جس خاندان کے سپرد تھی، قصی نے اس میں تبدیلی نہیں کی۔ اس کی سیاسی مصلحت یہ ہو سکتی ہے کہ اس طرح ان تمام خاندانوں کی حمایت قصی نے حاصل کر لی اور ابن اسحاق کی رائے یہ ہے کہ

انہ کان یراہ دینا فی نفسہ لا ینبغی تغییرہ۔[2]

یعنی جن روایات کی بنا پر جو خدمت کسی خاندان کے سپرد تھی قصی خود بھی انکو ایسی روایات مانتا تھا جن میں تبدیلی جائز نہیں ہوتی۔

(۴) قصی کی طرح قصی کی قوم بھی سیاست داں تھی۔ اس نے اس رائج مذہب پر اتنی شدت سے عمل کیا کہ حُمس کہلانے لگے۔ (کٹر مذہبی)

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۲۰۲ ج۲ [2] سیرہ ابن ہشام ص۱۳۲ ج۱

شہر مکّہ کی قدیم تنظیمات

قصی سے پہلے چند نظام یا رسمی ادارے قائم تھے۔ مثلاً

(۱) ایک نظام وہ تھا جس کے ذریعہ قصی اور بنو خزاعہ کی جنگ کا خاتمہ ایک ایسے فیصلہ پر ہوا جو بظاہر یک طرفہ اور بنو خزاعہ کے حق میں نہایت سخت تھا مگر وہ فیصلہ ہوا اور وہ نافذ بھی ہوا۔ اس کا جج۔ یعمر بن عوف تھا۔

(۲) اشہر حرم۔ یعنی وہ مہینے جن میں جنگ ممنوع ہو جاتی تھی، ہتھیار باندھ کر رکھ دیئے جاتے تھے اور بطور عقیدہ ظلم و فساد کو حرام سمجھا جاتا تھا۔ ان مہینوں کے نام اگرچہ مقرر تھے[1] مگر وقت مقرر نہیں تھا۔ نام کے لحاظ سے یہ قمری مہینے ہوتے تھے مگر معاشی ضرورتیں خصوصاً حج کی ضرورت ان کو مجبور کرتی تھی کہ قمری کو شمسی سال کے سانچہ میں ڈھالتے رہیں کیونکہ زائرین اور منتظمین حج دونوں کی سہولت اس میں ہوتی تھی کہ حج کا مہینہ ایسے موسم میں ہو کہ کھجوریں پک کر ٹوٹنے لگیں[2] یہ پوری قوم کی مشترک ضرورت تھی، کبھی جنگی ضرورت کا تقاضا ہوتا تھا کہ ان مہینوں کو آگے پیچھے کر دیا جائے۔

ہندوستان میں پانڈوں کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ وہ لوند کا مہینہ بڑھاتے ہیں اور یہ طے کرتے ہیں کہ اس سال مثلاً ساون دو ہوں گے۔ عرب میں ایک مخصوص خاندان[3] تھا جس

---

[1] ماہ رجب۔ پھر تین ماہ کے بعد ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم الحرام۔ مگر رجب کے بارہ میں اختلاف تھا۔ ہم جس کو ماہ رجب مانتے ہیں جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے بیچ میں ہوتا ہے یہ مضری قبائل کا مسلّمہ رجب تھا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی اور قبائل ربیعہ رمضان کو رجب قرار دیتے تھے یعنی وہ شعبان اور شوال کے بیچ کے مہینہ کو رجب مانتے تھے۔ البدایہ والنہایہ ص ۲۰۴ ج ۲

[2] جیسے ہمارے علاقہ شمالی ہند میں گیہوں کٹنے کے موسم میں کاشتکاروں کو سہولت ہوتی ہے تو عموماً شادی بیاہ اسی موسم میں کئے جاتے ہیں۔

[3] اس کے مورث اعلیٰ کا نام حذیفہ بن عبد تھا جو قلمس کے نام سے مشہور تھا اور ظہور اسلام کے وقت اس سلسلہ کا آخری شخص ابو ثمامہ جنادہ بن عوف تھا۔ ابن ہشام ص ۲۲ و ۲۳۔ قلمّس کا جوڑ کیلنڈر سے بھی لگایا گیا ہے یعنی کیلنڈر والا۔ نظام حکمرانی ص ۴۹۔

کے لئے یہ حق پورے عرب میں تسلیم کیا جاتا تھا اور اسی کے فیصلہ پر پورے عرب میں عمل ہوتا تھا۔ اُن کو نُساۃ کہا جاتا تھا کیونکہ وہ نسی[1] (لوند کے مہینہ) کے ذمہ دار تھے۔ اس زائد مہینہ کو (کبیسہ) بھی کہا جاتا تھا جو عموماً قمری سال کے ختم پر یعنی محرم اور ذی الحجہ کے درمیان بڑھایا جاتا تھا

(۳) "حج" ایک مُرکب عبادت ہے جو ۸ ذی الحجہ سے ۱۳ ذی الحجہ تک ۵ دن میں چند مقامات پر (حرم کعبہ۔ منیٰ۔ مزدلفہ۔ عرفات۔ صفا مروہ) مختلف صورتوں میں عمل میں لائی جاتی ہے ایک ایسا مجمع جو ہزاروں سے بھی متجاوز ہو جس میں بوڑھے۔ جوان۔ عورتیں اور بچے سب ہی شامل ہوں اس انبوہِ کثیر کا ان مقامات پر پہنچنا اور وہاں کی عبادتوں یا رسومات کو پورا کرنا کسی نظم کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ایک خاندان (آل صفوان) کی یہ حیثیت تسلیم کر لی گئی تھی کہ اس کے افراد اس مجمع کی قیادت کریں گے اور تمام قبائل ان کے طے کردہ پروگرام کے پابند ہوں گے اس خاندان کے افراد کو صوفہ کہا جاتا تھا[2]

قصی نے ان تنظیمات کو باقی رکھا۔ اس کے علاوہ تقریباً ایک درجن جدید نظام قائم کئے گئے جن کی تفصیل آگے آتی ہے گی۔ مگر قریش نے صوفہ کی قیادت حج کے سلسلہ میں تسلیم نہیں کی۔ انہوں نے صوفہ کے نظام سے بغاوت بھی نہیں کی بلکہ اپنے لئے یہ طے کر لیا کہ وہ ان مقامات پر نہیں جائیں گے جہاں صوفہ کی قیادت نمایاں ہوتی تھی۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ قریش نے دعویٰ کیا کہ وہ جار اللہ ہیں (اللہ کے پڑوسی) خانہ خدا کے خاص محافظ اور خصوصی خدام۔ ان کو حج کے موقع پر حدودِ حرم سے باہر نہیں جانا چاہیئے۔ اس دعوے کی بنا پر اُن کو حج کے قواعد میں کچھ ترمیم کرنی پڑی[3] مگر اس طرح صوفہ کی قیادت سے اُنکی عظمت محفوظ ہو گئی۔

---

[1] یہ وہی نسی ہے جس کو قرآن حکیم میں زیادۃٌ فی الکفر فرمایا گیا ہے۔ ھو تاخیر بعض الاشھر الحرم الی شھر اٰخر (المفردات فی غریب القرآن)

[2] سیرۃ ابن ہشام ص۱۲۶ وص۱۲۷ ج ۱ و ابن سعد ص۳۹ ج۱ و قاموس لفظ صوف۔

[3] عرفات حدودِ حرم سے خارج ہے۔ دین ابراہیمی میں یہاں جانا بھی حج کا ایک رکن تھا مگر قریش نے اپنے حق میں اس رکن کو ختم کر دیا۔ وہ صرف مزدلفہ جاتے اور وہیں سے واپس آجاتے تھے۔ بخاری شریف ص۲۲۸ وص۶۳۶ و فتح الباری ص۴۰۳ ج۳

مکہ مکرمہ کی شہری مملکت
جدید تنظیمات
نادی۔ دارالندوہ۔ شعبے اور منصب

دیہات میں اور قصبات کے محلوں میں ایسے مکانات ہوتے ہیں جن کو چوپال کہا جاتا ہے یہ عموماً محلّہ یا گاؤں کے بڑے آدمی کی حویلی کا مردانہ حصہ ہوتا ہے جس میں گاؤں یا محلہ والوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ کوئی تقریب منائیں۔ کوئی مشاورتی اجتماع یا تفریحی مجلس کریں۔ چوپال میں وعظ کے جلسے بھی ہوتے ہیں، بیاہ شادی کی تقریبات بھی، مشاعرے اور ادبی مجلسیں بھی ہوتی ہیں اور کبھی رقص و سرود کی رنگین محفلیں بھی جمتی ہیں۔

چوپال۔ ایک بڑا ہال ہوتا ہے اور موجودہ زمانہ میں بھی۔ عموماً دیہات میں یہ ہال خام ہوتا ہے یعنی دیواریں مٹی یا کچی اینٹوں کی ہوتی ہیں اور چھت کڑیوں کی۔ بیچ میں شہتیر اور دور حاضر میں، گاڈر رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے اوپر دو طرفہ کڑیاں ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے اس کو دو کڑیہ بھی کہتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے مدینہ والے اس کو سقیفہ کہتے تھے۔ مگر مکہ معظمہ میں اس کے لئے "نادی"[1] کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

نادی (مقاصد اور فوائد) جو کام ہمارے یہاں چوپالوں میں ہوتے ہیں وہ ان اندیہ (نادیوں) میں بھی ہوا کرتے تھے اس پر مستزاد یہ کہ،

(۱) سلسلہ نسب کے بارے میں کوئی اعلان ہوتا تو وہ ان نادیوں میں کیا جاتا تھا۔[2]

---

[1] نادی۔ ندیٰ سے ماخوذ ہے۔ ندیٰ کے معنی ہیں رطوبت۔ تراوٹ اسی سے نداء بمعنی آواز بھی ماخوذ ہے کہ جس کے حلق میں تراوٹ زیادہ ہوتی ہے اس کی آواز بلند ہوتی ہے نادی۔ میں جام و سبو کی تراوٹ بھی ہوا کرتی تھی تو داد و دہش کی سیرابی بھی اور جسطرح بحث و مباحثہ میں آوازیں بلند ہوتی تھیں شعراء کے ترنم اور مغنیوں کے طرب انگیز نغمے بھی ہوتے تھے یہی مناسبتیں وجہ تسمیہ ہیں۔

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے چند سال پہلے زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) کو متبنیٰ بنایا (جس کی بعد میں ممانعت کردی گئی) تو آپ نے انہیں اندیہ (مجالس) میں جا کر اعلان فرمایا تھا جس کی تفصیل حصہ سیرت میں آئے گی،

(۲) قبیلہ میں داخل کر لینے کا ایک خاص قاعدہ اور رواج تھا۔ جس کو داخل کرتے تھے۔ وہ مولیٰ کہلاتا تھا اور جو معاہدہ اس سے ہوتا تھا اس کو "عقد موالات" کہا کرتے تھے یہ عقد موالات نادی ہی میں ہوتے تھے۔

(۳) عقد موالات کے برعکس خلع یا طرد کا اعلان بھی اسی نادی میں ہوتا تھا۔ یعنی جس کو "مولیٰ" بنایا گیا تھا۔ اگر وہ "معاہدہ" کی پابندی نہ کرتا یا اپنے عمل اور کردار میں غلط ثابت ہوتا تو اس کو قبیلہ سے خارج بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس کو "خلع" کہتے تھے (الگ کر دینا) اور طرد کا لفظ بھی اس کے لئے استعمال کرتے تھے (دھکے دے کر نکال دینا) یہ شخص خلیع[1]۔ مخلوع یا مطرود کہلاتا تھا۔

(۴) خرید و فروخت کے اہم معاملات۔ تجارتی کاروانوں کا استقبال اور ان کی روانگی کی تقریب۔

(۵) تفریحی مجلسیں۔ رات کو قصہ خوانی (مسامرہ) رقص و سرود اور سوانگ (ڈرامے) بھی نادی میں ہوا کرتے تھے۔

نظم و نسق کے لحاظ سے یہ نادی[2] قبیلہ کی ہیئت حاکمہ اور شیخ قبیلہ کی اجتماعی طاقت ہوتی تھی ہر ایک "نادی" کے ساتھ ایک علا بخی بھی ہوتا تھا۔ جس کو موذن منادی یا نقیب کہا کرتے تھے۔

دارالندوہ قبیلہ وار نظام کی طرح پورے شہر کا کوئی مرکزی نظام نہیں تھا۔ ضرورت کے وقت عام اجتماع ضرور ہو جاتے تھے۔ مگر نہ ان کا کوئی ضابطہ تھا، نہ کوئی جگہ ان کے لئے معین تھی۔ مصلح قوم "قصی" کا قابل فخر کارنامہ یہ تھا کہ اس نے شہری اجتماع کا ایک نظم اور ضابطہ مقرر کیا، اپنا مکان جو اس نے کعبہ کے شمالی میدان میں اس طرح بنایا تھا کہ اس کا دروازہ مسجد حرام کی طرف تھا، مرکزی نظام کے لئے عام کر دیا اور دارالندوہ[3] اس کا نام رکھا۔

---

[1] ملاحظہ فرمائیے بخاری شریف باب القسامہ۔ [2] فلیدع نادیہ (سورہ علق) [3] آخر میں یہ حویلی حکیم بن حزام کی ہو گئی۔ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں اس کو ایک لاکھ درہم میں فروخت کر دیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ناراض ہوئے۔ فبعت شرف قومک بمائة الف درہم (باقی بر صفحہ آئندہ)

دارالندوہ کے ضابطے ندوہ۔ کمیٹی یا مجلس کو کہتے ہیں۔ یہ کمیٹی جس کے نام پر یہ دارالندوہ تھا اس کی تشکیل کا ضابطہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔ قیاس یہ ہے کہ قبائلی مجالس (نادی) کے شیوخ اور سربراہ اس کے ارکان ہوتے تھے۔ البتہ ازرقی نے اخبار مکہ[1] میں اور ابن درید نے کتاب الاشتقاق[2] میں تصریح کی ہے کہ دارالندوہ کے اجلاس میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے جن کی عمر کم سے کم چالیس سال ہوتی تھی۔ صرف دارالندوہ کے بانی (قصی) کی اولاد اس شرط سے مستثنیٰ تھی۔[3]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) (تم نے اپنی قوم کے روایتی شرف کو ایک لاکھ درہم میں بیچ دیا۔ اس پر حکیم بن حزام نے جو جواب دیا وہ نہایت دلچسپ ہے۔ حضرت حکیم نے فرمایا۔ آج کے دور میں شرف صرف تقویٰ کا نام ہے اور میں گھاٹے میں نہیں رہا۔ میں نے زمانہ جاہلیت میں اس کو شراب کی ایک مشک کے بدلے میں حاصل کر لیا تھا اب ایک لاکھ ملے ہیں تو کیا گھاٹا ہے۔ اور میں آپ سب کو گواہ بناتا ہوں۔ کہ یہ پورا ایک لاکھ فی سبیل اللہ ہے۔ اب فرمایئے گھاٹے میں کون ہے۔ البدایہ والنہایہ ج۲ ص۲۱۸ ابن سعد نے حضرت حکیم رضی اللہ عنہ کے اس معاملہ کا ذکر نہیں کیا اس کا بیان یہ ہے کہ عبدالدار (جس کو قصی نے دارالندوہ کا متولی بنایا تھا) کے پڑپوتے عکرمہ بن عامر نے اس کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ فروخت کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو دارالامارۃ (گورنمنٹ ہاؤس) بنا دیا ص۴۵ ج۱ پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ان کے بعد دور اموی میں ولید بن عبدالملک نے پھر عباسی خلفاء نے لوگوں کے مکانات پوری پوری قیمت بلکہ پوری سے بھی زیادہ قیمت پر خریدے اور حرم شریف کی توسیع کی بالآخر ۲۸۱ھ میں خلیفہ عباسی معتضد باللہ کے حکم سے دارالندوہ حرم شریف میں داخل کر دیا گیا۔ اخبار مکہ ص ۱۱۰ و ۱۱۱ ج ۲ کہا جاتا ہے اسی جگہ "مصلی احنف" بنایا گیا جو اب ماذنہ بن گیا ہے۔ اس میں لاؤڈ سپیکر فٹ ہے اذان و تکبیر یہیں سے ہوتی ہے۔

[1] اخبار مکہ ص۱۰۱ ج۱ [2] کتاب الاشتقاق ص۹۷ ۔ [3] بعد میں اس استثناء میں توسیع کی گئی۔ چنانچہ ابوجہل کو تیس سال کی عمر ہی میں دارالندوہ کے اجلاس میں شریک کیا جانے لگا۔ لجودۃ رائیہ کتاب الاشتقاق ص۹۷ اور حکیم بن حزام کو پندرہ بیس سال کی عمر ہی میں یہ عزت حاصل ہو گئی تھی۔ تاریخ دمشق لابن عساکر جلد ۴ ص۴۱۹ سطر ۲ (بحوالہ عہد نبوی میں نظام حکمرانی از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدر آبادی)۔

اجلاس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جب ضرورت ہوتی اجلاس کر لیا جاتا تھا۔ دارالندوہ کا منتظم اجلاس کا داعی ہوتا تھا۔ صدر کوئی مقرر نہیں تھا۔

دارالندوہ میں انجام پانیوالے کام

(۱) شہر مکہ اور قوم قریش سے تعلق رکھنے والے معاملات کے متعلق مشورے اور فیصلے[1] (۲) کسی قبیلہ یا گروہ سے جنگ یا صلح کے فیصلے۔ (۳) مدافعتی تدابیر (۴) جنگ کے وقت علمبردار کا تقرر۔ (۵) تجارتی معاہدات (۶) بیرونی مہمانوں کا استقبال (۷) قصی کی شخصیت سے برکت حاصل کرنے کے لئے شادی کی تقریبات بھی یہاں ہوا کرتی تھیں (۸) قافلوں کی روانگی اور واپسی پر ان کا استقبال بھی یہاں ہوتا تھا (۹) ایک خاص رسم رائج تھی کہ جب لڑکی سن بلوغ کو پہنچ جاتی تھی تو اس کو درع پہنایا جاتا تھا (بڑا کرتا) اور چھوٹا کرتا اتروا دیا جاتا تھا۔ یہ رسم بھی یہاں انجام دی جاتی تھی[2] (۱۰) قومی ملکیت کی چیزیں بھی یہیں محفوظ کر دی جاتی تھیں[3]

مختلف شعبے اور منصب

مکہ جو صرف ایک شہر یا ایک آزاد ریاست نہیں بلکہ پورے عرب کا متبرک مرکز بھی یہی تھا جہاں عرب کا مرکزی معبد۔ کعبہ تھا۔ اس کے انتظامات کی جو صورتیں پہلے تھیں قصی نے ان کو باقی رکھا (تفصیل پہلے گذر چکی ہے) ان کے علاوہ اور بہت سے شعبے قائم کئے' ان کے منصب اور منصبدار (عہدہ دار) مقرر کئے۔ کچھ شعبے اپنے پاس رکھے۔ تفصیل یہ ہے۔

(۱) دارالندوہ۔ اس کا نظم و نسق مستقل شعبہ تھا۔ جو قصی سے متعلق تھا۔ اس کے بعد عبدالدار سے متعلق ہوا۔

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کا فیصلہ بھی یہیں کیا گیا تھا۔ [2] سیرۃ ابن ہشام ص۶۹ ج۱ ابن سعد ص۲۹ ج۱ [3] مثلاً غزوہ اُحد کی تیاری کے لئے جو تجارتی مال لایا گیا تھا کہ اس کا نفع مصارف جنگ میں صرف کیا جائے گا وہ مال یہیں جمع رکھا گیا تھا۔ (ابن ہشام وغیرہ)

(۲) مشورہ۔ یعنی مشاورتی اجتماع کا انتظام۔

(۳) حجابت۔ کلید برداری یعنی کھولنے اور بند کرنے کی ذمہ داری اور خانہ کعبہ کے اندر داخل ہونے کی اجازت دینے کا اختیار۔

(۴) سدانت۔ دربانی، کھولنے بند کرنے اور صاف رکھنے کی خدمت یہ کوئی مستقل منصب نہیں تھا۔ بلکہ منصب حجابت ہی سے متعلق تھا۔

(۵) (حرم کعبہ کا عام انتظام اور نگرانی) اس منصب کا ذمہ دار یہ نگرانی بھی رکھتا تھا کہ حرم میں شور و غل یا جھگڑا فساد نہ ہو۔

(۶) ایسار۔ بتوں سے استخارہ یعنی فال لینا۔ جس کا قاعدہ مقرر تھا۔[1]

(۷) اموال محجرہ[2]۔ خانہ کعبہ کو جو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے ان کی حفاظت کا شعبہ۔ خانہ کعبہ میں ایک پختہ گڑھا کنوئیں کی طرح تھا۔ چڑھاوے کی طلائی اور نقرئی چیزیں اس کنوئیں میں ڈالدی جاتی تھیں۔ اسی کنوئیں کے کنارہ پر صنمخانہ کعبہ کا سب سے بڑا بت ہبل تھا۔

حج سے متعلق

رفادہ۔ حجاج کے کھانے کا انتظام۔

قصی کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ جب اُس نے قریش کو مکہ میں آباد کیا تو اُن کے ذہن نشین کرایا کہ آپ محافظ اور خادم کعبہ ہیں۔ زائرین جو عرب کے کونہ کونہ سے آتے ہیں یہ آپ کے مہمان ہونے چاہئیں اور اُن کے خورد و نوش کا انتظام آپ کو کرنا چاہیئے یہ قریش کی عالی حوصلگی تھی کہ انہوں نے اس تجویز کو منظور کیا اور پھر یہ طے ہوگیا کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اس مقصد

---

[1] اس کا ماخذ میسر ہے۔ میسر کے معنی قمار اور جوا (قاموس) چھوٹے چھوٹے تیر جن کو ازلام کہا جاتا تھا وہ جوا کھیلنے کے کام میں آتے تھے انہیں کے ذریعہ فال بھی نکالا جاتا تھا۔ [2] اموال محجرہ۔ یعنی محفوظ مال۔ حجر سے ماخوذ۔ حجر کے معنے حفاظت کے بھی آتے ہیں (قاموس) یہی دولت ہے جس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا تھا کہ تقسیم کردیں مگر پھر یہ ارادہ ملتوی کردیا کیونکہ اُن کے پیش رو یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلیفۂ اوّل حضرت صدیق اکبرؓ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ بخاری شریف صفحہ ۲۱۰۔

عظیم کے لئے جمع کرادیا کریں گے۔ تجارتی مال میں یہ حصہ کم سے کم عشر (دسواں حصہ) ہوتا تھا۔ بعض باحوصلہ اس سے بھی زیادہ دے دیا کرتے تھے۔ اس تجویز کی سیاسی مصلحت یہ تھی کہ۔

(۱) عرب خزاعہ کو بھول گئے، جن سے قصی نے اقتدار چھینا تھا۔

(۲) قریش کے تسلط کو نعمت اور رحمت سمجھنے لگے۔

(۳) شہر مکہ اور حرم کعبہ میں قصی نے جو انقلاب برپا کیا تھا کہ عرب کے عقیدے کے خلاف جنگل اور درخت کٹوا کر قریشی خاندان آباد کر دیئے۔ عرب نے اس کو برداشت کیا۔ فریق مخالف (خزاعہ) جو اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے عرب کو مشتعل کر سکتے تھے، اسکے راستے بند ہو گئے۔ خطرات ختم ہو گئے۔

(۴) نہ صرف سرزمین مکہ میں بلکہ پورے عرب میں قریش کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ چنانچہ عام عرب کیلئے صرف چار ماہ حُرم تھے، جن میں اُن کو کہیں آنے جانے میں خطرہ نہیں ہوتا تھا اور قریش کے لئے پورے بارہ مہینے حرم ہو گئے۔ اس سے بسل کی اصطلاح ایجاد ہو گئی۔ یعنی باقی آٹھ ماہ کا بھی حرام ہونا۔[۲]

یہ قریش کا اعلیٰ درجہ کا تدبر تھا کہ رفادہ کے باعث انہوں نے خرچ سے زیادہ منافع کی صورتیں پیدا کر لیں اور اُن کے عظمت و احترام میں بھی چار چاند لگ گئے۔ پھر احرام کا انتظام بھی قریش نے اپنے ذمہ لے لیا۔ یعنی جب عرفات سے واپس ہو کر طواف کعبہ کریں جو ۱۰ تا ۱۲ ذی الحجہ کو ہوا کرتا تھا تو یہ طواف ان کپڑوں میں نہ ہونا چاہیئے جو سال بھر پہنے جاتے ہیں جن کو پہن کر سیکڑوں گناہ کئے جاتے ہیں۔ بلکہ اس طواف کے لئے احرام کا کپڑا قریش دیں گے اور اگر کوئی شخص کسی وجہ سے قریش کا یہ عطیہ حاصل نہ کر سکے تو وہ برہنہ بدن طواف کرے۔[۳]

---

[۱] جیسے قصی کے پوتے ہاشم۔ جس کا ذکر آگے آئے گا (انشاء اللہ) [۲] البسل ھو تحریم ثمانیۃ اشھر لھم من کل سنۃ البدایۃ والنہایۃ ص ۲۰۳ ج ۲ قد عرفت ذالک لھم العرب لا ینکرونہ ولا یدفعونہ یسیرون بہ الی ای بلاد العرب شاءوا لا یخافون منھم شیئا۔ ابن ہشام ص ۶۶ ج ۱ [۳] ابن سعد ص ۴۱ ج ۱ -

سقایہ | حجاج کے لئے پانی کا انتظام۔ یہ شعبہ بھی رفادہ کی طرح بہت اہم اور بہت کٹھن تھا۔
خزاعہ سے شکست کھا کر جب بنو جرہم مکہ سے فرار ہوتے تھے تو ان بھاگنے والوں نے "سب کچھ تباہ کر دینے" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوتے زمزم کو بھی (جو پہلے چشمہ تھا پھر یہاں کنواں بنالیا گیا تھا اور چشمہ کنویں کا سوت ہو گیا تھا جس کی وجہ سے کنوئیں کا پانی کبھی کم نہیں ہوتا تھا) نہ صرف بند کر دیا تھا بلکہ لاپتہ کر دیا تھا۔ قصی نے جب کعبہ کا حرم بنایا اور اس کے قریب قریش کو آباد کیا تو یہاں کوئی کنواں نہیں تھا تو زائرین کے لئے پانی کی سخت دشواری ہوتی تھی۔ شعبۂ سقایہ کا کام یہ تھا کہ مکہ کے مختلف محلوں میں جو کنوئیں تھے وہاں سے پانی لاتے اور حوضوں میں بھر دیتے تھے۔
زائرین صرف حرم کعبہ ہی میں نہیں رہتے تھے بلکہ عرفات اور مزدلفہ بھی جاتے تھے اور منیٰ میں تو کئی روز تک جشن رہا کرتا تھا۔ پانی کا انتظام سب جگہ کیا جاتا تھا۔ واٹر پروف کی قسم کی کوئی چیز اس وقت نہیں تھی البتہ چمڑہ ان کے یہاں ہوتا تھا۔ جو حبش وغیرہ بھی بھیجا جاتا تھا۔ بڑے بڑے حوض چمڑے ہی کے بنائے جاتے تھے۔ یہ سب انتظام شعبۂ سقایہ سے متعلق تھا۔
وقادہ[1] : ۹ ذی الحجہ کی شام کو حاجی۔ عرفات سے روانہ ہو کر مزدلفہ پہنچتے ہیں۔ رات کو مزدلفہ میں قیام رہتا ہے۔ صبح کو وہاں سے منیٰ آتے ہیں۔ یہی دستور زمانہ جاہلیت میں تھا یہ رات اگرچہ چاندنی ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی قصی نے یہ انتظام کیا تھا کہ مزدلفہ کے ٹیلوں پر آگ جلائی جاتی تھی۔ جس سے میدانِ مزدلفہ روشن رہتا تھا اور آنے والوں کو سہولت ہوتی تھی[2]۔ اس کو وقادہ کہا جاتا تھا۔
اجازہ یا افاضہ : روانگی کا پروگرام بنانا۔ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ اختیار "صوفہ" کو حاصل تھا کہ وہ طے کیا کرتے تھے کہ مثلاً عرفات سے کونسا قبیلہ پہلے اور کونسا بعد کو روانہ ہوگا

---

[1] ابن سعد ص ۴۱ ج ۱ [2] وقادۃ۔ آگ روشن کرنا بمعنے وقود۔ [3] ابن سعد ص ۴۱ ج ۱ -

قبۃ: حج کے موقعہ پر ہر ایک قبیلہ کا قیامگاہ (پڑاؤ) الگ ہوتا تھا جس کو منزل کہا جاتا تھا۔ کمبلوں کے خیمے ہوتے تھے۔ مگر قریش کے خیمے سرخ چمڑے کے ہوتے تھے۔ ایسے خیمہ کو قبہ کہا جاتا تھا (جمع قباب[1]) اُن کے انتظام کا ایک شعبہ تھا اُس کو قبہ ہی کہتے تھے۔

عدالت اور فصل خصومات

حکومت۔ عام مقدمات کی سماعت اور فیصلہ اس شعبہ سے متعلق تھا۔

اشناق: قتل کے سلسلہ میں بعض صورتیں ایسی ہوتی تھیں۔ جن میں دیت واجب ہوتی تھی۔ دیت کی ایسی صورت ہوتی تھی کہ اس کو اجتماعی جرمانہ کہا جا سکتا ہے پوری دیت کے سو[2] اونٹ ہوتے تھے جو مقتول کے وارثوں کو دیئے جاتے تھے۔ مگر یہ اونٹ قاتل نہیں دیتا تھا۔ بلکہ اس کی ادائیگی عاقلہ کے ذمہ ہوتی تھی۔ یعنی وہ سوسائٹی جس میں یہ رہتا تھا پھر قبائل کے جو معاہدات ہوتے تھے ان میں ایک دفعہ یہ بھی ہوتی تھی کہ اگر کسی قبیلہ پر دیت ادا کرنی لازم ہو تو اس کا اتنا حصہ وہ قبیلہ ادا کرے گا اور اتنا حصہ اسکا حلیف (معاہد قبیلہ) ادا کریگا پھر اگر جان ہلاک ہوئی ہے تو پوری دیت لازم ہوتی تھی اور اگر ناک۔ کان یا کوئی عضو کاٹ دیا ہے تو بعض صورتوں میں پوری دیت اور بعض صورتوں میں دیت کا ایک حصہ لازم ہوتا تھا۔ چونکہ اسلام نے بھی دیت کے طریقہ کو (جزوی اصلاحات کے بعد باقی رکھا) تو اس کے احکام کتب فقہ میں بھی ہیں۔ بہر حال قتل و دیت کے مقدمات نہایت اہم ہوتے تھے اور ان میں فیصلہ طلب امور یہ ہوتے تھے کہ پوری دیت لازم ہوتی ہے یا دیت کا جزو۔ اور جو بھی صورت ہو اس کی ادائیگی صرف قاتل کے قبیلہ اور اس کے عاقلہ پر لازم ہوگی یا اس قبیلہ کے

---

[1] کانوا اهل القباب الحمر
[2] پہلے ایک انسان کی دیت دس اونٹ ہوا کرتی تھی جب عبد المطلب کی منت ماننے کے مشہور واقعہ میں عبد اللہ کے فدیہ میں سو اونٹ پر قرعہ نکلا اور عبد المطلب نے عبد اللہ کے فدیہ میں سو اونٹ ذبح کئے تب سے ایک انسان کی دیت سو اونٹ قرار دیگئی۔ جس کو اسلام نے بھی باقی رکھا۔ ابن سعد ج ۱ ص ۵۴

حلیف قبائل پر بھی۔ اور اگر حلیفوں پر بھی لازم ہوتی ہے تو بڑے معاہدہ کتنی۔ اور اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی اس شعبہ کا نام (جس کے ذریعہ ان مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا تھا) اشناق[1] تھا اور اس کا ذمہ دار وہی ہو سکتا تھا جو اونچے درجہ کا معاملہ فہم ہو اور صحیح فیصلہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اسلام سے پہلے یہ شعبہ ابوبکر بن قحافہ کے سپرد تھا۔ جن کو اسلام نے صدیق اکبر کا خطاب دیا۔ "رضی اللہ عنہ۔"

فوجی نظام

غیر موزوں نہ ہوگا۔ اگر یہاں "بے ضابطہ فوج" کا لفظ استعمال کیا جائے۔ بے ضابطہ "فوج" سے مراد قبائل کے وہ جنگجو ہیں جو کسی بھی مقابلہ کے وقت میدان میں آجاتے تھے۔ ان کے اسلحہ[2] خود اپنے ہوتے تھے۔ ان کا کوئی کمانڈر مستقل نہیں ہوتا تھا۔ اس کا انتخاب[3] وقت پر ہوتا تھا۔ ہر قبیلہ کا جھنڈا الگ ہوتا تھا اس کو لِوا کہا جاتا تھا اور ایک عَلَم[4] پوری فوج کا ہوتا تھا اس کو عقاب کہتے تھے۔ پوری فوج کے سالار اعظم کو قائد اس منصب کو قیادت[5] اور اس کے کیمپ کو قبہ کہا کرتے تھے۔ خاص خاص رسموں کے ساتھ یہ عہدے اور جھنڈے سپرد کئے جاتے تھے۔ سپرد کرنے والے بھی خاص سردار ہوتے تھے۔

قسمیں: فوج کی چند قسمیں ہوتی تھیں: تیر انداز[1]۔ رُماۃ جمع رامی۔ پیادہ[2] رجالہ۔ سوار[3]۔ خیل

---

[1] اشناق شنق سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں جزو دیت اور زکوٰۃ کے جو نصاب اسلام نے مقرر کئے ہیں تو دو نصابوں کے درمیان جو کسر ہوتی ہے اس کو بھی شنق کہا جاتا ہے۔ مثلاً چالیس بکریوں پر ایک بکری زکوٰۃ میں ادا کرنی ہوتی ہے اور ایک سو بیس پر دو بکریاں۔ تو چالیس سے زائد اور ایک سو بیس سے کم تعداد شنق ہوتی۔ [2] تلوار۔ نیزہ تیر اور حفاظت کے لئے ڈھال، ذرہ (درع) اور خود (بیضہ) خود کے آہنی جھالر جن سے گردن کی حفاظت ہوتی تھی۔ مغفر کہلاتے تھے۔ [3] یہ عموماً قرعہ کے ذریعہ ہوتا تھا۔ قبائل کے سردار امیدوار ہوتے تھے۔ جنگ فجار کے موقع پر حضرت عباس کا نام نکل آیا۔ یہ اس وقت بچے تھے تو ان کو ایک ڈھال پر بٹھا کر لے گئے

العقد الفرید صفحہ ۲۶/۳ ج ۳۔ [4] اخبار مکہ والعقد الفرید۔

سوار فوج کے لیئے اعنہ[1] کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔

فتح کے وقت لوٹ کے مال کو غنیمت کہا جاتا تھا۔ اس کا اتنا نظام تسلیم شدہ تھا کہ ایک چوتھائی قائدِ فوج یا سردار اعظم کا ہوتا تھا۔ اس چوتھائی کو مرباع کہتے تھے (چوتھ[2]) باقی تین حصے مختلف طریقوں سے تقسیم کیئے جاتے تھے[3]۔

اس خاکہ کے بموجب فوج کے منصب دار یہ ہوتے تھے:

(۱) قائد اعظم (۲) علمبردار جس کے پاس عقاب رہتا تھا (۳) کیمپ، یعنی قبہ کا منتظم اور محافظ (۴) سوار فوج کا سردار۔ صاحب اعنہ۔ اس کو مختصر کر کے اعنہ کہتے تھے۔

باضابطہ فوج یا پولیس قریش نے حفاظتی مقاصد کے لئے ایک مستقل نظام بھی بنایا تھا اس کو قائم کہتے تھے۔ مگر اس کی حیثیت تنخواہ دار پولیس کی تھی۔

لڑائیوں کے وقت قبائل کے جنگجو بھی اپنے مفاخر کے ترانے گاتے ہوئے میدان میں آیا کرتے تھے اور مقابلہ بھی ان سے کرتے تھے جو اُن کے ہمسر ہوتے تھے۔ غزوۂ بدر میں سرداران قریش نے انصاری مجاہدین کو مقابلہ پہ دیکھا تو لڑنے سے انکار کر دیا۔ کہ یہ کاشت کار اور کسان ہیں۔ قریش کے ہم پلہ نہیں ہیں۔ یہ بھی ایک ضابطہ تھا۔

---

[1] عنہ و عنان کی جمع ہے۔ عنان یعنی باگ۔

[2] عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان بھی چوتھ سے نا آشنا نہ تھا۔ شیواجی عالمگیر سے اس پر لڑتا رہا کہ وہ چوتھ مانگتا تھا۔ یعنی یہ کہ عالمگیر یہ تسلیم کرے کہ شیواجی کو اپنے میں چوتھ حاصل کرنے کا حق ہو گا۔ سلطان عالمگیر اس کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

[3] عموماً تین چوتھائی باقی ساتھیوں پر۔ اگر کچھ مال دشمن کی شکست اور عام لوٹ سے پہلے مل جاتا تھا۔ اس کو نشیطہ کہا جاتا تھا۔ "فضول" سے مراد ناقابلِ تقسیم کسرات ہوتے تھے اور صفی کسی ایسی منتخب چیز کو کہتے تھے۔ جو مہم کا سردار اپنے لئے منتخب کر لیا کرتا تھا۔ مثلاً کوئی تلوار یا کوئی گھوڑا وغیرہ۔ سردار کو اس انتخاب کا حق ہوتا تھا۔

تقسیم مناصب[1] جب آفتاب اسلام طلوع ہوا تو مناصب کی تقسیم اس طرح تھی

شعبے	نمبر شمار	منصب	خدمات و فرائض	قبیلہ	منصب دار
نظم وحفاظت کعبہ مکرمہ	۱	حجابہ وسدانہ	خانہ کعبہ کی کلید برداری	بنو عثمان بن عبداللہ بن قصی	عثمان بن طلحہ
	۲	عمارت	حرم کعبہ کا عام انتظام اور نگرانی	"	"
	۳	الیسار	فال نکالنے کی خدمت جس کا قاعدہ مقرر تھا	بنو جمح	صفوان بن امیہ
	۴	اموال محجرہ	بتوں کے نام پر حاصل شدہ نذرانوں کی حفاظت اور ان کا انتظام	بنو سہم	حارث بن قیس
حج اور ضروریات حجاج	۵	سقایہ	حاجیوں کے لئے پانی کا انتظام	بنو ہاشم	ابو طالب
	۶	رفادہ	حاجیوں کیلئے کھانے اور احرام کے کپڑوں کا انتظام	"	"
	۷	اجازہ یا افاضہ	عرفات سے واپسی میں ترتیب قائم کرنا	صوفہ	"
	۸	وقادہ	مزدلفہ میں روشنی کا انتظام	بنو عبد مناف	
	۹	نسی	لوند کا مہینہ معین کرنا	صوفہ	ابو ثمامہ جنادہ بن عوف
	۱۰	قبہ	حج کے موقع پر قبائل کے لئے قیام گاہوں نیز جنگ کے وقت خیموں اور خرگاہوں کا انتظام		
عدل وانصاف اور اجتماعی امور	۱۱	ندوہ	سماعت مقدمات اور دعوت وغیرہ کی تقریبات کا انتظام	بنو عبدالدار	عثمان بن طلحہ
	۱۲	مشورہ	اہم امور میں مجلس مشاورت کا انتظام	بنو اسد	یزید بن زمعہ
	۱۳	اشناق	خون بہا۔ جرمانہ اور مالی تاوان کا فیصلہ اور نظم	بنو تیم	ابو بکر (الصدیق)
	۱۴	حکومت	مقدمات کی سماعت و فیصلہ	بنو سہم	حارث بن قیس
فوج و جنگ	۱۵	قیادت	فوجوں کی کمانداری	بنو امیہ	ابو سفیان بن حرب
	۱۶	لواء	علم برداری	بنو عبدالدار	
	۱۷	اعنہ	سواروں کے رسالہ کی سپہ سالاری	بنو مخزوم	خالد بن الولید
امور خارجہ	۱۸	سفارت	دوسرے ملک یا دوسرے فریق جنگ سے جنگ یا صلح کی گفتگو اور پیغام رسانی	بنو عدی	عمر فاروق رض

[1] ماخوذ از طبقات ابن سعد ج ۱ - اخبار مکہ - العقد الفرید و سیرۃ ابن ہشام ج ۱

قصی کے جانشین

کشمکش۔ احلاف مطیبین و احلاف لعقۃ الدم اور مفاہمت

قصی کہا کرتا تھا میرے چار لڑکے ہوئے۔ دو کے نام میں نے اپنے دیوتاؤں کے نام پر رکھے۔ عبد مناف اور عبد العزیٰ۔ ایک کا نام دار کے نام پر عبد الدار اور ایک کا نام عبد القصی رکھا۔ عبد القصی کو عبد بن قصی بھی کہتے تھے۔ دو لڑکیاں تھیں۔ تخمر۔ برہ[1]۔

عبد الدار سب سے بڑا تھا۔ باپ کی خدمت میں رہتا تھا۔ کچھ کرتا کراتا نہیں تھا اور لڑکوں نے باپ سے الگ ہو کر اپنا اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔

قُصَیّ نے اپنے بعد عبد الدار کو جانشین کر دیا اور جو شعبے قصی کے پاس تھے وہ سب عبد الدار کے حوالے کر دیئے۔

ممکن ہے قصی کا منشا یہ ہو کہ باپ کے بعد سب سے بڑے بیٹے کی جانشینی کا قاعدہ رائج کر دے۔ مگر اس کا یہ منشاء پورا نہ ہو سکا۔ بیشک قصی کے بیٹے باپ کے فیصلے کے پابند رہے مگر پوتوں کا دور آیا تو یہ بحث شروع ہو گئی کہ ان سب شعبوں پر ایک بیٹے کی اولاد کا قبضہ کیوں رہے جبکہ دادا کے سب پوتے استحقاق میں برابر ہیں اور قابلیت اور صلاحیت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ اب قصی کے پوتوں کی دو پارٹیاں ہو گئیں اور ہر ایک کے ساتھ اور قبیلے بھی ہو گئے۔

اولاد عبد الدار کے حامی بنو مخزوم۔ بنو سلیم۔ بنو جمح۔ بنو عدی۔ اور اولاد عبد المناف کے حمایتی۔ بنو اسد۔ بنو زہرہ۔ بنو تیم۔ بنو الحارث۔

ہر ایک فریق کے حامیوں نے حلف اٹھائے اور عہد کئے۔ عبد مناف کے لڑکوں نے ایک طشت یا تسلے میں عطر بھر کر خانہ کعبہ کے سامنے رکھ دیا۔ ان کے تمام حامیوں نے عطر میں ہاتھ ڈال کر عہد کیا۔

---

[1] ابن سعد ص ۳۹ ج ۱۔

ہم نہ مدد چھوڑیں گے نہ کسی ساتھی کو دشمن کے حوالے کریں گے
جب تک سمندر میں یہ صلاحیت باقی ہے کہ وہ اُون کو بھگو سکے

حلف کے وقت کسی مقدس کتاب کو ہاتھ میں لینے کے بجائے وہ خانۂ کعبہ کی دیوار پر ہاتھ رکھتے تھے اور عہد کے الفاظ ادا کرتے تھے۔ چونکہ انہوں نے عہد کے وقت خوشبو سے کام لیا تھا تو ان کو "مطیبین" کہا گیا۔

عبدالدار کے لڑکوں نے عطر کے بجائے تسلے میں خون بھرا اور اسی طرح حلف لیا خون کی نسبت سے ان کو "احلاف لعقۃ الدم" کہا گیا۔ لیکن یہ تیاریاں تیاری کی حد سے آگے نہ بڑھیں، کیونکہ بااثر امن پسند سرداروں نے بیچ میں پڑ کر طے کرا دیا کہ جنگ کے بجائے گفت و شنید سے معاملات طے کئے جائیں اور یہ شعبے دونوں ٹولیوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ چنانچہ باہمی گفتگو سے شعبوں کی تقسیم اس طرح کر دی گئی کہ:[۱]

بنو عبد مناف کو رفادہ اور سقایہ دے دیا گیا اور باقی شعبے بنو عبدالدار کے پاس باقی رکھے گئے۔

قیادت اس تقسیم میں قیادت کا ذکر نہیں ہے لیکن مؤرخ علامہ ازرقی کا بیان ہے کہ منصب قیادت بھی عبد مناف کے حوالہ کیا گیا۔ عبد مناف کے بعد اس کا بیٹا عبد شمس۔ عبد شمس کے بعد اس کا بیٹا اُمیّہ۔ اس کے بعد حرب بن امیہ اس منصب پر فائز ہوا۔ قریش کی سب سے زیادہ مشہور لڑائیوں میں قائد حرب بن امیہ ہی رہا۔ پہلے جنگ "ذات نکیف" میں قیادت کی جو قریش اور بنی بکر کے درمیان ہوئی تھی۔ اطرافِ مکہ کے دو اعرابی جن کو احابیش کہا جاتا تھا اس وقت بنو بکر کے ساتھ تھے۔ (غزوہ حدیبیہ کے موقع پر قریش نے انکو اپنے ساتھ ملا لیا تھا (بخاری باب غزوۃ الحدیبیہ صنّ۶) پھر قریش اور قیس غیلان کی جنگ میں جو یوم عکاظ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد پہلی اور دوسری جنگ فجار میں حرب بن امیہ ہی قائد رہا۔ حرب کے بعد اس کا بیٹا ابوسفیان قائد بنایا گیا۔ غزوۂ بدر کے موقع پر یہ مکہ میں نہیں تھا۔ اس لئے عتبہ بن ربیعہ قائد بنایا گیا۔ مگر اس کے بعد جنگ احد اور جنگ احزاب میں قائد اعظم یہی ابوسفیان

---

[۱] ابن سعد صہ۴۴ ابن ہشام صہ۴۳ البدایہ والنہایہ صہ۲۰۹/۲۔

تھا۔ (اخبار مکہ ص۱۱۵ ج ۱)

عبد مناف کے بلند حوصلہ فرزند فرزندانِ عبد مناف کی حوصلہ مندی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان چار بھائیوں میں سے صرف عبد شمس مکہ میں مرا۔ باقی ہاشم کا انتقال شام کے علاقہ "غزہ" میں ہوا مطلب کا انتقال یمن کے علاقہ "ردان" میں اور نوفل کی وفات "سلمان" میں ہوئی جو عراق میں تھا[1]

کارنامہ۔ قصیؔ نے اگرچہ بادشاہت کا دعویٰ نہیں کیا مگر قریش پر اور قریش کے ذریعہ پورے عرب پر اس کا اقتدار کسی بادشاہ سے کم نہیں تھا۔ اور اس لحاظ سے اس کی اولاد کی حیثیت وہی تھی جو شاہزادوں اور راج کماروں کی ہوا کرتی تھی۔

عبد مناف کی اولاد نے اپنی شخصیت اور اپنی اس حیثیت کو پہچانا اور اس سے کام لیا۔ چنانچہ انہوں نے پڑوسی ممالک کے بادشاہوں اور شاہنشاہوں سے تعلقات پیدا کئے اور ان کو بڑھایا اور قابلِ قدر بات یہ ہے کہ ان تعلقات کے فوائد کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ ان تعلقات سے کام لے کر اپنی قوم کے لئے تجارتی مراعات اور سفروں میں آسانیاں پیدا کیں۔ چنانچہ مطلب نے جو سب سے بڑا تھا شاہ حبش نجاشی اور یمن کے ملوک (ملوک حمیر) سے ہاشمؓ نے بازنطینی شہنشاہ ہرقل سے اور نوفل نے شہنشاہِ ایران "کسریٰ" سے اپنی قوم کے لئے آزاد تجارت کے فرامین حاصل کر لئے کہ قریشی تاجر جو اُن کے ملکوں میں جائیں گے۔ اُن سے کوئی محصول یا ٹیکس نہیں لیا جائے گا[3]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص۱۰۶ ج ۱ [2] عبد شمس کے کسی کارنامہ کا تذکرہ نہیں ہے یہاں ایک تاریخی لطیفہ قابلِ تذکرہ ہے کہتے ہیں ہاشم اور عبد شمس جڑواں پیدا ہوئے تھے اس طرح کہ ہاشم کا پیر عبد شمس کے سر سے چپکا ہوا تھا۔ اس کو الگ کیا گیا تو خون نکلا۔ اس پر اس زمانہ میں لوگوں نے کہا تھا کہ ان کی اولاد میں آپس میں خونریزی ہوگی۔ بنو عباس اور بنو امیہ کی جنگ جو ۱۳۲ھ میں ہوئی جس نے بنو اُمیّہ (اولادِ عبد شمس) کو نہ صرف عرب، بلکہ ایشیا سے بھی باہر نکال دیا۔ اس کو اس پیشین گوئی کا مصداق کہا جا سکتا ہے۔ البدایۃ النہایہ ص۲۵۳ ج ۲ [3] طبقات ابن سعد ص۴۳ ج ۱ البدایۃ النہایہ ص۲۵۳ ج ۲۔

ظاہر ہے تجارت پیشہ قوم کے لئے اس سے بڑی نعمت کیا ہو سکتی ہے۔ اسی لئے اُن کو "مُجِیْرُون" کہا جاتا تھا[1]

بلند حوصلہ ہاشم بن عبدِ مناف

رفادہ اور سقایہ۔ سب سے اہم شعبے تھے جن کے لئے دولت کی ضرورت بھی تھی اور محنت کی بھی۔ یہ اگرچہ عبد مناف کے چاروں بیٹوں کے سپرد ہوتے تھے مگر ان میں پیش پیش ہاشم رہا۔ یہ سب بھائیوں میں سب سے زیادہ بلند حوصلہ۔ باسلیقہ۔ صاحب الرائے اور سادی تھا۔ رفادہ اور سقایہ کو جس قدر رقم کی ضرورت تھی ہاشم کا حوصلہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا۔

پہلے گذر چکا ہے قصی نے قریش کو سمجھایا تھا کہ زائرین (جو حج کو آتے ہیں) وہ قریش کے مہمان ہونے چاہئیں۔ قریش نے اس فلسفہ کو بخوشی تسلیم کر کے ایک ٹیکس بھی مقرر کر لیا تھا جس کو ہر ایک امیر و غریب اپنے اپنے حوصلہ اور ہمت کے بموجب عقیدتمندی سے ادا کیا کرتا تھا۔ بعض بعض عطیے سو سو "مثقال[2] ہرقلی" کے ہوتے تھے۔ مگر ہاشم کے عطیے کی کوئی حد نہیں تھی' جو کچھ کمی رہتی وہ اپنی جیب سے پوری کیا کرتا تھا۔

اب تک رفادہ کے سلسلہ میں کھجور دیئے جاتے تھے جو عرب خصوصاً بدوؤں کی عام غذا تھی۔ اور رفادہ کے اس فیض سے ضرورت مند ہی فیضیاب ہوتے تھے۔ مگر ہاشم نے رفادہ کو پُر تکلف دعوت کی صورت دے دی۔ ہر ایک حاجی مدعو ہوتا تھا اور عرب کا سب سے بڑھیا کھانا یعنی "ثرید[3]" پیش کیا جاتا تھا۔

ثرید کبھی گوشت کا ہوتا تھا، یعنی قورمے میں چوری ہوئی روٹی اور کبھی روٹی گھی میں

---

[1] طبقات ابن سعد ص۴۳ ج۱، البدایۃ النہایہ ص۲۵۳ ج۲ [2] ایک مثقال ساڑھے چار ماشہ کا سو مثقال ۳۸ تولہ آٹھ ماشے کے تقریباً ۳۹ تولہ سونا۔ [3] کسی کھانے کے اجزاء ترکیبی بتا دینے سے کھانے کی پوری صفت سامنے نہیں آتی مثلاً بریانی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ایک کھانا ہے گوشت کی یخنی پکا کر اس میں چاول (باقی برصفحہ آئندہ)

پچوری جاتی تھی اور گھی روٹی کا ثرید پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ شربت۔ ستو۔ کھجور وغیرہ دعوتوں کا یہ سلسلہ، ذی الحجہ (یوم الترویہ سے ایک دن پہلے سے شروع ہو کر ۱۴ تک رہتا تھا۔ عرفات منیٰ و مزدلفہ جہاں جہاں حاجی جاتے تھے۔ یہ دعوتیں ہوتی تھیں[۱]۔ ہاشم کا ذریعہ آمدنی تجارت تھی۔ شہنشاہِ روم (ہرقل) سے تعلقات بہت اچھے تھے ایسے ہی شاہانِ ایران و یمن اور حبش سے تعلقات تھے۔ اس نے ان تمام فرامین کی تجدید کرائی جو پہلے ہو چکے تھے اور رحلۃ الشتاء والصیف کا طریقہ اسی نے ایجاد کیا کہ قریش کا تجارتی قافلہ سردیوں میں یمن اور حبش جاتا تھا اور گرمیوں میں شام سے غزہ تک اور کبھی انقرہ تک پہنچ جاتا تھا۔ یہاں کے بادشاہ اور امراء ان قافلوں کا اعزاز کرتے تھے[۲]۔

وجہ خطاب کہتے ہیں اصل نام عمرو تھا۔ ہاشم خطاب تھا۔ اس خطاب کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ قحط کے زمانہ میں جب مکہ میں غلہ کا نام و نشان نہیں رہا تھا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: ڈال دیتے ہیں اس سے بریانی کی پوری صفت سامنے نہیں آتی یہی صورت ثرید کی ہے اگرچہ اس کی حقیقت یہی ہے کہ شوربے میں روٹی ڈالی جاتی ہے۔ مگر شوربا اس طرح بنایا جاتا ہے اور پھر روٹی کے ٹکڑے اس میں اس طرح ڈالے جاتے ہیں اور اس طرح پکائے جاتے ہیں کہ نہایت لذیذ اور زود ہضم کھانا ہو جاتا ہے۔

[۱] ابن سعد ص۴۵ ج۱ وکان یطعمهم اول مایطعم قبل یوم الترویة بیوم بمکة و بمنی و جمع وعرفة وکان یثرد لهم الخبز واللحم والخبز والسمن والسویق والتمر ابن سعد ص۴۵ ج۱

[۲] ابن اسحاق کی شہادت یہ ہے کہ دعوتوں کا یہ طریقہ جو ہاشم نے جاری کیا تھا آج تک قائم ہے۔ چنانچہ سلطان کی طرف سے منیٰ میں دعوت ہوتی ہے ص۲۵۳ ج۱ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ابن اسحاق کے زمانہ کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا البدایہ والنہایہ ص۲ ج۱۔ ازرقی کی شہادت یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو انتظام حج کے لئے بھیجا۔ تو حجاج کے مصارف طعام کے لئے بھی آپ نے حضرت ابوبکر کو رقم عنایت فرمائی۔ اخبار مکہ ص۱۱۲ ج۱ [۳] ابن سعد ص۴۳ ج۱۔

تو ہاشم شام گیا اور وہاں سے سیکڑوں من "کیک" بوروں میں بھروا کر لے آیا۔ واپس آکر جن اونٹوں پر وہ کیک لایا تھا، ان کو ذبح کراکر قورما بنوایا اور کیک اس میں چور کر ان کو باقاعدہ ثرید کی طرح پکا کر تمام مکہ والوں کو بڑی افراط سے ثرید کھلایا۔ تب سے ہاشم خطاب ہو گیا۔ یعنی روٹی چور کر کھلانے والا۔ ہشم کے معنیٰ ہیں چور نا[1]

کہتے ہیں ہاشم کے برادر زادہ امیہ بن عبد شمس نے بھی ہاشم کی طرح نام پیدا کرنا چاہا مگر وہ بے چارہ حوصلہ سے محروم تھا۔ لہٰذا مقابلہ میں تو شکست کھائی البتہ اس نے ایک عناد دل میں ضرور بٹھالیا۔ یہیں سے بنو ہاشم اور بنو امیہ میں مخالفت کا آغاز ہوا[2]

شیبہ عرف عبدالمطلب بن ہاشم

ہاشم کا زیادہ وقت سفروں میں گذرتا تھا۔ ایک مرتبہ شام جا رہا تھا۔ راستہ میں یثرب میں قیام ہوا (جس نے بعد میں مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے غیر فانی شہرت پائی) وہاں ایک میلہ لگ رہا تھا۔ ہاشم نے بھی اس میلہ سے فائدہ اٹھایا۔ میلہ میں ایک عورت کو دیکھا بڑے اچھے موقع پر اس کی بہت بڑی دوکان تھی وہ تمام کام کی نگرانی نہایت ہوشیاری اور سلیقہ مندی سے خود کر رہی تھی۔ شریف عورت صاحب جمال۔ اس کی سلیقہ مندی اور سمجھ بوجھ سے ہاشم متاثر ہوئے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قبیلہ نجار کی یہ خاتون ہے سلمیٰ نام ہے (بنت عمرو بن زید) شوہر کا نام اُحیحہ تھا۔ اس سے چھوٹ چھٹا ہو چکا ہے۔ اب اگر کوئی نکاح کا پیغام بھیجتا ہے تو یہ شرط لگاتی ہے کہ اس کو طلاق کا اختیار ہوگا، وہ جب چاہے گی جدا ہو جائیگی۔ اس عورت سے ہاشم اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ انہوں نے بھی اپنا پیغام بھیج دیا۔ سلمیٰ، واقعی ہوشیار تھی۔ وہ ہاشم بن عبد مناف کو جانتی تھی کہ قریش کا نگ ہے مکہ کا بے تاج بادشاہ، پورے عرب میں اس کا طوطی بول رہا ہے۔

---

[1] ابن سعد ص ۴۲ ج ۱ [2] ابن سعد ص ۴۴ ج ۱ -

سلمیٰ نے یہ رشتہ منظور کر لیا۔ نکاح ہوا۔ ہاشم نے شاندار ولیمہ کیا۔ کچھ عرصہ مدینہ میں قیام کیا، پھر وہ شام روانہ ہو گیا۔ ہاشم کا اسی سفر میں بمقام غزہ انتقال ہو گیا۔ وہیں اس کو دفن کر دیا گیا یہاں سلمیٰ کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ سر کے بال سفید تھے۔ اس لئے اس کا نام "شیبہ" رکھا گیا۔

ہاشم نے اپنے بھائی مطلب کو اپنی اولاد کی نگرانی کی وصیت کی تھی مطلب نے بھائی کی وصیت کا پورا خیال رکھا[۱]۔ وہ مدینہ آیا۔ شیبہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ اس نے شیبہ کو مکہ لے جانا چاہا۔ اولاً ماں اور ماموں راضی نہیں ہوئے، سختی سے انکار کیا۔ مگر جب مطلب نے ان کو سمجھایا کہ یثرب میں اس بچّہ کی زندگی خراب ہو گی۔ یہاں ترقی کا موقع نہیں ملے گا۔ مکہ میں اپنے خاندان کی بڑی عزت ہے۔ ہاشم کے قدردان بھی ابھی موجود ہیں، وہاں شیبہ کو ترقی کا موقع ملے گا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے شیبہ کو مطلب کے حوالے کر دیا۔

مطلب نے شیبہ کو اپنے ہی اونٹ پر پیچھے بٹھا لیا، اسی صورت سے وہ مکہ میں داخل ہوا لوگوں نے سمجھا کہ یہ غلام ہے مطلب خرید کر لاتے ہیں تو اس کو عبدالمطلب کہنا شروع کر دیا مطلب نے بتایا کہ غلام نہیں برادر زادہ ہے مگر عبدالمطلب کا لفظ چل چکا تھا یہ ایسا چلا کہ یہی نام ہو گیا مطلب ہاشم سے بڑے تھے۔ ہاشم کے بعد رفادہ اور سقایہ انہیں کے سپرد رہا۔ مگر یہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے۔ کچھ دنوں بعد یمن گئے وہیں "ردمان" میں ان کا انتقال[۲] ہو گیا۔

مطلب کے بعد عبدالمطلب جانشین ہوئے۔ یہ ان کی خداداد صلاحیت تھی کہ ہاشم کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور چند کام ایسے کئے جن سے نہ صرف قریش یا عرب کی تاریخ متاثر ہوئی بلکہ تاریخ اسلام بھی ان سے متاثر ہے۔ مثلاً،

(۱) چاہ زمزم کی برآمدگی (۲) خزاعہ سے معاہدہ (۳) دیت کے اونٹوں کی تعداد

---

[۱] یہی تعلق تھا جس کی بنا پر ہاشم اور مطلب کی اولاد میں اتحاد رہا۔ کانوا کید واحدۃ اور ان کے بالمقابل عبد شمس اور نوفل کی اولاد ایک ہاتھ کی انگلیوں کی طرح متحد رہی۔ ابن سعد ص ۴۶۔

[۲] ابن سعد ص ۴۵-۴۶ ج ۱، ابن ہشام ص ۷۸ ج ۱۔

ہیں اضافہ (۴) اصحاب فیل کے واقعہ میں اہل مکہ کو محفوظ کر لینا۔ جس کا ذکر "قریش کے ہمہ گیر اثر و رسوخ" کے سلسلہ میں آگے آئے گا (انشاء اللہ)

چاہ زمزم کا ظہور زمزم جو ایک چشمہ تھا۔ جب آبادی کی سطح بلند ہونے لگی تو "بنو جرہم" نے جو مکہ پر قابض تھے اس کو کنوئیں کی شکل دے دی تھی یہ چشمہ اس کنوئیں کا ایک سوتا ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے اس کا پانی کبھی ٹوٹتا نہیں تھا۔ مگر خزاعہ نے مکہ پر حملہ کیا اور بنو جرہم کو شکست کھا کر مکہ سے نکلنا پڑا تو انہوں نے خزانہ کعبہ کی قیمتی چیزیں مثلاً سونے کے ہرن۔ سونے کی تختیاں اور سات تلواریں جو بہت عمدہ اور قیمتی تھیں۔ وہ چاہِ زمزم میں ڈالیں اور کنوئیں کو پاٹ کر اس طرح زمین کی برابر کر دیا کہ وہ لاپتہ ہو گیا۔

بنو خزاعہ کی خاندانی روایات کا کوئی تعلق زمزم سے نہیں تھا، لہٰذا ان کو اس سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی، پھر ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ کعبہ کے قریب سونا بے ادبی ہے وہ یہاں مکان بنانا بھی بے ادبی سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ حرم سے فاصلہ پر آباد ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علاقہ ویران ہو گیا اور آبادی کے بجائے یہاں کیکر اور جھڑبیریوں کا جنگل آباد ہو گیا۔

بنو خزاعہ کو شکست دینے کے بعد جب قصی نے اس جنگل کو کٹوایا۔ حرم کعبہ کو صاف کیا اور نئے نقشہ پر مکہ کو دوبارہ آباد کیا تو زمزم کا نام و نشان نہیں تھا اور اس کئی صدی کے عرصہ میں ایسے آدمی بھی باقی نہیں رہے تھے جو اس کا پتہ بتا سکیں۔ البتہ سینہ بہ سینہ خاندانی روایات کا ذخیرہ ان کے پاس تھا جس کی بنا پر زمزم سے ان کی عقیدت قائم تھی اور ذہنوں میں جستجو کا جذبہ تھا اور ہر سال حج کے موقعہ پر مکہ کے مختلف کنوؤں سے پانی فراہم کرنے کی جو پریشانی پیش آتی تھی وہ جذبۂ جستجو میں نئی حرکت پیدا کر دیتی تھی۔ قصی کے پڑپوتے عبدالمطلب کی قدرت نے مدد کی۔ دو تین روز تک ایک ہی خواب دیکھتا رہا، الفاظ میں فرق تھا۔ کہ پہلے دن کہا گیا احفر طیبہ[1] (طیبہ کو کھودو) دوسرے روز کہا گیا احفر برۃ (برہ کو کھودو) تیسرے روز کہا گیا احفر المضنونہ۔ المضنونہ (نہایت قیمتی چیز) کو کھودو۔ اور چوتھے روز اس کو بتایا گیا

---

[1] طیبہ۔ پاکیزہ۔ برہ نیک۔ المضنونہ نہایت قیمتی چیز جس کے حق میں لوگ بخیل ہوں۔ کسی کو بخشتے نہ ہوں۔

کہ کھود کر زمزم کو برآمد کرو اور اس کا پتہ یہ بتایا گیا[۱] گوبر اور خون کے بیچ میں جہاں سفید پنجوں[۲] والا کوا ٹھونگ مارے وہاں کھود دو۔

عبدالمطلب نے اس مقدس خدمت کو خود ہی انجام دینا چاہا۔ صرف بڑے لڑکے حارث کو ساتھ لیا اور کھودنا شروع کر دیا۔ تین روز بعد ان کو کنوئیں کی من نظر آئی، جو کامیابی کی بشارت تھی، پھر تلواریں، سونے کی تختیاں اور سونے کے ہرن بھی نکل آئے۔ عبدالمطلب نے ان سب چیزوں کو خانہ کعبہ ہی میں آراستہ کر دیا[۳]

کم و بیش پانچ سو برس بعد چاہ زمزم برآمد ہوا تو سقایہ میں سہولت ہو گئی۔ اب زائرین کے لئے زمزم کا پانی ہوتا تھا۔ مکہ کے کنوؤں سے فراہم کرنے کی ضرورت نہ رہی بلکہ عرفات و منیٰ وغیرہ میں یہی پانی پہنچایا جاتا تھا، جہاں چمڑے کے بڑے حوضوں میں جمع کر دیا جاتا تھا[۴]

بنو خزاعہ سے معاہدہ

بنو خزاعہ اگرچہ اپنی شکست کا قریش سے انتقام نہ لے سکے مگر درپئے انتقام رہنا ایک قدرتی امر تھا۔ عبدالمطلب نے بغض و عداوت کی فضا کو ختم کیا۔ دارالندوہ میں ایک اجتماع ہوا۔ تناصر و مواسات (باہمی تعاون اور خیر سگالی) کا عہد نامہ لکھا گیا اور اس کو خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیا گیا۔ عبدالمطلب کے بھائی (فرزندانِ ہاشم) اور مطلب کے وارث۔ اس معاہدہ میں شریک ہوئے۔ عبدشمس اور نوفل کے اخلاف اس معاہدہ میں شریک نہیں ہوئے[۵]

---

[۱] دہی بین الفرث والدم عند نقرۃ الغراب الاعصم۔ ابن سعد ص۴۹ والغراب الاعصم۔ ہو ابیض الجناحین و قیل ابیض الرجلین (مجمع البحار) [۲] عربی لفظ غراب اعصم ہے جس کے معنی سفید پنجے والا کوا یا سفید ڈینوں والا کوا۔ [۳] ابن سعد ص۴۹ ج۱ [۴] ایضاً۔ [۵] ابن سعد ص۵۱ صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی یہی صورت ہوئی کہ بنو خزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت آل ہاشم اور آل مطلب کے واحد نمائندہ تھے اس وقت بھی عبدالشمس اور نوفل کی اولاد فریق مخالف کے ساتھ تھی۔

دیت | عبدالمطلب نے جب غیبی اشارہ کی بنا پر چاہ زمزم کے برآمد کرنے کے لئے زمین کھودنی شروع کی تو یہ منت مان لی تھی کہ میرے دس لڑکے ہوجائیں گے تو ایک لڑکے کو خدا کے نام پر ذبح کردوں گا۔ خدا کا فضل وکرم تھا کہ عبدالمطلب کے دس لڑکے ہوئے۔ عبدالمطلب نے اپنی منت پوری کرنے کے لئے قرعہ ڈالا۔ قرعہ میں عبداللہ کا نام نکلا۔ عبدالمطلب نے چھری ہاتھ میں لی اور عبداللہ کو مذبح کی طرف لے جانے لگے تو عبداللہ کی بہنوں نے شور مچایا۔ عبدالمطلب کے دوست احباب بھی آڑے آئے۔ بہ مشکل تمام عبدالمطلب کو اس پر آمادہ کیا کہ عبداللہ کے فدیہ میں اونٹ ذبح کر دیئے جائیں۔ طے یہ ہوا کہ فال نکالنے کے قاعدہ کے بموجب دس اونٹ اور عبداللہ کے ناموں میں قرعہ ڈالا جائے۔ اگر پہلی مرتبہ اونٹوں کے نام پر قرعہ نہ نکلے تو دس اونٹ اور بڑھائے جائیں اور اسی طرح دس دس اونٹ بڑھائے جاتے رہیں۔ یہاں تک کہ قرعہ اونٹوں کے نام پر نکلے۔ تو جس تعداد پر قرعہ اونٹوں کے نام پر نکلے۔ اونٹوں کی اتنی ہی تعداد بطور فدیہ ذبح کی جائے۔ اس قرارداد پر عمل کیا گیا اور اتفاق ایسا ہوا کہ جب سو اونٹ اور عبداللہ کے درمیان قرعہ ڈالا گیا تو اونٹوں کے نام کا قرعہ نکل آیا۔ عبدالمطلب نے فوراً تعمیل کی۔ سو اونٹ بطور فدیہ صفا اور مروہ کے درمیان ذبح کر دیئے۔[1]

استسقا | کئی سال گذر گئے مکہ میں بارش نہ ہوئی، کنوئیں خشک ہونے لگے۔ مکہ کے باشندے سخت پریشان تھے۔ مخرمہ بن نوفل زہری کا بیان ہے کہ ان کی والدہ رقیقہ بنت ابی صیفی بن ہاشم جو عبدالمطلب کی بھتیجی تھیں اور ہم عمر بھی تھیں انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت ہو چکی ہے پھر اس نے ایک شخص کا حلیہ بتایا اور کہا کہ اس حلیہ کا جو آدمی تمہارے یہاں ہو اس سے کہو کہ وہ مکہ کے ہر ایک خاندان کے ایک ایک آدمی کو ساتھ لے اور یہ سب لوگ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر پہلے حرم میں جائیں وہاں حجر اسود کو بوسہ دیں پھر کوہ ابو قبیس کی چوٹی پر

---

[1] ابن سعد ص۵۱

پہنچ کر دُعا مانگیں۔ یہ شخص دعا مانگے، سب آدمی آمین کہیں۔
رقیقہ کا بیان ہے کہ عبدالمطلب کا یہی حلیہ تھا جو خواب میں بتایا گیا۔ لہٰذا عبدالمطلب کو بتایا گیا کہ وہ خواب کے اشارہ کی تعمیل کریں۔ عبدالمطلب نے پورے اہتمام سے تعمیل کی اور اپنے پوتے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی ساتھ لیا۔ ابوقبیس پر پہنچ کر دعا مانگی۔ ابھی یہ دعا مانگ رہے تھے کہ بادل آسمان پر چھا گئے پھر زور کی بارش برسی۔ سرزمین مکہ جل تھل ہو گئی۔[۱]

عبدالمطلب کے بعد خواجہ ابوطالب اور حق سقایہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تقریباً ۸ سال تھی جب عبدالمطلب کا انتقال ہوا۔
عبدالمطلب کے جانشین ابوطالب قرار دیئے گئے۔ خدمتِ سقایہ ان کے سپرد ہوئی۔ ابُوطالب اخلاق اور کمالات میں سب بھائیوں سے ممتاز تھے مگر دولت میں کم تھے۔ حج کا زمانہ آیا تو ہاتھ خالی تھے اور خدمتِ سقایہ کے لیئے دس ہزار کی ضرورت تھی۔ انہوں نے یہ رقم اپنے بھائی "عباس" سے ایک سال کے وعدہ پر قرض لی۔ دوسرا سال آگیا۔ قرض ادا نہ ہو سکا اور مزید خرچ کی ضرورت پیش آگئی تو بھائی عباس سے پھر ایک سال کے لئے چودہ ہزار قرض لئے۔ مگر اس مرتبہ عباس نے یہ طے کر لیا کہ اگر آئندہ سال تک یہ رقم ادا نہ ہو سکے تو آپ خدمتِ سقایہ میرے حوالہ کر دیں۔ خواجہ ابوطالب نے یہ شرط منظور کر لی۔ پھر یہ اتفاق ہوا کہ ابوطالب ادائیگی قرض کا انتظام نہ کر سکے تو حسبِ وعدہ خدمتِ سقایہ عباس کے حوالے کر دی۔[۲]

---

[۱] خواجہ ابُوطالب نے اپنے قصیدہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتے ہوئے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی تفصیل حصۂ سیرت میں آئے گی (ان شاء اللہ) [۲] ابن سعد ص ۵۴ ج ۱

[۳] البدایہ والنہایہ ص ۲۴۴ ج ۲ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا احترام فرمایا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد بھی یہ خدمتِ سقایہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے نام پر ہی باقی رکھی۔ (صحاح)

پورے عرب پر قریش کا ہمہ گیر اثر

مذہبی عظمت۔ سیاسی قیادت۔ اقتصادی برتری۔ تجارتی سربراہی

ہندوستان کے پنڈت ہمارے پڑوسی ہیں مگر چھوت چھات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم پڑوسیوں کو یہ معلوم نہیں کہ دیوتاؤں کے نام پر جو جانور چھوڑے جاتے ہیں کیا اُن کا کوئی ضابطہ ہے یا ایک آزادانہ عمل ہوتا ہے جس کا کوئی ضابطہ نہیں ہے اور بے ضابطگی ہی اس کا ضابطہ ہے مگر عربوں کے یہاں یہ عمل بے ضابطہ نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے یہاں "تسییب سوائب" مویشی کو چھوڑتے اور پُن کر دینے کی بہت سی قسمیں تھیں اور ہر ایک قسم کے بہت سے ضابطے مقرر تھے۔ اور صرف دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے یہ عمل نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایسی صورت بھی ہوتی تھی جس کو بچہ کشی کا سارٹیفکیٹ کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً اونٹنی کے سات بچے ہو گئے تو وہ آزاد کر دی جاتی تھی بعض صورتوں میں اس سے کم تعداد پر بھی یہ آزادی ضروری ہو جاتی تھی۔ مثلاً کسی اونٹنی کے مادہ بچے متواتر تین نمبروں تک ہوتے رہے[1] وغیرہ وغیرہ۔

پھر کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ذبح کی ممانعت ہوتی تھی۔ کسی کے گوشت پر یہ پابندی ہوتی تھی کہ مرد کھا سکتے تھے۔ عورتیں نہیں کھا سکتی تھیں وغیرہ وغیرہ۔

غرض ان تمام صورتوں کے لئے قواعد و ضوابط تھے اور ان کے موجد۔ بنو خزاعہ تھے اور جب قریش ان کے جانشین ہوئے تو یہ بھی انہیں ضابطوں کے پابند اور ان رسومات پر عمل پیرا ہو گئے۔ تسییب سوائب سے کہیں زیادہ مکمل ان کا ضابطۂ بت پرستی تھا۔

نظامِ بُت پرستی

پورے عرب کو چند منطقوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر ایک منطقہ کا بت الگ ہوتا تھا۔ اس کا مندر الگ ہوتا تھا جس کے ساتھ اس کے تمام لوازمات

---

[1] کسی قدر تفصیل عہد زریں میں کی گئی ہے۔ (حاشیہ) صفحہ ۳۱۹

ہوتے تھے۔ مثلاً بنو ثقیف[۱] نے "لات" کو اپنا دیوتا بنا رکھا تھا۔ طائف میں اس نام کا بُت تھا
باشندگانِ یثرب[۲] (قبائل اَوس اور خزرج) اور جو اُن کے ہم مشرب و پیرو تھے ان کا مخصوص
دیوتا "منات" تھا۔ جو ساحل سمندر پر مُشلّل کے ایک جانب قُدید میں[۳] تھا جو ایک مقام کا نام تھا۔

قبیلہ[۱] دوس، قبیلہ خثعم۔ قبیلہ بجیلہ اور جو اس منطقہ میں تھے اُن کا دیوتا ذوالخلصہ تھا جس
بیت (مندر) تبالہ میں تھا اس کو کعبہ یمانیہ بھی کہا جاتا تھا[۲]۔

آجا[۳] و سلمٰے یعنی جبال طے کے باشندوں کا دیوتا قلس تھا۔ حمیر[۴] اور اہل یمن نے نسر نام
کا اپنا دیوتا مان رکھا تھا، جس کے نام کا بیت (مندر) یمن کے شہر صنعاء میں تھا۔

بنی ربیعہ[۱] اور بنی کعب کا دیوتا الگ تھا اس کا نام رضاء تھا۔ بنو بکر۔ بنو تغلب۔ بنو
وائل اور ایاد کا دیوتا "ذوالکعبات" تھا۔ سنداد میں اس کا بیت تھا۔

قریش[۳] اور بنی کنانہ کا مخصوص دیوتا "عزیٰ" تھا جس کا بیت نخلہ میں تھا[۵]۔ (مقام کا نام)

عجیب بات یہ ہوئی کہ حضرت نوح علیہ السّلام کی قوم نے جو دیوتا بنا رکھے تھے جب
عرب میں بُت پرستی کا رواج ہوا تو احیائی ذہنیت نے ان فراموش شدہ دیوتاؤں کو پھر یاد دلا دیا۔
پھر کسی طرح وہ مورتیاں بھی برآمد کر لی گئیں۔ تو مختلف قبائل ان دیوتاؤں کے بھگت (پجاری) ہو
گئے۔ سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کی تفصیل یہ بیان[۴] کی ہے۔

وُدّ۔ بمقام دُومۃ الجندل۔ قبیلہ کلب اس کا بھگت تھا۔

سُواع۔ بمقام رہاط[۵] ساحل سمندر کے قریب۔ قبیلہ ہذیل اس کا بھگت تھا۔

یغوث۔ بمقام جُرف (یمن) پہلے قبیلہ مراد اس کی خدمت کیا کرتا تھا۔ پھر بنو غطیف
اس کے خادم اور بھگت بن گئے۔

یعوق۔ اہل ہمدان اس کے پجاری تھے۔

---

[۱] بخاری شریف ص ۲۲۲ [۲] ایضاً ص ۵۲۹ [۳] سیرۃ ابن ہشام ص ۵۴ تا ص ۵۶ عہد نبوی ص ۲۸۵ [۴] بخاری شریف ص ۲۲۲ [۵]
شام کا ایک شہر جو عراق سے متصل تھا۔ فتح الباری ص ۵۴۲ ج ۸ [۶] رہاط۔ بفتح راء ساحل سمندر کے قریب صوبہ حجاز کا
ایک شہر (فتح الباری)۔

نسر۔ ذی الکلاع (جو علاقہ حمیر) کا مشہور خاندان تھا، اس کا بھگت تھا۔

یہ تمام صنم اور اُن کے مندر اگرچہ علاقائی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر طواف نذرانہ اور قربانی وغیرہ کی رسومات جو کعبہ میں انجام دی جاتی تھیں وہ یہاں بھی پوری کی جاتی تھیں اور خانۂ کعبہ کے خدام کے جو منصب تھے۔ کلید برداری۔ دربانی اور السیار وغیرہ یہ تمام منصب ان علاقائی کعبوں کے خدام کے بھی ہوا کرتے تھے اس طرح پورے عرب میں مندروں یا چھوٹے بڑے کعبوں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ خدام اور پجاریوں کے سینکڑوں خاندان اس نظام سے وابستہ تھے، اس پورے نظام کا مرکز کعبہ[1] تھا، اسی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا "بیت اللہ" سمجھا جاتا تھا۔ اور اسی کے گرد طواف کر کے حج کا مقدس فرض انجام دیا جاتا تھا پس جو یہاں کے خادم تھے وہ پورے عرب کے مخدوم تھے! اور جب کہ یعمر بن عوف کا یہ فیصلہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وراثتِ ابراہیم اور تولیتِ کعبہ کا حق قریش کو ہے تو قریش پورے عرب کے مخدوم اور مذہبی مقتدا تھے

تنظیم سے پہلے بُت پرستی کا آغاز اگرچہ بنو خزاعہ کے دور میں ہوا جس کو قریش نے منظم کیا، مگر اس کے جراثیم ذہنوں میں پہلے سے سرایت کر چکے تھے۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی اولاد جب عرب کے مختلف علاقوں میں منتقل ہوئی۔ تو مکہ سے ہجرت کرنے والا خاندان حرم کعبہ کا ایک پتھر اپنے ساتھ لے جاتا تھا جس وہ تبرک" سمجھتا تھا۔ یہ خاندان جہاں سکونت اختیار کرتا اس تبرک کو وہاں کسی مناسب جگہ پر نصب کر دیتا تھا اور اس کی زیارت کر کے اپنے وطن اور اپنے آبائی معبد کی یاد تازہ کیا کرتا تھا۔ چند پشتوں کے بعد اس متبرک یادگار نے اصل کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہ خود ایک چھوٹا کعبہ بن گیا اور کعبہ کی طرح اس کا بھی طواف کیا جانے لگا۔ اور جب خزاعہ نے بُت پرستی اختیار کی تو اس متبرک یادگار نے بھی معبودیت کا درجہ حاصل کر لیا۔ اور اس کی پوجا ہونے لگی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ ہو گئی کہ سنگِ حرم کی بھی قید نہیں رہی، بلکہ جو اچھا پتھر مل جاتا تھا۔ پہلے پتھر کو الگ کر کے اس

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۵۲/۱ [2] سیرۃ ابن ہشام ص ۵۱

اچھے پتھر کی پوجا شروع کر دی جاتی تھی اور کسی جگہ پتھر نہ ملتا تو ریت اکٹھا کر کے ڈھیری بنا دی جاتی تھی۔ پھر بکری کو پکڑ کر اس کا دودھ اس چھوٹے سے تودۂ خاک پر دوھا جاتا۔ یہ "شیر نوش" تودۂ خاک ہی معبود بن جاتا[1] جس کے چرنوں میں ناک رگڑی جاتی یا ماتھا ٹیکا جاتا تھا (معاذ اللہ) یہ پرستش خواہ کتنی ہی مضحکہ انگیز تھی مگر اس سلسلہ میں بھی مرکزیت بیت اللہ اور خدام بیت اللہ یعنی قریش ہی کو حاصل تھی۔

سیاسی قیادت

بُت پرستی کے اس نظام نے قریش کو پورے عرب کا مذہبی پیشوا ضرور بنا دیا تھا۔ مگر قریش کی عظمت صرف اس نظام پر موقوف نہیں تھی بلکہ اس زمانہ کے بین الاقوامی سیاسی گٹھ جوڑ نے بھی قریش کو ایسی حیثیت دے دی تھی کہ پورے عرب کا اس سے متاثر ہونا ضروری تھا روم (بازنطینی)، ایران اور حبش۔ تینوں سلطنتوں کے بیچ میں عرب حد فاصل تھا۔

تینوں سلطنتیں عرب پر نظر رکھتی تھیں۔ قریش اس حیثیت کو پہچانتے تھے اور اس سے کام لینا بھی جانتے تھے۔ قصی نے بنو خزاعہ کا مقابلہ کیا اور ان کو مکہ سے نکالا تو نہ صرف یہ کہ شہنشاہ روم (بازنطینی شہنشاہ) کی حمایت اس کو حاصل تھی بلکہ ابن قتیبہ کی شہادت یہ ہے کہ اَعَانَہٗ قَیْصَرُ عَلَیْھَا[2] (قیصر[3] روم نے اس کو کمک بھی پہنچائی تھی)

قصی کے پوتوں نے ان تعلقات کو وسیع کیا اور لطف کی بات یہ ہے کہ ایران، روم حبش اور ملوک یمن آپس میں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ مگر آلِ عبد مناف (قصی کے پوتوں) نے سب سے قریش کے لئے یکساں حقوق اور رعایتیں حاصل کرلیں چنانچہ مطلب نے شاہِ حبش (نجاشی) اور اس کے حریف شاہانِ یمن (ملوک حمیر) سے نوفل نے شہنشاہ

---

[1] بخاری شریف ص۶۲۱ [2] معارف ابن قتیبہ ص۲۱۵ ملوک الشام۔ [3] بازنطینی شہنشاہ کو عرب قیصر کہا کرتے اور ایران کے شہنشاہ کو کسریٰ اور شاہِ حبش کو نجاشی کہا کرتے تھے۔

ایران (کسریٰ) سے اور ہاشم نے بازنطینی شہنشاہ "ہرقل" سے قریش کے لئے آزاد تجارت کے فرامین حاصل کر لئے۔[1]

ابن سعد کا بیان ہے۔

ہاشم ایک شریف آدمی تھا۔ یہی ہاشم ہے جس نے قیصر (شہنشاہِ روم) سے یہ حلف لیا تھا (فرمان حاصل کر لیا تھا) کہ اس کے حدودِ مملکت میں قریش کو آزادی ہوگی۔ ان کے جان و مال کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ قیصر روم نے یہ فرمان اپنی مملکت کے لئے دیا اور اپنے دوست ملک (حبش) کے بادشاہ نجاشی کو بھی لکھ دیا کہ وہ اپنے ملک میں قریش کو آمد و رفت اور کاروبار کی اجازت دیں۔[2]

ہاشم نے فرامین سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قریش کی تجارت کو منظم کیا۔ تجارتی قافلوں کا ایسا پروگرام بنایا کہ وہ سال بھر رواں دواں رہتے اور جہاں جاتے موسم کی خوشگواری ان کا استقبال کرتی۔ سردیوں میں یمن کی طرف جاتے اور حبشہ تک تجارتی قافلے پہنچتے اور گرمیوں میں شام کی طرف غزہ تک اور کبھی انقرہ تک تجارتی قافلے پہنچتے تھے۔ بسا اوقات ہاشم خود ان کی قیادت کرتا تھا۔[3]

دیگر قبائل کے لئے مراعات

ان طویل راستوں میں جو قبائل پڑتے تھے اُن کے لئے مراعات یہ تھی کہ قریشی قافلے ان کا سامان بھی لے جاتے مزید احسان یہ کرتے کہ سامان لے جانے لانے کا محصول تو درکنار بار برداری کا خرچ بھی نہ لیتے تھے۔[4]

مکہ مکرمہ پورے عرب کا مرکزی شہر (ام القریٰ) تھا۔ سیاسی قیادت کے لئے یہی کافی تھا کہ قریش اُم القریٰ پر قابض اور اس کے مالک تھے، مزید برآں آل مناف نے پڑوسی

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۴۳ ج ۱ [2] ابن سعد ص ۴۵ ج ۱ ۔ [3] ابن سعد ص ۴۳ و ص ۴۵ ج ۱ [4] ابن سعد ص ۴۵ قرآن حکیم نے اس سلسلہ کو ایلاف سے تعبیر کیا ہے (یعنی مانوس کرنا) (تشریح آگے آئے گی۔ انشاء اللہ)

ممالک سے یہ رعایتیں حاصل کر کے قریش کے آسمانِ قیادت کو ماہ و پروین اور کہکشاں سے آراستہ کردیا۔ اب پورا عرب قریش کا کلمہ گو اور اس کے احسانات کا ممنون تھا۔

عرب کا تجارتی نظام اور قریش کی سربراہی

بُت پرستی کے منطقوں کی طرح عرب کے ایسے علاقے بھی ہو گئے تھے جن کو تجارتی منطقہ کہا جا سکتا تھا۔

قصبوں اور شہروں میں چھوٹے بڑے بازار بھی تھے۔ ہفتہ وار بازار بھی جگہ جگہ لگا کرتے تھے۔ لیکن ہر ایک منطقہ کے مرکزی مقام پر ایک میلہ سالانہ ہوتا تھا جس میں نہ صرف عرب بلکہ قریب کے (غیر عرب) علاقوں کے تاجر بھی مال لاتے، دکانیں لگاتے اور نفع کماتے تھے یہ میلے سال کے بارہ مہینوں میں دائر سائر رہتے۔ مورخین نے ان میلوں کی تفصیل و ترتیب یہ بیان کی ہے:

(۱) دومۃ الجندل میں جو شام و حجاز کے مابین ہے یکم ربیع الاول کو میلہ لگتا۔ جو پورے مہینہ رہتا۔

(۲) یہاں سے لوگ چل کر بحرین میں مُشقّر آتے۔ یہاں یکم سے آخر جمادی الاخریٰ تک میلہ لگتا۔ اور دومۃ الجندل کی طرح یہاں بھی مقامی حکمران کو عشر (دس فیصدی) (چنگی یا کسٹم) دیا جاتا۔ ایران تک کے تاجر سامان لے کر یہاں آتے۔

(۳) یکم رجب کو مُشقّر سے بازار اُٹھتا تو صُحار کے لئے روانگی ہوتی جو عمان کا پُر رونق شہر تھا۔ تقریباً بیس دن راستہ میں صرف ہوتے۔ یہاں پانچ دن کا میلہ ہوتا اور بادشاہ جُلندی کو عشر دیا جاتا تھا۔

(۴) رجب کے آخر میں دَبا کا میلہ شروع ہوتا۔ یہ عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھا۔ یہاں سندھ۔ ہند۔ چین اور مشرق و مغرب کے لوگ آتے اور خشکی اور سمندر کے

راستوں سے سامان لاتے یہاں کا عُشر بھی بادشاہ جلندی کو ملتا۔

(۵) اس کے بعد مہرہ کے شہر شحر میں وسط شعبان سے میلہ لگتا جہاں بری اور بحری تاجر دُبا سے چل کر آتے۔ یہ کھالوں اور کپڑے کی خاص منڈی تھی۔ مقامی پیداوار کی جنسیں ایلوا لوبان وغیرہ بھی یہاں سے خریدی جاتیں۔

(۶) پھر یکم رمضان سے عدن میں میلہ لگتا۔ عدن میں جو عطر بنتا تھا۔ اُس کی دور دور تک شہرت تھی۔ بحری راستہ سے آنے والے سندھ اور ہند تک اور خشکی کے راستہ سے آنے والے ایران اور رُوم تک یہاں کا عطر لے جاتے تھے یہاں کا عشر ایران سے بھیجے ہوئے آباد کا افسر لیتے تھے

(۷) عدن کے بعد صنعا (یمن) کا میلہ لگتا جو وسط رمضان سے آخر رمضان تک رہتا۔ یہاں روئی، زعفران، مختلف قسم کے رنگوں اور لوہے کی منڈیاں تھیں یہاں کا عشر بھی شاہ ایران کا گورنر لیتا تھا۔

(۸ و ۹) وسط ذی قعدہ سے آخر ماہ تک دو میلے لگتے

(الف) رابیہ میں جو علاقہ "حضرموت" کا ایک شہر تھا

(ب) عُکاظ میں جو مکہ اور عرفات کے درمیان تھا۔

(۱۰) عکاظ کے قریب ذی المجاز ہے۔ یہاں یکم ذی الحجہ سے میلہ لگتا جو دس ذی الحجہ تک رہتا۔

(۱۱) زمانہ حج میں (۱۰ ذی الحجہ سے ۱۵ ذی الحجہ تک) منیٰ میں میلہ لگتا۔

(۱۲، ۱۳) منیٰ سے فارغ ہو کر لوگ خیبر یا یمامہ جاتے، جہاں محرم کی دسویں سے میلے لگتے۔

(۱۴، ۱۵) اس کے بعد جنوبی فلسطین میں بُصریٰ اور اَذرعات کے میلے لگتے[1]

ان تمام میلوں میں سب سے زیادہ اہمیت عکاظ اور ذوالمجاز کے میلوں کو تھی۔ کیونکہ

(الف) یہ میلے اشہر حرم میں لگتے تھے۔ جو پورے عرب کے لئے امن اور پناہ کے مہینے

---

[1] کتاب المحبر و اسواق العرب محمد بن حبیب (مرزوقی)

تھے۔ اس لیے سب طرف سے بڑی بڑی تعداد میں تاجر اور زائرین امن کی بانسری بجاتے ہوتے یہاں آتے رسومات حج ادا کرتے۔ مال خریدتے اور عیش و تفریح کی مجلسیں جماتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس میلہ میں عام نگرانی۔ حفاظت اور جو ہنگامے ہو جاتے ان کے مقدمات کی سماعت اور ان کا فیصلہ کرنا "قبیلہ تمیم" کے متعلق ہوتا تھا جبکہ قبیلہ تمیم کا مسکن عرب کی انتہا مشرق تھا اور مکہ و عکاظ انتہا مغرب میں تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان میلوں سے پورے عرب کا تعلق رہتا اور تعلق بھی عقیدت مندانہ ہوتا تھا۔

میدان تجارت میں قریش کی سربراہی

(۱) عکاظ اور ذی المجاز کے مذکورہ بالا عظیم الشان میلوں کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ تھی کہ اس موقع بڑے بڑے اجتماعات بھی ہوا کرتے تھے۔ جن میں پورے عرب کے اساتذہ شعرو سخن شرکت کرتے! دبی مقابلے ہوتے۔ دھوم دھام سے مشاعرے ہوتے۔ مشہور مقررین کی تقریریں ہوتیں جن میں وہ اپنے قبائل کے کارنامے بیان کرتے۔ مختصر یہ کہ مذہبی جشن (حج) کے ساتھ قومی جشن بھی منائے جاتے تھے۔ ان میلوں کے جملہ انتظامات قریش سے متعلق تھے یا قریش کے تعاون سے ہوتے تھے۔ اس طرح میلوں کے سلسلہ میں بھی قریش کو سربراہی حاصل تھی۔

(۲) قریش نے جب تجارت کو منظم کرتے ہوتے "رحلۃ الشتاء والصیف" موسم گرما اور سرمائی قافلوں کا طریقہ ایجاد کیا اور اس طرح ان کا تجارتی سلسلہ عرب کے چپہ چپہ میں پھیل گیا تو انہوں نے ایک حفاظتی فوج بھی تیار کی جس میں حبشی غلام اور تنخواہ دار سپاہی ہوتے تھے۔ اس کو قائمہ کہا جاتا تھا۔ یہ فوج قریش کے قافلوں کی طرح حلیف قبائل کے قافلوں کی بھی حفاظت کرتی تھی [1]

---

[1] المحبر لمحمد بن حبیب۔

(۳) جیسا کہ[1] پہلے گذر چکا ہے۔ عرب میں نہ کوئی سلطنت تھی نہ حکومت۔ نہ فوج۔ نہ پولیس۔ البتہ قبائلی معاہدات کا ایک سلسلہ تھا۔ جو افراد کی جان و مال کی حفاظت کا ذریعہ ہوتا تھا۔ قبائل کے معاہداتی گروپ تھے۔ جو فرد کسی گروپ سے تعلق رکھتا تھا تو پورا گروپ اس کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ اس ذمہ داری کا نام خُفارت[2] تھا۔ راہرو کو اس کی سند دے دی جاتی تھی تو وہ اس گروپ کے حدود تک محفوظ رہتا تھا۔ اس سند کو بھی خفارت ہی کہا جاتا تھا۔ (یعنی پروانہ راہداری یا ویزا) کبھی خفارت پر معاوضہ بھی لیا جاتا تھا۔ اس کو خُفات (بضم خا) کہا جاتا تھا۔[3]

قریش کے تعلقات کا دائرہ پورے عرب کو گھیرے ہوئے تھا تو اس کا "پروانہ راہداری" خفارہ بھی پورے عرب کے لئے کافی ہوتا تھا۔

(۴) تنظیم تجارت اور تجارتی قافلوں کے ذریعہ جب دوسرے ممالک سے تجارتی تعلقات قائم ہوئے تو پہلے تو یہ ہوا کہ تجارتی قافلے واپسی کے وقت شام اور یمن وغیرہ سے غلہ بھر کر لاتے تھے تو مکہ اور اطرافِ مکہ جہاں کاشت کا نام و نشان نہیں تھا وہاں غلہ کی فراوانی ہوگئی۔ پھر ان ممالک کے باشندوں نے خود بھی غلہ کی درآمد (سپلائی) شروع کر دی خشکی کے راستوں سے بھی غلہ آتا اور بحری راستے سے بھی جدہ کی بندرگاہ پر غلہ اُتارا جاتا تھا۔[4]

یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر قریش کو مذہبی عظمت اور سیاسی قیادت کی طرح اقتصادی برتری اور تجارتی سربراہی بھی حاصل ہوگئی۔

---

[1] زیر عنوان معاہداتی حکومت [2] اس ذمہ داری کی خلاف ورزی کو اخفار کہتے تھے۔ کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانہ من صلی الغداۃ فی ذمۃ اللہ فلا یخفرن اللہ فی ذمتہ۔ مجمع البحار) [3] قاموس اللغات۔ [4] ابن قتیبہ کے استاذ محمد بن حبیب المتوفی ۲۴۵ھ ۸۵۹ء نے اپنی کتاب المحبر میں اس کی تفصیل دی ہے۔ صفحہ ۲۶۳ و صفحہ ۲۶۴۔

واقعۂ اصحابِ فیل

اسباب اور نتائج

قصی کا زمانہ بظاہر چوتھی صدی عیسوی کا وہ ابتدائی نصف ہے جب مسیحیت جدید ترتیب کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی تھی۔ تثلیث کو جزو دین بنایا گیا تھا اور قسطنطین اوّل نے مسیحیت قبول کر کے حکومت کا مذہب بھی عیسائیت قرار دے دیا تھا جب مسیحیت کا مرکز رومتہ الکبریٰ۔ اٹلی بنا تو مسیحیت کی لہران تمام علاقوں میں پہنچی جو بازنطینی شہنشاہیت کے زیر اثر اور اس بلاک میں داخل تھے[1]۔ عرب کے وہ علاقے جو شام سے متصل تھے۔ افریقہ کے علاقے خصوصاً حبش اور یمن کے بھی کچھ علاقے عیسائیت سے متاثر ہوئے[2]۔

بازنطینی شہنشاہ (قیصر روم) نے قصی کی امداد کی۔ پھر ہاشم کے ساتھ یہ مراعات کی کہ قیصر نے اپنی طرف سے بھی اس کو آزادانہ تجارت کا پروانہ دیا اور شاہِ حبش سے بھی مراعات دلوائیں۔ اس کا مقصد خالص سیاسی بھی ہو سکتا ہے کہ ایران کے مقابلہ میں عربوں کو اپنی طرف مائل اور تجارتی راستوں کو اپنے زیر اثر رکھے! اور اس کا مقصد مذہبی بھی ہو سکتا ہے کہ عرب میں عیسائیت کو رواج دے۔ غالباً اسی سلسلہ کی آخری کڑی یہ تھی کہ ابرہہ نے (جو خود عیسائی تھا اور حبش کے عیسائی بادشاہ (نجاشی) کی طرف سے یمن کا گورنر تھا) یمن کے مرکزی شہر صنعا میں نہایت عظیم الشان[3] کلیسا تعمیر کرایا تو عربوں کو ہدایت کی کہ وہ خانہ کعبہ کے بجائے اس کلیسا کو اپنا معبد بنائیں اور اسی کا طواف کیا کریں۔ مگر جب عربوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ عرب کے

---

[1] دوسرا بلاک وہ تھا جس کی قیادت شہنشاہِ ایران (کسریٰ) کیا کرتا تھا جس کے اثر و رسوخ کا دائرہ ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا۔ [2] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو عہد زریں صفحہ ۲۸۴ تا صفحہ ۳۰۱ [3] سنگ مرمر اور سنگ خارہ وغیرہ قیمتی پتھروں کی دیواریں ان پر سونے کا کام اور جگہ جگہ یاقوت اور ہیرے جڑے ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ ابن سعد صفحہ ۵۵ ج ۱۔

وہی پانڈے جو لونڈ کا مہینہ (نسی) مقرر کیا کرتے تھے[1] ان میں سے ایک نے رات کو اس کلیسا میں قیام کر کے کلیسا کے پاک اور مقدس حصہ کو گندگی سے ملوث کیا[1] اور فرار ہو کر مکہ چلا آیا تو ابرہہ اور اس کے سرپرستوں کی یہ توقعات ختم ہو گئیں کہ عرب اُن کی مذہبی رہنمائی قبول کر سکتے ہیں۔ اور اب اس گستاخی کے انتقام میں نیز اس تصور کی بنا پر کہ جب تک مکہ میں کعبہ ہے عرب میں عیسائیت کی دال نہیں گل سکتی۔ ابرہہ نے بیٹھے کر لیا کہ وہ خانہ کعبہ کو منہدم کر دے۔

ابرہہ نے بڑی فوج تیار کی۔ تیرہ ہاتھی ساتھ لیے جن سے عمارتوں کے توڑنے کا کام لیا جاتا تھا جن میں سب سے ممتاز ہاتھی وہ تھا جس کو "محمود" کہا جاتا تھا۔ اس شان و شوکت اور جلال و جبروت کے ساتھ منزل بمنزل مارچ کرتا ہوا مکہ کے قریب پہنچ گیا اور "مغمس"[2] میں پڑاؤ ڈالا۔ فوج کو حکم دیا کہ وہ تمام اصطبل اور طویلے لوٹ لیں۔ جو مکہ سے باہر تھے جن میں قریش کے اونٹ اور گھوڑے رہا کرتے تھے اس غارتگری میں عبدالمطلب کے دو سو اونٹ بھی فوج کے قبضہ میں پہنچ گئے۔ پھر ابرہہ نے حملہ سے پہلے مکہ والوں کو پیغام بھیجا کہ:

"ہم اہل مکہ کو تباہ کرنا نہیں چاہتے نہ ان سے جنگ کرنا چاہتے ہیں ہم صرف کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے آتے ہیں اگر مکہ والے آڑے نہ آئیں تو محفوظ رہیں گے۔"

خناطہ حمیری۔ یہ پیغام لے کر مکہ پہنچا اور رقائد مکہ خواجہ عبدالمطلب کو پہنچایا۔ خواجہ نے جواب دیا۔

"ابرہہ اتنی طاقتور فوج لے کر آیا ہے کہ اہل مکہ تو کیا عرب کے دوسرے قبائل بھی مقابلہ کرنا چاہیں تو کامیاب نہیں ہو سکتے اس لئے ہم خود بھی ابرہہ سے جنگ کے لئے تیار نہیں ہیں۔ البتہ یہ بیت ہمارا نہیں ہے۔ یہ اللہ کا

---

[1] ابن سعد ج ۱ ص ۵۵ اور بروایت ابن اسحاق۔ پاخانہ بھر دیا۔ ابن سعد ج ۱ ص ۳۰ ابن ہشام ج ۱ ص ۳۰ [2] مکہ سے چار میل (۲ فرسخ) کے فاصلہ پر طائف کے راستہ میں ایک مقام تھا۔

بیت ہے خلیل اللہ کا بنایا ہوا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے اور اپنے خلیل کے اس
بیت کو بچانا چاہے گا وہ خود بچالے گا اور اگر اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ اس
کا بیت محفوظ رہے تو ہم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ہم اس کی حفاظت
کرسکیں[1]

حناطہ نے کہا کہ آپ میرے ساتھ چلئے اور خود ابرہہ سے بات کر لیجئے۔
خواجہ عبدالمطلب بہت شریف صورت حسین وجمیل باوجاہت اور نہایت شاندار سردار تھے دیکھنے والوں پر رعب پڑتا تھا۔ جیسے ہی وہ ابرہہ کے سامنے پہنچے ابرہہ بھی متاثر ہوا۔ تخت پر اپنے برابر بٹھانا اپنے یہاں کے شاہانہ آداب اور مصلحت کے خلاف سمجھا تو خود تخت سے اتر کر خواجہ عبدالمطلب کی برابر بیٹھا۔ اور ترجمان کے ذریعہ بات چیت شروع کی

ابرہہ نے دریافت کیا آپ کیا چاہتے ہیں۔ خواجہ عبدالمطلب نے جواب دیا۔ آپ کی فوج نے میرے دوسو اونٹ لوٹ لئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کو واپس کرادیں ابرہہ حیران ہوا۔ اس نے ترجمان سے کہا۔ ان سے کہو کہ آپ کی وجاہت اور شاندار صورت سے میں متاثر ہوا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ آپ کوئی بڑا مطالبہ پیش کریں گے۔ آپ نے صرف اپنے اونٹوں کی واپسی کی درخواست کی اور تعجب ہے آپ نے اس کعبہ کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جو آپ کا اور آپ کے آباؤ اجداد کا دین اور دھرم رہا ہے۔

خواجہ عبدالمطلب نے جواب دیا۔

اس بیت کا ایک رب ہے۔ اس کا محافظ وہ ہے اس کی فکر وہ کریگا
میں اس بیت کا مالک نہیں ہوں۔ میں ان اونٹوں کا مالک ہوں جن کی
واپسی کی میں نے درخواست کی ہے۔

ابن ہشام کی روایت ہے کہ حناطہ نے عبدالمطلب سے پہلے دو اور سرداروں کو پیش

---

[1] سیرہ ابن ہشام ج۱ ص۳۲، ۳۳ و ج۱ ص۳۳۔

کیا تھا۔ ایک قبیلۂ بنی بکر کے شیخ عمر بن نفاثہ اور دوسرے قبیلۂ ہذیل کے سردار خویلد بن نائلہ۔ ان دونوں نے یہ پیش کش کی تھی کہ مکہ میں جو کچھ دولت ہے اس کی ایک تہائی ابرہہ منظور کر لے اور ہدم کعبہ کے ارادہ سے باز آجائے۔ مگر ابرہہ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا اس روایت کو سامنے رکھا جائے تو عبدالمطلب کی یہ موقع شناسی تھی کہ انہوں نے کعبہ کے متعلق ابرہہ سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ صرف اپنے اونٹوں کی بات کی اور کعبہ کا معاملہ رب کعبہ کے حوالہ رکھا۔

ابرہہ نے اونٹ واپس دلوا دیئے۔ عبدالمطلب ان کو لے کر مکہ میں آئے۔ تمام اونٹ[1] قربانی کیلئے وقف کر دیئے اور مکہ والوں کو ہدایت کی کہ شہر خالی کر کے پہاڑوں پر چلے جائیں پھر تنہا اور ایک روایت کے مطابق چند ساتھیوں[2] کو لے کر حرم کعبہ میں آئے اور خانہ کعبہ کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر حلقہ باب کو سنبھالا اور یہ منظوم[3] دعا کی۔

۱۔ لاھمّ ان العبد یمنع رحلہ فامنع حلالك

۲۔ لا یغلبن صلیبھم۔ ومحالھم غدواً محالك

۳۔ ان کنت تارکھم وقبلتنا فامر ما بدالك

یہ تین اشعار ابنِ سعد اور ابنِ ہشام نے نقل کیئے ہیں ان کے علاوہ یہ دو شعر بھی مروی ہیں۔

۴۔ جروا جموع جموعھم والفیل کی یسبوا عیالك

۵۔ عمدوا حماك بکیدھم جھلاً وما رقبوا جلالك

---

[1] قلدھا النعال واشعرھا۔ وجعلھا ھدیا وبثھا فی الحرم (ابن سعد ص۵۶ ج۱) [2] عمرو بن عائذ۔ مطعم بن عدی۔ ابو مسعود ثقفی۔ ابنِ سعد ص۵۶ ج۱ [3] عبدالمطلب نے جو جوابات دیئے ان سے نیز اس دعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خدا پرست مُوحِد تھے۔ ولا شبہ انہ من اھل الفترۃ و ممن لم تبلغہ الدعوۃ عن الاصل اللّٰھمّ۔ حاشیہ سیرۃ ابن ہشام ص۳۳ ج۱۔

(ترجمہ) اے اللہ! ایک غلام اپنے کجاوہ کی حفاظت کرتا ہے۔ بس (خداوندا) توان کی حفاظت کر جو تیرے بیت کے پڑوسی اور مجاور ہیں۔

(۲) ایسا ہرگز نہ ہو کہ ان کی تدبیر اور ان کا مکر و فریب کل کو تیری تدبیر پر غالب آجائے۔

(۳) اگر میں ان (دشمنانِ کعبہ) کو اور اپنے قبیلہ کو چھوڑ کر جا رہا ہوں (کہ میں مجبور اور بے بس ہوں میرے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہے تو خداوندا) جو تیرا ارادہ ہو اس کا حکم کردے۔

(۴) یہ اپنے بے شمار لشکروں کو لے آتے ہیں اور ہاتھیوں کو لائے ہیں، تاکہ باشندگان مکہ کو جو تیرے عیال ہیں قید کریں۔

(۵) انہوں نے اپنے مکر و فریب اور جہالت سے تیرے حمار (محفوظ علاقہ حرم) کا قصد کیا ہے۔ انھوں نے تیری عظمت کا پاس و لحاظ نہیں کیا۔

اس کے بعد کیا ہوا۔ تاریخ عالم کا وہ عبرت انگیز اور ہولناک حادثہ پیش آیا۔ جس کا تذکرہ قرآن حکیم نے بھی کیا ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ ابرہہ عظیم الشان مسلح فوج کے ساتھ تیرہ قلعہ شکن ہاتھی لایا تھا۔ ان میں سب سے بڑا ہیبت ناک اور بڑے ڈیل ڈول کا ہاتھی محمود تھا۔ وہ ہاتھیوں کی کمان کر رہا تھا۔ جب حملہ کا وقت آیا تو یہ ہاتھی اپنی جگہ جم گیا۔ بہت مارا پیٹا۔ مگر یہ آگے کی طرف حرکت نہ کرتا۔ دائیں بائیں اس کا رخ کر دیا جاتا تو خوب لپک کر چلتا۔

یہاں ہاتھی کا یہ تماشا ہو رہا تھا۔ اُدھر آسمان پر پرندوں کی قطار نمودار ہوئی۔ ہر ایک

---

[1] عقل پرستوں نے اس واقعہ کی تاویل کی۔ کسی نے کہا فوج میں چیچک کی وبا پھیل گئی۔ انہوں نے قرآن پاک کی آیتوں کو اپنی عقل کے تابع کرتے ہوئے معنے پہنائے مگر یہ خیال نہیں کیا کہ قرآن حکیم کلام اللہ ہے معمولی اور عام واقعہ کا تذکرہ کسی بادشاہ یا صدر جمہوریہ کے ایڈریس میں بھی نہیں آتا تو کلام اللہ کی شان تو بہت بلند ہے۔ کلام اللہ میں اسی واقعہ کا تذکرہ آسکتا ہے جو تاریخ عالم میں قطعاً غیر معمولی ہو۔ اس میں تاویل کرنا فہم کلام اللہ اور تعظیم کتاب اللہ سے تہیدستی کی دلیل ہے۔

پرندہ تین کنکریاں لیئے ہوئے تھا۔ ایک ایک چونچ میں دو دو پنجوں میں۔ یہ کنکریاں چنے کی اور مسور کے دانے کے برابر تھیں۔ یہ کنکریاں جس پر پڑتیں اس کا چورا کر دیتی تھیں۔ پھر پانی کی ایک رو آئی اس نے ان سب کو بہا کر سمندر میں ڈال دیا۔ ابرہہ اور اس کے مخصوص ساتھی اس وقت ختم نہیں ہوئے۔ وہ بھاگے اور طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا ہو کر راستہ ہی میں مر گئے۔ ابرہہ کو ایسی بیماری لگی کہ اس کا بدن گل گیا۔ ایک ایک عضو گل کر گرتا رہا۔ وہ صنعاء پہنچ گیا مگر اس حالت میں پہنچا کہ گوشت کا لوتھڑا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس کا سینہ پھٹا۔ دل باہر نکل آیا دل کے ساتھ جان بھی نکل گئی۔[۱]

واقعہ اصحاب فیل کے نتائج

جیسے یہ واقعہ غیر معمولی تھا، قدرتی بات تھی اس کے نتائج بھی غیر معمولی ہوئے سیاسی لحاظ سے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

(۱) عربوں کو قیصر روم اور اس کی ماتحت حکومتوں سے نفرت ہو گئی۔ اس واقعے سے تقریباً پچاس سال بعد جب روم کی فوجوں کو ایران نے شکست دی تو مکہ والے بہت خوش ہوئے۔[۲]

(۲) یمن کی وہ طاقتیں جو ابرہہ کی طاقت کے سامنے جھک گئی تھیں ابھریں اور انہوں نے شہنشاہ ایران (کسریٰ) سے مدد لیکر ابرہہ کے باقیماندہ اثرات کو یمن سے ختم کیا۔

(۳) یمن کی یہ ابھرنے والی طاقتیں اچھی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں ان میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تو کسریٰ نے براہ راست یمن کے ایک علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اور

---

[۱] لا تصیب شیئًا الاھشمتہ۔ ابن سعد ص ۵۶ [۲] ایٹم کی ایجاد کے بعد وہ ذہنی مرعوبیت ختم ہو جانی چاہیئے جو عقل پرستوں کو تاویل پر مجبور کیا کرتی تھی۔ [۳] ابن ہشام ج ۱ ص ۳۵ [۴] سورۃ روم کی ابتدائی آیتوں میں اس کی طرف اشارہ ہے

وہاں اپنا گورنر مقرر کردیا۔[1]

(۴) مذہبی لحاظ سے پورے عرب پر اس کا اثر یہ ہوا کہ عقیدتمندی کی زنجیریں اور مضبوط ہو گئیں۔ قریش جو کہا کرتے تھے کہ ہم "جار اللہ" (اللہ کے پڑوسی ہیں) عرب کو یقین ہو گیا کہ کعبہ یقیناً بیت اللہ ہے اور قریش یقیناً جار اللہ ہیں ان سے مقابلہ کرنا اور ٹکرانا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ٹکرانا ہے۔

(۵) یہ واقعہ ۵۷۱ء میں پیش آیا۔ اسی سال سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔ اس واقعہ کو علماء سیرت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا ارہاص (مقدمہ اور علامت) قرار دیا ہے۔ مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ واقعہ علامت سے زیادہ دعوت اسلام کے لئے غیر معمولی مشکلات کا باعث بن گیا اور اس واقعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کو کٹھن سے کٹھن تر اور دشوار سے دشوار تر کر دیا کیونکہ جس طرح عرب کی عقیدت قریش سے پختہ ہوئی قریش کو اپنی حق پرستی کا یقین ہو گیا۔ اسی واقعہ کے باقی ماندہ اثرات تھے کہ ابوجہل جیسے باطل پرستوں کے قائد اعظم نے غزوۂ بدر کے موقع پر دعا مانگی تھی اَللّٰھُمَّ ان کان ھذا ھو الحق من عندك الآیۃ سورہ انفال ۵۶ آیت ۳۲۔ یا اللہ اگر یہی دین (جس کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیش کر رہے ہیں) تیرے نزدیک حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا دردناک عذاب ہم پر نازل کردے (سورہ انفال) ابوجہل کی یہ دعا یقیناً اپنے حامیوں کو متاثر کرنے کیلئے پروپیگنڈا تھی مگر واقعہ اصحاب فیل کو سامنے رکھا جائے تو حامیانِ ابوجہل کا اس دعا سے متاثر ہونا بھی بے وجہ نہیں تھا۔ اس دعا کے وقت اگرچہ واقعہ اصحاب فیل کو پچپن سال گذر چکے تھے مگر اس کا یقین ذہنوں میں موجود تھا۔ کیونکہ اس واقعہ کے دیکھنے والے موجود تھے۔

---

[1] جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو کسریٰ کی طرف سے یمن کا گورنر باذان تھا جو دولت اسلام سے مشرف ہوا (ابو الفداء)

تصدیق کلام اللہ

اصحاب فیل کا یہ واقعہ جس طرح قادر ذوالجلال کی قدرت بے پایاں کا مظاہرہ تھا ایسے ہی قریش پر احسان عظیم بھی تھا۔ قریش خواب وخستہ تھے۔ مگر رب ذوالجلال کو ان سے کام لینا تھا۔ یہی قریش تھے جنہوں نے کچھ دنوں بعد دنیا کا چولا بدلا اور عالم انسانیت کو ایسے زیور سے آراستہ کیا جو اسی طرح بے مثال و بے نظیر ہے جس طرح تاریخ عالم میں اصحاب فیل کا واقعہ بے نظیر ہے۔

سورہ فیل میں اللہ تعالیٰ نے اسی احسان عظیم کا تذکرہ فرمایا ہے۔ خطاب اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (یا ہر اس شخص کو ہے جو قابل خطاب ہو) مگر روئے سخن قریش کی طرف ہے۔ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے الفاظ میں کسی قدر تشریح کے ساتھ یہ ہے۔

تو نے نہیں دیکھا، کیا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ
کیا نہ کر دیا ان کا داؤ غلط۔ اور بھیجے ان پر اڑتے جانور تنک تنک
(ٹکڑیاں بنا کر) پھینکتے ان پر پتھریاں کھنگر کی[1] (ٹھیکرے کی) پھر
کر ڈالا ان کو جیسے بھس ہو کھایا ہوا۔

ترجمہ کی تشریح کی ضرورت نہیں ہے البتہ جو عقل پرست اس کی تاویل کرتے ہیں کہ فوج میں چیچک کی وبا پھیل گئی تھی ان کو سمجھنا چاہیئے کہ ان سے زیادہ عقل پرست قریش تھے وہ معاند تھے جو اسلام کے دشمن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے درپے تھے۔ کلام اللہ کے کلمات اگر حقیقت کا مرقع نہ ہوتے اور ان میں کچھ بھی بناوٹ ہوتی تو قریش کے جہاندیدہ چالاک سردار آسمان سر پہ اٹھا لیتے اور یہ سورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تردید و تکذیب کے لئے بہترین حربہ ہوتی مگر کیا کوئی روایت ہے کہ اہل مکہ نے اس خداوندی

[1] یعنی یہ کنکریاں پتھر کی نہیں تھیں بلکہ ایسی تھیں جیسے مٹی کے برتن مثلاً گھڑے کے ٹھیکرے کی کنکریاں ہوتی ہیں۔

اعلامیہ کی تردید کی؟

سورہ فیل سے متصل دوسری سورت سورۂ قریش ہے۔

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اِیْلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ
فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ
جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ۔

حضرت شاہ صاحب نے سورت کا ترجمہ یہ کیا ہے:

اس واسطے کہ ہلا رکھا قریش کو (مانوس کرکے رکھا قریش کو) ہلا رکھنا (مانوس کرنا) ان کو کوچ سے جاڑے کے اور گرمی کے تو چاہیئے کہ بندگی کریں اس گھر کے رب کی جس نے ان کو کھانا دیا بھوک میں اور امن دیا ڈر میں۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قریش کو خاص طور سے حکم دیا ہے کہ وہ رب ھذا البیت کی عبادت کریں اور اس حکم کی معقولیت کے لئے وہ احسانات شمار کرائے ہیں جن کی تفصیل وہ ہے جو اس کتابچہ کے اوراق میں پیش کی گئی۔ مختصر یہ کہ

(۱) اس سورت میں سب سے زیادہ بیت پر زور دیا گیا ہے، یہاں تک کہ ذات معبود کے لئے اللہ یا رحمٰن کے بجائے "رب ھذا البیت" کا لفظ لایا گیا ہے۔ کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ عظمت قریش کے قلعہ معلّٰی کا سنگ بنیاد بیت ہی تھا (یعنی کعبہ)

(۲) یہی بیت تھا جس کی وجہ سے قریش کا اثر عرب پر قائم ہوا قریش نے بیت کی خدمت کی اور وہ عرب کے سرتاج بنے۔

(۳) قریش نے بیت اللہ کی زیارت کرنے والوں (حجاج) کی خدمت کی وہ پورے عرب میں محبوب ہوگئے۔

(۴) یہی محبوبیت تھی جس کی بنا پر پورے عرب کی پرآشوب درخوں آشام زمین ان کے

لئے امن کا گہوارہ بن گئی۔ چار ماہ کے بجائے پورے بارہ ماہ ان کے لئے حرم رہتے تھے۔ اور وہ بلاخطر جہاں چاہتے جاتے تھے۔

(۵) یہی عظمت تھی جس کی بنا پر وہ قیصر و کسریٰ اور نجاشی تک پہنچے اور ان سے تجارت کے پروانے حاصل کئے۔

(۶) اندرون عرب عربوں کی عقیدت اور ان کی ارادتمندی اور احسان شناسی اور بیرون عرب فرامین شاہی کی طاقت نے قریش کو موقع دیا کہ ان کا رہنما ہاشم۔ رحلۃ الشتاء اور رحلۃ الصیف کا طریقہ ایجاد کر سکا اور تجارت کو منظم کر سکا۔

(۷) مکہ اور اطراف مکہ میں غلہ عنقا تھا۔ شکار کا گوشت اور کھجور عام غذا تھی۔ رحلۃ الشتاء والصیف کی ایجاد نے ان کو موقع دیا کہ وہ واپسی کے وقت غلہ لا سکیں اور عرب کا فاقہ توڑ سکیں۔

(۸) کلبی کی تحقیق یہ ہے کہ ہاشم ابن عبد مناف پہلا شخص ہے جو شام کے علاقہ میں تجارتی قافلہ لے کر گیا اور وہاں سے گیہوں بھر کر لایا۔[1]

(۹) اسی سورت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد یہ ہے کہ قریش کی حالت نہایت ابتر تھی۔ وہ فاقہ کش تھے اللہ تعالیٰ نے ہاشم کو توفیق بخشی کہ انھوں نے رحلۃ الشتاء والصیف کا طریقہ ایجاد کیا، اب ان کو بہت کافی نفع ہوتا تھا۔ بڑے تاجر اپنے منافع غریبوں اور فقیروں کو تقسیم کر دیا کرتے تھے تو ان کے فقیر بھی امیروں کی طرح ہو جاتے تھے۔[2]

(۱۰) جب رحلۃ الشتاء والصیف سے تجارتی تعلقات دوسرے ممالک سے قائم ہو گئے تو پھر غلہ کی درآمد کے لئے ان قریشی قافلوں کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ بلکہ دوسرے ممالک خود غلہ بھیجنے لگے۔ یمن میں تبالہ اور جرش میں بہت غلہ پیدا ہوتا تھا، وہاں کے کچھ تاجر بحری راستہ سے بندرگاہ جدہ پر غلہ پہنچاتے تھے۔ کچھ تاجر خشکی کے راستہ سے براہ راست مکہ غلہ

---

[1] تفسیر مظہری تفسیر سورۃ قریش [2] ایضاً۔

پہنچاتے تھے اسی طرح شام کے تاجر بھی غلہ سپلائی کرتے تھے[1] یہ اونٹ اور خچر اور گدھے جن پر
خشکی کے راستوں سے غلہ آتا تھا، ان کا پڑاؤ محصب ہوتا تھا جس کو ابطح۔ بطحا اور خیف بنی کنانہ
بھی کہتے تھے[2] جو مکہ اور منیٰ کے درمیان ہے۔

یہ ہے اطعمہم من جوع (کھانا دیا بھوک میں) کا احسان عظیم۔

(۱۱) حرم کعبہ کا احترام اگرچہ حضرت اسمٰعیل و حضرت ابراہیم علیہما السّلام کے زمانہ سے چلا آرہا تھا اور اس وجہ سے حرم مکہ کے رہنے والے مامون رہا کرتے تھے۔ مگر جب رحلۃ الشتاء والصیف کے سلسلہ میں مامونیت کا تذکرہ ہے تو اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ قریش کے یہ سرمائی اور گرمائی قافلے مال لے جانے اور لانے میں راستہ کے قبائل کی جو خدمت کیا کرتے تھے اس حسن سلوک نے قریش کو خارج حرم ان قبائل کی حدود میں بھی محفوظ و مامون کر دیا تھا جن کا پیشہ ہی غارتگری تھا۔ عبادتِ رب کے حکم کی معقولیت سمجھانے کیلئے ان گیارہ احسانات کی طرف اس سورت (سورۂ قریش) میں اشارہ کیا اور ایک احسانِ عظیم وہ تھا کہ مکہ اور اہل مکہ کو اصحابِ فیل سے محفوظ رکھا۔ اس کی نوعیت چونکہ جداگانہ تھی کہ وہ دنیاوی اسباب سے بالا و برتر محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا معجزہ تھا تو اس کو مستقل سورت میں ذکر فرمایا اور بظاہر یہی حکمت ہے ان دونوں سورتوں کے متصل ہونے کی۔

واللہ اعلم بالصّواب

قبل مغرب یوم جمعہ ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ، ۱۲ جولائی ۱۹۶۸ء

---

[1] معالم التنزیل [2] معجم البلدان

سیرتِ مبارکہ

قرآن اور تاریخ کے آئینہ میں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

جو ظلم و ستم کی طاقتوں کی پوجا کرنے سے الگ رہتے ہیں اور اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ مستحق بشارت ہیں۔ پس خوش خبری دیدو میرے اُن بندوں کو جو کان لگا کر (پوری توجّہ سے) سنتے ہیں بات پھر اچھی سے اچھی بات پر چلتے ہیں (اور اسی کی پیروی کرتے ہیں) یہی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی (کامیابی کی راہ بتائی) اور یہی ہیں وہ جو اہل عقل (دانشمند) ہیں۔ (سورہ ۳۹ زمر آیت ۱۸)

ایک شخص کہہ رہا ہے

میری بات سنو۔ آپ کے کام کی بات کہہ رہا ہوں۔ میں اسی لئے کھڑا ہوں کہ آپ کو کام کی بات بتاؤں۔ میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ سنیں، سمجھیں اور سمجھ سے کام لیں۔

اب آپ کا اخلاقی فرض کیا ہوگا؟

ہم سب کو اللہ تعالیٰ اداء فرض کی توفیق بخشے

(مؤلف)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعاء اور ظہور دُعاء

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دُعائے خلیل و نوید مسیحا

حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہما الصّلوٰۃ والسّلام جب خانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو ان کے پاکیزہ دلوں سے یہ دُعا نکل رہی تھی:

اے ہمارے پروردگار! ہماری نسل میں جو قوم پیدا ہو۔
خداوندا اُن میں ایک رسُول مبعوث فرما جو خود اسی نسل کا ہو
جو اُن کے سامنے تیری آیتیں پڑھے۔ ان کو اللہ کی کتاب
اور حکمت و دانش کی باتیں بتائے اور ان کو سنوارے۔

(سورہ ۲ بقرہ آیت ۱۲۹)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا:

میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہیں آئے گا۔

(یوحنا کی انجیل باب ۱۶ فقرہ ۸)

جب وہ سچائی کی رُوح آئے گا۔ تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہیں کہے گا۔

لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں
دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اس لئے کہ مجھ ہی سے
حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا۔

(یوحنا کی انجیل باب ۱۶ فقرہ ۱۴، ۱۵)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ وکفٰی وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

محمدؐ - جس کی تعریف کی جاتی ہو

احمد - بہت تعریفوں والا *

یہ دو نام ہیں اُس ذاتِ پاکؐ کے جن کو مسلمان اللہ کا آخری نبیؐ مانتے ہیں۔ آپ کی نعت دلوں کی راحت ہے اور آپ کی تعریف سے ایمان کی شمع روشن ہوتی ہے، لیکن جو آپ کو نہیں پہچانتے وہ آپ کی تعریف سے پہلے آپ کی سیرت معلوم کرنا چاہتے ہیں

* یہ دونوں لفظ 'حمد' سے ماخوذ ہیں۔ حمد جس طرح تعریف کرنے کو کہتے ہیں ایسے ہی اس کے معنے پورا پورا حق ادا کرنے کے بھی ہیں۔ پس "محمد" جس کا حق پورا پورا ادا کر دیا گیا ہو۔ احمد جس نے پورا پورا حق ادا کر دیا۔ یعنی قدرت کی طرف سے نوعِ انسان کو باطنی اور رُوحانی کمالات کی جس منزل تک پہنچانا تھا جس کا نام محمدؐ رکھا گیا وہ اس کی آخری سرحد ہیں یعنی کمالاتِ انسانیت کا نقطۂ عروج۔ جس کا تقاضا معراج تھا جس کا شرف آپؐ کو عطا ہوا پس آپؐ من جانب اللہ "محمدؐ" ہیں اور بندہ اور عبد ہونے کے لحاظ سے انسان پر اپنے رب اور خالق کے حضور میں جو عبدیت اور نیازمندی لازم ہے۔ احمد نے اس واجبی حق کو عجز و انکسار اپنی نیازمندی۔ وفاداری اور اطاعت شعاری سے پورا پورا ادا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف آپ معصوم ہیں۔ تقویٰ۔ طہارت اور ہر طرح کے گناہ سے تحفظ اور عصمت آپ کی فطرت ہے چنانچہ آپ کو اور نہ صرف آپ کو بلکہ آپ کے رفقاء کو بھی مغفرت کی بشارت دیدی گئی۔ دوسری طرف تقاضاء عبدیت یہ ہے کہ دن کی چہل پہل کو آپ صوم وصال کی سخت جانی پر قربان کرتے ہیں اور رات کی نیند کو شب بیداری کے سوز و گداز پر۔ اس مخصوص نیازمندی کا مخصوص انعام یہ ہے کہ تہجد آپ پر فرض کیا گیا تاکہ روزِ محشر میں آپ وہ اعلیٰ ترین مقام حاصل کر سکیں جس کا نام مقامِ محمود ہے۔ پوری کائنات جس کی حمد و ستائش کرے گی اور جس پر تحسین و آفرین کی نذرِ عقیدت پیش کرے گی۔ (باقی برصفحہ آئندہ)

اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ کردار وعمل کے آئینہ میں آپ کے جمال باکمال کی زیارت کریں۔
اوراق کے اس مجموعہ میں آپ کی پاک زندگی کی مختصرسی تصویر اس لئے پیش کی جارہی ہے کہ
نہ جاننے والے جان سکیں اور جاننے والے عمل کے لئے کچھ سبق سیکھ سکیں۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے

حسن یوسف۔ دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

بلغ العلےٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ وآلہٖ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کما قال اللہ تعالیٰ ومن اللیل فتہجد بہ نافلۃً لک۔ عسیٰ ان یبعثک ربک مقامًا محمودًا۔

(سورہ ۱۷، اسراء (بنی اسرائیل) رکوع ۹۔ ج ۱۵۔

لہ عرب میں ان ناموں کا رواج نہیں تھا۔ مگر کاہنوں۔ نجومیوں اور کتب سابقہ کی بشارتیں چونکہ عام ہو چکی تھیں تو اس تمنا اور آرزو میں کہ شاید یہ سعادت اُن کے لخت جگر کو میسر آجائے کچھ لوگوں نے یہ نام اپنے لڑکوں کے رکھے تھے۔ مورخین نے ان کے یہ نام شمار کرائے ہیں۔ اُحیحہ بن الجلاح الاوسی۔ (۲) سلمۃ الانصاری (۳) البراء الکندی (۴) سفیان بن مجاشع (۵) حمران الجعفی (۶) خزاعی الاسلمی۔ ان لوگوں نے اپنے لڑکوں کے نام "محمد" رکھے تھے۔ لیکن نام "احمد" پھر بھی نرالا ہی رہا۔ یہ نام کسی نے نہیں رکھا۔ اور یہ بھی قدرت کا خاص کرشمہ ہے کہ یہ چھ مولود جن کے نام محمد رکھے گئے تھے ان میں سے کسی نے بھی "نبوت" کا دعویٰ نہیں کیا۔

(البدایہ والنہایہ ص ۳۵۹۔ ج ۲)

ظہور بشارتِ عظمیٰ

وقت - دن - تاریخ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو بشارت دی تھی "یَاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗ اَحْمَدُ"
میرے بعد ایک رسول آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔

۲۵ اپریل ۵۷۱ء کو اس جان آفرین بشارت کا ظہور ہوا۔[1]

صبح کا سہانا وقت تھا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ ہدایت و رحمت کا یہ آفتاب افقِ مکہ پر طلوع ہوا۔ ربیع الاوّل کی بارہ[1] تھی۔

شرافت اور انسانیت کے چمن میں آپ کی تشریف آوری
فصلِ گل کی آمد تھی تو آپ کی پیدائش بھی موسمِ بہار میں ہوئی

نام نامی | اس چہیتے بچہ کا نام دادا نے "محمد" والدہ نے "احمد"[2] رکھا۔ باپ (عبداللہ) کا انتقال دو مہینے پہلے ہو چکا تھا[3] ماں کا نام "آمنہ"

---

[1] مشہور یہی ہے۔ ھذا ھو المشھور عند الجمہور۔ البدایۃ والنہایہ ج ۲ ص ۲۹۰ مگر مورخین نے ۱۲ کے علاوہ اور تاریخیں بھی بیان کی ہیں۔ فلکیات کے ماہر علامہ محمود فلکی نے ۹ ربیع الاوّل صحیح قرار دی ہے۔ حضرت الاستاذ العلام المحدث مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ ان کے علاوہ علامہ شبلی رحمۃ اللہ نے بھی علامہ محمود فلکی کی تحقیق کو تسلیم کیا ہے۔ یعنی ۹ ربیع الاوّل۔ ۲۱ اپریل ۵۷۱ء۔

[2] روایت ہے کہ یہ نام اُن کے سوچے ہوئے نہیں تھے بلکہ دادا اور ماں کو ان ناموں کی بشارت خواب میں ہوئی تھی (سیرۃ ابن ہشام، خصائص کبریٰ وغیرہما۔

[3] تجارتی قافلہ میں شام گئے تھے غلہ لینے کے لئے۔ واپسی میں جب قافلہ مدینہ پہنچا تو عبداللہ بیمار ہو گئے۔ مدینہ کے مشہور قبیلہ بنی عدی بن نجار سے ننھیالی رشتہ تھا۔ عبداللہ یہیں ٹھہر گئے قافلہ والوں نے مکہ پہنچ کر خواجہ عبدالمطلب کو

(باقی بر صفحہ آئندہ)

تھا۔ اور دادا کا نام عبدالمطلب[1]۔ جو قریش کے سردار اور مکہ کے بڑے لوگوں میں سے تھے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عبداللہ کی بیماری کی خبر دی۔ عبدالمطلب نے اپنے بڑے لڑکے "حارث" کو مدینہ بھیجا۔ مگر عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ دارالنابغہ میں ان کو دفن کیا گیا۔ پچیس سال عمر ہوئی۔ ترکہ میں بکریوں کا ایک گلہ۔ پانچ اونٹ اور ایک باندی "اُم ایمن" چھوڑی (طبقات ابن سعد ص ۶۱ ج ۱)

[2] آمنہ کے باپ کا نام وہب تھا پسر عبد مناف پسر زہرہ پسر کلاب پسر مرہ۔ کلاب پر مادری اور پدری دونوں سلسلے جمع ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے دوسرا حاشیہ عبدالمطلب کے متعلق۔

لطیفہ۔ آمنہ کے چچا کا نام وُہیب تھا وہ اُنہیں کے یہاں رہتی تھیں۔ خواجہ عبدالمطلب وہیب کے پاس گئے اور عبداللہ کی شادی کا پیغام دیا۔ انہوں نے منظور کیا اور عقد ہو گیا۔ اسی موقع پر خواجہ عبدالمطلب نے بھی وہیب کی صاحبزادی سے جن کا نام ہالہ تھا اپنا پیغام دیا اور شادی کر لی۔ حضرت حمزہؓ انہیں ہالہ کے بطن سے ہیں ہالہ رشتہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ ہوئیں۔ اس بنا پر حضرت حمزہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خالہ زاد بھائی بھی ہوئے اور چچا بھی۔ (ابن سعد ص ۵۸ ج ۱)

[1] عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مُرہ بن کعب بن لُوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار۔ یہ سلسلہ نسب خود آنحضرتؐ نے ایک تقریر میں بر سر منبر ارشاد فرمایا تھا۔ البدایہ والنہایہ ص ۲۵۵ ج ۲۔ اس کے بعد کا سلسلہ واضح نہیں ہے اسی لئے علماء نے اس کو نقل کرنا بھی پسند نہیں کیا۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ کے سامنے کسی نے حضرت آدم علیہ السلام تک سلسلہ بیان کیا۔ مگر حضرت مالک رضی اللہ عنہ نے اس کا ثبوت طلب فرمایا تو جواب کچھ نہیں تھا اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک سلسلہ نسب کے متعلق بھی آپ نے ناپسندیدگی ظاہر کی کہ کوئی قابلِ اعتماد ثبوت نہیں ہے۔ البتہ عدنان تک سلسلہ نسب کو صحیح کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے عدنان سے آگے سلسلہ نسب بیان کیا جاتا تو فرماتے "کذب النسابون" (نسب بیان کرنے والے غلط کہتے ہیں) ان کی غلط بیانی کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما (باقی بر صفحہ آئندہ)

رضاعت و شیر خوارگی اور مرضعات

(دُودھ پلانے والی مامائیں)

زعم برتری اور خوش حالی کا ایک تکلف یہ تھا کہ بیگمات اپنے بچوں کو خود دودھ نہیں پلاتی تھیں۔ کچھ عرصہ بچہ ماں کے پاس رہتا تو دُودھ پلانے میں خاندان کی عورتیں یا باندیاں مدد کیا کرتی تھیں۔ پھر بچہ کو مستقل طور پر کسی ماما کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔

قریش کو اپنی زبان سے عشق تھا۔ وہ شخص قوم کا سردار نہیں مانا جا سکتا تھا جو فصیح نہ ہو بچپن ہی سے زبان کی حفاظت کی جاتی تھی اور بچوں کو فصیح عربی کا عادی بنایا جاتا تھا۔ مکہ شہر میں یہ ممکن نہیں تھا کہ بچے ٹکسالی فصیح عربی کے عادی ہوں۔ کیونکہ یہ ایک تیرتھ تھا جہاں غیر قریشی عرب جو فصاحت سے نا آشنا ہوتے تھے۔ ہمیشہ آتے رہتے تھے۔ یہاں قیام کرتے تھے۔ تجارت کے سلسلہ میں بھی آمد و رفت رہتی تھی اور زبان کے لحاظ سے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ یہاں عجمی (شام اور افریقہ وغیرہ کے غلام) بکثرت رہتے تھے ایک ایک گھرانے میں کئی کئی غلام ہوتے تھے۔ ان کی مخلوط عربی مضحکہ خیز ہوتی تھی اور بچوں کا واسطہ زیادہ تر انہیں غلاموں سے پڑتا تھا اس لئے قریش نے کچھ ایسے دیہاتی قبائل منتخب کر رکھے تھے جن کی زبان فصیح مانی جاتی تھی۔ انہیں قبائل کی عورتوں کو وہ اپنے بچوں کی "ماما" بناتے تھے۔ ان قبائل کی عورتیں مکہ میں آتیں اور بچوں کو لیجاتیں وہی دودھ پلاتیں اور وہی پرورش کرتیں۔ انہیں کی ٹکسالی عربی کے الفاظ بچوں کے کانوں میں پڑتے انہیں الفاظ کی ادائیگی کیلئے بچوں کی زبان پہلی مرتبہ ہلتی اور فصاحت گویا اُن کی گھٹی میں پڑ جاتی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نے اس آیت سے استدلال کیا۔ والذین من بعد ھم لا یعلمھم الا اللہ رسورۂ ابراہیم آیت ۹) یعنی جب اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہ فرماتے ہیں کہ قوم نوح و عاد و ثمود اور جو اُن کے بعد قومیں گذریں ان کو صرف اللہ ہی جانتا ہے تو اب ان ادوار اور قوموں کے متعلق ماہرین انساب کا دعویٰ واقفیت یقیناً غلط ہے ؎ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فخر یہ فرمایا کرتے تھے انا اعربکم انا قرشی و استرضعت

زبان کی حفاظت کے علاوہ صحت کے لحاظ سے بھی دیہات کی کھلی ہوا بچوں کے لئے مفید ہوتی تھی۔ اس سماجی رسم کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ بچوں کا نشوونما صحت مندانہ ہو۔[۱] اخلاق و خصائل کے لحاظ سے بھی یہ قبیلے پست نہیں تھے۔[۲] یتیم عبداللہ کے دورِ رضاعت کو خاندانی آداب کے اسی سانچے میں ڈھلنا پڑا۔ چنانچہ آپ کی والدہ نے تو صرف سات یا نو روز دودھ پلایا۔ پھر ابولہب[۳] کی آزاد کردہ باندی ثویبہ[۴] نے سات ماہ دودھ پلایا۔ ان[۵] کے علاوہ کچھ اور خواتین نے

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ) فی بنی سعد بن بکر۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۱۰۲ ج ۱۔ میں تم میں سب سے زیادہ خالص صحیح اور شستہ عربی بولنے والا ہوں۔ میں قریشی ہوں (جن کی زبان ٹکسالی ہوتی ہے) اور قبیلہ بنی سعد بن بکر میں میں نے دودھ پیا ہے، جو فصاحت زبان میں مقام اعلیٰ کا مالک ہے،، ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں لسانی لسان بنی سعد بن بکر (طبقات ج ۱ ص ۷۱) [۱] ماخوذ از سیرۃ ابن ہشام ص ۱۰۱ ج ۱۔ سیرۃ حلبیہ ص ۹۶ ج ۱۔ [۲] قبیلہ سعد جس سے حضرت حلیمہ اور ان کے شوہر حارث بن عبدالعزیٰ کا تعلق تھا۔ ثقیف کی ایک شاخ ہے جو بہادری شجاعت اور تیر اندازی میں مشہور تھا۔ اور شرافت میں قریش کے ہم پلہ مانا جاتا تھا۔ چنانچہ قریش نے اس کی رشتہ داریاں بھی کی تھیں۔ [۳] ابولہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوتیلے چچا۔ اصل نام عبدالعزیٰ تھا مگر چونکہ سرخ سپید رخسار انگارے کی طرح دہکتے تھے اس لئے ابولہب کنیت اختیار کی۔ (خصائص و سیرۃ ابن ہشام وغیرہ) اپنی تعریف مقصود تھی کہ انگارہ کی طرح چمکدار اور روشن۔ اتفاق سے یہ تعریف مذمت بن گئی۔ کیونکہ حسین اور روشن رخسار کے بجائے "ابولہب" دوزخی کو کہا جانے لگا۔ (معاذ اللہ) [۴] ابولہب کی باندی ثویبہ نے جب گوشۂ جگر عبداللہ کی ولادت کی خبر سنائی تو ابولہب نے اس خوشی میں اس باندی کو آزاد کر دیا۔ احادیث میں ہے کہ اس کارِ خیر کی وجہ سے ابولہب کے عذاب میں دوشنبہ کے روز تخفیف کر دی جاتی ہے (البدایہ والنہایہ ص ۲۷۳ ج ۲)۔ ثویبہ کچھ عرصہ پہلے حضرت حمزہ کو بھی دودھ پلا چکی تھیں جنہوں نے اسلام میں سید الشہداء کا خطاب پایا۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹے چچا تھے اور ثویبہ کے رشتے سے دودھ شریک (رضاعی) بھائی بھی ہو گئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلانے کے بعد ابوسلمہ کو دودھ پلایا۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی برہ کے فرزند ارجمند تھے یعنی پھوپی زاد بھائی پہلے سے تھے۔ اب دودھ شریک بھائی بھی ہو گئے۔ اسلام سے مشرف ہوئے۔ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں وفات ہوئی۔ الکمال فی اسماء الرجال و بخاری شریف ص ۷۰۵ وغیرہا [۵] ثویبہ کا لڑکا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دودھ پیا اس کا نام مسروح تھا

نام بھی لئے جاتے ہیں جنہوں نے دودھ پلایا۔ اس کے بعد آپ حضرت حلیمہ کے سپرد کئے گئے جو آپ کو قبیلہ بنی سعد میں لے گئیں۔ کم و بیش چار سال آپ نے اسی قبیلہ میں گذارے۔

یتیم بچہ اور کمزور ماما

جیسا کہ رواج تھا۔ دیہات کی عورتیں دودھ پینے والے بچوں کو لینے کے لئے مکہ میں آئیں مگر یتیم عبداللہ کو کسی نے قبول نہیں کیا کہ "بیوہ ماں" سے کچھ زیادہ انعام کی امید نہیں تھی۔ دادا اگرچہ سردار مکہ تھے مگر چراغ سحر تھے۔ قبیلہ سعد کی ایک عورت حلیمہ تھی وہ بھی "ماما" بننے کے لئے آئی تھی۔ مگر اس کو عورتوں نے اس لئے منظور نہ کیا کہ وہ فاقہ زدہ کمزور تھی۔ وہ خیال کرتی تھیں کہ یہ سوکھی عورت خود دودھ کی محتاج ہے۔ بچہ کو دودھ کیا پلائے گی۔ مگر نامرادی مراد بن گئی۔ جب حلیمہ سعدیہ سیدہ آمنہ کے پاس پہنچیں اور آمنہ کا لال اسے دودھ پلانے کے لئے مل گیا۔ حلیمہ کو شغل ہاتھ لگا اور آمنہ کی اپنی پڑوسنوں اور سہیلیوں میں آنکھ نیچی نہ ہوئی ورنہ انہیں صدمہ تھا کہ عورتیں کہیں گی کہ اس یتیم کو کوئی "ماما" بھی نصیب نہ ہوئی۔

بھاگوان بچے کی برکت قدرت کا یہ حیرت انگیز کرشمہ تھا کہ جیسے ہی حلیمہ کی گود اس یتیم موتی سے آراستہ ہوئی اس پر برکتوں کا مینہہ برسنے لگا۔ پہلے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ابن سعد ص ۶۷ ج ۱ ثویبہ کے اسلام میں علماء کا اختلاف ہے۔ حافظ ابو مندہ نے ثویبہ کو صحابیات میں ذکر کیا ہے ثویبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکی تکریم کرتے ہجرت کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ثویبہ کے لئے ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔ فتح خیبر کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا اور ان کے لڑکے مسروح کا بھی۔ فتح الباری ص ۱۱ ج ۹۔ ۵ تین لڑکیاں قبیلہ بنی سلیم کی تھیں جن میں سے ایک کا نام عاتکہ تھا۔ ایک خاتون کا نام ام فروہ تھا۔ ام ایمن کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ السیرۃ حلبیہ ص ۹۵ ج ۱۔

۱ ماخوذ از سیرۃ ابن ہشام و بیہقی و خصائص کبریٰ۔ ۲ قبیلہ سعد کی دس عورتیں آئی تھیں جن میں حلیمہ بھی تھیں ابن سعد ۳ الانوار المحمدیہ من المواہب اللدنیہ ص ۱۹۔ ۴ سیرۃ ابن ہشام و بیہقی و خصائص کبریٰ و الانوار محمدیہ۔

اس سوکھی فاقہ زدہ عورت کے دودھ سے اس کے بچے کا پیٹ بھی نہیں بھرتا تھا۔ اب دونوں شکم سیر ہونے لگے۔ گھر کی بکریوں کے تھنوں میں بھی دودھ بڑھ گیا۔ اور وہ گدھی جس پر حلیمہ سوار ہو کر آئی تھیں پہلے سُستی اور مریل تھی اور جب واپس ہوئی تو سب سے آگے آگے چل رہی تھی جیسے کسی پیاسے نے پانی دیکھ لیا ہو۔ بارش نہیں ہوئی تھی جنگل سوکھ رہے تھے۔ گاؤں کی بکریاں بھوکی آتی تھیں مگر حلیمہ کی بکریاں شام کو گھر آئیں تو کوکھیں تنی ہوئی ہوتی تھیں اور تھن لٹکے ہوئے۔

حلیمہ کو حیرت

حلیمہ کا اپنا بچہ بچوں کی طرح دودھ پیتا تھا مگر یہ یتیم بچہ صرف داہنا دودھ پیتا تھا۔ بائیں کو لب بھی نہ لگاتا تھا۔ حلیمہ بایاں دودھ دیتیں تو اپنا منھ ہٹا لیتا تھا۔ حلیمہ کو اس پر حیرت ہوتی، مگر اس کو کیا خبر تھی کہ یہ بچہ بڑا ہوگا تو قناعت کا معلم عدل و انصاف کا پیکر اور مساوات کا سب سے بڑا علمبردار ہوگا۔

یہ بچہ کچھ اور بڑا ہوا۔ نوالہ لینے لگا تو اس کی مرضی ہوتی تھی کہ جو اس کو ملے وہ اس کے دودھ شریک کو بھی ملے۔ بچے روتے ہیں کہ کوئی چیز دوسرے بچے کو کیوں دی اور یہ بچہ اس پر روتا تھا کہ جو چیز اس کو ملی وہ اس کی بہن کو کیوں نہیں ملی۔ اسی لئے آپ کے رضاعی چچا ابوثروان نے کہا تھا:

> مَیں نے آپؐ کا ہر دور دیکھا ہے اور ہر دور میں آپ کو سب سے بہتر پایا۔ زمانہ شیرخوارگی میں سب سے بہتر شیرخوار۔ دودھ چھوٹا تو سب سے بہتر فطیم[۲] جوان ہوئے تو سب سے زیادہ صالح نوجوان۔ آپؐ کے اندر خیر کی خصلتیں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہیں[۳]۔

---

[۱] فیا بی ان یثرب منه۔ ذکرہ ابن سبع فی الخصائص۔ خصائص کبری ص۵۹ ج۱

[۲] دودھ پینے والے بچے کو رضیع یا مرضع کہتے ہیں اور دودھ چھوٹ جائے تو فطیم کہتے ہیں۔

[۳] خصائص کبریٰ ص۵۹ ج۱۔

عجیب و غریب واقعہ اور حلیمہ کی پریشانی

چار سال ہو گئے یہ معصوم بچہ حلیمہ کے کلیجہ کو ٹھنڈک اور گھر کو رونق بخش رہا ہے۔ لیکن اب ماں کی مامتا چاہتی ہے کہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے پاس رکھے۔ یہی بیوہ کی زندگی کا آسرا تھا اور اسی کی خاطر وہ اپنی جوانی تج رہی تھی۔ اس گھر کو چھوڑ کر کسی دوسرے کا گھر آباد کرنے کا خیال بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ عرب کے دستور کے مطابق یہ عیب[1] کی بات نہیں تھی۔

مگر حلیمہ اور اس کے شوہر حارث بن عبدالعزیٰ کو اس بچہ سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ جدا کرنا ان کو گوارا نہیں تھا۔ لیکن جب ماں اور دادے کا تقاضہ زیادہ ہوا تو چار و ناچار یہ دونوں اپنے گھر کے اس چراغ کو لے کر عبدالمطلب کے یہاں پہنچے۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ انہیں دنوں میں مکہ میں وبا پھوٹ پڑی۔ بس حلیمہ کو بہانہ مل گیا۔ وہ بچہ کو واپس لے آئیں کہ جب مکہ کی آب و ہوا ٹھیک ہو جائے گی تب پہنچا دیں گی۔

شقِ صدرِ مبارک

دلارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر اسی طرح حلیمہ کے یہاں رہنے لگا۔ حلیمہ کے سب[2] بچے اس کا خیال رکھتے تھے۔ اس سے محبت کرتے تھے اور کہیں اکیلا نہیں چھوڑتے تھے۔

ایک روز گھر سے باہر یہ سب بچے کھیل رہے تھے انہوں نے دیکھا کہ دو آدمی آئے یہ بڑے حسین و جمیل خوبصورت اور شاندار آدمی تھے۔ نہایت عمدہ صاف لباس پہنے ہوئے۔ انہوں نے بچہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو اٹھایا اور اس کو الگ لے گئے۔ بچے دوڑتے ہوئے گھر پہنچے وہاں سے حلیمہ اور ان کے شوہر دوڑے ہوئے آئے۔ دیکھا "محمد" اپنی جگہ موجود ہیں اور کوئی آدمی وہاں موجود نہیں ہے۔ "محمد" خوش و خرم ہیں۔ مسکرا[3] رہے ہیں۔ البتہ چہرے

---

[1] بلکہ بیوہ رہنا عیب سمجھتے تھے۔ عرب میں اب بھی یہی رواج ہے۔ [2] حضرت حلیمہ کے اپنے بچے تین تھے۔ ایک لڑکا عبداللہ بن حارث اور دو لڑکیاں انیسہ اور حذافہ۔ حذافہ کو شیما بھی کہتے تھے اور حلیمہ کہیں چلی جاتی تھیں تو شیما ہی (حضرت) محمد کو ساتھ رکھا کرتی تھیں۔ سیرۃ ابن ہشام ص۱۰۱۔ [3] خصائص کبریٰ بحوالہ بیہقی و ابن عساکر۔

پر کچھ اثر[1] ہے۔ اُن سے پوچھا بیٹا کیا ہوا۔ کون آدمی تھے۔ وہ تمہیں کیوں اٹھالائے تھے۔ وہ کہاں چلے گئے۔

معصوم بچّہ نے بھولی بھولی زبان سے سارا قصہ سنا دیا۔ کہ ان دونوں نے مجھے لٹا کر یہاں سے یہاں تک (سینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) چاک کیا۔ پھر گوشت کا ایک لوتھڑا (دل) نکالا۔ اُس کو چیر کر سیاہ دانہ اس میں سے نکالا۔ برف اُن کے پاس تھا اُس سے دھویا۔ پھر اس کو اپنی جگہ رکھ دیا اور ٹھیک کر کے چلے گئے۔ مجھے تکلیف کچھ نہیں ہوئی۔ بلکہ ٹھنڈک سی معلوم ہوتی اور اب تک معلوم ہو رہی ہے۔

حلیمہ اور حارث نے بچّہ کو چمکارا۔ پیار کیا۔ سینہ سے لگا کر گھر لے آئے۔

حلیمہ اور اُن کے شوہر نے دیکھا وہاں کچھ نہیں تھا۔ البتہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دوسرے بچوں سے جو سنا تھا اس پر اُن کا خیال یہ ہوا کہ ہو نہ ہو یہ جنات کا اثر ہے اور یہ دونوں آنے والے جن تھے۔ عرب جنات کو مانتے تھے اور ایسی باتوں کو جنات کی حرکت سمجھا کرتے تھے۔ لیکن ان دونوں کو خیال رہنے لگا کہ آج یہ ہوا ہے کل کو خدا جانے کیا ہو جائے۔ کچھ دن اسی سوچ وچار میں گذرے۔ اس واقعہ کا چرچا ہوا تو کچھ پڑوسیوں نے حلیمہ اور حارث کو مشورہ دیا کہ کسی کاہن یا کسی یہودی یا عیسائی عالم کے پاس لے جا کر بچّہ کو دکھائیں اور پوچھیں یہ کیا بات ہے۔ چنانچہ ایک یہودی عالم کے پاس لے گئے مگر وہاں پہنچ کر جو واقعہ ہوا اس سے ان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

جس یہودی کے پاس لے گئی تھیں اُس نے بچّہ کو دیکھنے کے بعد شور مچانا شروع کر دیا "یہی بچّہ ہے جو عرب میں انقلاب برپا کرے گا اس وقت کے مذہبوں کو ختم کر دے گا۔ پوجا پاٹ بند اور مورتیوں کا کھنڈن کرے گا۔ اے لوگو! اپنا مذہب بچانا چاہتے ہو تو اس بچّہ کو ختم کر دو[2]"

---

[1] فنجدہ قائما منتقعا لونہ (سیرۃ ابن ہشام ص۱۰۳ ج۱) [2] سیرۃ ابن ہشام و ابن کثیر و خصائص کبریٰ وغیرہ۔

یہودی عالم کی یہ حرکت دیکھ کر حارث اور حلیمہ اور بھی گھبرا گئے۔ فوراً بچہ کو اٹھایا۔ نظروں سے بچا کر گھر لاتے اور طے کر لیا کہ بچہ کو خیریت کے ساتھ اس کی ماں اور دادے کے پاس پہنچا دیں۔ . . . آمنہ سمجھے ہوئے تھیں کہ حلیمہ "بچہ کو اپنے شوق سے لے گئی ہیں تو جب تک میں اصرار اور تقاضہ نہیں کروں گی وہ واپس نہیں لائیں گی۔ لیکن اچانک ایک روز دیکھا کہ حلیمہ بچہ کو لئے آرہی ہیں۔ آمنہ کو حیرت ہوئی۔ حلیمہ سے اس طرح اچانک لے آنے کی وجہ دریافت کی۔ حلیمہ نے سارا قصہ سنایا اور جو اُن کا خیال تھا وہ بھی بتا دیا کہ شاید بچہ پر کسی جن کی نظر ہے مگر حلیمہ کو حیرت ہوئی کہ آمنہ اس قصہ کو سن کر پریشان نہیں ہوئیں انہوں نے بچہ کو گلے لگایا اور حلیمہ کو جواب دیا کہ تمہارا خیال غلط ہے۔ میرا یہ پھول جس کے چہرے پر نور کھل رہا ہے اس پر جنات کا اثر نہیں ہو سکتا۔ یہ برکتوں والا بچہ ہے اس کے سر پر رحمت خدا کا سایہ ہے۔ میں رحمت کے آثار شروع سے دیکھتی رہی ہوں مجھے طرح طرح کے انوار نظر آتے رہے ہیں۔ جنات کے اثر سے دل پہ دہشت اور دماغ میں وحشت ہوتی ہے مگر مجھے جو آثار نظر آئے[1] اُن سے ہمیشہ دل کو سکون اور طبیعت کو بشاشت اور فرحت ہوئی ہے۔ بچہ کے چہرے پر بھی رونق ہے نور چمک رہا ہے۔ جنات کے اثر سے چہرہ مرجھا جاتا ہے اور بیماروں جیسی صورت ہو جاتی ہے۔ یہ تمہاری مہربانی ہے کہ بچہ کو لے آئیں۔ میرے دل کی مراد پوری ہوئی۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ آمنہ نے حلیمہ کو رخصت کیا اور دادا عبدالمطلب نے اس کو خوش کر کے واپس کیا۔

---

[1] مثلاً یہ کہ زمانۂ حمل میں طبیعت ہلکی پھلکی رہی۔ حتیٰ کہ مجھے احساس بھی نہیں ہوا مجھے خواب میں بتایا گیا کہ تم حاملہ ہو اور جو بچہ پیدا ہوگا وہ اُمت کا سردار اور نبی ہوگا۔ ابن سعد ص ۶۰ ج ۱۔ پہلے خواب میں دیکھا کہ ایک نور میرے اندر سے نکلا جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔ خصائص کبریٰ ص ۴۷۔ پھر ولادت کے وقت بھی ایسا ہی نور دیکھا (مسند احمد و مستدرک وغیرہ) فاطمہ بنت عبداللہ جو وہاں بوقت ولادت موجود تھیں انہوں نے دیکھا کہ تمام مکان نور سے روشن ہو گیا۔ (خصائص ص ۴۰ ج ۱ بحوالہ ابن عساکر)

گمشدگی اور عبد المطلب کی بے تابی

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (سورۂ ضحیٰ)

آپ کو پایا راستہ بھولا ہوا۔ پس راستہ بتا دیا آپ کو[1]

حلیمہ[2] ابھی پہنچا کر واپس نہیں ہوئی تھیں کہ آپ باہر نکلے اور راستہ بھول کر کہیں چلے گئے۔ تلاش کیا گیا۔ آپ نہیں ملے تو سب پریشان ہو گئے۔ اُس وقت بوڑھے اور غمزدہ دادا کی بے تابی عجیب تھی۔ اسی بے تابی میں وہ حرم میں پہنچے اور خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر دعا کرنے لگے۔ ابن سعد نے اس دعا (مناجات) کے چند شعر نقل کئے ہیں

لاھُمَّ اَدِّ راکبی محمّداً	اَدِّہ الیَّ واصطنع عندی یداً
خداوندا میرے سوار محمد کو پہونچا دے	اس کو میرے پاس پہنچا دے اور مجھ پر احسان فرما
انت الّذی جعلتہٗ لی عضداً	لا یُبعد الدھرُ بہٖ فیبعداً
تو ہی ہے جس نے اُسے میرا بازو بنایا ہے	اس کو کبھی بھی گردشِ زمانہ تباہی میں نہ ڈالے

انت الّذی سمیتہٗ محمّداً

تو ہی ہے جس نے اس کا نام محمد رکھا ہے

بہر حال یہ بے تابی بتقاضائے محبت تھی۔ تھوڑی دیر میں کسی نے آپ کو پہنچا دیا یا خود آپ پہنچ گئے۔ تو عبد المطلب نے گلے لگایا، پیشانی کو بوسہ دیا (ابن سعد ص۶۸ ج۱)

[1] حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں یہ واقعہ بیان کیا ہے (تفسیر مظہری)

[2] ایک روایت یہ بھی ہے کہ عبد المطلب کا اونٹ کہیں بھاگ گیا تھا تو انہوں نے پوتے کو بھی تلاش کرنے کے لئے بھیجا تھا آپ راستہ بھول گئے۔ جب آپ بہت دیر کے بعد ملے تو عبد المطلب نے گلے لگایا اور کہا آئندہ کبھی کسی کام کو نہیں بھیجوں گا۔ طبقات ابن سعد ص۶۸ ج۱۔

سیدہ آمنہ مدینہ میں

مدینہ منورہ جس کا نام اُس وقت یثرب تھا۔ سیدہ آمنہ کا وہاں ننہیالی رشتہ تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حلیمہ سعدیہ کے یہاں سے آ گئے تو تقریباً تیرہ سال بعد سیدہ آمنہ مدینہ گئیں۔ اپنے نورِ چشم لختِ جگر کو بھی لے گئیں اور خدمت کے لئے متوفیٰ عبداللہ کی باندی "ام ایمن" بھی ساتھ گئیں۔ وہاں دارالنابغہ میں قیام کیا۔ یتیم عبداللہ۔ آمنہ کا لال جس طرح حسن و جمال میں موتی تھا۔ اُس کی خصلتیں بھی سب بچوں سے نرالی تھیں۔ ذہین بچے شریر ہوتے ہیں مگر آمنہ کے اس جگر گوشہ میں ذہانت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی شرارت کا نام نہ تھا۔ ہر بات میں ادب اور تہذیب۔ ہر ایک کام سلیقہ کا۔ بھولی بھولی بات چیت بہت شیریں سمجھداری اور شرافت ایسی کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے، دوسروں سے تذکرہ کرتے وہ اس بچہ کو دیکھنے آتے تھے۔ مدینہ سے دو دو تین تین میل کے فاصلہ پر یہودیوں کی بڑی بڑی بستیاں تھیں وہاں بڑے بڑے عالم رہتے تھے۔ وہ آنے والے نبی کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے اور اُس کی آمد کے منتظر تھے۔ نجومیوں اور جوتشیوں (کاہنوں) کی باتیں بھی مشہور تھیں۔ اس بچہ کی خبر رفتہ رفتہ ان یہودیوں کو پہنچی تو وہ دیکھنے آنے لگے۔ کوئی دیکھ کر بچہ کی تعظیم کرتا اور کوئی ہکا بکا دم بخود رہ جاتا کہ جو باتیں آنے والے نبی کی ہیں وہ اس بچہ میں پائی جاتی ہیں پھر اپنی تنگ نظری سے جزبز ہونے لگتا کہ نبوت تو ہمارے خاندانوں کا حصہ ہے۔ قریش میں یہ بچہ کیوں پیدا ہو گیا اس طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ سیدہ آمنہ کو حلیمہ کی بات یاد آ گئی کہ وہ ایک یہودی کے پاس اس نونہال کو لے گئی تھیں تو اُس نے شور مچا دیا تھا کہ اس بچہ کو ختم کر دو ورنہ انقلاب برپا کر دے گا۔ تمہارے مذہب بدل دے گا۔ سیدہ آمنہ کو فکر ہوئی۔ انہوں نے مدینہ کا قیام مختصر کیا۔ صرف ایک مہینہ ٹھہریں۔ پھر اپنی آنکھوں کے نور، دل کے سرور کو لے کر مکہ روانہ ہو گئیں۔ لیکن اس یتیم بچہ کی انوکھی بات یہ بھی تھی کہ قدرت نے ابھی سے اس کو آزمانا شروع

کر دیا تھا۔ سیدہ آمنہ مدینہ سے چلیں تو طبیعت خراب ہو گئی۔ اب جیسے جیسے قافلہ چل رہا تھا ان کا مرض بڑھ رہا تھا۔ ایک مقام کا نام ابواء تھا۔ وہاں قافلے پڑاؤ کیا کرتے تھے۔ جب سیّدہ آمنہ یہاں پہنچیں تو مرض اور بڑھ گیا۔ آگے چلنے کی ہمت نہیں رہی، مکہ کے بجائے آخرت کیلئے رختِ سفر باندھ لیا اور دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہیں اُن کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ام ایمن ساتھ تھیں۔ وہ اس یتیم کو جو اب یسیر بھی ہو گیا تھا[1] لے کر مکّہ معظمہ آئیں۔ دادا کو خبر ہوئی تو بہت صدمہ ہوا

اس واقعہ سے تقریباً پچاس سال بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو آپؐ کو بچپن کی باتیں یاد تھیں۔ آپ بتایا کرتے تھے کہ یہاں ہم ٹھیرے تھے۔ یہاں والدہ کا قیام ہوا تھا۔ یہودی مجھے آ آ کر دیکھا کرتے تھے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ "بنی عدی بن نجار" کے محلہ میں ایک باولی تھی۔ میں اس میں تیراکی کی مشق کیا کرتا تھا۔ ام ایمن بیان کیا کرتی تھیں کہ مجھے خوب یاد ہے۔ یہودی کہا کرتے تھے کہ یہ بچہ اس امت کا نبی ہو گا۔ مکّہ سے ہجرت کر کے آئے گا یہ اس کا دارالہجرت ہے۔

اس ننھے معصوم کو غریب الوطنی اور سفر میں ماں کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ صدمہ بہت سخت تھا۔ مگر قدرت چپکے چپکے تسلی دے رہی تھی کہ

؎ جن کے رتبے ہیں ان کی سوا مشکل ہے

دادا عبدالمطلب کی سرپرستی اور وفات

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی[2]۔ (سورہ والضحیٰ)

یہ غم زدہ معصوم مکہ معظمہ پہنچا تو عبدالمطلب نے اپنے یتیم و یسیر پوتے کو چھاتی سے لگایا اور اپنے ساتھ رکھنے لگے۔ یہ معصوم بھی دادا سے لگ گیا اور اتنا کھل گیا کہ ان کے پاس جاتا

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۷۳۔ [2] کیا ایسا نہیں ہوا کہ اللہ نے آپ کو یتیم دیکھا تو ٹھکانا دے دیا۔ (مربّی اور سرپرست کھڑے کر دیئے۔)

توبلا تکلف اُن کی گدی پر بیٹھ جاتا تھا۔ خانۂ کعبہ کی دیوار کے نیچے ان کے لئے فرش بچھایا جاتا تھا۔ فرش پر عبدالمطلب بیٹھتے اور کنارے پر لڑکے بیٹھا کرتے تھے۔ مگر یہ معصوم "محمد" آگے پہنچ جاتے تھے۔ چچا تائے منع کرتے تھے۔ لیکن عبدالمطلب خوش ہوتے اپنے پاس بٹھا لیتے۔ کمر پر ہاتھ پھیرتے اور فرمایا کرتے تھے۔ یہ میرا بیٹا بہت بڑا آدمی ہوگا۔ اس کی خاص[۱] شان ہوگی۔ یہودی کہتے ہیں کہ یہ نبی[۲] ہوگا۔ اُم ایمن جن کو برکت کہتے تھے ان کو تاکید کیا کرتے کہ دیکھو برکت میرے محمد کا ہر وقت خیال رکھا کرو۔ کہیں باہر نہ جانے دیا کرو[۳]

لیکن عبدالمطلب چراغ سحری تھے۔ سو[۴] سال سے بھی زیادہ عمر ہو چکی تھی۔ صرف دو سال پوتے کی دیکھ بھال کر سکے۔ پھر ان کی وفات ہوگئی۔ اُم ایمن کہا کرتی تھیں کہ اس روز میں نے دیکھا کہ جنازے کے پیچھے "محمد" روتے جا رہے تھے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ آپ کو دادا کی وفات یاد ہے؟۔ فرمایا خوب یاد ہے میری عمر اُس وقت آٹھ سال تھی[۵]

خواجہ ابوطالب کی سرپرستی

انتقال کے وقت عبدالمطلب کے نو لڑکے تھے اور چھ لڑکیاں[۶]۔ پانچ لڑکیاں اور تین

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ص۱۰۱ [۲] طبقات ابن سعد ص۷۵ ج۱ [۳] ایضاً ص۷۵ [۴] ایک روایت ہے کہ ایک سو دس سال اور دوسری روایت میں ہے کہ ایک سو بیس سال عمر ہوئی۔ یہ بھی روایت ہے کہ بیاسی سال عمر ہوئی۔ حجون میں دفن کیا گیا طبقات ص۷۶ ج۱ [۵] ایضاً طبقات۔ [۶] حارث جو سب سے بڑے اور پہلے بیٹے تھے۔ حجل (یا جحل) لقب غیداق کیونکہ بہت سخی تھے۔ مقوم، ضرار، ابولہب۔ اصل نام عبدالعزیٰ، ابوطالب۔ اصل نام عبد مناف، زبیر، حمزہ، عباس۔ لڑکیاں۔ صفیہ۔ ام حکیم البیضاء۔ عاتکہ۔ امیمہ۔ اروی۔ برہ (سیرۃ ابن ہشام ص۹۹ ج۱۔ اولاد عبدالمطلب) صفیہ اور عاتکہ مسلمان ہوئیں۔ برہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ صفیہ کے علاوہ تمام لڑکیوں کی اور عبداللہ، ابوطالب اور زبیر کی والدہ ایک تھیں ان کا نام فاطمہ تھا۔ حضرت صفیہ حضرت حمزہ مقوم اور حجل کی والدہ کا نام ہالہ (باقی صفحہ آئندہ)

بھائی۔ ابوطالب۔ عبداللہ اور زبیر ایک ماں سے تھے۔ عبدالمطلب نے یتیم عبداللہ کو "ابو طالب" کے سپرد کیا۔ ابوطالب کو پہلے سے بھی اس بھتیجے سے محبت تھی۔ اب یہ محبت اور بڑھ گئی۔ بقول ابن عباس (رضی اللہ عنہما) اپنی اولاد سے زیادہ اس بھتیجے سے محبت کرتے تھے ابوطالب کو ایسی محبت کبھی کسی سے نہیں ہوئی تھی۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے۔ کہیں جاتے تو ساتھ لے جاتے۔ رات کو اپنے پاس لٹاتے تھے۔ دسترخوان بچھ جاتا سب بچے بیٹھ جاتے مگر ابوطالب اس وقت تک نوالہ نہ توڑتے جب تک ان کا چہیتا "محمد" نہ آجاتا تھا۔ محمد کی باتیں بھی ایسی تھیں کہ ابوطالب کے دل کو لبھاتی رہتیں۔ دسترخوان پر جب بچے اکٹھے ہوتے تو چیخ ویکار اور چھین جھپٹ کرتے، مگر یہ بھولے صاحبزادے "محمد" خاموش بیٹھے رہتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ انہیں کچھ بھی نہ ملتا۔ دوسرے بچے ہی جھپٹ لیتے تھے۔ ابوطالب نے "محمد" کا کھانا الگ کردیا مگر یہ بات محمد کی فطرت کے خلاف تھی کہ الگ کھائیں یا کوئی چیز ان کو مل جائے اور دوسروں کو نہ ملے اس لئے الگ کھانے پر "محمد" راضی نہ ہوئے۔ سب کے ساتھ ہی کھاتے اور اپنے کھانے سے زیادہ دوسروں کے کھانے سے خوش ہوتے۔ کبھی خود اپنے پاس سے اٹھا کر دے دیتے تھے۔

ابوطالب کو ایک اور تجربہ بھی ہوا تھا کہ جب "محمد" ساتھ کھاتے تو کھانے میں برکت ہوتی۔ تھوڑے سے کھانے سے سب کے پیٹ بھر جاتے۔ اور اگر کبھی کسی وجہ سے "محمد" شریک نہ ہوسکے تو زیادہ کھا کر بھی نیت نہیں بھرتی تھی۔ [۳]

ایک عجیب بات یہ بھی تھی کہ محمد ہر وقت صاف ستھرے رہتے۔ ابوطالب کے بچے صبح کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حارث کی والدہ کا نام سمراء اور ابولہب کی ماں کا نام لبنیٰ۔ ضرار اور حضرت عباس کی والدہ کا نام نتیلہ تھا۔ یہ سب خاندان قریش سے تھیں۔ سیرۃ ابن ہشام ص۶ ج۱ (اولاد عبدالمطلب) ابن سعد نے بارہ لڑکے شمار کرائے ہیں ان دس کے علاوہ عبدالکعبہ اور قثم کا اضافہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ حارث کا انتقال بھی باپ کے سامنے ہی ہوگیا تھا۔ نیز یہ کہ آئندہ نسل صرف دو کی چلی ابوطالب اور عباس کی ص۵۵

[۱] بدایہ ونہایہ ص۲۸۲ ج۲ [۲] ایضاً ص۲۸۳ ج۲ [۳] ایضاً ص۲۸۲ ج۲۔

اٹھتے تو کسی کی آنکھ جھکی ہوئی چہرہ پر سے جمے ہوئے، کسی کی ناک گندی مگر محمد کا مُنہ صاف جیسے کسی نے ابھی دھویا ہو۔ دانت موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے، چہرہ روشن۔ آنکھیں سرگیں۔ ناک پچھی ہوئی صاف۔ ناک کے بانسے پر نور چمکتا ہوا۔ [1]

قصہ کہانی کی مجلسیں

اُس زمانہ میں سینما تو نہیں تھے البتہ رات کو تفریحی مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ جن میں کہانیاں کہی جاتی تھیں۔ ڈرامے کی طرح سانگ بھرے جاتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقع پر ناچ گانے کی محفلوں کا خاص انتظام کیا جاتا تھا۔ بچے ان محفلوں میں شوق سے شریک ہوتے اور رات رات بھر جاگتے رہتے تھے۔ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خود اپنا بیان ہے کہ جس زمانہ میں مَیں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ تب دو مرتبہ مجھے بھی خیال آیا کہ کہیں چل کر کہانی سنوں۔ چنانچہ اپنے ساتھی کو میں نے تیار کیا کہ وہ میری بکریاں دیکھتے رہیں گے اور میں کہانی سننے چلا۔ راستہ میں گانے کی آواز کان میں پڑی۔ میں نے پوچھا یہ گانا اور باجا کیسا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ فلاں شخص کی شادی ہوئی ہے۔ اس لئے یہاں گانا بجانا ہو رہا ہے۔ میں کچھ ٹھٹکا اور وہیں بیٹھ گیا۔ لیکن بیٹھتے ہی ایسا سویا کہ جب مونھ پر دھوپ آگئی تب آنکھ کھلی۔ میں گھبرا کر اپنے گلہ کے پاس گیا۔ ساتھی نے کہا، بتاؤ کیا دیکھا۔ میں نے کہا کچھ بھی نہیں دیکھا اور سارا قصہ سُنا دیا۔ اس کے بعد پھر ایک مرتبہ میں بکریوں کا انتظام کر کے اسی ارادہ سے چلا۔ لیکن ایسا ہی واقعہ پھر بھی ہوا۔ میں کچھ سننے نہ پایا تھا کہ سو گیا۔ اور دھوپ لگنے پر آنکھ کھلی۔ تب بھی میں نے واپس ہو کر ساتھی کو یہی رُوداد سنائی اس کے بعد کبھی ارادہ تو کیا خیال بھی نہیں کیا۔ [2]

علمائے سیرت و تاریخ کا ایک متفقہ بیان ہے اس موقع پر اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کردار کے ساتھ جوانی کی منزل پر پہنچے کہ زمانۂ جاہلیت

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۲۸۳ ج۲ و ابن سعد ص۶۷ ج۱ و ص۱۱ ج۲۔ [2] البدایہ والنہایہ ص۲۸۷ ج۱ بحوالہ بیہقی۔ [3] طبقات ابن سعد ص۸۰ ج۱ ابن ہشام ص۱۱۵ ج۱ ابن کثیر ص۲۸۱ ج۱۔

کی باتوں سے اللہ تعالےٰ نے ہمیشہ آپ کو محفوظ رکھا۔ آپ ایسے نوجوان تھے کہ مروت میں سب سے افضل۔ شرافت کی باتوں میں سب سے اعلیٰ۔ اخلاق میں سب سے بہتر۔ میل جول میں نہایت شریف، جواب دینے میں نہایت مہذب اور باسلیقہ۔ گفتگو نہایت شیریں۔ سمجھ بوجھ میں سب سے برتر۔ نہایت بردبار۔ نہایت امانتدار۔ بات کے سچے۔ زبان کے پکے۔ ہر ایک بُرائی سے کوسوں دُور۔ ہر ایک کے خیرخواہ۔ کبھی کسی کو آپ سے تکلیف نہیں پہنچی۔ کبھی کسی کو سخت بات نہیں کہی۔ نہ کسی سے لڑائی۔ نہ کسی سے جھگڑا انہیں خوبیوں نے آپ کی قوم کو آپ کا گرویدہ بنادیا۔ آپ کی سچائی اور امانتداری نے لوگوں میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ آپ کو الامین الصادق کہیں اور اسی نام سے آپ کو یاد کریں۔

(۲)

اپنا تکفل خود اور دُوسروں کی مدد

اپنی زندگی خود بناؤ۔ اپنا بوجھ خود سنبھالو۔ دُوسروں کی مدد کرو

عبدالمطلب کی وفات کے بعد ابوطالب ان کے جانشین بنائے گئے۔ قبیلہ کے شیخ اور مکے ایک سردار مانے گئے۔ اس لحاظ سے عزت تو کافی تھی مگر دولت ناکافی۔ بڑا کنبہ

ہ عبدالمطلب کی وفات کے بعد آب زمزم کی تقسیم کرنے اور پلانے کی خدمت ابوطالب کے سپرد ہوئی تھی اس خدمت کے انجام دینے میں رقم بھی خرچ کرنی پڑتی تھی ابوطالب خرچ کرتے رہے۔ لیکن نبھا نہیں سکے ایک مرتبہ مصارف کے لئے اپنے بھائی عباس سے ایک سال کے وعدہ پر دس ہزار قرض لئے۔ سال ختم ہوگیا یہ قرض ادا نہ ہوسکا تو اگلے سال پھر عباس سے قرض لینا پڑا۔ اس مرتبہ چودہ ہزار کا خرچ تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس شرط پر قرض دیا کہ اگر ادا نہ کرسکے تو پھر یہ خدمت میں اپنے ذمہ لے لوں گا۔ ابوطالب نے یہ شرط منظور کرلی لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ پورا سال گذر گیا ادائے قرض کی کوئی صورت نہیں بن پڑی اور یہ خدمت حسب قرارداد حضرت عباس کے حوالہ ہوگئی۔ البدایہ والنہایہ ص ۲۴۷ ج ۲۔

عیال کثیر[1] آمدنی کا ذریعہ محدود۔ یتیم عبداللہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے سپرد ہوئے تو اگرچہ یہ یتیم عمر عزیز کی ابھی آٹھویں منزل ہی طے کر رہا تھا۔ مگر چچا کی پریشان حالی کے احساس نے اس کو اس ننھی سی عمر میں ہی فکر مند بنا دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اپنے مربی چچا کی مدد وہ کس طرح کر سکتا ہے مگر مکہ میں نہ کوئی دستکاری تھی نہ کوئی سرکار جس کی نوکری کی جا سکے، اس زمانہ کی دنیا کارخانوں سے بھی آشنا نہ تھی۔ اور مکہ کی پتھریلی اور ریتلی زمین اور آس پاس کے جھلسے ہوئے کالے اور بھوسلے پہاڑوں کو کسی چشمہ یا دریا کی سیرابی بھی میسر نہ تھی کہ وہاں کھیتی باڑی ہو سکے۔ البتہ بھیڑ بکری اور اونٹ یہاں بکثرت تھے اور قدرت نے اُن کا چارہ یعنی ببول کے درخت اور اذخر جیسی گھاس بھی وہاں پیدا کی تھی انہیں مویشی کے گلے اس زمانہ کی قیمتی دولت تھے اور جن کے پاس یہ دولت تھی وہ ان کے چرانے اور دیکھ بھال کے لئے مزدور اور اجیر بھی رکھا کرتے تھے یہ گلہ بانی سوسائٹی کی نظر میں کچھ بھی حیثیت رکھتی ہو مگر آمدنی اور گذر کا ایک جائز ذریعہ تھی۔ سردار قریش عبدالمطلب کے یتیم پوتے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسی ذریعہ کو اختیار کیا اور اُس کے ننھے سے وجود کے لئے اونٹوں کی گلہ بانی مشکل تھی تو بکریاں چرانے کی مزدوری کرنے لگے۔ اس طرح اپنی زندگی خود بنالی اور نہ صرف یہ کہ اپنا بوجھ خود سنبھالا بلکہ پریشان حال چچا کی مدد بھی کرنے لگے۔

مکہ تجارتی نقطہ نظر سے

مکہ کی زمین اگرچہ پیداوار کے قابل نہیں تھی۔ مگر تجارتی کاروبار کے لئے نہایت موزوں تھی۔ یہاں مشرق

---

[1] پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں۔ سب سے بڑے لڑکے طالب تھے جو جنگ بدر کے بعد لاپتہ ہو گئے۔ اُن سے چھوٹے عقیل جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوتے اُن سے چھوٹے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ جو غزوۂ موتہ میں شہید ہوتے۔ اُن سے چھوٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ چہارم ہر ایک بھائی دوسرے سے دس سال چھوٹا لڑکیوں کے نام یہ تھے۔ حضرت اُم ہانی جن کا اصل نام ہند تھا۔ جمانہ۔ ربطہ اور اسماء۔ ان سب کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھیں۔ یعنی ابو طالب کی چچا کی لڑکی۔ ایک دوسری بیوی علہ تھیں پانچواں لڑکا طلیق نام اُن کے بطن سے تھا۔ ابن سعد ج ۱ ص ۷۷۔

مغرب کے ڈانڈے ملتے تھے۔ ایران و عراق۔ یمن۔ شام اور افریقہ کے تجارتی تعلقات کی درمیانی کڑی یہی شہر تھا۔ قریش اس قدرتی نعمت کو پہچانتے تھے اور جہاں تک اُن کی گنجائش تھی وہ اس سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔

بعثت نبوی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی بنائے جانے) سے تقریباً دو سو برس پہلے قریش کے مشہور اور ممتاز سردار ہاشم[1] نے رحلت الشتاء والصیف (سردی اور گرمی کے موسم کے دو کوچ) کا دستور ڈال دیا تھا۔ گرمیوں میں مکہ والوں کے تجارتی قافلے شام اور انقرہ جاتے تھے۔ جہاں اس زمانہ میں ٹھنڈ ہوتی تھی، خوشگوار موسم، صحت بخش آب و ہوا

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب کے والد کو دولت کے ساتھ خدا نے حوصلہ بھی بے پناہ دیا تھا۔ حج کے موقع پر آپ حاجیوں کو گوشت اور روٹی کھلایا کرتے تھے جو کھجور اور شکار پر زندگی بسر کرنے والے عربوں خصوصاً بدوؤں کے لئے بہت بڑی نعمت ہوتی تھی۔ روٹیوں کے ٹکڑے شوربے میں ڈلوا دیا کرتے تھے اور وہ تقسیم کرایا کرتے تھے اسی وجہ سے ان کو لوگ ہاشم کہنے لگے تھے کیونکہ ہشم کے معنے چورنے کے آتے ہیں (سمّی هاشماً لهشمه الثريد مع لحمه لقومه فی سنی المحل) ایک مرتبہ عرب میں قحط تھا تو شام سے خبز (بسکٹ) بوروں میں بھروا کر لائے اور شوربے میں چور کر ثرید بنا کر حاجیوں کو کھلایا اور نہ صرف حاجی بلکہ سب مکہ والوں کو کھلایا۔ قحط کے زمانہ میں ایک عرصہ کے بعد اس وقت لوگوں نے سیر ہو کر کھایا (طبقات ابن سعد ج۱ ص۴۳ و ابن ہشام وغیرہما) ہاشم ہی نے قریش کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ تمام حاجیوں کو وہ اپنا مہمان سمجھیں اور حج کے زمانہ میں اُن کے کھانے کا انتظام وہ اپنے چندہ سے کیا کریں قریش نے اس کو منظور کیا اور وہ جس طرح سال بھر کماتے تھے اس موقع پر دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ اس مشترک انتظام میں بھی ہاشم کا حصہ سب سے ممتاز رہتا۔ ۸ ذی الحجہ سے ۱۲ تک تقریباً ایک ہفتہ تک ان کی طرف سے دعوت ہوتی تھی جس میں کبھی گوشت روٹی اور کبھی گھی اور روٹی کھانے کے لئے اور ستو۔ کھجور ناشتہ میں پیش کیا کرتے تھے۔ چمڑے کے بڑے بڑے حوضوں میں پانی بھروا دیتے تھے۔

کا لطف بھی اٹھاتے اور تجارت بھی کرتے اور سردیوں میں یہ قافلے حبشہ اور یمن جاتے تھے۔ ہاشم اور اس کے بھائیوں نے مختلف[1] ممالک سے عربوں کیلئے آزاد تجارت کے سارٹیفکٹ (پروانے) بھی حاصل کر لئے تھے۔ عرب میں قریش کی عظمت کا ایک بڑا سبب یہ تجارتی اقتدار بھی تھا۔

(حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عمر نے ترقی کی اور اس قابل ہوئے کہ تجارتی قافلہ کے ساتھ سفر کر سکیں تو آپ نے اس شریف پیشہ کو اپنانا چاہا۔ لیکن روپیہ آپکے پاس نہیں تھا تو آپ نے دوسروں کے سرمایہ سے تجارت شروع کر دی۔ بیرونی تجارت میں بھی حصہ لیا اور جیسا کہ (عبد اللہ بن ابی الحمس) کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے آپ مکہ میں گھوم پھر کر بھی کاروبار کیا کرتے تھے۔ تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمایئے۔ یہی دور تھا جب آپ نے چچا ابوطالب کی مستقل مدد یہ کی کہ نونہال "علی" کے مصارف سے ان کو سبکدوش کر دیا۔ اُن کو اپنے ساتھ رکھا اور جملہ مصارف کے ذمہ دار خود ہو گئے[2]

قومی خدمت کا جذبہ

بچپن کا یہی معصوم دور جس کی خودداری نے اس معصوم نونہال کو گلہ بانی پر آمادہ کیا تھا۔ فطری طور پر قومی خدمت کے جذبہ سے معمور تھا۔

کعبہ عربوں کا قومی اور مذہبی نشان تھا۔ چونکہ وہ پہاڑوں کے نشیب میں واقع ہے

---

[1] ہاشم نے شام، روم (اٹلی) اور غسان کے بادشاہوں سے، عبد شمس نے شاہ حبشہ (النجاشی اکبر) سے، نوفل نے (اکاسرہ) فارس کے بادشاہوں سے اور مطلب نے ملوک حمیر (شاہان یمن) سے امان اور تجارتی اجارہ (پروانہ) حاصل کر لیا تھا۔ اسی لئے ان بھائیوں کو "مجیرون" کہا جاتا تھا۔ (بدایہ و نہایہ صفحہ ۲۵۳ ج ۲)

[2] اس سال قحط تھا۔ گرانی بہت تھی تو وقتاً فوقتاً ابوطالب کی جو کچھ امداد فرمائی ہو گی اس کے علاوہ مستقل امداد یہ تھی کہ حضرت علیؓ کے مصارف کے ذمہ دار ہو گئے (البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۵) ایک روایۃ یہ بھی ہے کہ آپ نے حضرت علیؓ کی ذمہ داری لی اور آپ کے چھوٹے چچا عباس نے حضرت علیؓ کے بڑے بھائی جعفر کی۔ رضی اللہ عنہم۔ سیرت حلبیہ ج ۱ صفحہ ۲۸۵۔

تو جب بھی زور دار بارش ہوتی تھی سیلاب کی دھاریں اس کو چھوتی رہتی تھیں اور کبھی کبھی اس کو نقصان پہنچا دیا کرتی تھیں۔

مکہ اگرچہ ساحل سمندر سے صرف چالیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ مگر مان سون اُس طرف نہیں جاتا۔ برسات تو وہاں ہوتی ہی نہیں۔ بارش بھی کبھی کبھی ہوتی ہے۔ بسا اوقات کئی کئی سال گزر جاتے ہیں۔ بارش کی ایک بوند نہیں برستی۔ اور کبھی ایسی زور دار برستی ہے کہ مکہ میں طوفان آجاتا ہے۔ اس وقت کا ایک واقعہ ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تقریباً دس سال ہوگی کہ مکہ کی پہاڑیوں پر زور دار بارش ہوئی۔ پھر سیلاب بھی ایسے زور کا آیا کہ کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچ گیا۔ سیلاب اُترا تو کعبہ کی مرمت شروع کی گئی۔ سن رسیدہ اور نوجوان رضا کار اپنے اس قومی نشان کی مرمت کر رہے تھے تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک بچہ بھی نوجوانوں کی طرح سرگرم ہے اور اگرچہ بساط کچھ بھی نہیں مگر جذبہ اور شوق کا یہ عالم ہے کہ بھاری بھاری پتھر مونڈھے پر اٹھا رہا ہے اور کعبہ کی دیوار تک پہنچا رہا ہے۔ مونڈھے پتھروں سے چھلے جا رہے ہیں، بوجھ اٹھانے سے سانس چڑھ رہا ہے مگر اس کے ولولہ میں کوئی فرق نہیں آرہا۔

یہ بہادر بچہ وہی ہے جسے "محمد" کہا جاتا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

شرم و حیا

اس فلمی دور میں شرم و حیا ایک مذاق کی چیز بن گئی ہے۔ مگر دنیائے اخلاق میں یہ بہت قیمتی چیز ہے۔ کیونکہ یہ درحقیقت اُس خصلت کا نام ہے جو انسان کو ایسی باتوں سے روکے جو انسانیت اور شرافت کی نظر میں معیوب مانی جاتی ہیں۔

سیدنا "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فطرت کو جو شرم و حیا کی جنس گرانمایہ عطا ہوئی تھی اس کا ایک نمونہ اس موقع پر دیکھنے میں آیا۔

کعبہ کی مرمت کے سلسلہ میں جب آپ پتھر اٹھا رہے تھے تو آپ کے چھوٹے چچا "عباسؓ" جو آپ سے دو سال بڑے تھے وہاں موجود تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ بے ڈول اور نوکیلے پتھروں سے اُن کے معصوم بھتیجے "محمد" کے مونڈھے چھلے جا رہے ہیں۔

نیم وحشی عربوں میں برہنگی زیادہ معیوب نہیں تھی۔ وہ بسا اوقات اپنے عقیدہ کے مطابق حج جیسے مقدس فرض کو ادا کرتے ہوئے خانہ کعبہ کے قریب (جو اُن کے نزدیک سب سے زیادہ دلجب الاحترام مقام تھا) مادر زاد برہنہ ہو جاتے تھے۔ عقیدہ یہ تھا کہ جن کپڑوں میں سال بھر گناہ کرتے رہے ہیں۔ انہیں کپڑوں میں یہ مقدس فرض انجام دینا صحیح نہیں ہے۔

بہر حال "عباس" کو بھولے بھالے معصوم بھتیجے پر ترس آیا اور یہ چاہا کہ کوئی کپڑا بھتیجے کے مونڈھے پر ڈال دیں۔ کوئی اور کپڑا انہیں ملا تو اپنے یہاں کے عام دستور کے مطابق انہوں نے ارادہ کیا کہ بھتیجے کی "لنگی" کھول کر مونڈھے پر رکھ دیں مگر اتنی سی برہنگی بھی اس شرمیلی اور باحیا فطرت کیلئے ناقابل برداشت تھی جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عطا ہوئی تھی۔ چنانچہ ابھی لنگی کھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ اس "برادر زادہ" سعید کی حالت غیر ہونے لگی۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور ایک ایسی اضطرابی صورت پیدا ہو گئی کہ عباس گھبرا گئے اور لنگی جوں کی توں باندھ دی۔[1]

اسی قسم کا ایک واقعہ اس سے پہلے کا ہے جو آپ نے خود بیان فرمایا کہ بچے کھیل رہے تھے، میں بھی وہاں موجود تھا۔ اسی کھیل میں بچے پتھر اُٹھا اُٹھا کر ایک جگہ لیجانے لگے۔ پتھر اٹھاتے ہوئے انہوں نے لنگیاں کھول لیں اور برہنہ ہو گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی لنگی کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا کہ کسی شخص نے زور سے ڈانٹا۔ لنگی باندھو ایسی ڈانٹ میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔ میں نے فوراً لنگی باندھ لی[2]

غیر اللہ کی پرستش سے پرہیز

یہ عجیب بات ہے کہ مکہ کے باشندے بے دینی اور مذہب سے آوارہ ہونیکے باوجود آپنے آپ کو مذہبی سمجھتے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت عیسائیوں اور یہودیوں کے نزدیک مسلم تھی کیونکہ

---

[1] ماخوذ از سیرۃ ابن ہشام وغیرہ [2] سیرۃ ابن ہشام ص ۱۱۱ اس روایت میں لکمنی لکمۃ ہے جس کے معنیٰ ہیں میرے مکہ مارا۔ واللہ اعلم۔ یہ بھی یاد رہے کہ بلا ضرورت لوگوں کے سامنے ننگا ہو جانا گناہ ہے اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو بچپن میں بھی گناہوں سے پاک و صاف رکھتا ہے۔ یہ اسی کی مثالیں ہیں۔ واللہ اعلم۔ محمد میاں۔

عیسائی اور یہودی جو عام طور پر بنی اسرائیل تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں تھے۔ وہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نسلی اعتبار سے مورث اعلیٰ مانتے تھے ایسے ہی مذہبی اعتبار سے بھی ان کو اپنی ملت کا بانی مانتے تھے یہی حال اس زمانہ میں عربوں کا بھی تھا۔ کیونکہ عرب عموماً اور قریش خصوصاً حضرت ابراہیم کے بڑے فرزند یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد تھے۔ اس نسلی رشتے کے علاوہ خانہ کعبہ اور خود مکّہ شہر حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی تاریخی یادگار تھے۔ قریش خانہ کعبہ کے محافظ اور متولّی بھی تھے جس کی بنا پر تمام عرب ان کی تعظیم کرتے تھے اس لحاظ سے مکّہ والوں کے لئے مذہبیت ایک لازمی چیز تھی۔ مگر ان کی یہ مذہبیت شرک اور اوہام پرستی کا جال بن کر رہ گئی تھی ایک طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا نام زبان پر تھا، جنہوں نے شرک کے خلاف توحید کا جھنڈا بلند کیا تھا اور دوسری طرف حالت یہ تھی کہ حرم کعبہ میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے اور ان کے علاوہ ہر ایک قبیلہ کا دیوتا اور اس کا بُت الگ الگ تھا۔

شرک کی اس گرم بازاری میں کسی بچّہ کا غیر اللہ کی پرستش سے بچنا ناممکن تھا۔ مگر جس کو قدرت نے وہ سنجیدگی عطا فرمائی تھی جس نے اسکو کھیل۔ تماشے اور قصہ گوئی کی محفلوں سے الگ رکھا جو برہنگی کے تصور سے بھی لرز جاتا تھا۔ وہ عبادت کے معاملہ میں یہ بے جوڑ بات اور یہ مذاق گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توحید پرستی کے قصے سنے اور دوسری طرف اپنی پیشانی غیر اللہ کے سامنے جھکا دے۔

ایک وقت اپنے ہاتھ سے مورتی بنائے اور دوسرے وقت اسی مورتی کے سامنے ماتھا ٹیک دے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ کبھی آپکی گردن غیر اللہ کی عبادت کے لئے نہیں جھکی۔

جس فطرتِ سلیم نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو سمجھا دیا تھا کہ چاند سورج اور آسمان کے چمکدار تارے جن کو ان کی قوم معبود مانتی ہے، ہرگز قابلِ پرستش نہیں ہیں کیونکہ انسان کی طرح

رات دن کی تبدیلیوں کا اُن پر بھی اثر ہوتا ہے بلکہ وہ انسان سے زیادہ پابند اور بے بس نظر آتے ہیں جو پابند ہو جس پر رات دن کی تبدیلیوں کا اثر ہوتا رہتا ہو۔ وہ معبود نہیں ہو سکتا۔

اسی فطرتِ سلیم نے پاک طینت "محمد" صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوش سنبھالتے ہی بتا دیا تھا کہ جس کو انسان خود بنائے وہ معبود نہیں ہو سکتا، نہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ انسان اس کے سامنے گردن جھکائے یا ماتھا رگڑے۔

بتوں کو چھُونے سے پرہیز

لوگ خانہ کعبہ کا طواف جب بھی کیا کرتے تھے۔ وہاں پیتل کے دو بُت[1] اِساف اور نائلہ تھے، طواف کرنے والے ان کو بوسہ دیا کرتے تھے اور ان پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے غلام زید بن حارثہ نے اپنے بیٹے (حضرت اسامہ) کو واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ بچپن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طواف کر رہا تھا۔ چکر لگاتے ہوئے جب ہم اساف اور نائلہ کے پاس پہنچے تو میں نے چاہا کہ میں بھی انہیں چھوؤں۔ حضرت "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منع فرما دیا۔ اگلے چکر میں میں نے نظر بچا کر چھو لینا چاہا۔ اور چھو بھی لیا۔ مگر آپ کی جیسے ہی نظر پڑی آپ نے سختی سے ڈانٹا، میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا۔[2]

---

[1] یہ مرد اور عورت کے دو مجسمے ساتھ ساتھ تھے جن کو پُوجا کرتے تھے اور ان پر بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ خاص کعبہ مکرمہ میں فحش حرکت کرتے ہوئے مسخ کر دیئے گئے تھے۔ عجائب پرستی کی انتہا تھی کہ جب پتھر بن گئے تو ان کی پُوجا شروع کر دی گئی (اخبار مکہ۔ ازرقی ص ۱۲۱ ج ۱) [2] بدایہ ونہایہ ص ۲ ج ۲۰ بروایت بیہقی)

دَورِ شباب اور جوہری کردار

تجارت۔ نکاح۔ ہمدردی خلق۔ قومی لقب۔ امانت سچائی
معاملہ کی صفائی۔ وعدہ کی پختگی۔ نرم بات چیت۔ احترام انسانیت

تجارت

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰى[1] (سورۂ والضحیٰ)

اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو پایا نادار پس مالدار بنا دیا۔

نوخیز و نوجوان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) گلہ بانی سے آگے بڑھ کر میدانِ تجارت میں آئے تو آپ کے تعلقات وسیع ہوئے۔ لوگوں کو آپ کے آزمانے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو زیادہ قریب سے دیکھا وہی آپ کے سب سے زیادہ گرویدہ ہو گئے اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ صرف دس بارہ سال کے عرصہ میں آپ کی غیر معمولی امانت داری۔ راستبازی اور سچائی نے سب ہی مکہ والوں کو یہاں تک موہ لیا کہ وہ آپ کا نام لینا بے ادبی سمجھنے لگے۔ یہی مکہ کے بڑے بڑے تاجر اور سیٹھ جن کو اپنی دولت پر ناز تھا، جن کو اپنے بین الاقوامی تعلقات پر فخر تھا کہ اُن کے تجارتی قافلے شام، یمن، فارس وغیرہ جاتے رہتے ہیں۔ افریقہ کے بازاروں میں اُن کا لین دین رہتا ہے۔ ان ملکوں کے امیروں اور بادشاہوں سے اُن کی راہ و رسم ہے، ان سے اپنی بات منوا سکتے ہیں، یہی رؤسا، قریش جو اپنے سوا کسی کو نظر میں نہیں لاتے تھے جو دوسروں کی گردنیں اپنے سامنے جھکوانا چاہتے تھے، جن کے مشاعروں کی جان اُن کے وہ

[1] اور پایا تجھ کو مفلس پھر مفلوظ کر دیا (حضرت شاہ عبدالقادر صاحب)

فخریہ قصیدے ہوا کرتے تھے، جن میں وہ اپنی عظمت اور بڑائی کے ترانے گاتے اور کوئی ان کی توڑ کرتا تھا تو لڑ پڑتے تھے۔ یہاں تک کہ خونریز جنگ کی نوبت آجاتی تھی۔ دنیا جانتی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ "یتیم عبداللہ" کی غیر معمولی سچائی اور امانتداری نے ان سیٹھوں اور رئیسوں کو یہاں تک متاثر اور گرویدہ بنا دیا تھا کہ وہ آپ کو "الصادق" یا "الامین" ہی کہتے تھے۔ نام لینا بے ادبی سمجھتے تھے۔ یہ دو لفظ یہاں تک زبانوں پر چڑھ گئے کہ انہوں نے قومی لقب کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

مورخ حیران رہ جاتا ہے کہ وہ کردار اور وہ کیرکٹر کس درجہ بلند ہوگا جس نے تیس بتیس سال کی عمر کے نوجوان کو اتنا اونچا اٹھا دیا کہ بڑے بڑے لوگوں کی گردنیں اس کی صداقت و امانت کے سامنے جھک گئیں۔ ممکن ہے خاندانی رقابت کے سبب سے کچھ لوگ اس خطاب کو پسند نہ کرتے ہوں لیکن وہ مجبور تھے کہ آپ کو اس خطاب سے یاد کریں کیونکہ کوئی ایسی بات یا کوئی ایسا بہانہ[1] ان کو نہیں ملتا تھا کہ وہ تردید کرسکیں اور عوام کے جذبات کا مقابلہ کرسکیں۔

تاریخ کی یہ پرانی عادت بہت ہی تکلیف دہ اور مایوس کن ہے کہ کسی شخص کے واقعات قلمبند کرنے کے لئے وہ اسی وقت قلم اٹھاتی ہے۔ جب وہ شخص تاریخی انسان بن چکتا ہے اس سے پہلے اس کے قلم کو جنبش نہیں ہوتی۔ اس نے محمد رسول اللہ کے بارے میں بھی اسی بخل سے کام لیا اور ان تمام واقعات سے دامن سمیٹے رکھا جو نبوت سے پہلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے رہے، جو قریش کے گردن فرازوں کو متاثر کرتے رہے۔ تب بھی چند واقعات ایسے ہیں جو کسی طرح تاریخ کے سکڑے ہوئے دامن میں پڑ گئے اور تاریخ نے ان کو صحیح سند کے ساتھ محفوظ رکھا۔ قیاس کرنے کے لئے یہ واقعات ہی کافی ہیں اور ان سے قبل نبوت

---

[1] ان رقیبوں کے لئے دعوے نبوت بہانہ تھا۔ جیسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا ان لوگوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور آپ کے خلاف اتنی فضا گرم کردی کہ اپنے بھی پرائے بن گئے اور سرگرم حامی بھی جھجکنے لگے۔ تفصیل آگے آئے گی (انشاء اللہ)

کی زندگی روشنی میں آجاتی ہے۔

عبداللہ بن ابی الحمساء عامری ایک معمولی آدمی تھا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کا یہ معاملہ نہ ہوا ہوتا جو یہاں ذکر کیا جارہا ہے تو دنیا نہ اس کو پہچانتی اور نہ پہچاننے کی ضرورت محسوس کرتی۔

یہ عبداللہ حضرت محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کوئی سوداگر رہا تھا۔ بات چیت کرتے ہوئے اسے کوئی کام یاد آگیا۔ اس نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہا: آپ ٹھہریے میں ابھی آتا ہوں۔ تب بات کروں گا۔ آپ کی زبان سے نکل گیا۔ "اچھا"

اب بات کی پختگی اور زبان کی پابندی ملاحظہ فرمایئے۔

عبداللہ بن ابی الحمساء یہاں سے چلا تو اُس کو کوئی اور ضرورت پیش آگئی وہ اس میں ایسا لگا کہ اس کو اپنے وعدہ کا خیال بھی نہیں رہا۔ یہ دن یونہی گذر گیا۔ پھر اگلا دن بھی گذر گیا۔ تیسرے دن سے خیال آیا کہ میں "محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاملہ کر رہا تھا۔ بات یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ میں اُن کو ٹھیرا کر آیا تھا۔ اب چل کر بات پوری کر لینی چاہیئے۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی الحمساء آپ کے مکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ دو روز گذر گئے آج تیسرا دن ہے وہ مکان پر نہیں آئے گھر والے خود پریشان ہیں "عبداللہ بن ابی الحمساء یہاں سے روانہ ہوا جہاں جہاں خیال تھا سب جگہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تلاش کیا۔ کہیں نہ ملے تو احتیاطاً اس جگہ بھی پہنچا جہاں بات چیت ہو رہی تھی اور وہ آپ کو وہاں ٹھیرا کر آیا تھا۔

عبداللہ بن ابی الحمساء اس مقام پر پہنچا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ "محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہیں موجود ہیں اور عبداللہ بن ابی الحمساء کا انتظار کر رہے ہیں اور زیادہ حیرت اس کو اس بات پر ہوئی کہ مسلسل تین دن انتظار کی زحمت اٹھانے کے بعد بھی جب عبداللہ بن ابی الحمساء سامنے آئے تو نہ لڑائی جھگڑا تھا نہ ڈانٹ ڈپٹ۔ کہا تو صرف اتنا کہا اور وہ

لہ کہہ سکتے ہیں کہ وعدہ کی یہ صداقت اور پختگی وہ متبرک ترکہ تھا جو آپ کو اپنے جدِ اعلیٰ (باقی بر صفحہ آئندہ)

بھی دھیمی آواز سے یافتی لقد شققت علیّ۔ انا ھھنا منذ ثلاث انتظرک[1]۔ (اے صاحب! آپ نے پریشان کر دیا۔ تین دن ہو گئے۔ یہاں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔)

قیس[2] بن سائب بن عویمر۔ ایک صحابی تھے۔ اسی زمانہ میں جب آپ کاروبار کیا کرتے تھے وہ آپ کے شریک اور ساجھی رہے تھے وہ ہمیشہ تعریف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریکی فی الجاھلیۃ فکان خیر شریک لا یداری و لا یماری۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب نبی نہیں بنائے گئے تھے (زمانہ جاہلیت میں) میرے ساجھی تھے۔ بس بہت ہی اچھے ساجھی تھے۔ نہ کبھی سخت بات کہتے تھے نہ جھگڑتے اور بحث کرتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے ملا تھا۔ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام سے بھی ایک شخص نے کہا تھا کہ آپ یہاں ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں وہ اپنے کام میں لگ کر بھول گیا اور حضرت اسمٰعیل وعدہ کی پابندی کی بناء پر وہیں ٹھہرے رہے۔ دوسرے تیسرے دن جب اُس کو یاد آیا اور وہاں پہنچا تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اسی جگہ انتظار کر رہے تھے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا یہ وصف یہاں تک مقبول ہوا کہ وحی الٰہی نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی خصوصیات میں اس کو شمار کرایا ہے۔ اِنَّہٗ کان صَادِقَ الوعد (سورہ مریم) (درمنثور) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف الگ الگ وحی الٰہی نے شمار نہیں کرائے بلکہ ایک جامع اور مکمل سند یہ دیدی۔ انک لعلیٰ خلقٍ عظیم۔ یعنی اخلاق کی شاخیں جو انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں الگ الگ بیان کی گئیں آپ اُن سب کا مکمل مجموعہ ہیں۔

[1] ابو داؤد شریف باب فی العدۃ کتاب الادب۔

[2] علماء حضرت مجاہد کے نام سے واقف ہیں۔ یہ تفسیر کے امام ہیں تفسیر کلام اللہ کے یہ جلیل القدر امام انہیں حضرت قیس بن سائب رضی اللہ عنہ کے غلام تھے۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے اُن کو آزاد کر دیا تھا۔ انہوں نے حضرت قیس کی عنایتوں اور اپنی آزادی سے یہ فائدہ اٹھایا کہ فن تفسیر کے امام بنے۔ یہ حضرت مجاہد (باقی بر صفحہ آئندہ)

یہ کاروباری سلسلہ کی باتیں تھیں۔ اب ہمدردی نوع انسان اور احترام انسانیت کی ایک مثال مطالعہ فرمایئے جو اس زمانہ میں بھی اپنی نظیر آپ تھی اور تہذیب کی دعویدار موجودہ دنیا بھی اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

بردہ فروشی عرب میں عام تھی اور بسا اوقات شریف گھرانوں کے بچے بھی اس شکنجہ میں کس لئے جاتے تھے۔ چنانچہ "قبیلہ بنی القین بن جسر" کے آدمی ایک لڑکے کو پکڑ لائے، اور حضرت خدیجہ کے برادر زادے "حکیم بن حزام بن خویلد" کے ہاتھ بیچ دیا۔

حضرت خدیجہ اپنے بھتیجے کے یہاں گئیں تو یہ غلام اُن کو پسند آ گیا۔ انہوں نے فرمائش کی اور بھتیجے نے یہ غلام پھوپی کی نذر کر دیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نظر اُس پر پڑی تو اس کی معصوم زندگی اور اس کی مظلومیت سے دل بے چین ہو گیا۔ آپ نے حضرت خدیجہ سے اس کو خرید لیا۔ پھر بچہ سے اس کے ماں باپ کا نام اور خاندان و قبیلہ کا پتہ دریافت کیا۔ بچہ ذہین تھا۔ اُس نے برجستہ جواب دیا۔ میرا نام زید، میرے والد حارثہ بن شرجیل بن کعب اور والدہ سعدی بنت ثعلبہ ہیں اور قبیلہ طے کے خاندان بنی معن سے ہمارا تعلق ہے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے باپ کا نام اور پتہ معلوم ہو گیا تو اس کے والد کو خبر پہنچائی۔ والد (حارثہ) خبر پاتے ہی اپنے بھائی کو ساتھ لے کر مکہ آ گیا اور دریافت کرتا ہوا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پہنچا۔ بچہ کو دیکھا، چوما پیار کیا۔ گلے لگایا اور شفقت پدری کے بموجب یہ چاہا کہ اپنے لخت جگر۔ نور چشم کو ساتھ لے جائے اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں کچھ رقم بطور فدیہ پیش کر دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رقم لینے سے تو انکار کر دیا اور اس کی اجازت دیدی کہ بچہ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ البتہ یہ فرما دیا کہ خود بچہ سے بھی دریافت کر لیں کہ وہ آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہے یا یہاں رہنا چاہتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) فرمایا کرتے تھے کہ میرے آقا قیس ہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ یعنی جو ایسے کمزور ہیں کہ روزہ ان کو تھکا ڈالتا ہے اُن پر فدیہ ادا کرنا لازم ہے (استیعاب) ذکر قیس۔ یہ حکم اس وقت تھا جب ابتداءً ایام بیض کے روزے فرض تھے یہ آیت انہیں ایام معدودات کے بارہ میں ہے۔ (واللہ اعلم)

بچہ آپ کے یہاں آیا۔ اس کے والد کو اُس زمانہ کے ذرائع اور وسائل کے بموجب خبر دی گئی وہ علاقہ طے سے سفر کر کے یہاں آیا۔ اس میں کچھ دن لگ گئے۔ بچہ اس عرصہ میں حضرت محمدؐ کی شفقتوں سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ اس کو آپ سے جُدا ہونا گوارا نہ ہوا۔ اس نے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ باپ نے بہت سمجھایا مگر بچہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ آخر میں باپ اور چچا نے چبھتی ہوئی بات کہی۔ بیٹا تم یہاں غلام ہو، غلام رہنا پسند کرتے ہو۔ باپ کے ساتھ آزاد رہنا پسند نہیں کرتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اب تک باپ بیٹے کی گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا مگر یہ بات ایسی تھی جس کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سلوک اور آپ کے اندازِ فکر سے تھا۔ کیا واقعی زید کو آپ غلام سمجھتے ہیں۔ زید کو غلام کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کسی آزاد بچہ کے لئے غلامی پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے فوراً باپ بیٹے کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے فرمایا۔ غلام نہیں۔ بیٹا۔ زید میرے پاس رہے گا تو بیٹا بن کر۔ میں تمہارے سامنے یہ کہتا ہوں اور تمہیں اس سے اطمینان نہ ہو تو چلو۔ مجمع میں یہ اعلان کئے دیتا ہوں۔ چنانچہ آپ، باپ، چچا اور زید کو لے کر ایک چوپال[1] میں پہنچے۔ جہاں قریش کے سردار اور چودھری موجود تھے اور آپ نے اعلان فرما دیا کہ "زید میرا بیٹا ہے" میں اعلان کرتا ہوں آپ لوگ گواہ رہیں[2]

---

[1] ایک روایت میں یہ ہے کہ کئی جگہ لے گئے۔ جہاں جہاں لوگوں کی نشست ہوا کرتی تھی۔ پھر حرم میں بھی لے گئے جہاں لوگوں کا اجتماع رہتا تھا اور سب جگہ یہ اعلان فرمایا۔ (الاستیعاب)

[2] یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے۔ دعوئ نبوت کے بعد جو لوگ بغیر کہے ہوئے صرف یہ سن کر کہ آپ پر وحی نازل ہوتی ہے اور آپ نبی بنائے گئے ہیں آپ کی نبوت پر ایمان لے آئے اُن میں یہ زید بھی ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو شفقت زید پر رہی وہ تاریخ کی کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ انتہا یہ کہ آپ نے اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے ان کا نکاح کر دیا۔ پھر انہیں زید کے لڑکے "اسامہ" تھے۔ جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان کو حِبّ رسول اللہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے) کہا کرتے تھے۔ اپنے کاموں کے لئے ان سے سفارش کرایا کرتے تھے۔ فتح مکہ اور حجۃ الوداع جیسے اہم ترین موقع پر کبھی حضرت فضل بن عباس (باقی بر صفحہ آئندہ)

حارثہ (زید کے باپ) کی یہ آخری تدبیر بھی زید کو پھسلانے کی جو قطعاً ناکام رہی۔ اب حارثہ کو کہنا پڑا۔ اچھا آپ بیٹا بنا کر رکھتے ہیں تو مجھے بھی عذر نہیں[1]

فطرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ بلندی بھی نظر انداز نہ ہونی چاہیئے کہ آپ نے عبد محمد (محمد کا غلام) کہلانا پسند نہیں کیا۔ آپ نے "ابن محمد" کہلایا اور اسی نسبت سے ان کی شہرت ہوتی رہی[2] جب خود آپ کے دادا عبدالمطلب کا واقعہ سامنے آتا ہے تو اس فطرت بلند کا حسن اور بھی زیادہ نکھر جاتا ہے۔

آپ کے دادا کا اصل نام شیبہ[3] تھا۔ مطلب اُن کے چچا کا نام تھا۔ چونکہ شیبہ بچپن میں یتیم[4]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد چھوٹے بھائی اُ آپ کی سواری پر آپ کے ساتھ سوار ہوتے تو کبھی یہ اسامہ (رضی اللہ عنہ) اسی انداز کے ساتھ سوار ہوا کرتے تھے۔

[1] الاستیعاب ذکر زید بن حارثہ [2] یہاں تک کہ اس واقعہ سے تقریباً ۳۰ سال بعد آیت نازل ہوئی "ادعوھم لآبائھم" (سورہ احزاب) تب زید ابن محمدؐ کے بجائے دوبارہ زید بن حارثہ کہا گیا۔ [3] جب پیدا ہوئے تو سر کے بال سپید تھے اس لئے ان کی والدہ نے ان کا نام شیبہ رکھا۔ [4] والد ہاشم تھے۔ مکہ کے سب سے بڑے سردار نہایت سخی اور دل گردہ کے آدمی تھے۔ والدہ مدینہ کی ایک دولت مند صاحب جائداد باحوصلہ خاتون تھی بہت مردانہ رکھتی تھی۔ اپنے تمام کاروبار کی نگرانی خود کیا کرتی تھی۔ بیوہ ہوگئیں تو بہت سے بڑے بڑے آدمیوں نے پیغام بھیجا۔ مگر یہ کسی کو نظر میں نہیں لائیں۔ سب کو رد کرتی رہیں۔ ایک مرتبہ ہاشم "تجارتی قافلہ لئے ہوئے شام سے آرہے تھے۔ مدینہ میں قیام ہوا تو اس عورت کی چستی، دلیری اور ہمت مردانہ کے قصے سنے اور اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اپنے تجارتی کام کی نگرانی بڑی ہوش مندی سے وہ خود کر رہی ہے انہوں نے بھی پیغام بھیج دیا۔ اس خاتون نے یہ رشتہ منظور کر لیا۔ نکاح ہوگیا۔ نکاح کے بعد یہ خاتون مکہ میں آئیں۔ ہاشم کے یہاں رہیں۔ پھر یہ اپنے وطن مدینہ گئی ہوئی تھیں وہیں ولادت ہوئی اور شیبہ پیدا ہوگئے۔ لیکن انہیں ایام میں ہاشم کا مکہ میں انتقال ہوگیا تو بیوہ مدینہ ہی میں رہنے لگیں۔ شیبہ مدینہ میں ماں کے پاس یتیمی کی زندگی گذار رہے تھے کہ کچھ عرصہ کے بعد ہاشم کے چھوٹے بھائی مطلب کا مدینہ جانا ہوا اور بھتیجے (شیبہ) کو اپنے ساتھ مکہ لے آئے۔ جوان ہوگئے۔ تو قریش کے ارباب حل وعقد نے ان کو سردار بنا دیا۔ (طبقات ابن سعد وغیرہ)

ہو گئے تھے اور ان کی پرورش مطلب نے کی تھی تو اس شکر گذاری میں تمام عمر "عبد المطلب" کہلاتے۔

ایک طرف حقیقی چچا۔ اپنے حقیقی بھتیجے کے لئے جو اسی کی طرح آزاد ہے۔ لفظ عبد (غلام) استعمال کرتا ہے اور استعمال کراتا ہے۔ یہاں تک کہ یہی اضافی نام اصل نام کی جگہ لے لیتا ہے دوسری جانب ایک آقا اپنے زر خرید غلام کیلئے بھی "عبد محمد" کہلانا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ "ابن محمد" کہلاتا ہے اسی کو مشہور کراتا ہے اور بیٹے جیسا ہی اُس سے معاملہ رکھتا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہی کردار تھا جس نے سرداران قریش کی گردنیں اس کی تعظیم کے لئے خم کیں۔ یہاں تک کہ نام لینا بے ادبی سمجھنے لگے اور "الصادق" اور "الامین" کے خطاب آپ کے لئے عام ہو گئے۔

آپ کے مربی چچا "ابو طالب" آخر تک مسلمان نہیں ہوئے اپنے باپ دادا کے مذہب پر رہے۔ اسی مذہب پر جان دی۔ مگر بھتیجے کی اخلاق و کمالات اور ہمدردیٔ خلق کا جو جذبہ بھتیجے کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اسکے یہاں تک گرویدہ تھے کہ بھتیجے کی تعریف میں قصیدے کہا کرتے تھے۔

ایک قصیدہ جس میں تقریباً سو شعر ہیں اس کو ابن ہشام نے نقل کیا ہے جس کا مشہور شعر یہ ہے جس سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فیض بے پناہ کا انداز ہوتا ہے۔

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ ثمال الیتامٰی عصمۃ للارامل[1]

وہ نورانی چہرے والا۔ جس کی ذات اور جس کے چہرے کی برکت سے بادل بھی سیرابی حاصل کرتا ہے۔ یتیموں کا مربی۔ بیواؤں کی عزت وآبرو کا محافظ۔

وان فخرت یوماً فان محمداً ھو المصطفٰی من سرھا وکریمھا[2]

اور اگر کسی دن (کسی موقع پر) فخر کرنا چاہو تو محمد وہ منتخب شخصیت ہے جس سے کمالات قریش[3] کے مخفی خزانے نمایاں ہوتے ہیں جو پورے قریش میں صاحب کرم اور صاحب شرف ہے۔

---

[1] الثمال کالغیاث الذی یقوم بامر قومہ۔ [2] البدایہ والنہایہ ص ۲۵۳ ج ۲ وسیرۃ ابن ہشام ص ۱۸۰ ج ۱ [3] چونکہ پہلے اشعار میں قریش کا ذکر ہے! اس لئے یہاں یہ مفہوم لیا گیا۔ اس سیاق کا لحاظ نہ کیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ شخصیت ہے جس سے کمالات انسانیت کے مخفی خزانے نمایاں ہوتے ہیں۔ جو پوری نوع انسان میں صاحب کرم اور صاحب شرف ہے۔

نکاح

الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ (سورہ نور ۲۶)

نکاح مکہ کی رہنے والی ایک ادھیڑ عمر کی خاتون (خدیجہؓ)[1] جس کی عمر چالیس سال سے کم نہیں ہے۔ جو کئی بچوں کی ماں ہے، دو مرتبہ[2] بیوہ ہو چکی ہے۔ تیسری مرتبہ شادی کے لئے ایک پچیس سالہ نوجوان سے سلسلہ جنبانی کرتی ہے۔ یہ نوجوان حسب نسب کے لحاظ سے مکہ کے تمام شریف اور باعزت خاندانوں میں "نگ" ہے۔ جسمانی صحت بہت عمدہ۔ شکل و صورت بے مثال۔ اخلاق و عادات میں پورے مکہ کا قیمتی ہیرا۔ اس کے یہاں دولت کے انبار نہیں ہیں مگر کامیاب تجارت میں وہ نام پیدا کر چکا ہے کہ اس کے مقابلہ میں دولت و ثروت ایک "پرچھائیں" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ بیشک اس بیوہ کے لئے اس رشتہ میں بہت سی

---

[1] خدیجہ نام تھا۔ طاہرہ لقب۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم جد تھیں۔ قصی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پرداداتھے حضرت خدیجہ کے بھی پرداداتھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر قصیٰ تک چار پشتیں تھیں۔ عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصیٰ اور حضرت خدیجہ سے قصیٰ تک صرف تین پشتیں تھیں خویلد یعنی حضرت خدیجہ کے والد پھر اسد پھر عبدالعزیٰ بن قصیٰ۔

[2] حضرت خدیجہ پہلے ورقہ بن نوفل سے منسوب تھیں مگر کسی وجہ سے نکاح نہیں ہوا۔ اس کے بعد ابوہالہ سے نکاح ہوا جن کا نام ہند تھا۔ ابوہالہ کے مرنے کے بعد عتیق بن عائذ سے نکاح کیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد وہ بھی انتقال کر گئے (استیعاب و اصابہ) ان شوہروں سے اولاد بھی ہوئی۔ ابوہالہ سے جو لڑکا ہوا اس کا نام ہند تھا۔ یہ اپنے سوتیلے باپ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) سے صرف محبت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ روئے انور کے عاشق زار تھے ان کے سوتیلے بھانجے حضرت حسنؓ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما ان سے اپنے نانا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی باتیں پوچھا کرتے تھے اور یہ بڑے شوق سے مزے لے لے کر بیان کیا کرتے تھے۔ سراپا مقدس حلیہ اور شمائل و عادات کا بڑا حصہ بروایت حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ انہیں ابوہالہ سے نقل کیا گیا ہے۔

دلچسپیاں ہوسکتی ہیں، مگر اس پچیس سالہ نوجوان کے لئے دلچسپی کی ایک ایک چیز ختم ہے۔ یہ خاتون دولت مند ضرور ہے۔ لیکن جس خود دار نوجوان نے اپنی زندگی خود بنائی جس نے بچپن میں بھی گوارا نہ کیا کہ اپنا بار دوسروں پر ڈالے کسی خاتون کی دولت و ثروت اس کی خود داری اور غیرت کے لئے چیلنج تو ہوسکتی ہے، دلچسپی اور کشش کا باعث نہیں بن سکتی۔ ہاں ایک بہت بڑی دولت اور ہے۔ نیک نفسی۔ راست بازی۔ امانتداری۔ سچائی اور خلق خدا سے ہمدردی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات ستودہ صفات ان اوصاف کا خزانہ تھی اور یہ نیک نفس خاتون جو دنیا کی تمام بہاروں سے آسودہ ہوچکی تھی ان اوصاف کی قدردان تھی یعنی ایک طرف جوہر تھا تو دوسری طرف جوہری۔

قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

یہی سبب تھا کہ یہ رشتہ جو بظاہر اَن مِل بے جوڑ تھا ایسا مبارک ثابت ہوا کہ خاندان اور کنبہ والے اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ خود آپ کی وہ بیویاں جو بعد میں آپ کی حرم بنیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی حضرت خدیجہ کی تعریفیں سنتی تھیں تو رشک کیا کرتی تھیں۔

رشتہ کا سبب واقعہ اس طرح پیش آیا کہ "خدیجہ" جب دوسری مرتبہ بیوہ ہوچکیں تو اپنی تجارت کو باقی رکھنے کے لئے انہیں کسی ایسے امانتدار شخص کی ضرورت تھی، جو کاروباری سلیقہ اور تجارتی تجربہ بھی رکھتا ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اگرچہ تقریباً ۲۳ سال تھی مگر آپ کے اوصاف حمیدہ کے چرچے شروع ہوگئے تھے۔ کاروباری سلیقہ کی بھی شہرت ہوچکی تھی اور تجارتی قافلہ کیساتھ شام جاکر تجارت کا بھی آپ کو تجربہ ہوچکا تھا۔ حضرت خدیجہ نے آپ کی یہ شہرتیں سنیں پھر ذاتی طور پر بھی واقفیت حاصل کی تو اپنے وسیع کاروبار کے لئے آپ کو زیادہ سے زیادہ موزوں پایا۔ چنانچہ آپ نے جوان صالح حضرت محمد بن عبد اللہ القرشی المکی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیش کش کی کہ وہ کام کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ نفع میں ایک حصہ اُن کا ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش کش منظور فرمائی اور مال لے کر شام تشریف لے گئے۔ واپسی کے وقت آپ نے ایسا مال تلا[illegible]

کیا جس کا مکہ میں فوراً نکاس ہو جاتے۔ آپ نے شام سے یہ مال لاکر "مکہ معظمہ" میں فروخت کیا تو نفع بدرجہا زائد ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کاروباری دانشمندی، ہوشیاری اور مستعدی نے حضرت خدیجہ کی اُس رائے کی تصدیق کردی جو وہ اس "ترقی پسند" نوجوان کے متعلق پہلے قائم کرچکی تھیں

حضرت خدیجہ نے شام جاتے وقت جب مال سپرد کیا تو خاص اپنے بھروسے کے غلام "میسرہ" کو بھی ساتھ کر دیا تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ وہ خدمت کرتے رہیں گے اور مقصد یہ تھا کہ مال کی نگرانی بھی رکھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طور و اطوار کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہیں۔

سفر شام سے واپسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منافع کا مال حضرت خدیجہ کے سپرد کیا۔ اور "میسرہ" نے نہ صرف امانتداری بلکہ آپ کے عام اخلاق کی بھی ایسی تعریف کی کہ خدیجہ جو اپنی زندگی کا یہ آخری دور کسی راست باز کے حوالہ کرنا چاہتی تھیں "دامان محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ان کو گوہر مراد نظر آنے لگا۔ انہوں نے آپ کے خاص احباب اور بزرگوں کے ذریعہ رشتہ کی سلسلہ جنبانی کی جس نے منظوری کا شرف عظیم حاصل کیا اور نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد۔ تجارت اور کاروبار کی طرف خاص توجہ کا تذکرہ تو نہیں آتا۔ البتہ خدمت قوم۔ ہمدردی خلق۔ خدا پرستی اور خدا ترسی کے اوصاف روز افزوں نظر آتے ہیں۔ ادھر خدیجہ جن کے لئے یہی اوصاف باعث کشش تھے ان کی گرویدگی دن بدن بڑھ رہی ہے، یہاں تک کہ حضرت خدیجہ محض خانگی زندگی ہی میں رفیقہ حیات نہیں رہیں بلکہ قومی اور ملی خدمات میں بھی دہنا ہاتھ بنی رہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر تو اُن کا ایک حبہ بھی کبھی صرف نہیں ہوا۔ البتہ قومی اور ملی کاموں میں ان کی پوری دولت صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت وہ اس گھرانہ کی صاحب خانہ (گھرستن) تھیں جس کا فخر اور امتیازی نشان فقر و فاقہ تھا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ لوگوں نے مجھے امداد سے محروم رکھا۔ خدیجہ نے میری مدد کی۔ لوگوں نے مجھے جھٹلایا۔ مگر خدیجہ نے ہر موقعہ پر میری تصدیق کی اور ہمت بڑھائی[1]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ص ۱۲۹ ج ۵ و الاستیعاب وغیرہ۔

پچیس برس تک حضرت خدیجہ زندہ رہیں۔ چھ بچے ہوئے دو لڑکے جو بچپن ہی میں وفات پا گئے۔ چار لڑکیاں جو زندہ رہیں۔ ان کے نکاح بیاہ بھی ہوئے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے یہ لڑکیاں بھی وفات پا چکی تھیں۔ صرف ایک صاحبزادی "حضرت فاطمہ" زندہ رہیں جن کے دو لڑکوں (سیدنا حضرت حسن اور سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہما) کی اولاد کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کو سادات کہا جاتا ہے۔

دورِ شباب اور دورِ شباب سے کچھ آگے

اخلاقی بدحالی۔ جذبۂ اصلاح ——— امن پسندی اور صلح جوئی

چھٹی صدی عیسوی جس کے آخری حصہ میں یہ آفتاب طلوع ہوا۔ ایک اندھیری رات تھی جس پر گمراہیوں اور ظلم و ستم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

دولت پر غرور۔ جاگیر و جائداد پر گھمنڈ، نسلی اور خاندانی اونچ نیچ۔ اپنے آپ کو اونچا دوسروں کو نیچا سمجھنا۔ یہاں تک کہ ان سے چھوت چھات کرنا۔ غریبوں کو دبانا۔ کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا۔ عورتوں کو ایک خدمت گذار جاننا۔ شوہروں کے مرنے کے بعد ان کی زندگی کو اکارت ماننا۔ یہاں تک کہ ان کی خودکشی کو اُن کے لئے ذریعۂ نجات سمجھنا۔ خدا سے انکار کرنا۔ یا سینکڑوں ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے سامنے ماتھا رگڑنا۔ من مانی باتوں کو مذہب اور دھرم سمجھ لینا۔ خود غرضی۔ بے رحمی۔ سُود۔ شراب۔ زنا۔ رشوت۔ جوا وغیرہ ایسی بیماریاں تھیں جن کی وبا پوری دنیا[1] میں پھیلی ہوئی تھی۔ عرب میں ان عام بیماریوں کے علاوہ

۱۔ ایک بیماری یہ تھی کہ پورے ملک کی کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی۔ ہر ایک قبیلہ اپنی جگہ آزاد تھا۔

۲۔ کچھ انسانوں کو ناپاک سمجھنے کا عقیدہ تو نہیں تھا۔ مگر انسانی خون کو سستا اور مہنگا سمجھنا ان کا قومی مزاج بن چکا تھا۔ یعنی کسی معمولی قبیلہ کا کوئی آدمی اگر مارا جاتا۔ خواہ وہ اس قبیلہ کا سردار ہی ہوتا

---

[1] یعنی وہ دنیا جو اس زمانہ میں مہذب دنیا کہلاتی تھی مثلاً وسط ایشیا۔ ایران۔ ہندوستان یا مشرقی یورپ باقی مغربی یورپ اس زمانہ میں تہذیب و تمدن سے اتنا بعید تھا کہ شہروں اور قصبوں کی باقاعدہ آبادیاں بھی نہیں تھیں۔ ایک ہی جیسی جھونپڑیوں یا پہاڑی گھاٹیوں میں انسان اور ان کے مویشی ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ فرق بہت معمولی ہوتا تھا۔ افریقہ اور چین کو ہم آج بھی غیر مہذب سمجھتے ہیں اور امریکہ تو صرف چار صدیوں سے انسانی ممالک کے زمرہ میں داخل ہوا ہے۔

تو اس کے خون کے عوض میں چند اونٹ دینے کافی سمجھے جاتے تھے جس کو وہ دیت کہا کرتے تھے۔ لیکن اگر کسی بڑے قبیلہ کا کوئی معمولی آدمی بھی مارا جاتا تو اس کے عوض میں قاتل کے ایک نے امداد انتہا یہ کہ کبھی پورے قبیلہ کو تباہ کر دینا بھی اپنا حق سمجھتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

۴۔ فطرت جنگجو تھی اس بنا پر معمولی بات پر بھی بڑی سے بڑی جنگ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جو سالہا سال جاری رہتا۔ مثلاً ایک شخص کا اونٹ کھیت میں چلا گیا۔ کھیت والی عورت نے اسے مارا۔ اونٹ والے نے عورت کی چھاتی کاٹ ڈالی۔ اس بات پر ۴۹۴ء سے ۵۳۵ء تک برابر لڑائی رہی یعنی اکتالیس سال برابر۔ کہتے ہیں ستر ہزار آدمی اس میں مارے گئے۔ داحس ایک گھوڑا تھا۔ گھوڑ دوڑ میں وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اسے بدکا دیا۔ اتنی بات پر ایسا رن پڑا کہ قبیلے کے قبیلے کٹ مرے۔ اس لڑائی کا خاتمہ اس وقت ہوا جب اسلام کی امن پسندی نے محارب قبیلوں کے مزاج بدل دیئے۔ حالی مرحوم کے اشعار جو ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ اس زمانہ کے واقعات کا ایک مختصر خاکہ ہیں جو اس سلسلہ کلام کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ اشعار یہ ہیں۔

نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارہ
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا
وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی

۱؎ شخصی لڑائی کو قومی اور فرقہ وار لڑائی بنا لینے کا بدترین مرض ہمارے زمانہ میں خود ہمارے ملک میں موجود ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں مذہب کا نام دیدیا جاتا ہے اور وہاں قبائلی عصبیت کام کیا کرتی تھی جس کو اسلام نے عصبیت جاہلیت کہا تھا۔ ہمارے یہاں یہ عصبیت جاہلیت مذہب کے مقدس نام پر ہے۔

قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی　　تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک اُن کی جہالت کا تھا وہ

اسی طرح اک اور خوں ریز بیدا　　عرب میں لقب حرب داحس ہے جس کا
رہا ایک مدت تک آپس میں برپا　　بہا خون کا ہر طرف جس میں دریا
سبب اس کا لکھا ہے یہ اصمعی نے
کہ گھوڑ دوڑ میں چنید کی تھی کسی نے

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا　　کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لب جُو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا　　کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار اُن میں

مختصر یہ کہ ان قومی اور بین الاقوامی بیماریوں اور علتوں نے نہ صرف یہ کہ امن و امان کی زندگی کو ناممکن بنادیا تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ رحم، رواداری۔ بھائی چارگی۔ عدل و انصاف۔ مروت شرافت۔ مختصر یہ کہ انسانیت کی تمام شریف خصلتوں کے چراغ گل تھے۔ قریش جیسے قبائل اگرچہ تمدن میں اپنا ممتاز مقام رکھتے تھے۔ مگر روح تمدن سے وہ بھی محروم تھے۔ ان کی کاروباری منڈیاں بڑھ رہی تھیں مگر اخلاق کی جنس ان میں ناپید تھی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جیسے ہی بیدار مغز جوان صالح کی حیثیت سے شہری زندگی میں قدم جمایا۔ جس طرح آپ کو اپنے خالق اور پروردگار کی عبادت و پرستش کا شوق بڑھا۔ قوم کی یہ ابتر حالت بھی آپ کے دل کا درد اور جگر کا سوز بن گئی یہ سوزش آپ کو ہر وقت بے چین اور مضطرب رکھتی مگر کوئی معمولی نسخہ شفا اس درد کے مٹنے کا کارگر نہیں تھا۔

ے چنید معنی بد معاملگی، ہٹ دھرمی۔ بے ایمانی۔

اس درد کے علاج کے لئے ایک بہت بڑے سماجی انقلاب کی ضرورت تھی، لیکن وقتی طور پر ایک واقعہ نے موقع دیا کہ آپ اس میدان میں آگے بڑھیں اور پورے نہیں تو ادھورے علاج ہی میں حصہ لیں۔

واقعہ یہ تھا کہ یمن کا ایک سوداگر کچھ مال مکہ معظمہ میں لایا۔ مکہ کے ایک بیوپاری "عاص بن وائل سہمی"[1] نے اس کا مال خرید لیا۔ اور جب قیمت ادا کرنے کا وقت آیا تو اس کو مار پیٹ کر بھگا دیا۔ وہ مکہ والوں کے سامنے رویا دھویا۔ مگر کسی نے پرواہ[2] نہیں کی۔ مجبور ہو کر واپس ہوا مگر اب اس نے مکہ والوں کی ہجو میں اشعار کہنے شروع کئے اور اس طرح پورے عرب میں قریش کی بدنامی[3] ہونے لگی۔ ظاہر ہے مکہ جیسے تجارتی شہر کے لئے یہ بدنامی بہت خطرناک تھی۔ اس نے قریش کے سرداروں کو چونکا دیا اور اب وہ صورتِ حال پر غور کرنے کے لئے مکہ کے ایک رئیس "عبداللہ بن جدعان" کے یہاں جمع ہوئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ ابھی بیس[4] سالہ نوجوان تھے۔ مگر امن و آشتی اور صلح و مصالحت جو آپ کا فطری جذبہ تھا۔ اس کا یہ اثر تھا کہ جیسے ہی آپ کو خبر ہوئی آپ بھی مجمع میں پہنچ گئے۔ آپ کی شرکت کی یہ برکت تھی کہ واقعہ کا تعلق اگرچہ تجارت اور کاروباری سلسلہ سے تھا۔ مگر غور و فکر کے دائرہ کو وسیع کیا گیا اور ایک ایسی سوسائٹی (انجمن) بنائی گئی جس کے ارکان کا یہ عہد ہوتا تھا (۱) ہم اپنے وطن سے بے امنی دور کریں گے (۲) مسافروں کی حفاظت کیا کریں گے (۳) غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے (۴) طاقتور کو کمزور پر، بڑوں کو چھوٹوں پر ظلم کرنے اور ناانصافی سے روکا کریں[5] گے۔

---

[1] اپنے قبیلہ کا بارعب سردار بھی تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حلیف تھا۔ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تھے تو اس نے ان کو پناہ دی تھی۔ دیباچہ میں اس کا کچھ تذکرہ گذر چکا ہے۔ حضرت عمرو بن العاص انہیں کے فرزند تھے۔ [2] یعنی عاص بن وائل کا مقابلہ کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی [3] حاشیہ ابن ہشام ص۸۳ ج۱ الشیخ محمود سید الطحاوی [4] اسی سال جنگ فجار ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر بیس سال تھی۔ البدایہ والنہایہ ص۲۱۳ ج ۲۔ [5] ابن ہشام ص۸۳ و ص۸۴ ج ۱۔

مگر جب تک دلوں کی سطح ہموار نہ ہو اس طرح کے معاہدے پائیدار نہیں ہوتے۔ کیونکہ اُن کا منشا علاج نہیں ہوتا، بلکہ دفع الوقتی ہوتا ہے۔ وقت گذر جاتا ہے تو یہ معاہدے بھی فراموش ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح کا ایک معاہدہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔ جب مکہ پر قبیلہ جرہم کا قبضہ تھا مگر اب اس معاہدہ کا صرف نام یاد رہ گیا تھا۔ یعنی "حلف الفضول" وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قبیلہ جرہم کے یہ تین سردار جنہوں نے یہ معاہدہ ایجاد کیا تھا۔ تینوں کے نام "فضل" تھے۔ اس وقت جو معاہدہ ہوا وہ ایک طرح سابق انجمن کا احیاء تھا۔ لہذا اس کو بھی وہی نام دیا گیا[1]۔

بہرحال وقتی طور پر امن اور حفاظت جان و مال کے لئے ایک اچھا اقدام تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ اس میں حصہ لیا کہ نبوت کے بعد جب ایک مضبوط نظام مسلمانوں کا قائم ہو گیا تھا۔ تب بھی آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ قریش اگر حلف الفضول کو زندہ کریں تو میں سب سے پہلا شخص ہوں گا جو اس میں حصہ لوں گا[2]۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص۱۳۳ و ص۱۳۴ ج ا وہامشہ من الشیخ محمود سید الطحاوی۔
[2] سیرۃ ابن ہشام ص۱۳۴ ج ا۔

تعمیر خانہ کعبہ اور آنحضرتؐ کی ثالثی

سب کو ساتھ ملا کر۔ ہر ایک کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے قوم میں اتفاق اور یک جہتی پیدا کرتے ہوئے کام کرنے کا جو عجیب و غریب ڈھنگ آپ کا تھا۔ اس کی مثال آپ کا وہ طرز عمل ہے جو حجر اسود کے سلسلہ میں آپ نے اختیار فرمایا۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔

عمارت کعبہ اور تعمیر جدید

واقعہ یہ ہے کہ "کعبہ" باوجودیکہ پورے عرب کی عقیدتوں کا مرکز تھا۔ مگر اس کی عمارت ایک عجیب سی چار دیواری تھی۔ جس کا ایک کونہ[1] ایک طرف کسی قدر باہر نکلا ہوا۔ دوسری طرف کونے ہی نہیں تھے بلکہ ادھر ادھر کا حصہ گولائی لئے ہوئے تھا۔
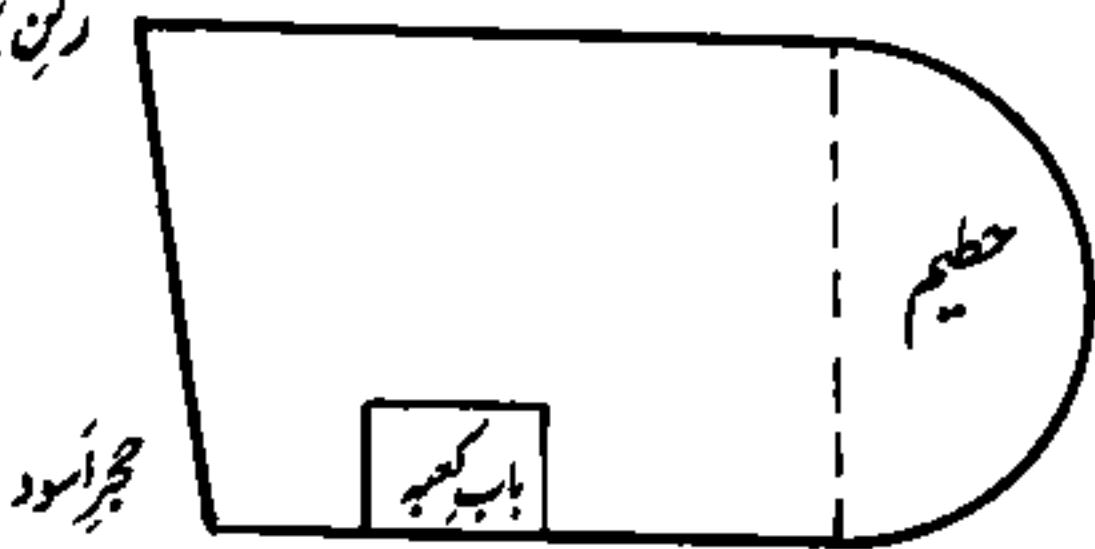
چار دیواری کے اندر دروازہ سے ملا ہوا خزانہ کعبہ تھا۔ جو کنوئیں کی طرح پختہ گڑھا تھا۔ قیمتی نذرانے اسی میں ڈال دیئے جاتے تھے۔ اس میں سونے کے زیورات کے علاوہ ایک سونے کا ہرن تھا۔ جس میں موتی اور جواہرات جڑے ہوئے تھے[2]

اس چہار دیواری پر چھت نہیں تھی۔ دیواریں نو ہاتھ[3] تقریباً ۱۵ فٹ اونچی تھیں۔ چھت

---

[1] اس کو رکن یمانی کہتے ہیں [2] ابن سعد ص ۹۳ ج ۱ [3] السیرۃ الحلبیۃ ص ۱۵۲۔ ج ۱۔

نہ ہونے کے باعث قیمتی چیزیں چوری ہو جاتی تھیں۔ اس لئے قریش کا منصوبہ تھا کہ عمارت پر چھت ڈال دی جائے۔

ایک واقعہ یہ پیش آ گیا کہ کوئی عورت دھونی سلگا رہی تھی کہ اس کی چلچی میں سے آگ کا پتنگا خانہ کعبہ کے پردہ پر پڑ گیا۔ جس سے تمام پردے جل گئے اور دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں [۲]

ان کمزور دیواروں پر تازہ حادثہ پیش آیا کہ زور کا سیلاب [۳] اُن سے ٹکرایا۔ جس نے ان کی جڑیں ہلا دیں۔ اب لامحالا طے کیا گیا کہ اس چار دیواری کو توڑ کر از سرِ نو تعمیر کر دیں۔ اس منصوبہ کو پورا کرنے کے لئے رقم کی ضرورت تھی۔ سامانِ عمارت درکار تھا اور کوئی انجینئر بھی ہونا چاہیئے تھا۔

عجیب اتفاق ہوا کہ اہل روم [۴] کا ایک جہاز جس پر عمارتی سامان لدا ہوا تھا۔ طوفانی ہواؤں نے اس کو توڑ پھوڑ کر شعیبیہ پہنچا دیا۔ جو جدّہ سے پہلے مکہ کی بندرگاہ تھا۔ ولید [۵] بن مغیرہ (مکہ کا رئیس اعظم) شعیبیہ پہنچا اور اس جہاز سے حسب ضرورت تعمیری سامان خرید لیا۔ ان رومیوں کا سردار (جہاز کا کپتان) "باقوم [۶]" تھا وہ فنِ تعمیر سے بھی واقف تھا۔ ولید نے اس سے طے کر لیا کہ وہ اپنی نگرانی میں مناسب نقشہ کے بموجب خانہ کعبہ کی عمارت مکمل کرا دے۔

فراہمی سرمایہ کے متعلق یہ طے کر لیا گیا کہ مقدس عمارت میں مقدس سرمایہ ہی صرف کیا جائے چندہ ہر ایک سے لیا جائے۔ مگر وہ پاک ہونا چاہیئے۔ چوری۔ ڈکیتی۔ غبن۔ غصب یا حرام فعل

---

[۱] حال میں ابولہب نے سونے کا ہرن چرا لیا تھا۔ کتاب المعارف لابن قتیبہ [۲] سیرۃ حلبیہ صفحہ ۱۵۲ ج ۱ [۳] سیلاب کو روکنے کے لئے پہاڑوں کے بیچ میں ایک بند زمانہ قدیم سے بنا ہوا تھا۔ یہ سیلاب بند کے اوپر سے دونوں طرف پہاڑوں کو چھوتے ہوئے مکہ میں پہنچا۔ سیرۃ حلبیہ صفحہ ۱۵۲ ج ۱ و بخاری شریف صفحہ ۵۴۱ - [۴] ایک روایت یہ ہے کہ یہ قیصر یعنی شہنشاہ روم کا جہاز تھا اور اس پر تعمیر میں کام آنے والے قیمتی پتھر رخام اور ساگوان وغیرہ کی لکڑی اور لوہا لدا ہوا تھا صفحہ ۳۰۱ ج ۱ البدایہ والنہایہ بحوالہ اموی [۵] ابن سعد صفحہ ۹۳ ج ۱ حضرت خالد انہیں کے نامور فرزند تھے ۱۲۔ [۶] روایت ہے کہ جب دعوتِ اسلام اس کو پہنچی تو وہ مسلمان ہو گیا۔ لاولد تھا۔ انتقال ہوا تو ان کا ترکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سہیل بن عمرو کو دلوایا۔ الاصابہ صفحہ ۱۴۱ ج ۱ و سیرۃ حلبیہ صفحہ ۱۵۶ ج ۱ -

(گانے بجانے اور رقص وغیرہ) کی اُجرت کا کوئی حبہ بھی اس میں نہ ہونا چاہیئے[1]

تقدس اور پاکیزگی کی ان شرطوں کے ساتھ جو رقم فراہم کی گئی وہ اتنی نہیں تھی کہ بناء ابراہیمی کے بموجب دیواریں کھڑی کر کے اُن پر چھت بھی ڈال دی جاتے۔ لہٰذا بجائے مدور و مستطیل عمارت کے مربع عمارت کا نقشہ منظور کیا گیا۔ ایک جانب تقریباً سات[2] ہاتھ کا حصہ جو گولائی لئے ہوئے تھا "کعبہ" سے خارج کیا گیا۔ جنوبی جانب کا ایک کونہ جو کچھ نکلا ہوا تھا اس کو سیدھ میں رکھا گیا۔ دیواریں پہلے نو ہاتھ بلند تھیں۔ اب اٹھارہ[3] ہاتھ (۹ گز) بلند کی گئیں۔ یہ تقریباً ۱۵ × ۵ ا گز کا طویل و عریض احاطہ۔ اس پر چھت ڈالنے کے لئے دو لینیں تین تین ستون کی کھڑی کی گئیں۔ یعنی چھ کھمبوں پر چھت ڈالی گئی[4] چوکھٹ کو زمین سے کافی اونچا رکھا گیا۔ تاکہ لوگ بے دھڑک آسانی سے داخل نہ ہو سکیں جس کو وہ روکنا چاہیں روک سکیں[5]

تعمیر سے پہلے تخریب یعنی بوسیدہ دیواروں کو گرانا ضروری تھا۔ لیکن کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ کعبہ کی مقدس دیوار پہ کدال چلائے۔ مگر ولید بن مغیرہ نے ہمت کی کہ ہم تخریب اور توہین کی غرض سے نہیں بلکہ تعمیر اور تعظیم کے لئے یہ تخریب کر رہے ہیں۔ لہٰذا خدا کے غضب یا کسی دیوتا کی ناراضی کا سوال پیدا نہیں ہوتا[6]

مکہ والوں نے ایک رات انتظار کیا کہ شاید ولید پر کوئی بلا نازل ہو جائے۔ مگر جب ولید بخیریت رہا تو اگلے روز سب شریک ہو گئے۔

بہرحال سابق تعمیر منہدم کی گئی۔ بڑے جوش[7] سے دوبارہ تعمیر شروع کی گئی۔ عمارت کے چند

---

[1] ابن سعد ص ۹۳ ج ۱ [2] ابن سعد ص ۹۵ ج ۱ بخاری شریف ص ۲۱۵ [3] سیرۃ حلبیہ ص ۱۵۶ ج ۱ پندرہ ہاتھ ابن سعد ص ۹۳ ج ۱ [4] ابن سعد ص ۹۲ ج ۱ بخاری ص ۲۱۳ سر سید مرحوم نے خطبات احمدیہ میں تین کھمبے غلط لکھے ہیں اور کعبہ کا نقشہ بھی صحیح نہیں دیا [5] ابن سعد ص ۹۵ ج ۱ صرف پیر اور جمعرات کے روز دروازہ کھولا جاتا تھا۔ دربانوں کی کڑی نگرانی رہتی۔ جس کو چاہتے نیچے دھکیل دیتے تھے اس میں لوگ ہلاک بھی ہو جاتے تھے۔ جوتوں سمیت نہیں جا سکتے تھے جوتے سیڑھی کے نیچے رکھ دیتے تھے۔ ابن سعد ص ۹۵ ج ۱ [6] ابن سعد ص ۹۲ و حلبیہ ص ۱۵۳ ج ۱ [7] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ابن سعد ص ۹۳ ج ۱۔

حصے مقرر کر کے ایک ایک حصہ ایک ایک قبیلہ کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ اس کے لئے پتھر لائیں اور تعمیر کریں اس طرح دیواروں کی تعمیر کے سلسلہ میں تو بحث نہیں ہوئی مگر جب دیوار کعبہ میں "حجر اسود" نصب کرنے کا وقت آیا تو ہر ایک قبیلے کو اپنے مفاخر یاد آئے "ہمارے کارنامے یہ ہیں، لہذا ہمیں ہی حق ہے کہ "حجر اسود" نصب کرنے کی تاریخی عظمت حاصل کریں۔ اس پر بحث شروع ہوئی تین چار روز بحث مباحثہ اور پرجوش تقریروں میں صرف ہو گئے۔ مگر گرمی بڑھتی ہی رہی۔ یہاں تک کہ دھمکیوں کی نوبت آ گئی۔ ساتھ ساتھ دھمکیوں کو پورا کرنے کی تیاری بھی ہونے لگی۔ اسلحہ صاف کئے جانے لگے۔ کچھ سمجھ دار لوگ سنبھلے۔ غصہ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ٹھنڈا کیا۔ اور سنجیدگی سے بات چیت کر کے یہ طے کر دیا کہ معاملہ کسی پنچ کے حوالے کیا جائے۔ مگر لوگوں کے دماغ اس درجہ برافروختہ تھے کہ کسی کے نام پر اتفاق کر لینا ناممکن تھا۔ تو ایک سردار کی یہ تجویز منظور کر لی گئی کہ نام کسی کا نہ لیا جائے۔ بلکہ جو شخص سب سے پہلے "باب بنی شیبہ"[1] سے آئے وہ ثالث تسلیم کر لیا جائے۔ ممکن تھا اس آنے والے پر بھی اختلاف ہو جاتا۔ مگر یہ قریش کی خوش نصیبی تھی کہ سب سے پہلے وہ آیا جس کی خوبیوں پر سب کو اتفاق تھا جس کو سب ہی "الصادق الامین" کہا کرتے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی نظریں رخ انور پر پڑیں بے اختیار زبانوں پر آ گیا۔

هٰذا محمدٌ	هٰذا امین	رضینا به
یہ محمد ہیں	یہ صاحب امانت ہیں۔	ہم انکی ثالثی پسند کرتے ہیں اس پر خوش ہیں

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آگے بڑھے۔ مجمع تک پہنچے۔ پورا ماجرا آپ کو سنایا گیا اور

---

[1] اس کو پہلے باب بنی عبد شمس کہا جاتا تھا اور اب اس کو باب السلام کہتے ہیں۔ سیرۃ حلبیہ ص۱۵۶ ج۱ اس زمانہ میں خانہ کعبہ کے گرد میدان تھا۔ پھر مکانات تھے۔ چار دیواری نہیں تھی۔ بخاری شریف ص۵۴۰ شہر کی سڑکیں اس میدان پر ختم ہوتی تھیں۔ ان سڑکوں پر پھاٹک بنے ہوئے تھے۔ ان پھاٹکوں کو مسجد حرام کا پھاٹک بھی کہہ دیا جاتا تھا چنانچہ روایتوں میں مختلف الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ کسی روایت میں اسی باب ابی شیبہ کو مسجد کا پھاٹک کہا گیا ہے کسی روایت میں سکہ کا لفظ آیا ہے (البدایہ والنہایہ) کسی میں فج کا۔ سکہ اور فج کے معنی ہیں راستہ۔ سڑک۔

آپ سے فیصلہ صادر کرنے کی درخواست کی گئی۔ آپ نے واقعہ سن کر تھوڑی دیر تامل کیا اور پھر ایک چادر منگوائی۔ چادر بچھا کر حجرِ اسودؓ کو اس کے اوپر رکھ دیا اور تمام قبیلوں کے سرپنچ اور شیوخ جو یہاں موجود تھے ان کو بلا کر ہدایت کی کہ سب مل کر چادر پکڑیں اور حجرِ اسودؓ کو اٹھا کر دیوارِ کعبہ تک لے چلیں۔ اس صورت میں مساوات اور یکسانیت پائی جا رہی تھی تمام شیوخ راضی ہو گئے۔ پھر جب حجرِ اسود دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ تو آپ نے خود اپنے دستِ مبارک سے اُس کو اٹھا کر دیوار میں نصب کر دیا۔

اس طرح ایک نہایت خوفناک جنگ ٹل گئی اور آپس میں غصہ اور نفرت کے بجائے اتحاد اتفاق اور یکجہتی کے جذبات اُبھر آئے جن کی ہما ہمی میں کعبہ کی باقیماندہ تعمیر مکمل کی گئی۔ ساتھ ساتھ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت و عظمت بدرجہا بڑھ گئی۔

خدا پرستی اور معرفتِ حق

خدا کو ایک ماننا اور اس کی عبادت کرنا عقل سلیم کا تقاضا ہے۔ مگر خدا پرستی کے وہ طریقے جن سے انسان روحانی ترقی اور ابدی سکون حاصل کر سکے، انسان اپنی عقل سے نہیں معلوم کر سکتا۔

عقل اُن فیصلوں میں بھی بسا اوقات غلطی کر جاتی ہے جن کا تعلق مشاہدہ سے ہے۔ انتہا یہ کہ وہ طاقتیں جو انسان کے اندر موجود ہیں اور تندرستی یا بیماری کی وہ کیفیتیں جو جسم انسان میں پائی جاتی ہیں چونکہ ان کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا تو عقل ان کو پوری طرح پہچاننے سے بھی قاصر رہتی ہے اور پہچانتی ہے تو بسا اوقات غلطی کر جاتی ہے۔ انتہا یہ کہ ایکسرے جیسی نظر آنیوالی چیز کے بعد بھی ڈاکٹروں کی تشخیص مختلف رہتی ہے۔ جن میں کوئی ایک صحیح ہوتی ہے اور کبھی ایک بھی صحیح نہیں ہوتی پس وہ معاملات جن کا تعلق ان حقیقتوں سے ہے جن تک مشاہدہ کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ نہ اُن کے تجربہ کی کوئی صورت ممکن ہے۔ اُن کے بارہ میں عقل کے فیصلوں پر وہی شخص اعتماد کر سکتا ہے جو انصاف جیسی نعمت سے محروم ہو یا موجودہ زندگی کے فلسفہ اور فکر مستقبل سے غافل اور لاپرواہ ہو۔ مگر وہ صاحب فہم و فراست جو دیکھتا ہے کہ ہر ایک فعل کی ایک تاثیر ہے اور یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ معمولی کمی بیشی سے تاثیروں میں بے انتہا فرق آجاتا ہے اگر صحیح توازن قائم رہے تو انسان ایٹم بم اور راکٹ تک بنا سکتا ہے اور چاند تاروں تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن توازن میں کچھ بھی فرق آجائے تو ساری محنت رائگاں اور دولت برباد ہوتی ہے وہ ہرگز جرأت نہیں کر سکتا کہ مشاہدہ سے بالا چیزوں کے بارہ میں عقلی فیصلوں پر اعتماد کر لے۔ وہ لامحالہ کسی ایسے مخبر اور ایسے رہنما کی تلاش کرے گا اور اس کی جستجو میں بے چین اور مضطرب رہے گا جو انسانی زندگی کے منتہا اور انجام کی صحیح خبر دے سکے! اور وہ متوازن چیزیں بتا سکے جن سے روحانی صحت اور ترقی حاصل ہو اور ابدی سکون میسر آئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت سلیم نے آپ کو ایک خدا کی یاد پر آمادہ کیا۔ اس کا شوق پیدا ہوا۔ ایک طرف قومی زندگی میں آپ وہ اعتماد حاصل کرتے رہے کہ آپ کو "الصادق

الامین" کا خطاب دیا گیا۔ دوسری جانب یادِ خدا کا شوق اتنا ہی بڑھتا رہا۔ یادِ خدا کے شوق کے ساتھ لامحالہ نوعِ انسان کی اصلاح و ترقی کے سوالات بھی آپ کے سامنے آتے رہتے۔

★ یہ اصلاح و ترقی صرف مادیات تک ہو یا اس کا تعلق روحانیت سے بھی ہو۔؟

★ انسانی زندگی۔ صرف اسی ظاہری زندگی تک ہے یا اس کے بعد بھی اس کا تعلق ہے؟

★ اگر انسان مرنے کے بعد بھی ایک وجود رکھتا ہے تو اس کی فلاح و بہبود کس طرح ہو سکتی ہے؟

★ اصلاح کا وہ طریقہ کیا ہو کہ انسان اس زندگی میں بھی امن و سکون اور ترقی سے ہمکنار ہو اور اس کے بعد کی زندگی بھی ایک خوشگوار زندگی ہو اور اس طرح یہ اصلاح مکمل اصلاح ہو۔

یہ وہ سوالات تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب حساس میں خلش پیدا کرنے لگے

لہ نبی اور ولی صوفی یا راہب اور سادھو میں یہ فرق ہے کہ ولی یا صوفی کے غور و فکر کا دائرہ یادِ خدا کی حد تک محدود رہتا ہے وہ نوعِ انسان کی فکر میں پڑے تو یادِ خدا کے شغل میں کمی آجائے۔ اس کا ظرف تنگ ہوتا ہے اس میں یادِ خدا اور فکر نوعِ انسان دونوں کی یکساں گنجائش نہیں ہوتی۔ مگر نبی اور رسول کا ظرف اتنا وسیع ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت دونوں کی یکساں گنجائش رکھتا ہے۔ نبی جیسی وسعتِ ظرف تو نبی کی خصوصیت ہے البتہ اگر کسی ولی کو کسی درجہ پر یہ وسعتِ ظرف حاصل ہو جائے کہ وہ یادِ خدا کے ساتھ نوعِ انسان کے مسائل پر غور کر سکے اور ان میں عملاً دلچسپی لے سکے تو ایسی ولایت کو ولایتِ نبوت کہا جاتا ہے اور ایسے علماء کو جو اس وسعتِ ظرف کے مالک ہوں وارثِ انبیاء قرار دیا جاتا ہے۔ خصوصیت صرف نبی کو حاصل ہوتی ہے کہ ایک طرف اس کی شان یہ ہو کہ تنام عینی ولا ینام قلبی۔ نیند کے وقت میری آنکھیں ضرور بند ہو جاتی ہیں مگر قلب کی بیداری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور دوسری جانب اس کی یہ شان ہو کہ ہر لاچار و بےبس کا پدرِ مشفق۔ ہر بے پناہ کا پشت پناہ۔ مظلوموں کا فریاد رس۔ حقوقِ انسانی کا محافظ۔ دستور و آئینِ مملکت کے لئے بہترین مقنن۔ قومی اور بین الاقوامی سیاست کا مفکرِ اعظم اور اس دریا کا بہترین تیراک۔ میدانِ جنگ کا فیلڈ مارشل اور روحانی قوانین کا اعلیٰ ترین مصلح۔ یہ وسعتِ ظرف صرف رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی اور نبی کی پرچھائیں صحابہ کرام پر پڑی تھی کہ وہ بھی ان اوصاف کے جامع ہو گئے تھے رضی اللہ عنہم اجمعین۔ انبیاء علیہم السلام کے آپس میں معیارِ فضیلت یہی خصوصیتیں ہیں جو ان خصوصیات میں سب سے ممتاز ہوگا اس کا درجہ بھی سب سے بلند ہوگا۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

اور ان کی خلش یہاں تک بڑھی کہ آپ کو اس غور و فکر میں لطف آنے لگا۔ گویا یہی غور و خوض، فکر و مراقبہ، آپ کی حیاتِ مقدسہ کا جوہر بن گیا اور چونکہ شہری زندگی اس میں حارج تھی تو آپ کو تنہائی پسند آنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ دل بستگی یہاں تک بڑھی کہ آپ شہر سے باہر پہاڑ کی ایک کھوہ میں رہنے لگے۔

حرا پہاڑ کا چار گز لانبا اور پونے دو گز چوڑا غار جہاں سے "کعبہ مکرمہ" بھی نظر آتا رہتا ہے اب بھی موجود ہے یہ مکہ شہر سے تقریباً تین میل ہے۔ راستہ اتنا دشوار کہ یہ تین میل تیس میل سے بھی زیادہ کٹھن پڑتے ہیں۔ طاقتور نوجوان بھی وہاں پہنچتے پہنچتے تھک جاتے ہیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عادت بنالی تھی کہ پانی اور ستو ساتھ لیتے اور اس غار میں پہنچ جاتے اور جب تک پھر ضرورت نہ ہوتی آپ وہیں یادِ خدا، غور و فکر اور مراقبہ میں مشغول رہتے۔

رفیقۂ حیات حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہا) بھی پوری وفاداری اور دل سوزی سے حقِ رفاقت ادا کرتی رہیں وہ پانی اور ستو کا ایک اندازہ رکھتیں اور جب ان کے اندازہ سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی واپسی میں تاخیر ہوتی تو وہ خود پانی اور ستو لیکر اس غار پر پہنچ جاتیں۔

آخر میں چھ ماہ[1] ایسے گذرے کہ آپ کو عجیب و غریب خوابیں آتی تھیں اور وہ اپنی تعبیر میں ایسی ہی سچی ہوتی تھیں جیسے سپیدۂ صبح طلوعِ آفتاب کی پیش گوئی میں صادق ہوتا ہے پھر آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ تو آفتاب آمد دلیل آفتاب بقول سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا[2]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب بھی گویا سپیدۂ صبح ہوتا تھا۔ جس کے بعد آفتاب تعبیر کی درخشانی لازمی ہوتی تھی۔

---

[1] یعنی نبوت سے چھ ماہ پہلے

[2] بخاری شریف والبدایۃ والنہایۃ وغیرہا۔

نبوّت

آپ اسی غار میں تھے کہ ایک وجود نمودار ہوا۔ اس سے گھبراہٹ نہیں ہوئی، بلکہ دل کو سکون ہوا۔ جیسے سوکھے ہونٹوں کو ٹھنڈا پانی مل گیا۔

اس نے فرمائش کی اِقْرَأْ پڑھو

حضرت محمدؐ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ آپ نے عذر پیش کر دیا۔ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس وجود نے دوبارہ یہی کہا۔ اِقْرَأْ پڑھو۔ اس مرتبہ بھی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وہی عذر تھا۔ اس وجود نے تیسری مرتبہ یہی کہا۔ اس مرتبہ جواب میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کیا پڑھوں۔ اس وجود نے یہ آیتیں پڑھوائیں۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۞

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۞ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۞ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ ۞

ترجمہ: پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے (ساری مخلوق کو) پیدا کیا۔ بنایا انسان کو لہو کی پھٹکی (جمے ہوئے خون) سے پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔ سکھایا آدمی کو جو نہ جانتا تھا۔

لہ یہ آیت ۶۱۰ء میں نازل ہوئی۔ یعنی ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں جو یورپ کے قرونِ وسطیٰ کا تاریک ترین زمانہ تھا جب مغربی یورپ پر جہالت کی گہری گھٹا چھائی ہوئی تھی، مشرقی یورپ میں کچھ تعلیم کا چرچا تھا تو اس کو کلیسا نے اپنی مخصوص جائداد سمجھ رکھا تھا کسی کی کیا مجال تھی کہ دست درازی کر سکے۔ ہندوستان میں جو کچھ علم تھا وہ چند گھرانوں کی ملک تھا۔ کسی غیر تک اگر بھنک پہنچ جاتی تو اس کے کانوں میں سیسہ پلا دیا جاتا تھا۔ انصاف پسندوں کو اس سے سبق لینا اور مسلمانوں کو گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیئے کیا واقعی ہم علم کے دلدادہ ہیں۔

آپ نے یہ آیتیں پڑھیں۔ آیتیں ذہن نشین ہوگئیں۔ مگر ساتھ ساتھ ذمہ داری کا احساس بھی ہوا۔ ایک طرف اپنی عاجزی کا غیر معمولی احساس تھا۔ آپ کی خصوصیت یہ تھی کہ اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے تھے ہیچ در ہیچ سمجھتے تھے دوسری طرف اتنی بڑی ذمہ داری، اور ایسی ذمہ داری جس کا

لہ انسان کا دوسرا نام ہے "عبد" (بندہ) چونکہ انسان اپنے خالق کا مخلوق اور بندہ ہے اور یہی اس کی حقیقت ہے، تو جو نام اس کی فطرت کے مطابق ہے وہ "عبد" ہے اور فطرتِ عبد کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے جذبات اور اس کا ہر ایک عمل اور کردار عبدیت اور نیازمندی کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہو۔ اس بنا پر عبدیت (بندگی) اور نیازمندی کو عبد (بندہ) کا سب سے اعلیٰ کمال سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ جس درجہ معبود کی عظمت کا احساس ہوگا۔ اتنا ہی اپنی عبدیت اور نیازمندی کا احساس ہوگا اور جو معرفت الٰہی اور خدا شناسی میں کامل و مکمل ہوگا۔ وہ اپنی بندگی نیازمندی، ہیچ در ہیچ اور بے حقیقت ہونے کے احساس میں بھی سب سے بڑھا ہوا ہوگا اور کامل و مکمل ہوگا۔ یہ عبدیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص صفت اور ایسی محبوب و مقبول خصلت ہے کہ حیات مبارکہ کے وہ تمام واقعات جو روحانیت روحانی عروج یا وحی اور تنزیل کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں ان میں آپ کے لئے (صلی اللہ علیہ وسلم) لفظ عبد ہی لایا گیا ہے۔ اور آپ کو عبد ہی سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً سورہ اقرأ جس سے وحی کا آغاز ہوا۔ اس میں ہے ارأیت الّذی ینھٰی عبدًا اذا صلّٰی۔ نزولِ قرآن کے سلسلہ میں ہے۔ تبارک الّذی نزل الفرقان علیٰ عبدہٖ (الفرقان) سورۂ کہف میں ہے۔ الحمد للہ الّذی انزل علیٰ عبدہ الکتاب۔ اعجاز قرآن کے سلسلہ میں ارشادِ ربانی ہے۔ وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا۔ جنات نے قرآن شریف سنا وہ ایمان لائے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ربّانی ہے۔ انہ لما قام عبد اللہ یدعوہ الآیۃ (سورۂ جن) اسرأ جو حیاتِ مقدسہ کی سب سے زیادہ ممتاز مخصوص شان ہے، وہاں ارشاد ہوا۔ اسریٰ بعبدہ لیلًا۔ معراج میں دیدارِ باری اور مکالمہ ربانی کا شرف حاصل ہوا تو اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے۔ فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ (نجم) جو کلمہ مدارِ ایمان قرار دیا گیا ہے اس میں ہے: اشھد ان محمدًا عبدہ ورسولہ۔

بس یہ عبدیت ہی کا ظہور تھا کہ سب کچھ اور سب سے افضل ہونے کے باوجود آپ اپنے آپ کو ہیچ در ہیچ اور ایسا بے حقیقت سمجھ رہے تھے کہ بارِ امانت کے تصور سے بھی قلب مبارک لرز گیا اور ایسا لرزا کہ پورے جسم مبارک کو

(باقی بر صفحہ آئندہ)

کوئی تجربہ اب تک نہیں تھا۔ یعنی بھٹکی ہوئی مخلوق کو پڑھنے پڑھانے، تعلیم دینے اور سدھانے کی ذمہ داری۔ اور ایسی صورت سے جو بالکل اجنبی صورت تھی، جس کا کبھی وہم و گمان بھی نہیں آیا تھا نہ کسی سے ایسی باتیں سنی تھیں۔ اس طرح کے خیالات اور غیر معمولی احساس کا اثر یہ ہوا کہ دل کانپنے لگا۔ آپ مکان پر پہنچے تو لرزہ جیسی کیفیت تھی۔ آپ نے رفیقۂ حیات (حضرت خدیجہؓ) سے کہا:

میرے اوپر کپڑا ڈال دو۔[1]

حضرت خدیجہؓ نے بلائیں لیں، پوچھا کیا بات ہے؟ طبیعت کو سکون ہوا تو آپؐ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لرزا دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت ملائکہ کے مقابلہ میں علم سے ہوئی اور شیطان کے مقابلہ میں عبدیت سے۔ شیطان سے باز پرس ہوئی کہ سجدہ کیوں نہیں کیا۔ تو یہ اس کی خود بینی اور خود پرستی تھی کہ اس نے دعویٰ کیا انا خیر منہ حضرت آدم علیہ السلام بھی اپنے فعل کی توجیہ کر سکتے تھے۔ مگر آدم علیہ السلام نے عجز و تواضع اور نیاز مندی پیش کرتے ہوئے اعتراف کر لیا ربنا ظلمنا انفسنا۔ اے ہمارے رب بلاشبہ ہم نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ یعنی اپنے قصور اور ظلم کا اعتراف بھی ہے اور یہ بھی اعتراف ہے کہ اس ظلم پر پردہ ڈالنے والا تیرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ بس یہ نیاز مندی اور عبدیت تھی، جس نے شیطان کے مقابلہ میں حضرت آدمؑ کو مقبولِ بارگاہِ حضرتِ حق بنایا۔ واللہ اعلم بالصواب

[1] اور اس امانت کی ذمہ داری جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ انا عرضنا الامانۃ الخ سورہ احزاب آخری رکوع۔ ترجمہ: ہم نے پیش کی امانت۔ آسمانوں کے سامنے۔ زمین کے سامنے۔ پہاڑوں کے سامنے۔ ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے خوف کھا گئے اور اٹھایا اس کو انسان نے۔ (سورۂ احزاب آخری رکوع پ ۲۲)

[2] خود قرآن پاک کی عظمت اور اس کا وقار ایک باحساس کو لرزہ براندام کرنے کے لئے کافی ہے۔ ارشاد ربانی ہے لو انزلنا ھذا القرآن علیٰ جبلٍ لرأیتہ الخ۔ اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔ (سورۂ حشر آخری رکوع پ ۲۸)

پورا قصہ سنایا۔ اور یہ بھی فرمایا۔ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے (ایسی بڑی ذمہ داری کس طرح اٹھا سکوں گا)

حضرت خدیجہؓ سمجھدار خاتون تھیں۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جس طرح پندرہ سال سے دیکھ رہی تھیں ان کو یقین تھا کہ اس غیر معمولی شخص کے لئے کوئی غیر معمولی صورت نمودار ہوگی جس کی شان نرالی ہوگی۔

حضرت خدیجہؓ نے پورا واقعہ سنا۔ پھر وہ آیتیں سنیں۔ جن میں اس طرف اشارہ تھا کہ خدار قادر جو خون کے لوتھڑے سے جیتا جاگتا انسان بناتا ہے۔ قلم کے ذریعہ لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے۔ انسان کو وہ باتیں بتاتا ہے جن کو وہ خود اپنے ذہن سے نہیں معلوم کر سکتا تھا، وہ خدار قادر کسی استاد یا قلم کی مدد کے بغیر محض اپنی قدرت سے علم کے دروازے آپ پر کھول دیگا۔

یہ آیتیں سن کر حضرت خدیجہ (رض) کو یقین ہو گیا کہ جس غیر معمولی صورت کی توقع تھی وہ سامنے آگئی ہے۔

وہ اس واقعہ کے متعلق کوئی فیصلہ تو نہیں کر سکیں۔ البتہ حضرت محمدؐ نے جو خطرہ ظاہر کیا تھا کہ ان ذمہ داریوں کے بوجھ سے میری جان جاتی رہے گی حضرت خدیجہؓ نے اس کا اطمینان دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کی زندگی کا مرقع پیش کر کے بہت لطیف پیرایہ میں اطمینان دلایا کہ آپ یہ بار اُٹھا سکیں گے۔ کیونکہ اب تک کی زندگی میں جو بوجھ اٹھاتے رہے ہیں وہ کم نہیں ہیں، وہ بھی غیر معمولی ہیں۔ پس اگر کوئی اس سے بھی بڑی ذمہ داری آپ پر پڑے گی تو آپ اُس کو بھی اٹھا سکیں گے۔

حضرت خدیجہؓ نے اطمینان دلاتے ہوتے فرمایا۔ كَلَّا وَاللهِ لَا يُخْزِيكَ اللهُ ابدا انك لَتَصِلُ الرَّحِمَ وتحمل الكل وتكسب المعدوم وتقري الضيف وتعين على نوائب الحق۔ (بخاری شریف ص۳)

ترجمہ: خدا شاہد ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کبھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ناکام کر دے۔ آپ کی مدد نہ کرے آپ رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں اُن

کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ ہارے، تھکے، درماندہ مسافروں کے لئے سواری کا انتظام کرتے ہیں اُن کو منزل تک پہنچاتے ہیں۔ آپ ایسے احسانات کرتے ہیں اور ایسی خدمات انجام دیتے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی، جو دوسری جگہ قطعاً نایاب ہیں۔ باہر کے مسافر جو بے ٹھکانا ہوتے ہیں آپ ان کو اپنا مہمان بناتے ہیں۔ برپا ہونے والے ہنگاموں اور ناگہانی حوادث میں آپ حق کی حمایت کرتے ہیں۔"

حضرت خدیجہؓ نے اس طرح تسلی دی۔ لیکن یہ اُن کی رائے اور ان کا اپنا اعتقاد تھا کہ جو اس طرح صاحب خیر ہو، خدا کی طرف سے اس کی مدد ہوگی۔ اس کو ذلیل و رسوا اور ناکام نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس طرح کے معاملہ کی حقیقت وہ بھی نہیں جانتی تھیں۔ کیونکہ نبوت اور الہام کی باتوں سے وہ بھی واقف نہیں تھیں۔ ان کو ایک شخص کا خیال آیا۔ یہ حضرت خدیجہؓ کے ہجید رشتہ کے بھائی ہوتے تھے۔ عیسائی مذہب اختیار کئے ہوئے تھے۔ عالم فاضل تھے نبوت اور الہام کی باتیں جانتے تھے۔ عبرانی زبان پر ان کو عبور تھا۔ عبرانی کی اصل انجیل کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ عربی میں اس کا ترجمہ بھی کیا کرتے تھے۔ اب بہت بڑھے تھے۔ بصارت سے بھی معذور ہو چکے تھے۔ مگر لوگ اُن کی قدر کرتے تھے۔ ان کا نام ورقہ تھا ولدیت نوفل۔

حضرت خدیجہؓ، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ساتھ لے کر اُن کے یہاں پہنچیں اور کہا آپ کے برادر زادے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو عجیب صورت پیش آئی ہے۔ یہ خود ہی بیان کریں گے۔ آپ غور سے سنئے اور رائے دیجئے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پورا واقعہ بیان کیا۔

ورقہ نے جیسے ہی سنا برجستہ جواب دیا۔

یہ تو وہی ناموس[1] (فرشتہ) ہے۔ جس کو اللہ تعالےٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا تھا۔

ورقہ نے کہا۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ کاش میں جوان ہوتا۔ کاش میں اس وقت تک زندہ ہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔

---

[1] رازدار فرشتہ فتح الباری۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سنا کہ قوم ان کو نکالے گی تو بہت تعجب ہوا۔ یہ قوم جو یہاں تک گرویدہ ہے کہ عقیدت اور احترام میں نام لینا بے ادبی سمجھتی ہے، مجھ سے دعائیں کراتی ہے اور بڑے معاملات کا فیصلہ کرنا میرے حوالے کر دیتی ہے، کیا وہ ایسی آنکھیں پھیر لے گی کہ مجھے مکہ سے نکال دے گی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے محبوب رہنما کے لئے یہ بہت ہی عجیب بات تھی۔ آپؐ نے تعجب سے دریافت کیا۔ کیا میری قوم مجھے نکالے گی؟

ورقہ! بیشک آپ کو نکالے گی اور یہ انوکھی بات نہیں ہے، جو شخص بھی ایسی بات پیش کرتا ہے جو آپ پیش کرنے والے ہیں، اس کے ساتھ قوم کا برتاؤ یہی ہوا کرتا ہے کاش میرے سامنے وہ دن آئے تو میں آپ کی پوری پوری مدد کروں۔

ورقہ تو زندہ نہیں رہے۔ کچھ دنوں بعد اُن کی وفات ہوگئی۔ مگر جو بات انہوں نے کہی تھی، وہ پوری ہوئی۔ (تفصیل آگے آئے گی۔)

یہ تھا نبوت کا آغاز۔ اور یہی تھی وحی کی ابتدا جس میں پڑھنے پڑھانے۔ علم اور قلم کا تذکرہ اور عالمانہ زندگی کی ترغیب ہے۔ (واللہ اعلم) ابتدائی ظہور کے بعد یہ سلسلہ کچھ عرصہ کیلئے بند ہوگیا۔

ذوق وشوق

کہتے ہیں عشق برق خرمن سوز ہوتا ہے جو اپنے سوا رمتاع ہستی کی ہر ایک نمود کو ختم کر دیتا ہے رہتا ہے تو صرف عشق۔ مگر محبوب کی طرح محبوب۔ درد ہے مگر رگِ جاں سے زیادہ عزیز۔ عاشق کی تمنا یہی رہتی ہے کہ یہ درد بڑھے وہ اپنے خاتمہ کی تمنا کر سکتا ہے۔ مگر خاتمہ عشق کا نام بھی زبان پر نہیں لا سکتا۔ کچھ ایسی ہی صورت یہاں بھی ہوئی جس کیفیت کا ایک اثر یہ تھا کہ قلبِ مبارک لرزنے لگا۔ اُسی کا دوسرا اثر یہ تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تمنا یہ ہوگئی کہ وہ کیفیت پھر میسر آئے۔ اس کا شوق یہاں تک بڑھا کہ آپ اس کے بغیر اپنی زندگی بیکار سمجھنے لگے۔ جب اس شوق کا غلبہ ہوتا تو آپ چاہتے کہ کسی پہاڑ کی چوٹی سے اپنے آپ کو گرا کر ختم کر دیں[1]۔ لیکن رحمتِ حق دستگیری کرتی۔ بہر حال

---

[1] بخاری شریف ص۱۰۳۵ ۔

جس قدرت نے آپ کو خاص مقصد کے لئے پیدا کیا تھا وہی رہنما بنی۔ اور کچھ عرصہ توقف کے بعد سلسلۂ وحی شروع ہو گیا۔ یعنی ذوق و شوق، ذکر و فکر اور مراقبہ کا ضروری کورس پورا ہو گیا تو وحیٔ الٰہی کی بارش ہونے لگی جو مسلسل اکیس[21] برس تک ہوتی رہی۔

تبلیغ اور دعوتِ عام سے پہلے تربیّت

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چالیس سالہ مثالی زندگی نے آپ کو الصادق اور الامین اور ایسا محبوب رہنما بنا دیا تھا جس کے اعلیٰ اخلاق اور بہترین کردار پر مکہ کے ہر ایک چھوٹے بڑے کو پورا اعتماد تھا۔ مگر ان اعلیٰ اخلاق کے باوجود منصب نبوت کے فرائض اور ادا، فرائض کے طریقوں سے آپ قطعاً ناواقف تھے۔ قرآن مجید نے آپ کی شان یہ بیان کی ہے۔

(الف) نہ آپ لکھ سکتے تھے، نہ لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے۔ نہ آپ نے کہیں تعلیم پائی تھی[۱] نہ آپ شاعر تھے نہ ادیب کی حیثیت سے آپ کی شہرت تھی[۲] نہ آپ کاہن یا نجومی تھے[۳] نہ سابق مذہبوں سے آپ کو واقفیت تھی[۴] نہ آپ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔ آسمانی کتاب کیا ہوتی ہے[۵]۔ نہ آپ کو کبھی یہ خیال آیا تھا کہ آپ پر کوئی کتاب نازل ہوگی[۶]۔ نہ اس شہر میں جہاں آپ پلے تھے، پڑھے تھے، نبوت یا رسالت کا چرچا تھا۔ انتہا یہ کہ وہ قوم جس کے آپ فرد تھے اُمّی تھی، یعنی نبوت سے ناآشنا، کیونکہ اس میں کوئی نبی نہیں ہوا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام سُنا تھا۔ مگر ان کی تعلیمات فراموش ہو چکی تھیں صرف دھندلے سے نشان باقی تھے۔ لیکن اب آپ پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ ایسی قوم میں مکمل انقلاب برپا کریں جو اگرچہ گمراہ ہے۔ مگر اپنے آپ کو تمام دنیا کی قوموں میں سب سے بہتر اور برتر سمجھتی ہے اور یقین رکھتی ہے کہ حق وہی ہے جس پر وہ قائم ہے[۷]۔ اور اس انقلاب کا آغاز خاص اس گروہ سے کریں جس کو نہ صرف اس کا یقین ہے کہ وہ حق پر ہے بلکہ فخر بھی ہے کہ وہ اپنے مذہب میں نہایت پختہ اور کٹر ہیں[۸]۔ اس قوم (عرب) سے متصل ایک طرف ایران، عراق، فارس اور ان سے متصل ہندوستان ہے۔ اُن کے

---

[۱] سورۂ عنکبوت ع ۲۹ آیت ۴۸ [۲] سورۂ یٰسین ع ۳۶ آیت ۶۹ [۳] سورۃ الحاقہ ع ۶۹ آیت ۴۱ و ۴۲ [۴] سورۂ قصص ع ۲۸ آیت ۴۴ تا ۴۶ [۵] سورۂ شوریٰ ع ۴۲ آیت ۵۲ [۶] سورۂ قصص ۲۸ آیت ۸۶ [۷] سورۃ ۸ انفال آیت ۳۲۔ اذ قالوا اللّٰھم ان کان ھذا ھو الحق الآیۃ۔ [۸] اپنے آپ کو وہ احمس یا حمس کہتے تھے۔ یعنی اپنے مذہب میں کٹر اور نہایت پختہ۔

مذہب اگرچہ مختلف ہیں مگر پرستش غیر اللہ (شرک) میں سب شریک ہیں کوئی بُت پرست ہے کوئی کواکب پرست۔ کوئی عجائب پرست۔ ہر ایک کے پاس ایک فلسفہ ہے اور ہر ایک کو اپنی روایات۔ اپنے تمدن۔ اپنی عقل و دانش اور اپنے فلسفہ پر ناز ہے۔

دوسری طرف شام۔ مصر۔ افریقہ اور یورپ کے علاقوں میں بازنطینی شہنشاہیت کے پرچم لہرا رہے ہیں اور اگرچہ آج (بیسویں صدی عیسوی میں) چھٹی ساتویں صدی عیسوی کے دَور کو قرون وسطیٰ کا پس ماندہ غیر مہذب اور غیر ترقی یافتہ۔ تاریک ترین دَور کہا جاتا ہے۔ مگر یہی علاقے ہیں جہاں رومۃ الکبریٰ کا مشہور قانون (رومن لا) جاری ہے اور اسی علاقہ میں سقراط۔ بقراط۔ ارسطو افلاطون۔ فیثا غورث۔ جیسے باکمال فلاسفر اور موجد گذر چکے ہیں۔ جن کے فلسفہ کو آج بیسوی صدی میں بھی زندہ فلسفہ کہا جاتا ہے۔

یہ پچھڑے ہوئے[1] اور پس ماندہ عرب کا ایک "اُمّی" ان تمام علاقوں اور اُن میں بسنے والے انسانوں یعنی پورے نوع بشر کے لئے ہادی اور رہنما بنایا جا رہا ہے۔ منصبِ رسالت اس کے سپرد ہونے والا ہے تو اس سے پہلے کہ وہ دوسروں کو دعوت دے ضروری ہے کہ جن باتوں کی وہ دعوت دے اُن کا نمونہ وہ خود بن جائے۔ چنانچہ نبوت کے بعد کم و بیش تین سال ایسے گذرے جن میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عام دعوت و تبلیغ کا حکم نہیں تھا۔ ہاں کچھ سعادت مند وہ تھے جنہوں نے مشک کی خوشبو خود سونگھ لی اور وہ خود ہی اس شمع کے پروانے بن گئے۔ ان میں سب سے پہلے یہ حضرات ہیں۔ ابوبکرؓ۔ خدیجہؓ۔ علیؓ۔ زیدؓ بن حارثہ اور اُم ایمن (رضی اللہ عنہم اجمعین) یہ تعداد میں صرف پانچ ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اُن کا تعلق آزاد۔ غلام۔ مرد۔ عورت۔ بچے یعنی نوعِ انسان کے ہر طبقہ سے ہے۔

---

[1] قبیلۂ قریش اور ثقیف وغیرہ چند قبائل اگرچہ متمدن تھے مگر عرب قوم متمدن نہیں تھی اس کی بڑی تعداد بادیہ نشین صحرا نورد تھی (محمد میاں)[2] تاکہ مقصدِ رسالت پورا ہو کیونکہ نبوت اور رسالت اس لئے نہیں کہ پیغام پہنچا دیا جائے بلکہ بشر کو نبی یا رسول بنانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ نوع بشر کے سامنے عملی نمونہ بھی پیش کیا جائے (دیکھو سورۂ ۶۔ الانعام آیت ۷ تا ۱۰)

آزاد مردوں میں	ابُوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ)
آزاد عورتوں میں	خدیجہ (رضی اللہ عنہا)
بچوں میں	حضرت علی (رضی اللہ عنہ وکرم وجہہٗ)
آزاد کردہ غلاموں میں	زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) جو اس وقت زید بن محمد کہلاتے تھے)
آزاد کردہ باندیوں میں	اُم ایمن (رضی اللہ عنہا) جو بچپن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ماما (خادمہ) تھیں۔

ان حضرات نے بھی ابھی تبلیغ شروع نہیں کی لیکن اچھا خربوزہ اگر اس کی پود ٹھیک ہو تو وہ دوسرے خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑ لیتا ہے۔ پس کچھ اور افراد جن کے کردار نے مستقبل میں ثابت کر دیا کہ وہ بہترین انسان اور پورے سماج کے قیمتی جواہر تھے، وہ خود متاثر ہوئے اور دعوتِ عام سے پہلے آغوشِ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اُن کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ (اُن کے پُرتقدس کارنامے تاریخ عالم کے سینے پر نقش ہیں۔ جو شہادت دے رہے ہیں کہ یہ حضرات کس درجہ صداقت پسند حق گو، دلیر اور بہادر تھے اور اسی لئے وہ سب سے پہلے الصادق الامین اور اس کے پیغام کے گرویدہ ہو گئے تھے۔

عثمان بن عفان۔ طلحہ بن عبید اللہ۔ زبیر بن عوام۔ سعد بن ابی وقاص۔ عثمان بن مظعون۔ ابو عبیدۃ بن الجراح۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ ابوسلمہ بن عبدالاسد۔ ارقم بن ابی ارقم[1] (رضی اللہ عنہم اجمعین) تعلیم و تربیت کے اس بنیادی دور میں ان کی تربیت بھی ہوتی رہی۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۰۔

نصاب اور طریقۂ تربیت

قرآن پاک کی وہ سورتیں جو ابتداء میں نازل ہوئیں انہیں کو نصاب کہا جا سکتا ہے ان سورتوں میں عقائد و نظریات کی بھی تعلیم دی گئی ہے اور طریقہ تربیت بھی بتایا گیا ہے۔ عجیب بات جو ایک طالب حق کو مطمئن اور گرویدہ بنا دیتی ہے یہ ہے کہ جن عقائد و نظریات کی تعلیم ابتداء میں دی گئی باقی ۲۳ سالہ زندگی میں ان کی ہی تشریح اور توضیح ہوتی رہی۔ ترمیم کسی ایک میں بھی نہیں ہوئی بنیادی تعلیمات درج ذیل ہیں۔ آیتوں اور سورتوں کے نمبر حاشیہ میں لکھ دیئے گئے ہیں:

- پوری کائنات کا ایک خالق ہے جس کی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ رب العالمین اور ارحم الراحمین ہے (یعنی مخلوقات کے جس قدر طبقات اور درجات کائنات عالم میں ہیں وہ ان کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے۔ اس نے ہر مخلوق کی ایک فطرت بنائی اور اس فطرت کے موجب نشو و نما۔ بقاء و تحفظ، تدریجی ترقی اور درجۂ کمال تک پہونچنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی اس کی رحمت نے ان کو مہیا کیا اور برابر مہیا کرتی رہتی ہے (تمام جہانوں کا رب اور سب پر رحم کرنے والا وہی ہے۔ تمام کمالات اسی کو حاصل ہیں۔ تمام تعریفوں کا وہی مستحق ہے[1]
- مشرق و مغرب کا رب وہی ہے۔ وہی معبود ہے۔ اس کے سوا اور کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے[2]
- اس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ اس کو دولت علم سے نوازا اور ترقی کے راستہ پر لگایا[3]
- وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ قلم اور لکھنے پڑھنے کے ذریعہ تعلیم کا طریقہ اسی نے بتایا[4] وہ

---

[1] الحمد للہ رب العالمین سورۃ ۱ آیت ۱ و ۲ [2] سورۃ مزمل ۷۳ آیت ۹ [3] سورۃ علق ۹۶ آیت ۲ و ۳ [4] سورۃ علق ۹۶ آیت ۴۔

اس ذریعہ کے بغیر بھی جس کو چاہے عالم و فاضل اور سرتاج فضلاء بنا سکتا ہے۔

- وہ ایک ہے، یکتا ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں، سب اُس کے محتاج ہیں۔ نہ اُس کے اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے[۱]
- انسان کا ہر ایک عمل اچھا ہو یا بُرا ایک حقیقت ہے۔ ہر ایک عمل اپنا اثر رکھتا ہے۔ انسان اپنے اعمال کے جال میں اس طرح پھنس جاتا ہے جیسے کوئی قیدی[۲]
- کوئی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر نہیں لے سکتا۔ کسی پر دوسرے کا گناہ نہیں ڈالا جا سکتا ہر شخص اپنا اور اپنے فعل کا ذمہ دار ہے انسان کو صرف وہی ملتا ہے جو اُس نے کمایا انسان جو کچھ کماتا ہے وہ اس کے سامنے آئے گا[۳]
- ایک خاص دن ہو گا جس میں انسان کے تمام اعمال کا حساب اور ہر معاملہ کا انصاف ہو گا[۴]
- خدا کی مخلوق صرف وہی نہیں ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مخلوق ہے۔ ایک خاص مخلوق وہ ہے جس کو فرشتہ کہا جاتا ہے اُن کی تعداد کا علم صرف ان کے خالق "اللہ رب العالمین" ہی کو ہے[۵] وہ خدا کے حکم کے سوا کچھ نہیں کر سکتے[۶] ان کی زندگی یہی ہے کہ اللہ تعالےٰ کے احکام کی تعمیل اور خدا کی حمد و ثنا کرتے رہتے ہیں وہ خدا کے حکم سے انسانوں پر خدا کی نعمتیں بھی نازل کرتے ہیں اور خدا کے حکم سے خدا کا قہر بھی بندوں پر اتارتے ہیں[۷]
- اللہ تعالیٰ انسانوں کی صحیح رہنمائی کے لئے نبی اور رسُول بھیجتا ہے[۸]۔ نبی اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، صرف وہ کہتا ہے جو خدا اس کو بتاتا ہے[۹]
- علم اور یقینی بات وہی ہے، جو اللہ کے بتانے سے رسُول بتاتا ہے۔ اس کے علاوہ جو

---

۱ سورۂ اخلاص ۱۱۲ ۲ سورۂ مدثر ۷۴ آیت ۳۸ ۳ سورۂ والنجم ۵۳ آیت ۳۸، ۳۹-۴۰ ۴ سورۂ الفاتحہ ۱ آیت ۳ ۵ سورۂ مدثر ۷۴ آیت ۳۱ ۶ سورۂ والنجم ۵۳ آیت ۲۵ ۷ سورۂ مدثر ۷۴ آیت ۳۱ ۸ سورۂ مزمل ۷۳ آیت ۱۵ ۹ والنجم ۵۳ آیت ۳-۴

کچھ انسان کے پاس ہے۔ وہ ظن ہے (تخمینی اور اٹکل کی باتیں ہیں) جو علم و یقین کا مقابلہ نہیں کرسکتیں[۱]

- تزکیۂ نفس اور دل کو پاک کرنے اور روحانیت کو ترقی دینے کی صورتیں یہ ہیں:
اللہ کو یاد کرو۔ دن کو یاد کرو۔ رات کو جاگ کر خدا کی یاد کرو[۲]۔ نمازیں پڑھو۔ زکوٰۃ ادا کرو (جو ایک لازمی فریضہ ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ)۔ اللہ کو قرض دو (ملی اور قومی کاموں میں خرچ کرو وہ اللہ تعالیٰ پر قرض ہوگا، کوئی نیک عمل ضائع نہیں کیا جائیگا۔ جو نیکی کرو گے خدا کے یہاں اس سے بہتر اور بہت بڑھا ہوا پاؤ گے۔ جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوتی رہیں اللہ تعالیٰ سے ان کی معافی اور مغفرت چاہتے رہو[۳]
- دولت کو اللہ کا انعام سمجھو۔ ہر ایک غرض سے بلند ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کے فرمان کی تعمیل اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہر ایک ضرورت مند کی مدد کرو اور اس سے کہہ دو کہ ہم کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔ صرف اللہ کی رضا چاہتے ہیں[۴]
- روحانیت کی پاکی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جسم کو پاک رکھو۔ لباس پاک رکھو ہر ایک پلیدی کو (ظاہری ہو یا باطنی) دور کرو[۵]
- عذاب کے کام۔۔۔ (جن سے انسان کی ابدی زندگی برباد ہوتی ہے اور دوزخ کا مستحق ہوجاتا ہے) یہ ہیں۔
نماز نہ پڑھنا۔ غریبوں کی امداد نہ کرنا۔ بیکار باتوں (اور خدا سے غافل کرنے والے کاموں) میں منہمک رہنا۔ عذاب و ثواب یعنی پاداش عمل پر یقین نہ رکھنا[۶]۔ کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرکے اس پر احسان جتانا۔[۷]

۱؎ والنجم ۵۳؍ آیت ۲۸ ۲؎ سورۃ مزمل ۷۳؍ آیت ۱-۲-۳-۴ ۳؎ سورۃ مزمل ۷۳؍ آیت ۲۰ ۴؎ سورۃ دہر ۷۶؍ آیت ۸-۹ ۵؎ سورۃ مدثر ۷۴؍ آیت ۶ ۶؎ سورۃ مدثر ۷۴؍ آیت ۴، ۵۔ ۷؎ سورۃ مدثر ۷۴؍ آیت ۴۴ تا ۴۶ ۸؎ ایضاً آیت ۶۔

ایسی صورتیں اختیار کرنا کہ دولت اپنے پاس جمع رہے اور غریبوں اور ضرورت مندوں کی امداد نہ ہو۔[1]

اچھے آدمی جن کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام سے نوازا[2] یعنی[3] (الف) خدا کے برگزیدہ نبی۔

جو ایسے پاک فطرت ہوتے ہیں کہ ہمیشہ گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

(ب) صدّیق: جو اپنے قول و فعل میں نہایت سچے۔ جن کا ضمیر سچا۔ جن کے ہر فعل میں سچائی اور صداقت۔ یہاں تک کہ وہ سچائی کا پیکر اور صداقت کی تصویر ہوتے ہیں۔

(ج) شہید: جو حق و صداقت کے راستہ میں ہر ایک قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں۔ جن کا جذبہ یہی ہوتا ہے کہ راہِ حق میں قربان ہوں اس کے علاوہ اور اپنے تمام جذبات قربان کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔

(د) صالح: نیک کردار۔ پاکباز۔ پاک طینت۔ جو اچھے کاموں کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں اور اس صلاحیت کو عمل میں لاتے رہتے ہیں۔

- مومن صالح اور سچا مسلمان وہ ہے جو راتوں کو جاگ جاگ کر خدا کو یاد کرے۔ دن کے کاموں کو خوبی سے انجام دے اور دل میں یادِ خدا رکھے۔ اُسی سے اس کا دِل لگا رہے۔ اسی پر بھروسہ رکھے۔ نمازیں پڑھے۔ زکوٰۃ ادا کرے قومی اور ملی کاموں کے لئے دولت خرچ کرتا رہے۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگتا رہے۔ مخالفین کی باتوں کو ضبط و تحمل سے برداشت کرے۔ برداشت سے باہر ہو جائیں تو خوش اسلوبی سنجیدگی

---

[1] سورۃ القلم ۶۸ آیت ۱۷ تا ۳۰ [2] سورۃ فاتحہ ۱ آیت ۵ [3] یہ تشریح قرآن پاک میں بعد میں نازل ہوئی (سورۃ نساء ۴ آیت ۶۹) لیکن عمل پہلے دن سے اسی پر تھا۔

اور نرمی کے ساتھ ان سے الگ ہو جائیے[۱] جو قول و قرار کے پکے ہوں، جو منت مان لیں یا عہد کر لیں اوس کو پورا کریں۔ جو بلا لحاظ مذہب و فرقہ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کی امداد کو اپنا فرض سمجھیں۔ اپنی ضرورتیں پیچھے ڈالیں اُن کی ضرورتیں پُوری کریں۔ خدا کی خوشنودی ان کا نصب العین ہو۔ جو کچھ کریں خدا کے لئے ہی کریں۔ کسی انسان سے کوئی معاوضہ گوارا نہ کریں۔ یہاں تک کہ یہ بھی نہ چاہیں کہ کوئی انسان اُن کا کسی طرح شکریہ ادا کرے۔ خوفِ خدا، خدا کی عظمت اور اپنے انجام کی فکر ان کے دل و دماغ پر چھائی رہے۔ جو کچھ کریں اسی لئے کریں[۲]

بدترین انسان وہ ہیں:

جو حکومت اور اپنے اقتدار پر گھمنڈ کریں۔ جن کو اپنی شاہنشاہیت پر ناز ہو (جیسے فرعون)، جو اپنی دولت کے نشہ میں صداقت سے مونھ موڑیں۔ حقائق کو جھٹلائیں[۳]

جن کو اپنی دولت پر۔ اپنی اولاد پر اپنے مادی ذرائع و وسائل پر ناز ہو۔ انہیں کی بڑھوتی کی اُدھیڑبن میں رات دن لگے رہیں۔ ذخیرہ اندوزی کے حریص ہوں۔ حق کے مقابلہ میں اکڑ جائیں۔ سچائی کی توہین کریں۔ عبرت کی آنکھیں بند رکھیں[۴]

جو خدا کو بھول جائیں۔ خدا کی مخلوق کو بھول جائیں۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹی قسمیں کھانے سے نہ شرمائیں، بلکہ اس کو ہوشیاری اور فن کاری سمجھیں۔ بجی کو چڑھائیں کسی کو اتاریں لگی بجھی کرتے رہیں۔ چغلیاں کریں۔ نہ ان کی نظر میں شرافت اور اخلاق کی قدر ہو نہ عصمت اور پاکدامنی کی۔ جن کی کوشش یہ ہو کہ غریبوں کا حق دبائیں اور اپنا سرمایہ بڑھائیں[۵]

آپ کسی بہترین شاعر کا تصور کیجئے، جس کے اشعار میں فصاحت و بلاغت کی تمام خوبیاں کے ساتھ ایسا درد بھی ہو جو سننے والوں کو خواہ مخواہ متاثر کر دے۔ مذکورہ بالا مضامین اگر ایسے شیریں

---

[۱] سورۂ مزمل ۷۳، آیت ۱۰۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰ اور ۲۰ [۲] سورۂ دہر آیت ۷، ۸۔ ۹۔ ۱۰ [۳] سورۂ مزمل ۷۳، آیت ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۰ و آیت ۱۱ [۴] سورۂ مدثر ۷۴، آیت ۱۱ تا ۱۶ [۵] سورۂ قلم ۶۸، آیت ۸۔ ۱۰ تا ۱۴۔

اور رقت انگیز کلام میں سمو دیئے جائیں اور وہ لوگ جو اپنی زندگی خاص سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں دن رات اس کلام کا وِرد رکھیں تو خود ان کی زندگی کیسی ہو جائے گی اور اس کا ردِ عمل ان پر کیا ہوگا جن پر اس کلام کی زد پڑتی ہے یعنی جن کے مفادات کو ٹھیس پہنچتی ہے یا اندیشہ ہے کہ ٹھیس پہونچے گی۔

قرآن حکیم منظوم نہیں ہے۔ نہ اس میں اول سے آخر تک کوئی شعر ہے مگر یہ اس کا تسلیم شدہ معجزہ ہے کہ اس کی شیرینی۔ لطافت۔ فصاحت و بلاغت شعر سے کہیں زیادہ رقت انگیز اور انقلاب آفرین ہے۔ عرب خصوصاً قریش اپنی زبان کے عاشق تھے۔ جتنا بڑا ادیب ہوتا تھا اتنا ہی زیادہ ادیبانہ کلام سے متاثر ہوا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض شعراء کے منتخب اشعار کو دیوتا کا درجہ دیا جاتا تھا اور ان کے سامنے سجدہ کیا جاتا تھا۔ یہ ادیب قرآنِ پاک سے بھی اتنے ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ متاثر ہوا کرتے تھے (اس کی تفصیل آگے آئے گی انشاء اللہ) یہاں تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جو سورتیں نبوت کے آغاز میں نازل ہوئیں ان میں ان مضامین کو ایسے انداز سے مرصع کیا گیا ہے کہ سننے والے اگر اپنی ضمیر کی آواز پر عمل کرتے تو ان مقاصد کے لئے اپنی زندگی تج دینے کے لئے بے تاب ہو جاتے تھے۔ یہ سورتیں اس دور کا تعلیمی نصاب تھیں۔ نمازوں میں پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے ایک ایک اشارہ پر عمل کیا جاتا اور ایک ایک لفظ کو بحث اور غور و فکر کا موضوع بنایا جاتا تھا۔

طریقۂ تربیت

- رات کو اُٹھو۔ جاگو۔ آدھی رات یا آدھی رات کے قریب یادِ خدا میں کھڑے ہو کر گذارو۔[1]
- قرآن کو ٹھیر ٹھیر کر اطمینان سے پڑھو۔[2]

(تبلیغ خصوصاً فرائض نبوت کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ ریاضت و مجاہدہ

---

[1] سورۂ مزمل ۷۳، آیت ۲-۳ [2] ایضاً آیت ۴۔

یعنی محنت کرنے اور مشکلات کو برداشت کرنے کی عادت ہو۔ضمیر پاک ہو۔اس کی تمام صلاحیتیں بیدار ہوں۔جو بات نکلے دل سے نکلے۔ہر ایک بات نہایت ٹھیک اور سنجیدہ ہو۔شب بیداری سے یہ خصلتیں پیدا ہوتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ رات کے اٹھنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور ہر بات خوب ٹھیک نکلتی ہے[1]۔ (لہذا شب بیداری کرو تاکہ یہ خصلتیں پیدا ہوں کیونکہ) ہم عنقریب ڈالیں گے تم پر بھاری کلام[2]

- پورے دن کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھو[3]
  اپنے رب کے نام کا ذکر جاری رکھو[4]
- اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو جاؤ۔[5]
- خدا کو اپنا وکیل اور ذمہ دار بنا لو[6]۔ اسی پر بھروسہ رکھو۔
- اس عقیدہ کو اپنے اوپر حاوی کر لو۔ کہ مشرق و مغرب (اور تمام عالم) کا رب وہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں جو معبود اور الٰہ ہو۔[7]
- جو کچھ وہ (مخالفین) کہتے ہیں اس پر ضبط و تحمل سے کام لو[8] زیادہ سے زیادہ برداشت کی عادت ڈالو۔
- دنیا داروں سے کنارہ کرو (مگر خوبصورتی کے ساتھ[9]) یہ کنارہ کشی ایسی ہو کہ اپنے اندر جمال رکھتی ہو۔نفرت نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسے طبیب، بیمار کی بیماری سے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔مگر۔اس طرح کہ اس بچاؤ میں بھی دلداری ہوتی ہے (مرض کا علاج کرتا ہے، مریض کا دل نہیں توڑتا۔

---

[1] سورۃ مزمل ۷۳، آیت ۶ [2] ایضاً آیت ۵ [3] ایضاً آیت ۷ [4] ایضاً آیت ۸ [5] ایضاً آیت ۸
[6] ایضاً آیت ۹ [7] ایضاً آیت ۹ [8] ایضاً آیت ۱۰ [9] ایضاً آیت ۱۰۔

داعی الی اللہ کے اوصاف اور اُن کی تربیت و تکمیل

جس ذات کو اس لئے اٹھایا جارہا ہو کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے ۔ بھٹکی ہوئی مخلوق کو حق و صداقت کے صراطِ مستقیم اور نیکی اور سچائی کے شاہراہِ اعظم پر چلائے ۔ اس کے کچھ اوصاف ہونے چاہیئں ۔ قرآن حکیم میں جابجا ان اوصاف کی طرف اشارے اور کہیں تصریح پائی جاتی ہے ۔

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت ایک بہترین مثال ہے اور ان اشاروں اور تصریحات کی شہادت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ کی ذاتِ اقدس بہترین مثال اور نمونہ اس لئے تھی کہ مقاصد دعوت و ہدایت کے لئے آپ کی تربیت خاص طور پر کی گئی تھی داعی حق کے تمام اوصاف اس مختصر کتابچہ میں بیان نہیں کئے جا سکتے یہاں صرف چند اوصاف بیان کئے جا رہے ہیں ۔

(۱) ہمدردی

کامیاب داعی اور ہادی کو شمع اور چراغ ہونا چاہیئے ۔ شمع پوری محفل کو فیض پہنچاتی ہے تاریک مجلس کو روشنی سے بھر دیتی ہے ۔ مگر اس طرح کہ اہل محفل کے لئے خود فنا ہوتی رہتی ہے ایک سوز ہوتا ہے جو اس کے تن من کو تحلیل کرتا رہتا ہے ۔ داعی حق بھی اسی طرح سوز و گداز کا پیکر ہوتا ہے وہ اپنی بقا ۔ اسی میں سمجھتا ہے کہ راہ حق میں خود کو فنا کر دے ۔ قرآن حکیم کی شہادت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سراج منیر (شمع سوزاں) تھے[۱] اور دردِ دل کا عالم یہ تھا کہ جانِ عزیز اسی میں گھلا رہے تھے[۲] کہ بھٹکے ہوئے انسان سیدھے راستہ پر آجائیں ۔

(۲) اذعان اور یقین ۔

(الف) ایک شخص اونچے پہاڑ پر کھڑا ہوا ۔ دشمن کے لشکر کو دیکھ رہا ہے جو تیزی سے حملہ کرنے کے لئے آرہا ہے ۔ اس کی بستی کے آدمی پہاڑ کے پیچھے ہیں وہ نہیں دیکھ رہے ۔

---

[۱] یا ایہا النبی انا ارسلناک ۔۔۔ سراجاً منیراً سورۃ احزاب ۳۳ آیت ۴۶

[۲] لعلک باخع نفسک الآیۃ سورۃ ۲۶ شعراء آیت ۳ نیز سورۃ ۱۸ کہف آیت ۶

یہ دیکھنے والا شخص جس خطرہ سے اپنی قوم کو آگاہ کر رہا ہے وہ اس کا مشاہدہ کر رہا ہے اس لئے وہ اپنی پوری طاقت صرف کر رہا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ بستی کے غافل لوگوں کو جگا دے اور اپنے مشاہدہ کا یقین ان کو دلا دے۔ داعی حق کو اپنی دعوت پر ایسا ہی یقین ہونا چاہیئے[1] گویا قبولِ حق اور کفر و انکار کے نتائج کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

(ب) ایک نہایت شاداب باغیچہ میں ایک گہری خندق ہے۔ جس میں آگ کے بڑے بڑے انگارے دہک رہے ہیں۔ خندق کے کنارے پھسلواں ہیں۔ سیر کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہے۔ جس کو خبر ہے وہ سیر کرنے والوں کو پورے یقین کے ساتھ خطرہ سے آگاہ کرتا ہے اور اگر باغ کی سیر کرنے والے اس کے دوست اور عزیز قریب ہوتے ہیں تو وہ اپنی پوری طاقت صرف کر دیتا ہے کہ ان کو اس خندق کی طرف نہ جانے دے۔

داعی حق باخبر باغبان ہوتا ہے۔ جس کو مخلوقِ خدا سے ایسی ہی محبت ہوتی ہے، جیسی اپنے اہل و عیال سے۔ وہ خندق کی طرف جانے والوں کو منع کرتا ہے۔ کوئی آگے بڑھ جاتا ہے تو اس کو کمر پکڑ کر کھینچتا ہے۔ اس وقت اس کی ہمدردی سراسر اضطراب بن جاتی ہے[2]۔ اس کا سوز و اضطراب ناقابلِ بیان ہوتا ہے۔

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے ہڈی ہڈی مری لے سوزِ نہاں جلتی ہے

(۳) داعی حق کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اُس کی شوکت و حشمت کے سامنے لوگوں کی گردنیں جھک جائیں۔ بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی دعوت کی معقولیت۔ دلائل کی مضبوطی، اس کے اخلاص، قول اور فعل کی صداقت اور اس کی سچی خیر خواہی اور ہمدردی بے لوث زندگی اور بلندیٔ اخلاق کے سامنے لوگوں کے دِل جھک جائیں۔ اُن میں گرویدگی اور عقیدت پیدا ہو جاتے۔ لہٰذا سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ: کوئی جور اور جبر نہ ہونا چاہیئے، ہر صاحب فکر کو آزادی حاصل ہو وہ خود اچھے بُرے اور اندھیرے اُجالے کو پہچانے اور اپنے ضمیر کی شہادت پر عمل کرے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (سورہ ۲ بقرہ۔ آیت ۲۵۶)

---

[1] بخاری شریف ص ۹۶۰ حدیث ابی موسیٰ فیہ انا النذیر العریان [2] بخاری ص ۹۶۰ حدیث ابی ہریرہ۔

(ب) بیشک داعیٔ حق اصلاحی مسائل پیش کرے گا۔ لوگوں سے مطالبہ کرے گا کہ وہ اس کے اصول تسلیم کریں اور ان پر عمل کریں۔ لیکن ضروری ہے کہ انداز نہایت سنجیدہ۔ دانش مندانہ نصیحت آمیز اور خیر خواہانہ ہو۔ تبادلہ خیالات اور بحث و مباحثہ کی نوبت آئے تو اس کا انداز اور طرز بھی ایسا حسین ہو کہ اس سے زیادہ نرم۔ دل کش اور پیار بھرا انداز نہ ہو سکے۔

(اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ[1] - الآیۃ - سورۃ ۱۶ نحل - آیت ۱۲۵)

(ج) گمراہ۔ سرکش۔ شورہ پشت۔ شرارت پسند۔ بدکردار۔ جن کو سیدھے راستہ پر لانا مقصود ہے ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ داعیٔ حق کی بات سنجیدگی سے سنیں گے اور شرافت کا جواب شرافت سے دیں گے۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ اُن کی عزت و عظمت شہرت یا اُن کے کسی مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہو تو وہ لامحالہ حق کے مقابلہ میں اپنی ہر ایک شرارت کو کام میں لائیں گے اور پوری قوت سے سرکشی اور بغاوت کا مظاہرہ کریں گے۔ اس صورت میں داعیٔ حق کا فرض کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ معافی اور درگذر کو اپنا اصول بنالو نیکی کی ہدایت کرتے رہو اور جاہلوں (ناداناں) سے کنارہ کرتے رہو۔ سورۃ ۷ اعراف آیت ۱۹۸۔ سورۃ ۱۶ نحل آیت ۱۲۷ سورۃ مزمل و سورۃ مدثر و سورۃ دہر وغیرہ

(۴) اگرچہ قانون یہ ہے کہ

بُرائی کا بدلہ اسی جیسی بُرائی ہوتی ہے۔ جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا (سورۃ ۴۲ شوریٰ آیت ۴۰)

مگر داعیٔ حق اس قانون پر عمل نہیں کرتا۔ بلکہ اُس کا اصول یہ ہوتا ہے۔

بدی کا جواب نیکی سے دیتے ہیں۔ بھلائی کر کے بُرائی کو دفع کرتے ہیں۔

---

[1] پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے (اے نبیؐ) اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو بلاؤ۔ اس طرح کہ حکمت (دانشمندی) کی باتیں بیان کرو۔ اور اچھے طریقہ پر پند و نصیحت کرو اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ حسن و خوبی کا طریقہ وہی ہو (اس سے اچھا نہ ہو سکے) تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا اور کون راہ راست پر ہے۔

یدرؤن بالحسنۃ السیئۃ (سورۃ ۱۳ رعد آیت ۲۲

(۵) عدل کے معنے برابری ... پیدا کرنے کے ہیں۔ اسی کو انصاف کہا جاتا ہے اس سے مساوات تو قائم ہو جاتی ہے مگر بدی ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ بسا اوقات جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ بدی کو بڑھاتا اور اس کے دائرہ کو وسیع کر دیتا ہے۔ داعئ حق کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ بدی اور برائی دنیا سے ختم ہو۔ لہٰذا اس کا اصول یہ ہوگا کہ جب کوئی بدی پیش آئے گی تو اس کے اسباب تلاش کر کے ایسا راستہ اختیار کرے گا کہ بدی اور برائی کی جڑ کٹے، دوست دشمن بن جائیں، جو برے ہیں وہ اچھے ہو جائیں۔

لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ سورۃ ۴۱ حم سجدہ آیت ۳۴۔

مگر یہ آسان بات نہیں ہے۔ اس کو وہی کر سکتے ہیں جو ضبط و تحمل کے عادی ہوں۔ جو مکارم اخلاق کے خوگر ہوں۔ (ایضاً آیت ۳۵)

لیکن عالم اسباب میں کسی چیز کی عادت جب ہی ہوتی ہے جب پہلے اس کی تربیت ہو چکی ہو۔ مختصر یہ کہ اس دور میں تربیت کا ایک مکمل باب یہ بھی تھا کہ ان کمالات و اوصاف کا عادی بنایا گیا جو سب سے افضل اور آخری پیغمبر اور سب سے زیادہ جلیل القدر داعی کیلئے ضروری تھے۔

ثمرۂ تربیت

جن کی فطرت سلیم نے بلا دعوت اور بلا فرمائش خود بخود محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کو پوری زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ اس زمانۂ تربیت میں جو رنگ محمد نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر غالب آتا رہا اسی رنگ میں یہ بھی رنگے جاتے رہے، ثمرہ یہ ہوا کہ ایک جماعت ایسی تیار ہو گئی

۱۔ جو خدا شناس اور سچی خدا پرست تھی۔

۲۔ جو سب کو چھوڑ کر اپنا رشتہ خدا سے جوڑ چکی تھی۔

۳۔ جس کا پورا بھروسہ اپنے خالق اور مالک پر تھا۔

۴۔ جس کا دل ہر ایک طمع سے پاک اور صرف اپنے خالق کی محبت سے لبریز تھا۔

۵۔ جس کے دل پر صرف خالقِ کائنات کی عظمت کا سکہ تھا۔ اسی کا خوف اس کے قلب و جگر کا داغ تھا، جس نے خوفِ خدا کے سوا ہر ایک خوف و خطر کے دھبے کو مٹا دیا تھا۔

۶۔ جس کو خالق کی ہر ایک مخلوق سے محبت تھی، کیونکہ وہ اس کے رب کی پالی ہوئی مخلوق ہے۔ ہر ایک انسان کا درد اس کے دل میں تھا۔ کیونکہ یہ انسان اُس خدا کی قدرت کا شاہکار تھا جس سے اس کو عشق ہو گیا تھا اور جس کیلئے یہ سب کچھ قربان کر دینے کو زندگی کا نصب العین اور دل کی آخری آرزو بنا چکا تھا۔

۷۔ اس جماعت کو اُن سے نفرت ہو گئی۔

(الف) جن کے دل اپنے خالق اور رب کی عظمت اور اس کی مخلوق کے درد سے ناآشنا تھے۔

(ب) جو خدا کو چھوڑ کر اپنی اغراض کی پُوجا میں لگے ہوئے تھے۔

(ج) جن کو مال اور اولاد پر ناز تھا اور انہی کی ترقی اُن کی زندگی کا محبوب نصب العین تھا۔

(د) جن کو غریبوں سے نفرت تھی کیونکہ وہ دولت سے محروم ہوتے تھے۔

(ہ) جو یتیموں اور بیواؤں کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے تھے کہ ان کی امداد کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی اُن سے کہیں زیادہ انہیں اپنی تجوریوں سے محبت تھی۔

(و) کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا، مخلوقِ خدا کو غلام اور غلاموں کی زندگی کو اپنی خواہشات کا کھلونا بنانا، ان کی عظمت و برتری کا نشان تھا۔ جس کو وہ کسی وقت بھی مٹانا یا نیچا کرنا نہیں چاہتے تھے، خواہ ان کی جان جاتی رہے۔

مقامی اور سماجی حالات اور ردّ عمل

۱۔ عرب میں بادشاہت نہیں تھی۔ ہر ایک قبیلہ آزاد ہوتا تھا۔ شیخ قبیلہ اندرونی نظام کا نگراں ہوتا تھا۔ مکہ میں اس نظام نے چھوٹے سے جمہوریہ کی صورت اختیار کرلی تھی صدرِ جمہوریہ تو پھر بھی کوئی نہیں تھا۔ البتہ قبائل کی ایک مشترک جماعت (کونسل) تھی اس نے شہری، سماجی اور انتظامی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر تقریباً ایک درجن شعبے (پورٹ فولیو) بنائے تھے اور ہر شعبہ کا سربراہ منتخب کردیا تھا۔ مثلاً مقدماتِ قتل کا ایک خاص شعبہ تھا۔ اس کے سربراہ ابوبکر صدیق تھے۔ شعبہ سفارت کے ذمہ دار حضرت عمر فاروق تھے اسی طرح باقی شعبوں کے ذمہ دار علیحدہ علیحدہ تھے۔ اُن میں سے صرف ابوبکر صدیق وہ تھے جو سب سے پہلے اسلام لا چکے تھے۔ عمر فاروق کئی سال بعد مسلمان ہوئے باقی شعبوں کے ذمہ دار یا سرے ہی نہیں ہوئے یا اگر مسلمان ہوئے تو بہت آخر میں۔

اس مشترک جماعت کے اجلاس ہوا کرتے تھے۔ اس مقام کا نام "دارالندوہ" تھا جہاں یہ اجلاس ہوا کرتے تھے۔ کوئی غیر معمولی معاملہ ہوتا تو ارکین کے علاوہ بھی نمایاں افراد کو خاص طور پر مدعو کرلیا جاتا تھا۔

۲۔ حرب بن اُمیہ۔ ولید بن مغیرہ۔ عاص بن وائل۔ عتبہ بن ربیعہ۔ ابولہب۔ ابوجہل اُمیہ بن خلف۔ ابی بن خلف۔ عقبہ بن ابی معیط۔ نضر بن حارث۔ اسود بن عبدیغوث بڑے بڑے دولتمند تھے۔ یہ تاجر بھی تھے، صاحب جائداد بھی۔ سودی کاروبار بھی بڑے پیمانہ پر کرتے تھے اور ان تمام خصوصیتوں کے مالک تھے جو سرمایہ داروں میں ہوا کرتی ہیں مثلاً ابولہب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا بھی تھا اور ہمیشہ مخالفت میں پیش پیش رہا اس کا سودی لین دین وسیع پیمانے پر تھا اور اس کے حرص و طمع کی یہ حالت تھی کہ اُس نے خانہ کعبہ کے خزانہ سے سونے کا ہرن چوری کرکے بیچ ڈالا تھا۔ یہ ہرن بہت عرصہ

سے محفوظ چلا آتا تھا۔[1]

عاص بن وائل بہت بڑا دولت مند قبیلہ کا مشہور سردار تھا مگر حضرت خباب سے اس پر جھگڑا ہوا کہ انہوں نے لوہے کی کوئی چیز بنا کر اس کو دی تھی، وہ اس کی اجرت مانگتے تھے اور یہ جان چراتا تھا۔[2] اور یاد ہو گا یہی عاص بن وائل تھا جس نے یمن کے ایک تاجر کو مار پیٹ کر بھگا دیا تھا جب اس نے اپنے دام مانگے جس سے تمام مکہ والوں کی بدنامی ہوئی اور جس کی بنا پر وہ انجمن بنائی گئی جس کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔[3]

قرآن شریف نے کسی کا نام نہیں لیا مگر اس کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سماج اور معاشرہ کا اونچا طبقہ جو مکہ پر چھایا ہوا تھا جو اس لحاظ سے خوش نصیب مانا جاتا تھا کہ ان کے یہاں دولت کے انبار بھی ہوتے تھے اور فرماں بردار اولاد کی بھی کمی نہیں ہوتی تھی، اس کے اخلاق اور اوصاف یہ تھے۔

(الف) اپنی اس خوش نصیبی پر کہ وہ صاحب مال اور صاحب اولاد ہیں اُن کو گھمنڈ اور غرور ہوتا تھا۔

(ب) جو اُن سے کم ہوتے تھے ان کو حقیر سمجھتے اور طرح طرح کے طعنے دیتے تھے۔

(ج) اپنے اثر ورسوخ اور اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے جھوٹی قسم کھانے سے ان کو عار نہ آتی تھی بلکہ بڑھ بڑھ کر قسمیں کھاتے، دوسروں کو لڑانے اور اپنے مخالفوں کو زک پہنچانے کیلئے بے دھڑک چغلیاں اور طرح طرح کا شرارت آمیز پروپیگنڈہ کرتے تھے۔[4]

(د) کمزوروں پر ظلم کرنا ان کی عادت تھی۔

(ہ) نرم مزاجی اور اخلاق سے ناآشنا تھے۔ نیک کام نہ خود کرتے تھے نہ دوسروں کو کرنے دیتے۔

---

[1] معارف ابن قتیبہ [2] بخاری شریف ص۳۰۲ [3] زیر عنوان کمزوروں کی امداد عدل وانصاف اور جذبۂ اصلاح [4] سورۂ ۶۸ القلم آیت ۱۰ تا ۱۵۔

(د) غریبوں کی امداد کا کوئی موقع ہوتا تو اس میں روڑے اٹکاتے نہ خود خرچ کرتے نہ دوسروں کو خرچ کرنے دیتے۔

(ذ) اخلاق سے ناآشنا۔ سخت دل، خشک مزاج طبیعت کے روکھے۔[1]

(ح) رات دن تجوری بھرنے کی کوشش میں مصروف رہتے۔ اس تصور سے ناآشنا تھے کہ یہ دولت ختم ہونے والی بھی ہے۔[2]

(ط) خدا سے بے تعلق۔ خدا پرستی سے بے گانہ۔ کج بحث۔ زبان زوری سے اپنے عیبوں کو چھپانے والے۔[3]

یہی لوگ تھے جو پورے مکہ پر چھائے ہوئے تھے اور چونکہ مکہ ہر لحاظ سے پورے عرب کا مرکز تھا تو اُن کے اثرات پورے عرب پر غالب تھے۔

ایک شخص جس نے بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمر کا ایک حصہ شہر کی کھلی ملی زندگی میں اس طرح گذارا ہو کہ وہ لوگوں کی آنکھ کا تارا بنا رہا ہو۔ اس کی زندگی میں خاص طرح کی تبدیلی آئے اس کے کچھ ساتھی ہو جائیں۔ اُن میں وہ بھی ہوں جو شہری زندگی میں اونچا درجہ[4] رکھتے ہوں۔ کچھ مالدار گھرانوں کے نوجوان[5] ہوں اور یہ سب ایک خاص قسم کی انقلاب انگیز زندگی بنانے لگیں۔ مان لیجئے یہ کسی کو اپنی طرف نہیں بلاتے مگر کیا خود ان کا عمل اور غیر معمولی انداز لوگوں کو متوجہ نہیں کریگا۔ خصوصاً وہ بڑے لوگ جو اپنے اقتدار کو سنبھالنے کے لئے ہر خطرہ کے موقع پر خوردبین سے کام لیتے ہیں۔ کیا وہ ان کے طرز زندگی سے ہراساں اور چوکنے نہیں ہونگے اور کیا یہ بات ان کو سراسیمہ اور پریشان نہ کردیگی کہ یہ جماعت جس طرح شرک اور بت پرستی کے خلاف توحید کی قائل اور خدا پرستی کی عاشق ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام حیات سے بھی اتنی ہی متنفر ہے اور جذبات نفرت کی پرورش کر رہی ہے۔

---

[1] سورۃ ۶۸ القلم آیت ۸ تا ۱۵ [2] سورۃ ۱۰۴ ہمزہ آیت ۲ [3] سورۃ ۷۴ مدثر آیت ۱۶ تا ۲۵ و آیت ۴۵ و ۴۶ وسورۃ ۸۳ المطففین آیت ۲-۳ و آیت ۱۲، ۱۳ سورۃ ۹۶ العلق آیت ۶، ۷۔ [4] جیسے صدیق اکبرؓ

[5] جیسے حضرت عثمانؓ بن عفان۔ عبدالرحمن بن عوف، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم۔

۵۔ ردِ عمل | یہ قدرتی بات تھی کہ سردارانِ قریش نے جیسے ہی اس چھوٹی سی جماعت کے انداز سے خطرات کو بھانپا، مخالفت شروع کردی۔ مگر جس طرح دعوتِ عام نہیں تھی، مخالفت بھی عام نہیں تھی۔ نجی مجلسوں میں تبصرے ہوتے۔ بیشک پھیلنے والے اثرات کو زائل کیا جاتا اور مخالفانہ رائے پختہ کی جاتی تھی۔ مگر گفتگو اور تبادلہ خیالات کے ذریعہ مثلاً سب سے پہلے قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت تھی جو ہر ایک صاحبِ ذوق کو متاثر کردیتی تھی اور جب کوئی صاحبِ فکر معنے اور مقصد پر غور کرتا تو حیران رہ جاتا اور بسا اوقات وارفتہ ہو جاتا تھا۔ یہ وارفتگی گرویدگی کی حد تک پہنچتی تھی جو اس کو سب سے چھڑا کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ کردیتی تھی۔ جو حضرات اب تک مسلمان ہو چکے تھے اگرچہ ان کی تعداد تھوڑی تھی مگر وہ قرآن پاک کی اس تاثیر کی بہترین مثال اور نمونہ تھے۔ قرآن پاک کی اس تاثیر کو معاذ اللہ جادو کہا جاتا تھا۔ کہ یہ منتر ہے جو کسی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہاتھ لگ گیا ہے وہ اس منتر سے متاثر کرتا رہتا ہے[1]

ان آیتوں اور سورتوں میں جن عقائد اور نظریات کی تلقین ہے جب ان پر بحث ہوتی تو بڑے لوگوں کا چلتا ہوا جواب یہ ہوتا تھا "پرانے زمانہ کی دقیانوسی باتیں ہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے اب یہ باتیں نہیں چل سکتیں"[2]

جب خدا پرستی اور توحید کا ذکر ہوتا تو جواب دیا جاتا۔ اپنے باپ دادوں کے مذہب سے ہٹ کر گمراہ ہو رہے ہیں[3]

جب ان کی شب و روز کی عبادت اور غیر معمولی شب بیداری کا تذکرہ ہوتا تو رؤسا قریش کی مجلسوں میں تبصرہ یہ کیا جاتا۔ دیوانے ہو گئے ہیں[4]

لیکن ظاہر ہے اس طرح کے جوابات وقتی طور پر کام کر سکتے ہیں واقعی اور حقیقی اثرات کو

---

[1] سورۃ ۷۴ مدثر آیت ۲۴ تنبیہ: سورۂ مدثر اور سورۃ القلم کی تمام آیتیں اگرچہ ایک ہی دفعہ میں نازل نہیں ہوئیں کچھ پہلے نازل ہوئیں کچھ تھوڑے وقفہ کے بعد مگر بہرحال تمام آیتیں نبوت کے ابتدائی دور میں ہی نازل ہوئیں۔ [2] سورۃ ۶۸ قلم آیت ۱۵ [3] ایضاً آیت ، [4] ایضاً آیت ۶

زائل اور سوال کرنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ تو اب ان لوگوں نے یہ چاہا کہ اس سے پہلے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اثرات متعدی ہوں اُن سے کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ چنانچہ سرداران قریش کا ایک وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

ارکان وفد پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

(۱) ولید بن مغیرہ۔ مکہ کا رئیس اعظم جو دولت مندی اور خوش حالی کی تمام عظمتیں اپنے لئے رکھتا تھا اسی وجہ سے اس کو "وحید" کہا جاتا تھا۔

(۲) ابو جہل۔ سب سے زیادہ ہوشیار اور چالاک سردار

(۳) اسود بن عبد یغوث۔ مکہ کا بہت بڑا تاجر اور رئیس۔

(۴) اخنس بن شریق۔ طائف کا سب سے بڑا سردار اور رئیس۔

وفد نے آپ کے سامنے تین صورتیں پیش کیں۔

اگر دماغی خلش ہے تو اجازت دیجئے ہم بہترین علاج کا انتظام کریں۔

اگر عیش و عشرت مقصود ہے تو ہم دولت اور حسن دونوں فراہم کر سکتے ہیں۔

اگر اقتدار مطلوب ہے تو مکہ کے اقتدار کی باگ ڈور آپ کے حوالے کرتے ہیں۔ مگر آپ اپنے انداز کو ہلکا کیجئے۔ آپ کے نظریات جو سننے میں آ رہے ہیں نہایت سخت ہیں۔ وہ ہیجان برپا کر دیں گے۔ مگر وحی الٰہی نے اس طرح کی پیشکشوں کی شدت سے تردید کر دی۔[2]

---

[1] سورۃ مدثر کی آیت ۱۱ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا کے تحت حضرات مفسرین نے اس کی تصریح فرمائی ہے

[2] تفسیر عزیزی متعلق آیت ۹ سورۃ ۶۸ قلم۔

تبلیغ کا آغاز

سب سے پہلے اپنا خاندان

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب حکم ہوا "قُمْ فَاَنْذِرْ"[1] اٹھو اور لوگوں کو آگاہ کرو (کہ ان کے موجودہ عمل اور کردار کا مستقبل کیا ہوگا) تو آپ نے اِنذار اور تبلیغ کا سلسلہ اپنے خاندان سے شروع کیا۔ خدا کا حکم بھی یہی تھا۔[2]

آپ نے کھانے کا انتظام کیا اور ان رشتہ داروں کو دعوت دی جو آپ کے پڑ دادا (دوسری پشت کے دادا) ہاشم کی اولاد تھے۔ ان میں وہ بھی تھا جس کا نام عبدالعزیٰ تھا۔ اور ابولہب کی کنیت سے مشہور تھا[3] یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کا سب سے بڑا بھائی تھا۔ عمر، سرمایہ اور دولت کے لحاظ سے خاندان میں سب سے اونچا تھا۔ عبدالعزیٰ سمیت تقریباً چالیس آدمی اس دعوت میں آئے۔ کھانا کھایا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فرمانا شروع کیا۔ ابھی آپ نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ عبدالعزیٰ نے پکار کر کہا: لَهَدَّ مَا سَحَرَكُمْ صَاحِبُكُمْ[4] یہ جادو بہت ہی عجیب ہے جو تمہارے دوست نے تم پر کیا ہے۔

جادو کا نام سن کر کون ٹھیر سکتا تھا۔ مجمع منتشر ہوگیا۔

ابولہب کی یہ حرکت بہت ہی ہمت شکن تھی۔ مگر اس کے مقابلہ پر تھی جس کی ہمت نے ٹوٹنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ نئے حوصلہ سے اٹھا۔ کچھ وقفہ کے بعد دوبارہ دعوت کی اور اس مرتبہ حلقہ وسیع کر دیا۔ پہلے ہاشم کی اولاد کو دعوت دی تھی اس مرتبہ ہاشم کے والد۔ عبد مناف کی اولاد کو دعوت دی۔ اور ابولہب کی پہلی حرکت کا ردِ عمل یہ ہوا کہ سب ہی آ گئے اور آخر تک جمے رہے۔

---

[1] سورۂ مدثر ۷۴ آیت ۲ [2] سورۂ شعراء ۲۶ آیت ۲۱۴ [3] لہب کے معنے آگ کی لپٹ کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کا رنگ سفید سرخ تھا۔ چہرہ انگارے کی طرح دہکتا رہتا تھا۔ اسی لئے یہ کنیت دی گئی گویا وہ آگ کے انگارے اور لپٹ کی تصویر ہے۔ [4] البدایہ والنہایہ ص ۴۰ ج ۳ و مجمع البحار لفظ ھدّ۔

آپ نے بھی اپنی بات پوری فرما دی۔ آپ نے فرمایا:

میں وہ پیغام پہنچا رہا ہوں کہ عرب کے کسی جواں ہمت نے یہ پیغام نہیں پہنچایا تھا یہ دنیا اور آخرت کی کامیابی کا پیغام ہے۔ اُمتہ عرب اس پیغام سے دنیا میں بھی سربلند ہوگی اور آخرت کی کامیابیاں بھی اس کو نصیب ہوں گی[1] یہ پیغام عمل کا پیغام ہے انسان کا عمل ہی اس کو کامیاب کرسکتا ہے۔ ایک کا عمل دوسرے کو کامیاب نہیں کرسکتا۔

اے معشر قریش۔ اپنے آپ کو جس درجہ پر رکھنا چاہتے ہو تو اس کی قیمت خود ادا کرو۔ عذاب الٰہی سے بچنا چاہتے ہو تو نجات کا سودا تم خود کرو۔

اے آل عبد مناف خدا کے مقابلہ پر میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ جب تک تم خود عمل نہ کرو میں تمہیں قانون قدرت کی گرفت سے نجات نہیں دلا سکتا۔

اے عباس[2] بن عبد المطلب۔ خدا کے مقابلہ پر میں تمہارے کام نہیں آ سکتا۔ اے رسول خدا کی پھوپی صفیہ" میں اللہ کی گرفت سے تمہیں نہیں بچا سکتا اے رسول کی بیٹی فاطمہ۔ میرے مال میں سے جو کچھ مانگنا چاہو مانگو میں دوں گا۔ مگر خدا سے بے نیاز ہو کر میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا۔ اللہ کے مقابلہ پر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا[3]

تقریر بے حد مؤثر اور بلیغ تھی۔ سننے والوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مگر دلوں کا پرانا مرض آسانی سے نکلنے والا نہیں تھا۔ یہاں بھی۔ عبد العزیٰ ابولہب نے اپنی عمر کی بڑائی اور رشتہ کی برتری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۳۹ و صفحہ ۴۰ ۔ [2] عباس اگرچہ چچا تھے۔ مگر ہم عمر اور ہم جولی تھے۔ تقریباً دو سال بڑے تھے۔ [3] بخاری شریف ص۲۳۸۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس مجمع میں سب سے زیادہ سن رسیدہ ابولہب تھا اور سب سے چھوٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ جن کی عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ بیمار اور کمزور بھی تھے۔ پیٹ بڑھا ہوا آنکھیں آتی ہوئیں۔ پنڈلیاں پتلی پتلی۔ کھڑا ہونا مشکل تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر کے بعد مجمع کی طرف سے جواب کا انتظار کیا تو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ (طفل بیمار) نے آپ کی تصدیق کی اور حمایت کا وعدہ کیا۔ آپ نے ان کی حوصلہ افزائی کے الفاظ کہے۔ ابولہب کو موقع مل گیا۔ اُس نے طنز کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ مجمع کا رُخ بدل گیا۔ پھر منتشر ہو گیا۔ [1]

---

[1] البدایہ والنہایہ صفحہ ۴۰ ج ۳۔

فاران کی ایک پہاڑی سے صدائے حق

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

جعقوق نبی کی کتاب باب ۳ درس ۲ میں شہادت دی گئی تھی۔

اللہ جنوب سے اور وہ جو قدوس ہے۔
فاران سے آیا۔ اس کی شوکت سے آسمان
چھپ گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہوئی۔[۲]

اسی فاران کی ایک پہاڑی کا نام "صفا" ہے۔ اس پہاڑی کا وجود اب بھی باقی ہے۔ کعبہ شریف سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔ اب یہ پہاڑی شہر مکہ کی سطح کے برابر ہو گئی ہے مگر اس زمانہ میں یہ بلند تھی۔ خانہ کعبہ کا حرم[۳] (میدان) اس کے دامن میں تھا۔ عام طور پر قریش کی یہاں نشست رہتی تھی۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس پہاڑی پر چڑھے

---

[۱] بائبل میں مکہ کو فاران کہا گیا ہے۔ کتاب پیدائش باب ۲۱ میں حضرت ہاجرہ کے بیٹے (اسمعیلؑ) کے متعلق کہا گیا ہے اور وہ فاران کے بیابان میں رہا۔ (فقرہ ۲۱)

[۲] رحمۃ للعالمین جلد ۱ صفحہ ۴۲۶ میرے پاس جو اردو کی بائبل ہے اس میں یہ الفاظ ہیں۔ اے خدا تو برسوں کے درمیان اپنے نام کو نئے سرے سے رونق بخش۔ برسوں کے بیچ اسے شہرت دے۔ قہر کے درمیان رحم کو یاد کر خدا تیمان سے اور وہ جو مقدس ہے فاران سے آیا سلاہ اسکی شوکت سے آسمان چھپ گیا اور زمین اسکی حمد سے معمور ہو گئی۔ (جعقوق نبی کی کتاب ۳ صفحہ ۸۵۹)

[۳] چار دیواری اس زمانہ میں نہیں تھی۔ بیچ میں خانہ کعبہ تھا۔ اس کے چاروں طرف میدان تھا۔ میدان کے کنارے پر روساء مکہ اور خادمانِ کعبہ کے مکانات تھے۔ میدان میں ان روساء کی نشستیں رہتی تھیں۔

اور قبائل قریش کو نام بنام پکارا۔ یا بنی فہر۔ یا بنی عدی وغیرہ وغیرہ

محمد۔ وہی محمد جن کا اثر و احترام یہ تھا اور قریش کے عوام و خواص اس درجہ گرویدہ تھے کہ آپ کو "الصادق" اور "الامین" کہہ کر خوش ہوا کرتے تھے انہیں الصادق اور الامین کی آواز کانوں میں پڑی تو لوگ پہاڑی کے دامن میں آکر جمع ہو گئے اور جو نہیں آسکتے تھے، انہوں نے اپنا کوئی آدمی بھیج دیا۔

سب پہنچ گئے تو آپ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

اگر میں یہ بتاؤں کہ یہ وادی جو اس پہاڑ کی آڑ میں ہے یہاں دشمن کی فوج پہنچ گئی ہے اور وہ عنقریب تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا آپ صاحبان میری بات سچ مانیں گے۔

سب نے جواب دیا۔

بیشک آپ کے متعلق ہمارا تجربہ یہی ہے کہ آپ سچ ہی بولتے ہیں[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عذاب خداوندی کا لشکر آنے والا ہے اس سے پہلے کہ عذاب کا یہ لشکر آئے میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔

آپؐ نے اسی موضوع پر تقریر فرمائی۔ بہت ممکن تھا لوگ اثر لیتے۔ مگر خاندانِ ہاشم کا وہی عمر رسیدہ عبد العزیٰ (ابو لہب) بھڑکتا ہوا اٹھا اور یہ کہتا ہوا چل دیا۔

"محمد تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ کیا اس لئے ہمیں یہاں جمع کیا ہے"[2]

خاندان کا بڑا پورے خاندان کا سرپرست اور مربی مانا جاتا ہے اور قاعدہ عرب کے مطابق وہ ولی یعنی جواب دہ اور ذمہ دار بھی ہوا کرتا تھا۔ چھوٹوں کے حق میں اس کی بات مانی جاتی تھی۔ ابو لہب کو یہ ولایت اور سرپرستی حاصل تھی کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] ما جربنا علیك الا صدقا بخاری شریف ص ۷۰۲، [2] بخاری شریف ص ۷۰۲

کے والد ماجد کا بڑا بھائی تھا۔ اس کے علاوہ مکہ کا باثر دولت مند تھا۔ مجمع نے جب اتنے بڑے آدمی کو خفا ہو کر جاتے ہوئے (واک آوٹ کرتے ہوئے) دیکھا تو مجمع بھی چلدیا۔ لیکن ذہنوں میں ایک سوال گھر کر چکا تھا (داعیٔ حق کی یہی کامیابی تھی)

اتنا اشتعال، بوکھلاہٹ، کیوں؟

(۱)

کوہِ صفا سے جس نے پکارا وہ وہی "محمد" تھا جس کا نام لینا لوگ بے ادبی سمجھتے تھے۔ جس کو "الصادق" "الامین" کہا کرتے تھے۔ جس سے دعائیں کرایا کرتے تھے۔ برکتیں حاصل کیا کرتے تھے۔ جس نے کچھ عرصہ پہلے اس خوفناک ہنگامہ کو نہایت خوبصورتی سے ختم کیا تھا جو تعمیر کعبہ کے وقت حجر اسود کے سلسلہ میں سر اٹھا چکا تھا۔

کوہِ صفا کی مختصر تقریر میں جن خرابیوں کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا ان کا احساس خود قریش کو بھی تھا۔ انہی کمزوریوں اور خرابیوں کی اصلاح کے لئے چند سال پہلے وہ انجمن بنائی تھی اور وہ عہدنامہ طے کیا تھا جو حلف الفضول کے نام سے مشہور تھا۔

یہ "ابولہب" جو اس وقت سب سے پہلے مشتعل ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی محترم بزرگ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پر اتنا خوش ہوا تھا کہ اپنی باندی ثویبہ کو فوراً آزاد کر دیا۔ اسی ثویبہ نے سب سے پہلے اس نونہال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دودھ پلایا تھا۔

پھر یہ خفگی اتنی برافروختگی اور بوکھلاہٹ کیوں؟

اس کا سبب وہ انقلاب تھا جس کی تصویر اس مختصر جماعت کے آئینہ کردار میں ان کو نظر آرہی تھی جو اس چند سال کے عرصہ میں (جو تربیت کیلئے مخصوص تھا) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں تربیت پاکر تاریخ عالم کے پلیٹ فارم پر جلوہ گر ہو چکی تھی جو ایک طرف شرک و الحاد کے مقابلہ میں توحید۔ فسق و فجور کے مقابلہ میں مکارم اخلاق۔ حیوانیت اور بہیمیت کے مقابلہ میں انسانیت

اور شرافت کی علمبردار بھی، تو دوسری جانب راتوں کو اٹھ اٹھ کر کلام الٰہی کی وہ آیتیں بھی گنگنایا کرتی تھی جو مفاد پرست، دولت و ثروت اور ظالمانہ سرمایہ داری کے خلاف گرج رہی تھیں۔ جس کا کردار یہ تھا کہ اپنی دولت کو راہِ خدا میں لٹا کر ان آیتوں کے مفہوم و مقصود کا وہ نقشہ پیش کر رہی تھی۔ جو ان دولت پرستوں کے لئے بہت ہی وحشتناک تھا۔ جھنجلاہٹ اور اشتعال کا باعث یہ بھی تھا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سمجھانے کی جتنی کوششیں کیں وہ ناکام ہو چکی تھیں۔

ابولہب جیسا سرمایہ پرست جو خزانہ کعبہ کے غزالہ زریں پر بھی ہاتھ مار دے، عاص بن وائل جیسا ذخیرہ اندوز جو مزدور کی مزدوری برسوں تک ٹلاتا رہے۔ ولید بن مغیرہ جیسا حریص جو سب سے بڑا دولتمند ہونے پر بھی صبر نہ کرے اور اس کی طمع اور لالچ کا جہنم "ھل من مزید" پکارتا رہے عتبہ بن ربیعہ اور مسعود ثقفی جیسے جاگیردار جن کی زندگی کا نصب العین ہی جاگیرداری اور زر اندوزی ہو، ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط جیسے باغی اور طاغی بڑے بڑے کاروبار کے مالک جو مکہ اور مکہ سے گزر کر پورے عرب پر چھائے ہوتے ہوں، سورہ ھمزہ میں انہی جیسوں کے لئے فرمایا گیا ہے:

"جہنم کی ہلاکت اور بربادی ہر ایسے شخص کے لئے جو دوسروں کے عیب نکالے اور ان کو نظر حقارت سے دیکھتے ہوئے طعنے دے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مال بٹور رکھا ہے اور اس کو بار بار گنتا رہتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا (اس کی سرمایہ داری پائدار ہو گی) ہرگز نہیں، بلا شبہ ایسا ہو گا کہ اس کو حطمہ میں ڈال دیا جائے گا۔ تم جانتے ہو حطمہ کیا ہے۔ وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو جھانک لیتی ہے۔ بلند اور دراز ستونوں کی طرح اس آگ کے شعلے ہوں گے ان لوگوں کو ان آتشیں ستونوں میں گھیر کر بند کر دیا جائے گا۔ (سورۃ ھمزہ[1])

سورۂ ھمزہ کو بار بار پڑھیئے۔ آپ کو سرمایہ داروں کے اس غیر معمولی اشتعال کا سبب

---

[1] ایمان ہو تو نہیں جلاتی کفر ہو تو جلا ڈالتی ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ۔

معلوم ہو جائے گا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ابتدائی دور میں اسلام سے مشرف ہو گئے تھے۔ آپ کی مشہور روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیوار کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما تھے۔ میں سامنے پہنچا تو آپ فرما رہے تھے "ھُمُ الْاَخْسَرُوْنَ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ" رب کعبہ کی قسم قیامت کے روز یہی لوگ خسارہ میں ہوں گے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے یہ الفاظ سنے تو میں چونک گیا۔ مجھے خیال ہوا کہ کہیں میرے بارہ میں بھی کوئی آیت نازل ہوئی ہے؟ میں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان۔ یہ بدنصیب کون ہیں؟

فرمایا۔ جو سب سے زیادہ دولت مند ہیں۔ صرف وہ مستثنیٰ ہیں جو آگے پیچھے دائیں بائیں سب طرف خرچ کرتے رہیں۔

لہ ترمذی شریف صفحہ ۱۲۰ و مسلم شریف صفحہ ۳۲۱ ج ۱ وغیرہا۔

تعلیمات کا دُوسرا رُخ

پڑھنا۔ لکھنا۔ تہذیب۔ تمدن

۱۔ تخلیق نواز اور انقلاب انگیز تعلیمات کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ مشہور مثل "کلام الملوک ملوک الکلام" کی وجد آفرین مثال بھی آپ کے سامنے آجائے گی۔

وحی کا آغاز لفظ "اقرأ" سے ہوا۔ اور اس اہمیت کے ساتھ کہ نام رب بھی بعد میں لایا گیا۔ اقرأ باسم ربك "پڑھ اپنے رب کے نام سے" پھر پروردگار (رب) کی تین صفتیں بیان کی گئیں خَلَقَ۔ اَلْاَکْرَم۔ علم زیادہ زور عَلَّمَ پر دیا گیا (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ) تعلیم دی قلم کے ذریعہ۔ سکھایا انسان کو وہ جو نہیں جانتا تھا۔

کیا اس اسلوب کلام سے ہمیں یہ سبق نہیں ملتا کہ جو شخص اس وحی پر ایمان لائے اس

---

۱ جس طرح یہ سبق ملتا ہے کہ معلم حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ انسان کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو وہ نہیں جانتا وہ جس طرح قلم کے ذریعہ سکھاتا ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ "امی محض" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بلا کسی واسطہ کے علم الاولین والآخرین سے نواز دے عَلَق (خون بستہ) یعنی لہو کی پھٹکی۔ اس کو علم سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ خون کی پھٹکی کے لئے علم کا تصور بھی بے محل ہے۔ لیکن خدا، قادر پروردگار عالم اس علق سے انسان کو پیدا کرتا ہے اور علم بے پایاں کی دولت سے نوازتا ہے۔ وہی رب ذوالجلال۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے اُمّی کو جوہر علم سے آراستہ کر رہا ہے۔ بلا شبہ کسی اُمی کو نہیں کہا جا سکتا کہ پڑھ۔ پڑھنے کا حکم امی کے حق میں تکلیف مالایطاق ہے۔ مگر رب محمد کا حکم محمدؐ کے لئے تکلیف مالایطاق نہیں ہے۔ کیونکہ جو حکم کر رہا ہے وہ پہلے ہی محمد کو (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ جوہر عطا کر چکا ہے جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب اقرأ کا اہل اور محل بنا دیا (واللہ اعلم بالصواب)

کا پہلا فرض ۔ قرأت اور تعلیم[۱] ہے۔اور تعلیم بھی وہ نہیں جو ماں باپ بچوں کو زبانی دے دیتے ہیں۔بلکہ تعلیم ایسی جس میں پڑھنا بھی ہو اور قلم سے لکھنا بھی۔

۲۔کچھ توقف کے بعد دوبارہ سلسلہ وحی شروع ہوا تو اس کا پہلا لفظ تھا۔ یٰاَیُّھَا الۡمُدَّثِّرُ (اے لحاف میں لپٹنے والے)

اس المدثر کو چھ کاموں کی ہدایت کی گئی۔

(۱) دعوت و تبلیغ (قُمۡ فَاَنۡذِرۡ (۲) تعظیم رب (عبادت) (رَبَّکَ فَکَبِّرۡ) (۳) ظاہر کی پاکی اور صفائی ثِیَابَکَ فَطَھِّرۡ (۴) باطن کی پاکی و صفائی وَالرُّجۡزَ فَاھۡجُرۡ (۵) بے لوث خدمت (لَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَکۡثِرُ) (۶) رضاء مولیٰ کو نصب العین

[۱] تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے یہ موضوع بہت دلچسپ ہے کہ وہ تحقیق کرے کہ اس وقت تعلیم کے بارے میں اقوام عالم کی حالت کیا تھی اور اُن کا ذوقِ تعلیم کہاں تک سرد پڑ چکا تھا۔مغربی یورپ۔انگلینڈ جرمنی وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ وہاں تو انسان ابھی پہاڑ کی گھاٹی اور پھونس کی جھونپڑی سے بھی نہیں نکلا تھا۔رات کو ایک ہی جھونپڑی میں اپنے مویشی کے ساتھ بند ہوتا تھا۔مشرقی یورپ جہاں "رومن لا" کا اقبال چمک رہا تھا، وہاں بھی علم اور تعلیم کی کچھ دولت تھی تو صرف کلیسا کے تاریک کناروں میں چھپی ہوئی۔ کلیسا سے باہر یا دولتِ علم سے آشنا ہی نہ تھے یا تعلیم اُن کے لئے ممنوع تھی اور کلیسا کے علماء بھی صرف نفع اندوزی کی حد تک علم کے قدر دان تھے۔اگر نفع کسی کتاب کی فروخت سے ہوتا یا چمڑے پر لکھی ہوئی کتاب کے حروف مٹا کر چمڑہ فروخت کر دینے میں نفع ہوتا تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے (موسیو لیبان)

ہندوستان کا حال معلوم ہے کہ یہاں صرف براہمہ ہند علم کے مالک سمجھے جاتے تھے اور غیر برہمن میں سے آدھی سے زیادہ مخلوق شودر تھی، وہ علم حاصل تو کیا کر سکتی اگر علم کی بھنک بھی کان میں پڑ جاتی تو کان میں سیسہ پگھلا دیا جاتا (منوسمرتی)

ایران اور فارس میں عیش پرستی علم پر غالب تھی اور چین و افریقہ کا ماضی اُن کے موجودہ حال سے معلوم ہو رہا ہے۔امریکہ و کناڈا۔ آسٹریلیا۔ ربع مسکون سے خارج تھا تو انسانی دنیا سے بھی خارج تھا۔

بناکر اس پر جم جانا، صبر و استقامت سے کام لینا۔ "وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ"

لفظ المدثر[1] سے خطاب اور اس کے بعد یہ احکام کیا ان کا اشارہ یہ نہیں ہے۔ کہ خدا پرستی اور تلاش حق، ہمدوش تہذیب و تمدن ہونی چاہیئے۔

---

[1] المدثر دثار سے ماخوذ ہے۔ دثار کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے لحاف فرمایا ہے کیونکہ دثار اس کپڑے کو بھی کہا جاتا ہے جس سے گرمائی حاصل کی جائے (مجمع البحار) لیکن عرف میں دثار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو اس کپڑے کے اوپر پہنا جائے جو بدن سے متصل رہتا ہے۔ جو کپڑا بدن سے لگا رہتا ہے اس کو شعار کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات انصار کے متعلق فرمایا تھا" انتم الشعار والناس دثار" یعنی تم میرا وہ لباس ہو کہ اگر تم الگ ہو جاؤ تو بدن ننگا ہو جائے اور دوسرے لوگ اوپر کا آرائشی کپڑا ہیں وہ اگر الگ ہو جائیں تو بدن برہنہ نہیں ہوگا۔ مختصر یہ کہ دثار میں صرف ستر پوشی نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایسی آرائش ہوتی ہے جو تہذیب کے تقاضے کو پورا کرے جیسے ہندوستان میں شیروانی یا اچکن اور عرب کے پرانے قاعدہ کے مطابق چادر اور دورِ حاضر میں عبا۔ پس لفظ المدثر اور اس کے بعد کے الفاظ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ یہ تصور پیدا کر رہے ہیں کہ داعی الی اللہ کو پورے لباس سے آراستہ ہونا چاہیئے اور لباس بھی ایسا جو پاک صاف ہو۔ یعنی اسلام جب رہبانیت یا سادھو پنے کو پسند نہیں کرتا تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ اس کا داعی برہنہ یا صرف ستر پوش (لنگوٹی کسنے والا) نیم برہنہ ہو۔ برہنگی یا نیم برہنگی دونوں حرام ہیں۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ پورا لباس اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب تمدن اس حد تک پہنچا ہوا ہو کہ کپڑا تیار ہو سکے وہ سل سکے وغیرہ وغیرہ۔ پس اس بات سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کلام اللہ شریف کے اس اسلوب خصوصاً ان الفاظ سے جیسے تہذیب و تمدن کی قدر افزائی ہوتی ہے۔ ایسے ہی صنعت و حرفت۔ تبادلہ۔ تجارت وغیرہ ان تمام عوامل کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو کسی انسان کے "المدثر" لحاف پوش، یا مہذب لباس پوش ہونے کے لئے ضروری ہوں اور جب ستر پوشی فرض ہے۔ تو لباس و پوشاک کا تیار کرنا۔ اور اس کی تیاری کے جملہ ذرائع مہیا کرنا بھی مسلمانوں کے حق میں اجتماعی فریضہ ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

دلیلِ صداقت[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی بہت سی دلیلیں پیش کی گئی ہیں مستقل کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں! احادیث اور تاریخی روایات کے علاوہ خود قرآن حکیم نے بہت سی دلیلوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں صرف دو دلیلیں پیش کی جا رہی ہیں ہر ایک انصاف پسند کیلئے یہ دو دلیلیں کافی ہیں

پہلی دلیل۔ خود آپ کی زندگی (صلوات اللہ علیہ وسلامہ ابداً دائماً) آپ کی زوجہ مطہرہ۔ حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کے سامنے بھی آپ کی سابقہ زندگی تھی اسی زندگی کے معیار پر حضرت خدیجہؓ نے غار حرا کے واقعہ کو پرکھا اور غیر اختیاری طور پر آپ کی نبوت کی معترف ہو گئیں اور جب آپ نے پوری قوم کے سامنے دعوت پیش کی تو وحی خداوندی نے ہدایت کی کہ آپ اپنی قوم سے یہ کہیں کہ یہ دعوت تو میں اب پیش کر رہا ہوں۔ لیکن

"واقعہ یہ ہے کہ میں اس سے پہلے تم لوگوں کے بیچ میں اپنی پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے"

(سورہ یونس ۱۰ آیت ۱۶)

تشریح: وحی الٰہی کی تلقین یہ ہے کہ محمد رسول اللہ۔ اپنی صداقت کے ثبوت کے لئے لوگوں سے کہیں کہ ساری باتیں چھوڑ دو۔ صرف اسی بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں، جس کے حالات و کردار کی تمہیں خبر نہ ہو۔ میں تم ہی میں سے ہوں اور اعلانِ وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی۔ بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی سچائی اور امانت کے خلاف

---

[1] سیرۃ کی عام کتابوں میں یہ عنوان نہیں ہوتا۔ مگر کتاب اللہ کے آغاز قرآن میں جب نوع انسان کو عبادت کا حکم دیا تو ساتھ ساتھ صداقت کتاب اللہ کی دلیل بھی ایسی پیش کی جس کے ساتھ رسول خدا کی صداقت بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے سورہ بقرہ رکوع ۳۔

مجھ میں دیکھی۔ تم نے نہ صرف صادق اور امین کہا، بلکہ صادق اور امین میرا لقب کر دیا۔ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان[1] باندھنے کے لئے تیار ہوں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم سمجھ نہیں سکتے۔

دُوسری دلیل خُود قرآن شریف (کلام اللہ)

سچے آدمی کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل خود اس کی زندگی ہے اور اپنی زندگی کو دلیلِ صداقت کے طور پر وہی پیش کر سکتا ہے جو فی الواقع سچا ہو اور اپنی سچائی پر اس کو پورا یقین ہو، جس کے عمل نے کبھی ضمیر سے بغاوت نہ کی ہو اور جس کا ضمیر اپنے کردار و عمل سے ہمیشہ مطمئن رہا ہو۔

---

[1] تمام علمائے اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق اور خصائل کے اُبھرنے اور پنپنے کا اصلی زمانہ ہوتا ہے۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس تک صادق و امین رہا ہے تو کیوں کر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب و مفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں، بلکہ اس خدا پر بہتان باندھنے لگے جس کو وہ اپنا خالق و مالک جانتا ہے، جس کی عظمت کا معترف ہے۔ جس کے قہر و غضب سے وہ خود بھی ڈرتا ہے اور لوگوں کو بھی ڈراتا رہا ہے، جس کی عبادت میں شب و روز مشغول رہتا ہے۔ جس کا ذکر ہر وقت اس کی زبان پر رہتا ہے اور ہر وقت وہ اپنی کوتاہیوں کی معافی اسی رب سے مانگتا رہتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں ہے کہ ایک ایک مجلس میں ستر ستر بار الفاظ استغفار زبانِ مبارک پر آ جاتے تھے پھر یہی خدا پرستی اور خداترسی کی لگن ہے جس کی وجہ سے اس کی قوم اس سے ناراض ہو رہی ہے اور وہ قوم کی نگاہوں میں معتوب ہو رہا ہے۔ کیا یہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے۔

[2] جب کہ کلام بھی ایسا ہو کہ اس کا کوئی فقرہ بھی خدا کے ذکر سے خالی نہ ہو کہیں اس کے قہر و غضب کا ذکر کہیں لطف و کرم کا۔ کہیں اس کے ہمہ گیر علم کو بیان کر کے بتایا گیا ہو کہ انسان جو بھی کرتا ہے اللہ اس کو دیکھ رہا ہے سُن رہا ہے۔ انسان کو اپنے ہر فعل اور ہر ایک قول کا جواب دینا ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

"آفتاب آمد دلیل آفتاب" لیکن آفتاب دلیل انہیں کے لیئے بن سکتا ہے جو آفتاب کو دیکھ رہے ہیں۔ جنہوں نے آفتاب نہیں دیکھا انہیں تو کسی اور شاہد کی ضرورت ہوگی۔ قرآن حکیم (کلام اللہ) کہتا ہے وہ شاہد میں ہوں۔ خود اپنی صداقت کی بھی دلیل ہوں اور صداقتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دلیل بھی میں ہی ہوں۔

وہ عرب جن کو مطمئن کر کے تمام دنیا کے لیئے داعی بنانا تھا۔ کلام الٰہی کا خطاب ان سے ہے:

"تم اہلِ لسان ہو۔ اپنی زبان کے عاشق ہو۔ ایسے عاشق کہ شعر و سخن ہر ایک کی گھٹی میں پڑا ہے۔ شعر و سخن کی یہی گرم بازاری ہے کہ قومی میلوں، تہواروں کے موقع پر خصوصاً زمانۂ حج میں جب سارے عرب کے چنیدہ دماغ منیٰ میں جمع ہوتے ہیں تو کئی کئی روز تک مشاعروں کی محفلیں گرم رکھتے ہو، ان میں بڑی شان سے مقابلہ کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ پھر جو قصیدے سب سے اونچے مانے جاتے ہیں ان کی یہاں تک قدر کرتے ہو کہ خانہ کعبہ میں جہاں تمہارے بہت سے معبود رہتے ہیں۔ اس قصیدہ کو بھی ایک معبود بنا کر آویزاں کرتے ہو اور تمہارے ذوق و شوق کا عالم یہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ماتھا رگڑتے ہو، ان کو سجدہ کرتے ہو اور صرف قصیدے ہی نہیں بلکہ شاعر کو بھی غیر معمولی طاقت کا انسان سمجھنے لگتے ہو کہ اس کے ساتھ جن رہتا ہے، جو ایسا غیر معمولی شعر اس کو سکھا دیتا ہے۔ اب دیکھو محمد" صلی اللہ علیہ وسلم بھی تمہارے سامنے ہیں جنہوں نے کبھی کسی اُستاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ کبھی کسی کی شاگردی نہیں کی۔ کبھی کسی مکتب میں نہیں پڑھا، کبھی کوئی شعر نہیں کہا، کبھی شعر و سخن کی مجلس میں شرکت نہیں کی۔ تم نے اس کو صادق اور امین تو کہا ہے مگر نہ کبھی شاعر کہا نہ کبھی خطبا اور مقررین میں انکو شمار کیا۔ اس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے ایک کلام تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ محمد کہتے ہیں کہ یہ کلام میرا نہیں، یہ کلام خدا کا کلام ہے جو میرے اوپر نازل

ہوتا ہے۔ جیسا نازل ہوتا ہے بجنسہٖ اور بعینہٖ آپ کو سنا دیتا ہوں۔ پس

"اگر تمہیں اس کلام کی سچائی میں شک ہے جو ہم نے (اللہ تعالیٰ) اپنے بندے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا ہے تو اس کا فیصلہ بہت آسان ہے اگر یہ محض انسانی دماغ کی بناوٹ ہے تو تم بھی انسان ہو، زیادہ نہیں اس جیسی صرف ایک ہی سورت بنالاؤ (اگر تمہارا عقیدہ ہے کہ جنات شعراء کے مددگار ہوا کرتے ہیں تو ایسا کرو کہ) اللہ کے سوا جن (طاقتوں) کو تم نے اپنا حمایتی سمجھ رکھا ہے اُن سب کو بھی اپنی مدد کے لئے بلا لو۔ اگر تم سچے ہو تو ایسا ضرور کر لو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو، اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہ کر سکو گے' تو اس آگ کے عذاب سے ڈرو جو (لکڑی کی جگہ) انسان اور پتھر کے ایندھن سے سلگتی ہے اور منکرینِ حق کیلئے تیار کی جا چکی ہے۔ (سورۃ بقرہ ۲ آیت ۲۴)

کلام اللہ کی شوکت وقوت اور اپنی صداقت کا یقین حیرت انگیز ہے۔ ایک شخص جس کے ساتھ صرف چند افراد ہیں جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے وہ نہ صرف قریش کو نہ صرف اہل مکہ کو بلکہ ہر ایک عربی بولنے والے بلکہ پوری دنیا میں جو بھی شک و شبہ کرے خواہ وہ کوئی ہو، ان سب کو چیلنج کر رہا ہے۔ چیلنج معمولی نہیں ہے' ایسا سخت اور تلخ چیلنج جو معمولی سے معمولی انسان کی غیرت کو بھی اس درجہ مشتعل کر دے کہ وہ اپنے تمام ذرائع اور وسائل کو کام میں لا کر چیلنج کا جواب دینے کے لئے بوکھلا جائے۔ مضمون چیلنج دوبارہ ملاحظہ فرمائیے۔

"اگر تم اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکتے اور اس جیسی کوئی ایک سورت نہیں لا سکتے تو یقین کر لو کہ تم باطل پر ہو۔ تم حق کا مقابلہ کر رہے ہو۔ تم عذاب الٰہی کے مستحق ہو تمہارا ٹھکانا دوزخ ہو گا جس کا ایندھن تم جیسے انسان اور پتھر ہوں گے۔"

قرآن حکیم کی ایک سورت ۱۰۸ سورۂ کوثر بھی ہے جس میں صرف تین آیتیں (جملے) ہیں جن کے کل الفاظ (کلمات) اٹھارہ ہیں۔

چیلنج کا خلاصہ یہ ہے کہ حق و باطل اور سچائی اور بناوٹ کا فیصلہ اس پر ہے کہ تم صرف ایسا کلام پیش کر دو جو ۱۸ لفظوں پر مشتمل ہو۔ مگر وہ اپنے ظاہری اور معنوی کمالات میں اس جیسا ہو۔ تمام دنیا کے ادیبوں کی مجلسیں اور شعر و سخن کے کمالات کا فیصلہ کرنے والے جج موجود ہیں۔ کسی بھی عدالت، کسی بھی ادبی مجلس میں موازنہ کے لئے پیش کر دو۔ اگر تمہارے حق میں فیصلہ ہو جائے تو مان لیا جائے گا کہ یہ کلام، اللہ کا نہیں ہے۔ محمدؐ کی من گھڑت ہے (معاذ اللہ)

پھر یہ چیلنج صرف ایک مرتبہ اتفاقی طور پر نہیں بلکہ مختلف عنوانوں سے بار بار دہرایا گیا اور اسی قوت کے ساتھ دہرایا گیا مثلاً:

(۱) سورۂ ۱۱ ہود۔ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ اس کی آیت ۱۳ جو اس سلسلہ کی سب سے پہلی آیت ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:-

کیا لوگ ایسا کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ قرآن اپنے جی سے گھڑ کر خدا پر بہتان باندھا ہے۔ آپ کہہ دیجئے اگر تم اپنی اس بات میں سچے ہو تو اس طرح کی دس سورتیں گھڑی ہوئی بنا کر پیش کر دو۔ اور اللہ کے سوا جس کسی کو اپنی مدد کے لئے پکار سکتے ہو اس کو پکار لو۔

پھر دو آیتوں کے بعد آیت ۱۶ کا ترجمہ یہ ہے:

یہ لوگ (جو صرف دنیاوی مفاد اور آسائش کے لئے حق سے اعراض کرتے ہیں اور اس کلام کو اللہ کا کلام نہیں مانتے) یہی وہ ہیں جن کے لئے آخرت میں آگ کے سوا، کچھ نہ ہو گا۔ (آیت ۱۶)

(۲) سورۂ ۱۰ یونس بھی مکہ میں نازل ہوئی، اس کی آیت ۳۸ میں بھی اس چیلنج کو دہرایا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ کے نام پر یہ بہتان باندھا ہے تم
کہہ دو اگر تم اس قول میں سچے ہو تو قرآن کی مانند ایک سورت بنا کر پیش کر دو۔
اور خدا کے سوا جن جن ہستیوں کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتے ہو (تمہیں پوری
اجازت ہے) بلا لو۔ آیت ۳۸۔

(۳) پہلے دس سورتوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس مرتبہ صرف ایک سورت کا۔ پھر سورہ ۹۲
طور میں "سورہ" کا لفظ بھی نہیں بلکہ حدیث (کلام۔ بات) کا لفظ آیا ہے فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ
مثلہ الخ آیت ۳۴ (ترجمہ) اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں اگر سچے ہیں۔ آیت ۳۴۔

(۴) سورہ بنی اسرائیل میں اعلان کیا گیا

اگر تمام انسان اور جن اکٹھے ہو کر چاہیں کہ اس قرآن کے مانند کوئی کلام
پیش کر دیں تو کبھی بھی پیش نہیں کر سکیں گے۔ اگرچہ ان میں سے ایک دوسرے
کا مددگار ہی کیوں نہ ہو (آیت ۸۸)

(۵) یہ آیتیں وہ ہیں جن میں یہ چیلنج صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اس جیسا قرآن پیش کر دیں (۱۷/۸۸)
دس سورتیں بنا لائیں (۱۱/۱۳)
ایک سورت بنا لائیں (۱۰/۳۸)
ایک سورت بنا لائیں (۲/۲۳)
اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں (۹۲/۳۴)

ان آیتوں کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں جن میں بطور اشارہ و کنایہ اس چیلنج کو
بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس چیلنج کے مخاطب عرب کے وہی فصحاء اور بلغاء ہیں جن کو اپنی ادبیت اور فصاحت و
بلاغت پر ناز تھا۔ جو اپنے زمانہ میں بھی ادب عربی کے استاد مانے جاتے تھے۔ اور آج بھی استاد
مانے جاتے ہیں۔

کیا قرآن پاک اور قرآن پاک کے پیش کرنے والے "محمد" صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے لئے یہ آفتاب جیسی کھلی ہوئی دلیل کافی نہیں ہے کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا جس میں اکثریت قرآن اور اسلام کے مخالفین کی ہے چودہ سو برس سے اس چیلنج کو سن رہی ہے مگر اس کو منظور کرنے سے آج بیسویں صدی عیسوی میں بھی اسی طرح عاجز ہے جیسے ساتویں صدی عیسوی میں عاجز تھی جب یہ قرآن نازل ہو رہا تھا۔

قریش جو اس کے مخاطب اول تھے ان سے یہ نہ ہو سکا کہ ۸ الفاظ کا کوئی مرتب کلام اس چیلنج کے جواب میں پیش کر سکیں۔ اس کے سوا جو کچھ تدبیریں وہ کر سکتے تھے وہ سب کر لیں، مثلاً منصوبہ بند طریقے سے ممانعت کر دی کہ کوئی قرآن نہ سنے اور جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بازاروں، میلوں اور پبلک مقامات پر کھڑے ہو کر سنانا شروع کیا تو منصوبہ یہ تھا کہ اتنا شور مچایا جائے کہ "محمد" صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کسی کے کان میں نہ پڑ سکے[1]

اگر کوئی اجنبی شخص اس شور و غل پر اعتراض کرنے لگے تو کبھی کہہ دیا جائے معاذ اللہ مجنون ہو گیا ہے کبھی یہ کہہ دیا جائے کہ یہ جادوگر ہے۔ یہ منتر پڑھتا ہے تو ماں بیٹے سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ بیوی اپنے شوہر سے اور بھائی بھائی سے جدا ہو جاتا ہے[2]

یہ ابتدائی تدبیریں تھیں۔ پھر جو کچھ کیا گیا، اسلام لانے والوں کو طرح طرح ستایا گیا۔ پھر ان کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ان کو ترک وطن پر مجبور کیا گیا اور جب وطن ترک کر چکے تو مدینہ پر بار بار حملے کر کے ان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب کچھ کیا گیا مگر یہ نہ ہو سکا کہ قرآن حکیم کے چیلنج کا جواب دے دیں اور ایک سورت اس کے مقابلہ میں پیش کر کے صداقتِ قرآن اور صداقتِ محمدؐ کی تردید کر دیں۔

یہ صداقت کی دوسری دلیل تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی اور یہ دلیل جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مسعود میں برہان قاطع اور حجۃ کاملہ تھی آج چودہ سو برس کے بعد

---

[1] ۴۱ حٰم سجدہ آیت ۲۶ [2] سورہ ۵۱ الذاریات آیت ۵۲ سورہ ۵۲ الطور آیت ۲۹ وغیر ذلک

ایسی ہی درخشاں اور تاباں دلیل ہے جو پوری دنیا کو للکار رہی ہے لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا [1]

(سورہ بنی اسرائیل ۱۷ آیت ۸۸)

ضمیر سے بغاوت کی یہ بدترین مثال تاریخ نے فراموش نہیں کی کہ قریش کے یہی سرغنہ ابوجہل اخنس بن شریق اور ابوسفیان جو دوسروں کو قرآن شریف سننے سے منع کرتے تھے راتوں کو چھپ چھپ کر خود قرآن شریف سنا کرتے تھے۔ رات کے آخری حصہ میں جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھینی بھینی آواز سے قرآن شریف پڑھتے تھے تو قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت صدا۔ پرسوز میں عجیب کیفیت پیدا کر دیتی تھی، جو ایک دفعہ سن لیتا وہ بار بار سننے کے لئے بے چین رہتا۔ ان سرداروں کو کسی طرح سننے کا اتفاق ہو گیا تو پھر جب موقع ملتا خلوت کدہ کے آستانہ مبارک پر پہنچ جاتے اور کان لگائے سنتے رہتے۔ کبھی آپس میں مڈبھیڑ بھی ہو جاتی تو ہر ایک دوسرے کو ملامت کرتا۔ مگر یہ ایک ایسا جرم تھا جس سے باز رہنا مشکل تھا۔ البتہ نوجوانوں کو منع کرتے ہیں۔ سب کا اتفاق تھا کہ اگر وہ گرویدہ ہو گئے تو ہماری طرح اپنے ضمیر سے بغاوت نہیں کر سکیں گے [2]

---

[1] اگر تمام انسان اور سارے جن اس پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا قرآن پیش کر دیں تو وہ اس جیسا قرآن پیش نہیں کر سکیں گے، خواہ وہ اس میں ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کریں۔

[2] سیرۃ ابن ہشام ص ۱۹۳/۱ البدایہ والنہایہ ص ۶۴/۳ الاصابہ ص ۲۳/۱ ذکر اخنس بن شریق۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت

فرائض اور خصوصیات

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے "محمد" صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا۔ (سورۃ احزاب)

اے نبی ہم نے تم کو بھیجا ہے اس شان سے کہ آپ

۱۔ شہادت دینے والے ہیں۔
۲۔ بشارت دینے والے ہیں۔
۳۔ آگاہ کرنے والے ہیں۔
۴۔ خدا کی طرف بلانے والے ہیں۔
۵۔ خدا کی طرف سے دعوت دینے کے مجاز ہیں۔
۶۔ چراغ ہیں روشنی دینے والے۔

یہ معجزانہ بلاغت ہے کہ خطاب ایسے الفاظ سے کیا گیا جس سے یہ بنیادی حیثیت پہلے ظاہر ہوگئی کہ آپ خدا کے بھیجے ہوئے نبی ہیں۔ اس کے بعد مندرجہ بالا چھ (۶) خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں۔

پہلی خصوصیت اور نبی اور فلسفی کا فرق پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آپ حق بات کو اس یقین

اور ایسے وثوق اور بھروسے سے بیان کرتے ہیں۔ جیسے کوئی آنکھوں دیکھی چیز کی شہادت دیتا ہے۔

یہ فرق ہے نبی اور فلسفی میں۔ فلسفی کے پاس قیاس۔ تخمینے اور تجربے ہوتے ہیں۔ تجربوں کی بنیاد اگرچہ لبسا اوقات مشاہدہ پر ہوتی ہے۔ مگر انسان کا مشاہدہ بھی لبسا اوقات غلطی کرتا ہے۔

ہزاروں برس تک دنیا کے فلسفی (جن میں سقراط، ارسطو اور افلاطون جیسے ماہر بھی داخل ہیں جو فلاسفر کے امام مانے جاتے ہیں) یہی یقین کرتے رہے کہ چاند اور سورج آسمانوں میں گڑے ہوئے ہیں۔ آسمان زمین کو گھیرے ہوئے ہیں اور وہ زمین کے گرد گھوم رہے ہیں۔ زمین اپنی جگہ ساکن ہے۔ یہ نہ حرکت کرتی ہے نہ کر سکتی ہے۔ یہ سب کچھ وہ اپنے مشاہدہ کی بناپر کہتے رہے ان کی عظیم الشان رصدگاہیں اسی یقین کی تصدیق کرتی رہیں اور اپنے اس یقین کی بناپر انہوں نے نجوم۔ جوتش وغیرہ بہت سے فن ایجاد کئے اور یقین کرتے رہے کہ یہ تمام فنون اور ان کی یہ تمام تحقیقات صحیح اور درست ہیں ان میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں[1]۔ مگر آج سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ یہ جو کچھ تھا فریب نظر تھا۔ آج کی دنیا میں اس سے بڑا احمق اور جاہل کوئی نہیں جو آسمان کو گھومتا ہوا مانے اور چاند سورج کو اس میں جڑا ہوا سمجھے۔

ان فلاسفہ کو پورا یقین تھا کہ ہماری زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ فوراً ہی فنا ہو جاتے ہیں ان کے فلسفی ضابطہ کا فیصلہ یہی تھا کہ حرکت اور اس کے اثرات کا کوئی اپنا وجود ہی نہیں ہے لہذا ان کے بقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری آواز اور ہمارے الفاظ زبان کی حرکت کا اثر ہے جو ساتھ ساتھ ختم ہوتا رہتا ہے۔ لیکن آج ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ جو لفظ زبان سے نکلتا ہے وہ باقی رہتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جو الفاظ انسانوں کی زبان سے بولے گئے وہ سب فضا میں موجود ہیں۔

بہر حال سابق فلاسفر نے جو باتیں صرف ذہانت سے معلوم کی ہیں اور موجودہ فلسفی جن باتوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں ان تمام تحقیقات اور مشاہدات کے باوجود یہ سب قدیم اور جدید فلاسفر اور ماہرین

---

[1] ان کے اس یقین میں لبسا اوقات جارحیت ہوتی تھی۔ وہ اپنے مخالف کو سخت سے سخت سزا کا مستحق سمجھتے تھے انہیں کے پیش رو وہ تھے جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نذر آتش کرنے کیلئے جہنم تیار کیا تھا۔

سائنس یہی سمجھتے رہے اور یہی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہماری تحقیق ہے وہ حرف آخر نہیں ہے ممکن ہے کوئی جدید تحقیق اس تحقیق کو غلط قرار دے دے۔ لہٰذا یہ یقین کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہی حرف آخر ہے اور وہی حق ہے اس کے سوا باطل ہے۔ یہ یقین فلسفی کو میسر نہیں آتا۔ اس کو خود اپنی تحقیق کے اندر شک رہتا ہے۔ اس بنا پر وہ اطمینان سے محروم رہتا ہے اور جب اطمینان کی دولت خود اس کے پاس نہیں ہوتی تو وہ کسی دوسرے کو یہ دولت کہاں سے دے سکتا ہے اور جب اس کو اپنی تحقیق پر مکمل اطمینان اور یقین نہیں ہوتا تو اس کے لئے فدا ہو جانے اور قربان ہونے کا جذبہ بھی اس کے اندر نہیں ہوتا۔ لہٰذا عمل کے لحاظ سے وہ عموماً کوتاہ رہتا ہے۔

مادہ کی طرح روح اور خدا سے تعلق رکھنے والے مسائل (مثلاً خالق کائنات کی ذات و صفات، اس سے انسان کا تعلق۔ حیات بعد الممات۔ عمل اور پاداش عمل جیسے مسائل) میں بھی فلسفی کا فیصلہ دوٹوک نہیں ہوتا۔ اس کا ترقی پذیر دماغ جس چیز کو آج روشنی سمجھتا ہے وہی چیز اگلے روز اس کو تاریک نظر آتی ہے اور سکون و اطمینان کے بجائے اس کا دماغ نئے خلجان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے پیرو کار جو بصیرت سے محروم اور اندھی تقلید کے عادی ہوں فلسفی کے کسی نظریہ کے معتقد ہو جائیں، مگر ان کی یہ تقلید بھی شک و شبہ کی گرد سے پاک نہیں ہوتی اور یہی سبب ہوتا ہے کہ اس کے مخالف اور متضاد نظریہ کو بھی حق سمجھنے لگتے ہیں[1]

قرآن حکیم میں بار بار کہا گیا ہے کہ ان عقل پرستوں کے پاس جو کچھ ہے وہ "ظن" ہے جو شک و شبہ اور خلجان کے گرد و غبار سے پاک اور صاف نہیں۔ جہاں حق کی ضرورت ہو وہاں "ظن" کام نہیں دے سکتا۔[2]

---

[1] برادران وطن کے دھرم کا مدار وحی پر نہیں ہے کیونکہ وہ نبوت کو نہیں مانتے ان کے دھرم کا مدار فلسفہ پر ہے وہ اپنے رشیوں اور منیوں کو فلسفی ہی مانتے ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ کسی ایک عقیدہ اور نظریہ پر ان کو یقین نہیں ہوتا وہ ہر ایک عقیدہ کو صحیح ماننے لگتے ہیں۔ وہ اس کو وسعت نظر اور فراخی ظرف سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا سبب گم گشتگی نظر اور فقدان یقین ہے۔

[2] سورہ والنجم ۵۳ آیت ۲۴ و ۲۸۔

مکڑی کا جالا کرم شب تاب کو الجھا تو سکتا ہے اس کو منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ قطب مینار کی بلندی تک وہی رسی پہنچا سکتی ہے جو نہایت مضبوط ہو۔ نبی کے پاس حق اور یقین کی یہی مضبوط رسی ہوتی ہے جو اس کو اس کا رب اور معبود عطا کرتا ہے[1] اور اس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ رسی خود اس کے رب کی عطا کردہ ہے۔ وہ اپنی جان قربان کر سکتا ہے۔ مگر اس رسی کو نہیں چھوڑ سکتا۔

اس یقین کا ثمرہ وہ غیر معمولی اعتماد اور توکل ہوتا ہے جو نبی کو اپنے رب پر ہوتا ہے۔ جو بڑی سے بڑی جابر و ظالم طاقت کے مقابلہ میں بھی اس کو پہاڑ کی چٹان بنائے رکھتا ہے اور سخت سے سخت خطرہ کے موقع پر بھی اس کا تصور یہ ہوتا ہے۔

"ہم اس خدا پر اعتماد اور بھروسہ کیوں نہ کریں جس کا فضل و کرم یہ ہے۔ کہ روحانی اور مادی زندگی کے) تمام راستوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ بلاشبہ ہمیں یہ کرنا ہے کہ ہم ان تمام اذیتوں کے مقابلہ پر استقلال اور ضبط و تحمل سے کام لیں جو تم ہمیں پہنچا رہے ہو اور اللہ ہی ہے جس پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیئے"

(سورۂ ابراہیم ۱۴ آیت ۱۱)

مختصر یہ کہ اللہ کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاہد ہیں یعنی جو کچھ بتاتے ہیں وہ ایسے یقین کے ساتھ جو مشاہدہ سے بھی بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ جس کی پشت پر حق و صداقت کی سرفروشانہ اور فداکارانہ پختگی ہوتی ہے۔

دوسری خصوصیت یہ کہ جو لوگ اس حق و صداقت کو قبول کر لیتے ہیں ان کو پہلی[2] بشارت یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے سچائی کا راستہ پا لیا اور خدا پرستی کے جس صراط مستقیم کی تلاش میں وہ سرگرداں تھے وہ صراطِ مستقیم ان کو مل گیا۔ وہ تشنہ کام، جو تلاشِ حق میں

---

[1] بقرہ آیت ۲۵۶ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ۔ [2] ایک سبق: نبی اور نہ صرف نبی بلکہ ہر ایک داعی حق کا یہ کام ہے کہ وہ پیامبر ہے اور جس کو وہ دعوت دے تو پہلے اس دعوت کے فائدہ بخش اور روشن پہلو اس کے سامنے رکھے۔

سالہاسال سے سرگرداں رہے ان کے لئے اس سے زیادہ بشارت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ گوہر مراد ان کے دامن میں آگیا جس کے لئے وہ بے چین تھے اور جس کی جستجو میں وہ اپنی عمر کھپا رہے تھے۔

دوسری بشارت یہ ہے کہ اس کے بہترین فوائد اور نتائج ان کو موجودہ زندگی میں بھی میسر آئیں گے اور اس عالم میں بھی میسر آئیں گے جہاں حق و باطل کا فیصلہ ہوگا۔ جہاں کی زندگی حقیقی زندگی ہے اور جہاں کی کامیابی ابدی کامیابی ہے۔

تیسری حیثیت یہ کہ جو لوگ سچائی کے سامنے گردن نہ جھکائیں جو اس سے موتھ موڑیں انکو آگاہ کردیں کہ وہ موجودہ اور آخرت کی زندگی کی کامیابیوں سے موتھ موڑ رہے ہیں اس کے بدترین نتائج اس زندگی میں بھی اُن کے سامنے آئیں گے اور اُس زندگی میں بھی جو حقیقی زندگی ہے۔ آپ کی حیثیت یہ ہے کہ آپ نذیر ہیں۔ (آگاہ کرنے والے)

چوتھی حیثیت یہ کہ آپ داعی الی اللہ ہیں۔ اور پانچویں حیثیت یہ ہے کہ آپ محض فطری خیر اندیشی اور خیر سگالی کی بنا پر دعوت نہیں دیتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس جلیل اور عظیم خدمت کے لئے مامور ہیں۔

چھٹی خصوصیت وہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا لب لباب ہے آپکی تمام سوانح حیات ان دو لفظوں میں سموئی ہوئی ہے کہ آپ سراج منیر ہیں یعنی نوع انسان کی محفل میں رونق افروز ہیں۔ مگر اس طرح کہ سراسر سوز و گداز ہیں اور یہ سوز و گداز ہی وہ نور ہے۔ جو دوسروں کو روشن کر رہا ہے۔

اس چھٹی خصوصیت کا مشاہدہ کرانے کے لئے حیاتِ مقدسہ کی مختصر سوانح آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہے۔ (واللہ الموفق وھو المعین)

سراج منیر کو گل کرنے کی سازش

وہی "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) سرداران قریش جس کو "الصادق" اور "الامین" کہا کرتے تھے اس کی مقدس تعلیم کو جب انہوں نے اپنے مفادات کے لئے خطرۂ عظیم اور برقِ خرمن سوز سمجھا تو اب رات دن ان کی کوشش یہ تھی کہ اس آواز کو دبائیں اور اس شمع کو گل کر دیں چنانچہ باپ دادا کے مذہب قدیم کے نام پر عوام میں اشتعال پیدا کر دیا۔ جس پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور گنے چنے مٹھی بھر مسلمانوں کے درپے ہو گئے اس کے علاوہ خود ان کی سرگرمیاں نئے نئے ستم ایجاد کرنے میں مصروف رہنے لگیں۔ خانہ کعبہ کا حرم محترم جہاں خود ان کے عقیدے کے موجب کسی بھی جاندار کو ستانا گناہ تھا۔ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) وہاں اپنے رب کی عبادت کرتے تو ستاتے جاتے اور طرح طرح ستاتے جاتے تھے۔ ایک دفعہ ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ اگر میں نے دیکھ لیا کہ حرم کعبہ میں "محمد" اپنا چہرہ زمین پر رکھے ہوئے ہیں۔ تو میں اس کی گردن اپنے پیر سے روند دوں گا۔[1]

ابوجہل نے تو ایسا نہیں کیا، لیکن اس کا دوست عقبہ بن ابی معیط" اس سے بھی زیادہ حرکت کر گذرا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ عقبہ بن ابی معیط نے چادر گردن میں ڈال دی اور اتنی زور سے اس کو اینٹھا کہ محبوب خدا" (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سانس گھٹ گیا۔ آنکھیں باہر کو آنے لگیں۔

اتفاق سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں پہنچ گئے۔ عقبہ کو دھکیل کر پیچھے کیا۔ چادر گردن مبارک سے ڈھیلی کی اور ان دشمنانِ حق سے کہا۔

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ

---

[1] بخاری شریف صفحہ ۲۰، لاَطَئَنَّ عُنُقَهٗ ۱۲

کیا تم ایک آدمی کو اس پر قتل کر رہے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور تمہارے پاس
تمہارے رب کی طرف سے دو روشن دلیلیں لایا ہے (جن کا تم انکار نہیں کر سکتے) [1]

خانہ کعبہ کے قریب اکثر سرداران قریش کی نشست رہتی تھی۔ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مصروف تھے۔ ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ فلاں محلہ میں اونٹنی ذبح ہوئی ہے۔ ایسا کرو کہ اس کا بچہ دان[2] اٹھالاؤ اور "محمدؐ" کے سر پہ رکھ دو۔ یہی بدبخت عقبہ بن ابی معیط کھڑا ہو گیا اس محلہ میں گیا۔ بچہ دان اٹھوا کر لایا اور جب آپ سربسجود تھے، پورا ملغوبا سر مبارک پر ڈال دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حرکت کرنی مشکل ہو گئی (یا بارگاہ خداوندی میں مظلومانہ[3] شکایت کے لئے قصداً حرکت نہیں کی) مگر یہ بدبخت اپنی اس بدمستی پر خوش تھے اور قہقہے مارتے ہوئے

---

[1] بخاری شریف ص۱۱ [2] سلا جزور۔ سلا بچہ دان (بخاری شریف وغیرہ) [3] قانون اسلام کے ماہرین یعنی حضرات آئمہ مجتہدین کیلئے یہ واقعہ ایک دوسرے نقطۂ نظر سے موضوع بحث بن گیا کہ نماز کیلئے پاکی شرط ہے۔ جب اتنی پلیدی ڈالدی گئی تو کیا نماز باقی رہی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ ختم کیوں نہیں کیا فقہی نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ بحث طلب ہے۔ اس بنا پر امام بخاری رحمۃ اللہ کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدار نماز اور بقار نماز کی حالت میں فرق ہے نماز کی ابتدار بیشک اس طرح کرنی چاہیئے کہ بدن یا کپڑوں پہ کوئی ناپاکی نہ ہو لیکن بقار نماز کیلئے یہ شرط نہیں ہے لیکن دیگر ائمہ کا یہ مسلک نہیں ہے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر نماز میں ناپاکی اتنی دیر رہے کہ اتنی دیر میں ایک رکن ادا کیا جا سکتا ہے تب نماز نہیں ہوگی اور اگر اس سے کم وقفہ تک رہے تو نماز ہو جائیگی۔ جو حضرات ابتدار اور بقار دونوں کیلئے پاکی ضروری قرار دیتے ہیں ان کا ایک جواب وہ ہے جسکی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ناپاکی کا احساس ہوا تو آپ نے یقین فرمالیا کہ نماز ختم ہو گئی اور اسی لئے آپ کو اتنا صدمہ ہوا کہ آپنے دعا فرمائی۔ باقی آپکا اسی حالت میں رہنا احتجاجاً تھا یعنی آپنے سر مبارک اس لئے نہیں اٹھایا کہ آپ بارگاہ رب العالمین میں یہ حالت پیش فرما کر احتجاج فرمارہے تھے لیکن حقیقت ہے کہ یہ تمام تحقیق اس وقت ہے جب یہ مان لیا جائے کہ پاکی کے احکام اس واقعہ سے پہلے نازل ہو چکے تھے لیکن اگر پاکی کا حکم (وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ مدثر۔) بعد میں نازل ہوا تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حافظ ابن حجرؒ نے سورۃ مدثر کی تفسیر میں ابن منذر کی روایت پیش کی ہے القی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سلی جزور فنزلت یعنی اس آیت کا سبب نزول ہی یہ واقعہ ہے۔ فتح الباری سورہ مدثر ص۵۱ ج۸۔

ایک دوسرے پر ڈھلک رہے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی صاحبزادی سیدہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کو خبر ہوئی۔ وہ دوڑی ہوئی آئیں اور گندگی کے اس بوجھ کو سر مبارک سے ہٹایا[1]

جب حرم پاک میں رہنماؤں اور سرداروں کی یہ حرکتیں تھیں تو مکہ کے عوام مکہ کی گلیوں کوچوں میں جو کچھ کر گذرتے کم تھا چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ اوپر سے کوڑا کرکٹ "جسد اطہر" پر ڈالا گیا۔ اور ایک پڑوسی عورت کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھا دیا کرتی تھی۔[2]

اس قسم کی حرکتیں خدا جانے کتنی ہوئیں اور لطف یہ ہے کہ یہ حرکتیں اصل پروگرام سے زائد تھیں۔

---

[1] بخاری شریف ص۳۷ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تکلیف پہنچائی جاتی تھی آپ اس کا انتقام تو کیا لیتے کبھی بد دعا بھی نہیں کرتے تھے۔ البتہ حقوق اللہ کی توہین کی جاتی تھی تو آپ بے چین ہو جاتے تھے اور اس وقت بد دعا کے الفاظ بھی زبان مبارک پر آجاتے تھے۔ یہاں اس وقت جو کچھ کیا گیا اُس میں اول حرم کعبہ کی توہین تھی جو خود عقیدہ قریش کے موجب بھی حق اللہ کی توہین تھی۔ دوم یہ کہ بارگاہ خدا میں سجدہ ریزی کی توہین تھی جس کو ہر ایک سلیم الفطرت انسان کی فطرت حق اللہ کی توہین سمجھتی ہے۔ چنانچہ اس موقع پر ان سرداران قریش کے حق میں آپ کی زبان سے بد دعائیہ کلمات نکلے اور وہ اس طرح پورے ہوئے کہ یہ سب سردار جنگ بدر میں مارے گئے۔ (بخاری شریف ص۳۷ وغیرہ)

[2] یہ ابولہب کی بیوی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چچی بھی ہوتی تھی اور اُس نے آپ کو بچپن میں گود بھی کھلایا تھا۔ طبقات ابن سعد ص۱۳۴ ج۱۔

منصوبہ بند کوششیں

ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ عام نہیں دی تھی۔ آپؐ خاموشی سے ذکر و فکر اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تربیت میں مصروف تھے۔ اس وقت بھی قریش کے تاڑنے والوں نے یہ کوشش کی تھی کہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھے اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی طرح کی مفاہمت ہو جائے۔ مگر اُن کی یہ کوششیں ناکام رہی تھیں۔ لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قریش بلکہ پورے عرب کو مخاطب کر کے تبلیغ شروع کی تو مخالفانہ کوششوں کا بھی نیا دور شروع ہوا۔

قریش کے لئے یہ سوال بہت اہم اور بہت پیچیدہ تھا کہ جس کا وہ احترام کرتے رہے تھے اور جس کو الصادق اور الامین کہا کرتے تھے اب اس کی تردید کس طرح کریں اور عوام کو کس طرح مطمئن کر کے الصادق الامین کے خلاف مشتعل کریں۔ حج کا زمانہ قریب آیا تو یہ سوال بہت اہم ہو گیا کیونکہ یہ یقین تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اجتماعِ عظیم سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے قبائل مکہ کے ذمہ داروں کا اجتماع کیا گیا۔ بحث [illegible] کے بعد طے پایا گیا کہ پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے الگ گفتگو کر لی جائے [illegible] ولید بن مغیرہ کو گفتگو کے لیے منتخب کیا گیا ولید بن مغیرہ مکہ کا سب سے [illegible] اور الیسا سلیقہ مند [illegible] اس کی [illegible]

[illegible] یہ ہے کہ اسلام کے مشہور اور کامیاب ترین جرنیل حضرت خالد [illegible] اور فرزند تھے جو اس واقعہ سے تقریبًا پندرہ سال بعد حلقہ بگوش اسلام ہوئے)

ولید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گفتگو کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مقصد کی وضاحت کی اور چند آیتیں قرآن پاک کی پڑھ کر سنائیں۔

ولید آیتیں سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ سے منع تو کیا کرتا خود گم

ہوگیا۔ خاموشی سے مجلس سے اٹھا اور جب مجلس قریش میں واپس پہنچا تو حالت عجیب تھی۔ لوگوں کو خیال ہوا ولید بہک گیا۔ محمدؐ کا ہوگیا (صلی اللہ علیہ وسلم) مگر ولید باہمہ عقل و دانش حیران تھا کہ جو کلام سنا ہے اس کے بارہ میں اور خود محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارہ میں کیا فیصلہ کرے پورے غور و فکر اور موازنہ کے بعد ولید نے ارکان مجلس سے کہا۔

"محمدؐ کو کاذب نہیں کہہ سکتے۔ اس کو کاہن بھی نہیں کہہ سکتے۔ شعر و سخن کا میں ماہر ہوں، اس کا کلام شعر بھی نہیں ہے۔ کاہنوں کی تک بندیوں کو بھی میں جانتا ہوں۔ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ ان سب سے بہت بلند ہے۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ مجھ جیسا پختہ اور ٹھوس آدمی بھی چکرا گیا۔"

اصل سوال کے متعلق ولید نے رائے دی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شائستہ اور شیریں گفتگو اور اس کلام کی غیر معمولی تاثیر کا توڑ یہی ہو سکتا ہے کہ پوری قوت سے پروپیگنڈہ کرو کہ (۱) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جادوگر ہے۔ وہ ایسے منتر پڑھتا ہے کہ گھر گھر میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ لہذا اس کی بات نہ سنو۔ (۲) وہ دین سے پھر گیا ہے، وہ کہتا ہے کہ تم سب، تمہارے باپ دادا۔ اور تمہارے وہ دیوتا جن کی پوجا کرتے ہو، یہ سب دوزخ کا ایندھن ہیں۔ (۳) تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔

ولید کی رائے سے سب نے اتفاق کیا اور صرف طے ہی نہیں کیا بلکہ اس شدومد سے عمل بھی شروع کر دیا کہ ابھی قبائل کے لوگ حج کے لئے روانہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بے دینی کا چرچا ان کی گلی کوچوں تک پہنچ گیا اور نہ صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بلکہ آپ کے خاندان "آل ہاشم" کے متعلق بھی نفرت کی لہر ان تمام قبائل میں دوڑ گئی جو حج کے لئے آنے والے تھے۔

ابولہب کے متعلق طے کیا گیا کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نگرانی رکھیں گے اور جہاں وہ تقریر کرنا چاہیں یا لوگوں سے گفتگو کریں وہ ان کو منتشر کر دیں۔

"ابولہب" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا چچا (تایا) تھا۔ مالدار اور باوجاہت بھی تھا عرب کے قاعدے کے مطابق خاندان کا بڑا شخص خاندان کے ہر فرد کا ولی مانا جاتا تھا اور اس کو حق ہوتا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے کے متعلق کوئی اعلان کر دے۔ قصاص وغیرہ کے قضیوں میں ایسے ولی کے قول کی خاص اہمیت ہوتی تھی۔ اسی غرض سے اس کو اس خدمت کیلئے مقرر کیا گیا تھا کہ خاندان کے سب سے بڑے شخص کی حیثیت سے لوگوں کو بتائے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ اپنے خاندانی بزرگوں کو جہنمی بتاتا ہے اور دیوتاؤں کی توہین کرتا ہے۔ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ خاندان کے سب سے بڑے شخص کے قول سے زیادہ کس کی بات معتبر ہو سکتی ہے۔

حج کے موقع پر انتظام کے متعدد شعبے خصوصاً سقایہ یعنی حاجیوں کے لئے پانی کا انتظام (جو سرزمین حجاز خصوصاً مکہ میں سب سے سخت کام تھا) آل ہاشم کے سپرد ہوتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابولہب کے علاوہ آپ کا پورا خاندان اگرچہ مسلمان نہیں ہوا تھا مگر آپ کا حامی تھا۔ خواجہ ابوطالب اُن میں پیش پیش تھے۔ سرداران قریش کے پروپیگنڈے کے باعث جو نفرت خاندانِ ہاشم سے عرب میں پھیل گئی تھی، خواجہ ابوطالب کو اس کا اندازہ تھا۔ انہیں خطرہ ہوا کہ حج کے موقع پر یہ نفرت بغاوت کی شکل اختیار کر لے گی اور وہ ان خدمات سے محروم ہو جائیں گے جو حج کے موقع پر ان کے سپرد ہوتی تھیں۔ قبائلی عصبیت اس فتنہ کو اور ہوا دے سکتی تھی۔

لہذا خواجہ ابوطالب[1] نے تقریباً "سو شعر" کا طویل قصیدہ لکھا۔ جس میں خانہ کعبہ۔ حرم شریف کی عظمت و حرمت، اس کے واجب الاحترام ہونے کے متعلق مسلمہ روایات، پھر خاندان ہاشم کی عظیم الشان خدمات کا تذکرہ کیا۔ اس قصیدہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بھی روشنی ڈالی کہ ان کے اخلاق و اوصاف کیا ہیں اور قریش کس طرح ان کی تعظیم کرتے رہے ہیں اسی قصیدہ کا وہ مشہور شعر ہے جو نعت شریف کے موقع پر عام طور سے پڑھا جاتا ہے۔

---

[1] ابن ہشام نے اس پورے قصیدہ کو نقل کیا ہے اور اس کی وجہ تصنیف یہی بیان کی ہے جو اوپر گذری۔ صفحہ ۱۶۶ تا صفحہ ۱۷۱ ج ۱۔

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ
یثمال الیتامٰی عصمۃ للارامل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محامد بیان کرنے کے بعد یہ بھی واضح کیا کہ اگرچہ وہ ایک نئے مذہب کی دعوت دے رہے ہیں مگر ابناء ہاشم جو حجاج کی خدمت کرتے ہیں وہ ان کے مذہب کے حامی نہیں ہیں وہ بدستور اپنے قدیم مذہب پہ قائم ہیں اور ان کے عقائد وہی ہیں جو سرداران قریش اور عام عرب کے عقائد ہیں، وہ اسی طرح دیوتاؤں کو مانتے ہیں اور اُن کی پوجا کرتے ہیں۔ بایں ہمہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ "محمد" کو مخالفین کے حوالے کردیں۔ خاندانِ ابوطالب اپنی جانیں قربان کردیگا مگر اپنی موجودگی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بال بیکا نہیں ہونے دے گا۔

عرب شعر کے دلدادہ ہوتے تھے۔ شاعروں کے قصیدے جیسے ہی پڑھے جاتے تھے، بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جاتے تھے اور پھر جگہ جگہ وہ نقل کئے جاتے تھے اس وقت شعراء کے قصائد کو وہی طاقت حاصل تھی جو دورِ حاضر میں کسی مضبوط پریس کو حاصل ہے۔ چنانچہ خواجہ ابوطالب کا یہ قصیدہ تمام قبائل میں پھیل گیا اور اس طرح وہ فتنہ فرو ہوا جو بنو ہاشم کے خلاف کھڑا کیا جارہا تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے متعلق اس کی وہی قوت باقی رہی بلکہ خواجہ ابوطالب کے قصیدے نے اور تائید کردی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نئے مذہب کے داعی ہیں۔ چنانچہ خواجہ ابوطالب اور ان کے ساتھیوں کو تو اپنی خدمات کی انجام دہی میں کوئی نئی دشواری پیش نہیں آئی مگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تعاقب پوری طرح کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاں تشریف لے جاتے عرب کا گورا چٹا[2] ایک باوجاہت سردار (ابولہب) اُن کے پیچھے ہوتا، جو

---

[1] یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تعریف یہ ہے کہ ایسا روشن چہرہ جس کا واسطہ دیکر بادل سے بارش مانگی جاتی ہے (یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ بارش نہیں ہوتی تھی تو قریش نے آپ سے دُعا کرائی تھی اور بارش ہوگئی تھی) یتیموں کی پناہ ہیں، بے سہارا بیوہ عورتوں کی عصمتوں کے محافظ۔ [2] ابولہب کا رنگ سفید، سُرخی رخساروں میں گُھلی ہوئی۔ اس کے رخساروں کو شعلوں سے تشبیہہ دیتے ہوئے اس کا لقب "ابولہب" رکھا گیا تھا۔ یعنی شعلوں والا۔

لوگوں کو ڈانٹا رہتا کہ ان کی بات نہ سنو، یہ پاگل ہو گئے ہیں[1]۔ (معاذ اللہ)

ہڑبونگ اور انتشار ابولہب کا یہ طریقہ انفرادی نہیں رہا بلکہ اجتماعی بن گیا اور یہ طے کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جہاں بھی تقریر کریں یا قرآن پاک کی آیتیں سنائیں اتنا شور مچاؤ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) زچ ہو کر رہ جائیں[2]۔ قریش مکہ کی شرارت پسندی کو داد دینی چاہیے کہ کئی سال تک یہ پروگرام چلاتے رہے۔

ناکہ بندی ابوذر۔ قبیلہ غفار کے نمایاں شخص تھے۔ دل میں صداقت کی تڑپ رکھتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوئ نبوت کا چرچا آپ تک پہنچا۔ حقیقت معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چھوٹے بھائی (اُنیس) سے کہا۔ مکہ معظمہ جاؤ اور تحقیق کر کے آؤ۔ اُنیس مکہ آئے ملے جلے اور واپس جا کر رپورٹ دی" ایک صاحب ہیں اچھی باتیں بتاتے ہیں بُری باتوں سے روکتے ہیں"

ابوذر اس دو حرفی رپورٹ سے مطمئن نہیں ہوئے۔ خود سفر کا ارادہ کر لیا اور فوراً ہی تیار ہو کر چل دیئے

اُبوذر مکہ میں آئے لیکن تحقیق کس سے کریں؟ جہاں نام لینا بھی مصیبت کا سر لینا تھا، لوگ مارنے اور پیٹنے کو تیار ہو جاتے تھے، وہاں راستہ کون بتاتا اور تعارف کون کراتا۔ کئی دن اسی شش و پنج میں گذر گئے۔ حضرت علی ان کو دیکھا کرتے تھے ایک روز ان کو دیکھ کر ٹھٹکے اتہ پتہ اور مکہ آنے کا سبب معلوم کیا اور جب مقصد معلوم ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ چلو۔ مگر اس طرح چلو کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میرے ساتھ چل رہے ہو میں کوئی اندیشہ محسوس کروں گا تو جوتا ٹھیک کرنے کے بہانے دیوار سے لگ کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ تم آگے چلتے رہنا غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی راز داری سے کام لیا تب حضرت ابوذر منزل مقصود تک پہنچ سکے۔

حضرت ابوذر کی نظر روئے انور پر پڑی۔ دل نے تصدیق کی کہ گوہر مراد حاصل ہو گیا۔ آپ نے اسلام کا پیغام معلوم کیا اور بقول ابوذر وہیں کے وہیں[3] (فوراً) مسلمان ہو گئے۔

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۴۵ ج ۱ وغیرہ [2] قال اللہ تعالیٰ لا تسمعوا لھٰذا القرآن الآیۃ سورۃ حم سجدہ ۵- آیت ۲۶ [3] اسلمت مکانی۔ بخاری شریف ص ۴۹۹۔

زد و کوب اور مشقِ ستم ایمان کا نور تھا یا جرأت و ہمت کا فولاد۔ جو ابو ذر کو حاصل ہوا۔ واپس ہو کر حرمِ کعبہ میں پہنچے۔ قریش کے کئی سردار حرم میں موجود تھے۔ حضرت ابو ذر کی نظر اِن فرعون منش سرداروں پر پڑی تو جوش آ گیا۔ ایسی سیدھی راہ اور ایسی سچی بات۔ اور ان لوگوں نے اس کے ناکے بند کر رکھے ہیں اور یہ "محمد" مجسّم صداقت و ہدایت۔ ان کا کوئی نام تک زبان پر نہیں لا سکتا۔ اس تصوّر نے جذبہ کی قوت حاصل کی۔ چنانچہ آپ نے اِن رؤساء کو خطاب کر کے فرمایا: یا معشر قریش۔ انی اشہد ان لا الٰہ الا اللہ۔

قریش کے سردار اس جرأت کو کب نظر انداز کر سکتے تھے۔ آواز دی۔ قوموا الی ھذا الصابی۔ اٹھ کھڑے ہو اس بے دین کی طرف (مارو اس بے دین کو) سب طرف سے لوگ حضرت ابو ذر پر ٹوٹ پڑے اور جاں بلب کر دیا۔ حضرت عباس جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہاں موجود تھے۔ انہیں خطرہ ہوا کہ ابو ذر کی جان جاتی رہے گی وہ اُن کے اوپر اوندھے پڑ گئے اور پکار کر کہا:

> "یہ قبیلہ غفار کا آدمی ہے۔ اس کے قبیلہ والوں نے اگر تمہارا راستہ بند کر دیا تو بھوکے مر جاؤ گے۔ غلّہ کا ایک دانہ تم تک نہ پہنچ سکے گا۔"

غلّہ کا نام سن کر لوگوں نے اُن کو چھوڑا۔

اگلے روز پھر یہی ہوا۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے اسلام کا نعرہ بلند کیا اور قریش کے نوجوانوں نے ان کو پیٹنا شروع کیا۔ تب بھی حضرت عباس ہی کسی طرح وہاں پہنچ گئے اور یہی کہہ کر اُن کو بچایا۔[1]

اس طرح کے واقعات اسلام لانے والوں کے ساتھ مسلسل ہوتے رہتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کئی بار اس طرح تختۂ مشق بن چکے تھے، مگر مارنے والوں میں کوئی بچانے

---

[1] بخاری شریف ص ۴۹۹۔

والا بھی کھڑا ہو جاتا تھا۔ جس سے جان بچ جاتی تھی۔ لیکن ایسا بھی ہوا کہ کوئی بچانے والا نہیں پہنچ سکا تو جان بھی جاتی رہی۔

حارث بن ابی ہالہ۔ جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لڑکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردہ تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھڑانے آئے۔ لوگوں نے آپ کو تو چھوڑ دیا مگر ان کو اتنا مارا کہ شہید ہو گئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے حرم مکہ کی وہ زمین رنگین ہوئی جہاں اللہ کے بندے طواف کیا کرتے ہیں[1]۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ۔ مشہور صحابی ہیں۔ ان کے والد کا نام یاسر اور والدہ کا نام سُمَیَّہ تھا ابوجہل نے حضرت سمیہ کے اندام نہانی میں برچھی ماری وہ غریب شہید ہو گئیں۔ یہ پہلی خاتون تھیں جو راہِ خدا میں شہید ہوئیں۔ رضی اللہ عنہا[2]۔

حضرت عمار کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اتنا مارتے کہ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ مگر زندگی تھی باقی رہ گئے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ، امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو ان کو تپتے ہوئے بالو پر لٹایا جاتا اور پتھر اُن کے سینہ پر رکھ دیا جاتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں اور اُن سے کہا جاتا کہ اسلام سے باز آئیں۔ مگر اُن کی زبان سے "احد" ہی نکلتا یعنی معبود ایک ہی ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

جب دھوپ میں تیزی نہ رہتی تو گلے میں رسی باندھ کر لڑکوں کے حوالے کر دیا جاتا کہ مکہ کے اس سرے سے اُس سرے تک گھسیٹتے پھریں۔

حضرت ابوفکیہہ۔ صفوان بن امیہ کے غلام تھے۔ صفوان ان کو بھی یہی سزا دلواتا تھا کہ ان کو گھسیٹتے ہوئے تپتے ہوئے ریت پر ڈال دیا جاتا اور سینہ پر پتھر رکھ دیا جاتا۔ ایک روز اتنا

---

[1] اول من قتل فی سبیل اللہ تحت الرکن الیمانی۔ الاصابہ ص ۳۰۶ ج ۱۔ [2] اول شہیدۃ فی الاسلام الاستیعاب ص ۶۳۵۔

بھاری پتھر سینہ پر رکھ دیا گیا کہ اُن کی زبان نکل آئی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو تیسرے خلیفہ ہوئے بہت اونچے خاندان کے باحیثیت رئیس تھے جب مسلمان ہُوئے تو دوسروں نے نہیں خود ان کے چچا نے ان کو رسی سے باندھ کر مارا۔

حضرت زبیر بن العوام اسلام لائے تو اُن کے چچا اُن کو چٹائی میں لپیٹ کر اُن کی ناک میں دھواں دیتے تھے۔

حضرت خبّاب بن الارت۔ مسلمان ہوئے تو ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں ایک روز دہکتے ہُوئے کوئلوں پر لٹا دیا گیا۔ ایک شخص چھاتی پر پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا کہ کروٹ نہ لے سکیں یہاں تک کہ کوئلے خون اور چربی سے تر ہو کر ٹھنڈے ہو گئے۔ مدتوں کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انھوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور پیٹھ کھول کر دکھائی جو برص کے داغ کی طرح بالکل سفید تھی[1]

الغرض اس طرح کے مظلوموں کی فہرست بہت طویل ہے اور مظالم کی داستان اس سے بھی زیادہ طویل۔ مقصد یہ ہے کہ اس طرح کے مظالم جو سوچے سمجھے منصوبے کے بموجب قریش کی طرف سے کئے جا رہے تھے انھوں نے مکہ کی پوری فضا کو اس درجہ دہشت زدہ اور مرعوب کر دیا تھا کہ کھلے بندوں اعلانِ حق تو درکنار لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی زبان پر لانے کی ہی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ حضرت ابوذر غفاری بعض روایتوں کے بموجب ایک ماہ تک حرم شریف میں پڑے رہے۔ صرف زمزم پر گذر رہا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچ سکے۔ کسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اندازہ ہوا تو بڑی رازداری کے ساتھ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے (جس کی تفصیل اوپر گذری)

اس طرح کے بے پناہ مظالم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کر دیا کہ کسی خفیہ مقام پر قیام فرمائیں۔ چنانچہ ایک مدت تک دار بنی ارقم میں آپ اور آپ کے ساتھی جن کی تعداد تیس کے قریب تھی پناہ گزیں رہے۔ نہایت عجیب بات یہ ہے کہ ان تمام مظالم کے مقابلہ میں رحمۃ للعالمین کی

---

[1] یہ تمام واقعات ان حضرات کے حالات میں الاستیعاب اور الاصابہ وغیرہ میں درج ہیں۔

زبان مبارک اگر متحرک ہوتی تو صرف دعائے خیر کے لئے۔ یہی حضرت خباب جن کو انگاروں پہ لٹایا گیا تھا۔ انہوں نے ایک روز درخواست کی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ان ظالموں کیلئے بد دعا فرما دیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیوار کعبہ کے سایہ میں چادر کا تکیہ بناتے ہوئے اس کے سہارے تشریف فرما تھے۔ جیسے ہی حضرت خباب کے الفاظ سنے سیدھے بیٹھ گئے۔ روئے انور سرخ ہو گیا فرمایا پہلی امتوں میں یہاں تک ظلم ہوئے ہیں کہ لوہے کے کنگھے سے ہڈیوں اور پٹھوں تک گوشت کھرچ دیا جاتا تھا۔ کسی داعی حق کے سر پر آرہ رکھ کر بیچ سے چیر دیا گیا مگر ان حضرات کے پائے استقلال میں جنبش نہیں آئی۔ پھر فرمایا۔ یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو مکمل فرمائیگا یہاں تک کہ ایک مسافر تنہا صنعاء یمن سے حضرموت تک پہنچ جایا کرے گا۔ راستہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہیں ہو گا۔ بہت سے بہت بھیڑیئے کا خطرہ ہو گا جو اس کے گلہ پر حملہ کر سکیگا۔[۱]

مقصد حضرت عمار ان کے والد اور والدہ تینوں کو طرح طرح ستایا جا رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف سے گذرے۔ ان کو مبتلا ء عذاب دیکھ کر فرمایا۔ صبراً یا آل یاسر ان موعدکم الجنۃ[۲]۔ آل یاسر! صبر کرو۔ تم سے جنت کا وعدہ ہے۔ یعنی اس انقلابی پارٹی کی پہلی شرط یہ تھی کہ اس کے مجاہدین کی نظر صرف آخرت پر ہو گی۔ ان کی ہر قربانی اللہ کے لئے ہو گی غلبہ اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد یقیناً دنیاوی مفادات بھی حاصل ہوں گے۔ مگر وہ اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام مانا جائیگا، مجاہد کا نصب العین نہیں ہو گا۔ قرآن حکیم نے اعلان فرما دیا ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ[۳]۔

یہ عالم آخرت ہم انہیں لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کیلئے ہوتا ہے۔

---

[۱] بخاری شریف ص ۵۴۳ ۔ [۲] الاستیعاب ص ۴۳۶ نمبر ۲۷۹۰ [۳] سورۂ قصص ۲۸ آیت ۸۳

ہجرتِ حبشہ

قریش اور ترقی پذیر قبائل عرب کے پاس نہ فوج تھی نہ پولیس۔ البتہ معاہدات کا سلسلہ ایسا تھا جو فوج اور پولیس کا کام دیتا تھا۔

معاہدہ ایک حصار ہوتا تھا جو جان کا بھی محافظ ہوتا تھا اور مال کا بھی اور ان معاہدات کے ذریعہ طاقت کا بھی توازن قائم رہتا تھا۔ حضرت ابو ذر غفاری کو اسی چیز نے بچایا تھا کہ قبیلۂ غفار (جس سے قریش کا معاہدہ تھا) اگر بگڑ گیا تو قریش کا اُس طرف سے گذرنا اور غلہ برآمد کرنا ناممکن ہو جائیگا۔ ابو بکر صدیق، عبدالرحمٰن بن عوف۔ سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہم) خود اپنے طور پر مختلف قبائل سے معاہدے کئے ہوئے تھے! ابتداء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم براہِ راست کسی قبیلہ سے معاہدہ کئے ہوئے نہیں تھے مگر اُن کی حفاظت کی ذمہ داری خواجہ ابو طالب نے لے رکھی تھی۔ خواجہ ابو طالب دوسرے قبائل سے معاہدے کئے ہوئے تھے اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح خواجہ ابی طالب کی پناہ میں تھے اور خواجہ ابو طالب آپ کی پناہ کے ذمہ دار تھے اسی طرح وہ تمام قبائل بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے ذمہ دار تھے جو ابو طالب سے معاہدہ کئے ہوئے تھے۔

مگر اسلام سے مشرف ہونے والوں میں بڑی تعداد وہ تھی جن کے کسی سے خود اپنے معاہدے نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے قبیلوں کے شیوخ اور سربراہ نہیں تھے، سربراہ دوسرے تھے، یہ ان کے تابع تھے۔ شیوخ اور سربراہوں کے معاہدات کے باعث یہ فائدہ تو تھا کہ غیر قبیلہ کے لوگ ان کو مظالم کا نشانہ نہیں بنا سکتے تھے مگر خود قبیلہ کے لوگوں کی مخالفت سوہان رُوح تھی۔ یہ مسلمان ہو گئے تھے مگر جس مقصد سے مسلمان ہوئے تھے وہ حاصل نہیں تھا۔ یعنی یہ لوگ خدائے واحد کی عبادت نہیں کر سکتے تھے چھپ کر قرآن شریف پڑھتے۔ اگر راز فاش ہو جاتا تو طرح طرح کے ظلم سہنے پڑتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اذیتیں اور تکلیفیں سہہ رہے تھے۔ مگر آپ کو اپنی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ البتہ ان ساتھیوں کی اذیت کا احساس آپ کو بے چین رکھتا تھا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ حبش کا بادشاہ

نیک نفس عیسائی ہے۔ اس کی مملکت میں لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لہٰذا آپ نے مشورہ دیا کہ جو جا سکتے ہوں وہ حبش چلے جائیں۔

اس مشورہ پر عمل ہوا۔ پہلے پندرہ صحابہ کا قافلہ روانہ ہوا۔ گیارہ مرد تھے اور چار عورتیں۔ یہ قافلہ ساحل سمندر پر پہنچا۔ ایک جہاز روانہ ہونے والا تھا۔ اس میں نہایت سستے محصول پر جگہ مل گئی قریش کو اس قافلہ کی روانگی کا علم ہوا تو ایک جماعت ان کو پکڑنے کے لئے دوڑا دی۔ مگر جب وہ ساحل سمندر پر پہنچی تو جہاز روانہ ہو چکا تھا۔

ان حضرات کو وہاں اطمینان میسّر آیا تو پھر اور مسلمانوں نے بھی یہ راستہ اختیار کیا۔ مکہ معظمہ سے خفیہ طور سے اکا دکا روانہ ہو کر پہلے ساحل پر جمع ہو گئے اور وہاں سے حبش روانہ ہو گئے۔ اس دوسرے قافلہ میں تقریباً ستر افراد تھے۔

قریش کے لئے یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ اتنے مسلمان وہاں جمع ہو گئے۔ انہوں نے بہت کچھ ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ شاہ حبش کے پاس سفارت بھیجی کہ یہ لوگ بھاگ کر چلے آئے ہیں ان کو حوالہ کر دیا جائے۔ بادشاہ نے مسلمانوں کو طلب کر کے ان کا مقصد معلوم کیا۔

حضرت جعفر بن ابی طالب نے مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی وہ تمام مورخین نے نقل کی ہے اس کا اُردو پیرہن یہ ہے۔

بادشاہ عالیجاہ۔

یہ درست ہے۔ ہماری قوم بت پرست ہے۔ جاہل ہے اس کو حلال حرام کی تمیز نہیں۔ مُردار کھا جاتی ہے۔ بدکاریاں کرتی ہے۔ ہمسایوں کو ستاتی ہے۔ بھائی بھائی پر ظلم کرتا ہے۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا ہے۔ جو برائی ہو سکتی ہے وہ سب ہمارے معاشرہ (سماج) میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا ہم میں ایک شخص پیدا ہوا۔ عمر کے چالیس سال اس نے ہمارے بیچ میں رہ کر اس طرح گزارے کہ پوری قوم اس کی شرافت کی قائل ہو گئی۔ اس کی صداقت اور سچائی سے یہاں

تک متاثر ہوئی کہ اس کو الصادق اور الامین کہنے لگی۔ اُس نے بتایا کہ خدا نے اُس کو نبی بنا کر بھیجا ہے اور خدا کا حکم یہ ہے کہ صرف خدائے واحد کی عبادت کرو۔ بُت پرستی چھوڑ دو۔ خدا کے سوا کسی کے سامنے ماتھا مت ٹیکو۔ کسی کو ناحق نہ ستاؤ، کمزوروں کی مدد کرو۔ غریبوں پر رحم کرو۔ خلقِ خدا کی خدمت کرو۔ رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرو۔ ایک دوسرے سے محبت کرو۔ آپس میں شفقت اور مہربانی سے کام لو۔ سچائی اختیار کرو۔ بُری باتیں چھوڑ دو۔ نیک اور دیانتدار بن جاؤ۔

اے بادشاہ ہمیں یہ باتیں اچھی معلوم ہوئیں ہم نے اس کا دامن سنبھال لیا ہے اور اس کے کہنے پر عمل شروع کر دیا ہے۔

سفارت قریش کے ارکان نے دیکھا کہ بادشاہ حضرت جعفر کی تقریر سے متاثر ہو رہا ہے تو انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اور حضرت مریم کے متعلق ان کا عقیدہ معلوم کیجئے۔ یہ کچھ اور کہتے ہیں اور عیسائیوں کی تردید کرتے ہیں۔

بادشاہ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام اور حضرت مریم کے متعلق ان کا عقیدہ معلوم کیا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورہ مریم کا پورا رکوع پڑھ کر سُنا دیا۔ جس میں حضرت مریم کی پاکدامنی بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ عیسٰی علیہ السلام خدا کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے معجزے عطا فرمائے تھے۔ اور پہلا معجزہ یہ تھا کہ انھوں نے گہوارے ہی میں بولنا شروع کر دیا تھا۔

بادشاہ قرآن پاک کی آیتوں اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے یہاں تک متاثر ہوا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، پادریوں کو خطاب کر کے کہا کہ میرا یقین ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی حیثیت اس سے ایک تنکے کی برابر بھی زیادہ نہیں ہے جو انھوں نے قرآن شریف کے حوالہ سے بیان کی ہے۔ پھر قریش کے سفیروں سے کہہ دیا کہ یہ لوگ آپ کے غلام نہیں ہیں۔ آپ

کے مقروض نہیں ہیں۔ پھر ان کو آپ کے حوالے کیوں کیا جاتے۔ مسلمانوں سے کہا کہ وہ اس کی مملکت میں اطمینان سے رہیں [1]

مسلمان وہاں پر رہے۔ ایک مرتبہ ایک غنیم کا حملہ ہوا تو مسلمانوں نے شاہی فوج کی مدد بھی کی [2]

قریش کا تاثر قریش کو اس سفارت کی ناکامی کا علم ہوا تو مسلمانوں کے خلاف ان کا غیظ و غضب اور بڑھ گیا اور خواجہ ابوطالب اور آلِ ہاشم پر پورا زور ڈالنا شروع کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری سے دست کش ہو جائیں۔ چنانچہ رؤسائے قریش کا ایک وفد خواجہ ابوطالب کے پاس پہنچا اور بہت زور ڈالا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کر دیں ورنہ اُن کو ہمارے حوالہ کر دیں۔ مجبور ہو کر ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی۔ آپ نے فرمایا۔

چچا جان۔ آپ کی شفقت و محبت کا شکریہ۔ آپ یقیناً معذور ہیں۔ آپ میری امداد سے دست کش ہو جائیے۔ مگر مجھے میرے رب نے جس مقام پر کھڑا کر دیا ہے میں اس سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹ سکتا۔

خواجہ ابوطالب نے یہ پختگی دیکھی تو قریش کو جواب دیدیا کہ وہ محمدؐ کی حمایت نہیں چھوڑ سکتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دی کہ وہ اپنا کام کرتے رہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لئے یہ نئی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ ایک سو کے قریب مسلمان حبشہ چلے گئے تو اب صرف تیس چالیس مسلمان رہ گئے جن کے لئے مکہ کی غضبناک فضا میں زندگی اور بھی دوبھر ہو گئی تھی۔ ان میں کافی تعداد غلاموں کی تھی۔ اگرچہ ان میں سے زیادہ تر کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کر دیا تھا لیکن آزادی کے بعد بھی وہ بے پناہ تھے۔ مسلمان ان کی پناہ

---

[1] یہ بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی روز اس کے انتقال کی خبر دیدی اور غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ [2] المبسوط للسرخسی صفحہ ۹۰ جلد ۱۰ باب نکاح اہل الحرب و دخول التجار الیھم بامان۔

ہو سکتے تھے مگر وہ خود چھپ چھپ کر زندگی گذارنے پر مجبور تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا

مسلمانوں کی تعداد سو سے زیادہ ہو گئی تھی ان میں طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور شیر خدا حضرت علی رضی اللہ عنہم جیسے جنگجو بہادر بھی تھے۔ جنہوں نے مستقبل میں عظیم الشان کارنامے انجام دیئے اور غزوات میں بہادری کے بے نظیر جوہر دکھائے۔ مگر یہ حضرات اس وقت ایسے نہیں تھے جن کی مکہ میں دھاک ہو اور جن سے پورا شہر مرعوب رہتا ہو۔ یہ بات صرف دو[1] کو حاصل تھی۔ عمر بن الخطاب اور ان کے ماموں ابو جہل بن ہشام کو۔ مگر یہ دونوں اسلام کے مقابلہ میں بہت سخت تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے کہ خداوندا ان دونوں میں جو تجھے زیادہ محبوب ہو اس سے اسلام کو تقویت فرما۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ جرأت ہی تھی کہ ایک روز طے کر لیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قصہ تمام کر کے اس خلفشار کا خاتمہ کر دوں۔ جس سے قریش کی زندگی تلخ ہو گئی ہے۔ اور آئے دن ایک ہنگامہ برپا رہتا ہے۔

عمر بن الخطاب نے تلوار ہاتھ میں لی اور محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلاش میں نکلے راستہ میں ایک صاحب نعیم[2] بن عبداللہ (رضی اللہ عنہ) نے آپ کو دیکھا۔ تیور چڑھے ہوئے تھے۔ دریافت کیا۔ ابن الخطاب کیا ارادہ ہے۔

عمر بن الخطاب۔ اس فتنہ کو ختم کرنے جا رہا ہوں جو محمد نے برپا کر دیا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

نعیم بن عبداللہ۔ خاندان ہاشم اور جو ان کے حلیف ہیں ان سے کیسے نمٹو گے؟ اور دیکھو

---

[1] نام دونوں کا عمر ایک عمر بن الخطاب دوسرے عمرو بن ہشام جو ابوالحکم کی کنیت سے مشہور تھا۔ پھر ابو جہل کے نام سے مشہور

[2] نعیم بن عبداللہ النحام مسلمان ہو چکے تھے مگر اپنے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا۔ النحام نحمہ سے ماخوذ ہے۔ نحمہ کے معنی ہیں آہٹ یا کھنکار کی آواز۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا تھا۔ سمعت نحمتہ فی الجنۃ۔ میں نے جنت میں ان کا نحمہ سنا ہے۔ اسی بشارت کی بنا پر ان کا خطاب نحام ہو گیا۔ سیرت حلبیہ صفحہ ۳۴۹ ج ۱

ابن الخطاب۔ محمد کو ختم کرنے سے پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ اور بہنوئی "سعید بن زید" مسلمان ہو چکے ہیں۔

عمر (رضی اللہ عنہ) ان طعن آمیز۔ اشتعال انگیز فقروں کو کب برداشت کر سکتے تھے وہ فوراً چلے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش چھوڑ کر بہن کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ قرآن شریف پڑھا رہے تھے۔ جیسے ہی حضرت عمر نے دروازے پر پہنچ کر آواز دی، ہمشیرہ صاحبہ نے حضرت خباب کو اندر کر دیا۔ مگر تلاوت کی کچھ بھنک عمر کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ عمر جیسے ہی مکان میں داخل ہوئے پوچھا تم کیا پڑھ رہے تھے۔ بہن بہنوئی نے بات کو چھپانا چاہا۔ کچھ خاموش رہے تو عمر نے اسی تیزی میں کہا۔ میں نے سنا ہے۔ تم بے دین ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی پر ہاتھ اٹھایا۔ بہن اپنے شوہر کو بچانے کے لئے آگے بڑھیں تو ان کے سر پر بھی اتنی زور سے مارا کہ خون بہنے لگا۔ اب بہن کو جوش آگیا۔ فرمایا۔ عمر جو چاہو کر لو ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور ہم قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔

بہن کے سر سے خون بہتا ہوا دیکھ کر حضرت عمر کچھ پسیجے۔ غصہ ٹھنڈا ہوا تو فرمایا۔ مجھے دکھاؤ کیا پڑھ رہے تھے۔

بہن نے فرمایا۔ تم دیکھنا چاہتے ہو تو پہلے غسل کرو۔ تم کافر ہو۔ ناپاک ہو۔ قرآن کو نہیں چھو سکتے۔

اب عمر فاروق کا غصہ ختم ہو چکا تھا اور اصل حقیقت معلوم کرنے کا شوق اتنا بڑھ چکا تھا کہ بہن کے توہین آمیز کلام کو برداشت کیا اور غسل کر کے کلام اللہ کے اوراق پڑھنے شروع کئے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ الآیۃ (سورۃ ۵۷ حدید ۱تا۷)

ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے (کہ وہ ہر ایک نقص سے مبرا ہے) وہ زبردست حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے (مستحق بادشاہت وہی ہے) وہی زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے

اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی پہلے ہے۔ وہی پیچھے۔ وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی (باطن) اور وہ ہر چیز کا پورا علم رکھنے والا ہے۔ وہ ایسا ہے کہ اس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ روز (دور) میں۔ پھر وہ عرش پر رونق افروز ہوا (پوری کائنات کو اپنے اقتدار میں لے لیا) ہر چیز کا اس کو علم ہے۔ وہ جانتا ہے ہر اس چیز کو جو زمین کے اندر داخل ہوتی ہے اور جو زمین سے نکلتی ہے۔ جو آسمان سے اترتی ہے جو آسمان پر چڑھتی ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے تمام اعمال دیکھتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے اور تمام باتوں کا مرجع وہی اللہ کی ذات ہے وہ ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں وہ دل کی باتوں کو پوری طرح جانتا ہے۔ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔

(سورہ ۵۷ حدید آیت ۱۔ تا۔ ۷)

اوپر کی آیتوں میں اللہ کی ذات اور صفات کا ذکر ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان فرمایا کرتے تھے، میں یہ آیتیں پڑھ رہا تھا اور جب اللہ کا نام آتا تھا دل کانپ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب ساتویں آیت پر پہنچا "ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر" تو بے اختیار زبان سے نکلا اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً رسول اللہ۔

حضرت خباب رضی اللہ عنہ جن کو اندر چھپا دیا گیا تھا انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے کلمۂ شہادت سنا تو خوش ہوتے ہوئے باہر آئے اور فرمایا۔ عمر بشارت ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ خداوندا ابو جہل اور عمر میں سے جو تجھے زیادہ محبوب ہو اس سے اسلام کی تقویت فرما۔ حضرت عمر یہ بشارت سن کر فوراً ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دار بنی ارقم میں جو کوہ صفا کی تلی میں تھا، پناہ گزیں تھے۔ حضرت حمزہ۔ حضرت طلحہ اور کچھ اور صاحبان حاضر خدمت تھے۔ ان صاحبان نے عمر کو دیکھا۔ تلوار ہاتھ میں لئے آرہے ہیں۔ کچھ

خیال پیدا ہوا۔ مگر یہ بھی سوچ لیا کہ بھرپور جواب دیا جائے گا۔ لیکن عمر پہنچے تو انداز دوسرا تھا۔ آگے بڑھے تو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر استقبال کیا اور چادر یا کرتے کا کنارا پکڑ کر فرمایا۔ عمر کیسے آئے۔ پھر فرمایا۔ عمر! باز نہ آؤ گے۔ کیا خدا کے قہر کا انتظار کر رہے ہو۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔ حضرت! باز آچکا ہوں۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کی اتنی مسرت ہوئی کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زور سے تکبیر کہی اور آپ کے ساتھیوں نے بھی زور سے تکبیر کہی یہاں تک کہ یہ امن کوہ نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھا۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہو جانے سے اسلام کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اب تک یہ موقع نہیں ملتا تھا کہ مسلمان حرم کعبہ میں نماز پڑھ سکیں۔ مگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو پہلے سرداران قریش میں سے ہر ایک کی ڈیوڑھی پر پہنچ کر ہر ایک کو آگاہ کیا کہ عمر مسلمان ہو گیا ہے اس کے بعد تمام مسلمانوں کو ساتھ لے کر حرم شریف میں داخل ہوئے اور کھلے بندوں نماز پڑھی۔ لیکن قریش نے سب کی پوری طرح تواضع کی۔ خصوصاً حضرت فاروق ہر ایک کا نشانہ بنے۔ کافی مار پیٹ کے بعد کسی طرح یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ مگر عمر بن الخطاب کا مسلمان ہو جانا ایسا حادثہ نہیں تھا جس پر قریش آسانی سے صبر کر لیتے۔ انھوں نے حضرت عمر کی زندگی دوبھر کر دی۔ حتیٰ کہ وہ بھی مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ لیکن عرب کے مشہور اور باہیبت قبیلہ بنی سہم سے اُن کا معاہدہ تھا یہ معاہدہ اس وقت کام آیا۔[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ کی روایت ہے۔ "عمر فاروق رضی اللہ

---

[1] البدایہ والنہایہ صفحہ ۸۱ ج ۳ [2] ماخوذ از البدایہ والنہایہ صفحہ ۷۹ تا صفحہ ۸۲ ج ۳۔ السیرۃ الحلبیہ صفحہ ۳۴۹ تا صفحہ ۳۵۴ و تاریخ الخلفاء۔ [3] ماخوذ از تاریخ الخلفاء، جلال الدین السیوطی والبدایہ والنہایہ صفحہ ۸۲ تا صفحہ ۷۹ ج ۳ والسیرۃ الحلبیہ صفحہ ۳۴۹ تا صفحہ ۸۲ ج ۱

عنہ مکان میں چھپے ہوئے تھے۔ باہر میدان میں اتنا ہجوم تھا کہ پوری وادی آدمیوں سے پٹی ہوئی تھی اور یہ شور تھا کہ عمر بے دین ہوگیا ہے۔ میں مکان کی چھت پر کھڑا ہوا یہ ہنگامہ دیکھ رہا تھا۔ میں پریشان تھا کہ کیا ہوگا۔ دفعتہً ایک صاحب نمودار ہوئے۔ ریشمی کفوں دار قمیص پہنے ہوئے اس کے اوپر ریشمی قبا اور شیوخ عرب کے قاعدے کے بموجب ایک بڑھیا چادر اوڑھے ہوئے وہ اندر مکان میں پہنچے۔ والد صاحب سے دریافت کیا۔ کیا واقعہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ جرم یہ ہے کہ مسلمان ہوگیا ہوں۔ اس سردار نے کہا۔ ہرگز نہیں۔ یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو پناہ دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر یہ سردار باہر آیا اور اعلان کر دیا کہ عمر کو میں نے پناہ دے دی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ جیسے ہی اس سردار نے یہ اعلان کیا وہ تمام مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا۔ میں نے کسی سے پوچھا۔ یہ صاحب کون ہیں۔ جواب دیا قبیلہ بنی سہم کا شیخ و رئیس عاص بن وائل سہمی[1]

بایں ہمہ حضرت عمر کے اسلام لانے سے مسلمانوں کی ڈھارس بندھی اور بقول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وہ قوت حاصل ہوئی جو پہلے نہیں تھی[2] ہم کھلے بندوں حرم کعبہ میں پہنچے۔ طواف کیا۔ نماز پڑھی۔ حضرت ابن مسعود فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عمر کا مسلمان ہونا، اسلام کی فتح تھی۔ اُن کی ہجرت نصرت اور اُن کی حکومت رحمت[3]

---

[1] بخاری شریف ص۵۴۵ [2] بخاری شریف ص۵۲۰ [3] البدایہ والنہایہ ص۹۱ ج۳

شعب ابی طالب میں پناہ
قریش کی طرف سے قومی بائیکاٹ

پے در پے ناکامیوں نے قریش کو اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ کھلم کھلا قتل کرنے میں قبائلی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا۔ لیکن خفیہ طور پر قتل کرنے میں پہلے ثبوت کی ضرورت تھی۔ جس کا مہیا کرنا بنو ہاشم کے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ خفیہ طور پر جانِ جہاں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان لینے کی سازش ہونے لگی۔ خواجہ ابو طالب کے چوکنے دماغ نے اس کو بھانپا۔ انہیں صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق ہی نہیں بلکہ خاندانِ ہاشم کے اور لوگوں کے متعلق بھی خطرہ ہوا مثلاً خواجہ ابو طالب کے بڑے صاحبزادے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اگرچہ ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے لیکن چھوٹے صاحبزادے حضرت "علی" یہیں تھے جو ہر دم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ خواجہ ابو طالب نے خاندان کے لوگوں سے مشورہ کیا اور طے یہ کیا کہ شہر کے خطرناک ماحول سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پناہ لی جائے۔

پہاڑیوں کے بیچ میں ایک مقام "خیف بنی کنانہ" تھا۔ یہ بنو ہاشم کا موروثی رقبہ تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہاں جا کر قیام کیا جائے۔ چنانچہ پورا خاندان (جس کے بہت سے افراد ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے) اس مقام پر چلا گیا جس کا دوسرا نام شعب ابی طالب تھا۔ صرف ابولہب اور اس کا گھرانا مکہ میں رہ گیا، جو اپنے خاندان کے خلاف قریش کا سرگرم حامی تھا۔ ابو طالب یہاں پہنچ کر بھی اپنے بھتیجے کی نگرانی راتوں کو کیا کرتے تھے! اُن کے سونے کی جگہ بھی بدلتے رہتے تھے۔

قریش کے سرداروں نے اس کا جواب یہ دیا کہ تمام مخالف گروپوں کو ملا کر اُن سب کا مقاطعہ کر دیا جو خواجہ ابو طالب کے ساتھ اس گھاٹی میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ قریش کے ساتھ قبیلہ

بی کنانہ بھی اس معاہدہ میں شریک ہوا۔ مقاطعہ صرف رشتے ناتے کا نہیں تھا بلکہ کھانے پینے کی چیزیں بھی بند کر دیں۔ ایک عہد نامہ لکھا گیا کہ ان کے ساتھ نہ نکاح بیاہ کیا جائیگا نہ خرید و فروخت اور کوشش کی جائے گی کہ مکہ سے باہر بھی کہیں سے یہ لوگ کچھ نہ خرید سکیں۔ بیوپاریوں کو آمادہ کیا گیا کہ مکہ کے راستوں کی نگرانی رکھیں اور باہر سے آنیوالی جنس کو مکہ میں پہنچنے سے پہلے ہی خرید لیا کریں۔[۱]

سرداران قریش کے اس معاہدہ پر دستخط ہوئے اور یہ عہد نامہ قومی حفاظت خانہ (خانہ کعبہ کے خزانہ) میں محفوظ کر دیا گیا۔[۲]

نبوت کے ساتویں سال محرم کی پہلی تاریخ سے یہ مقاطعہ شروع ہوا تھا[۳] جو تقریباً تین سال تک رہا۔ اس عرصہ میں درختوں کے پتے اور جڑیں کھا کر زندگی گذارنی پڑی۔ بچے بلبلاتے تھے مگر ان کو دودھ میسر نہیں آتا تھا۔ بکریاں ختم ہو گئی تھیں اور پے در پے فاقوں سے ماؤں کے دودھ خشک ہو گئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما جیسے افراد اگرچہ بنو ہاشم نہیں تھے مگر وہ ان کے ساتھ تھے تو مقاطعہ ان سے بھی اتنا ہی سخت تھا۔[۴]

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا چمڑا ہاتھ آ گیا۔ میں نے اس کو پانی سے دھویا۔ پھر آگ پر بھونا اور پانی ملا کر کھایا۔[۵]

مکہ میں جو رشتہ دار تھے ان میں وہ بھی تھے جن کو اس حالت پر ترس آتا تھا۔ مگر پابندیاں ایسی سخت تھیں کہ کوئی کچھ امداد نہیں کر سکتا تھا۔

اس معاہدہ کی کوئی مدت نہیں تھی۔ اس کی انتہا یہ تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کے لئے حوالہ کر دیں۔[۶]

تین سال پورے ہونے لگے تو یک طرفہ متواتر ظلم و ستم نے کچھ اہل قرابت کے دلوں میں نرمی پیدا کی اور یہ بحث شروع ہوئی کہ معاہدہ کی پابندی کب تک کی جائے۔ لیکن پلہ ان کا بھاری تھا

---

۱ بخاری شریف صفحہ ۵۴۲ ۲ البدایہ والنہایہ بحوالہ موسیٰ بن عقبہ عن الزہری ج۳ ص۸۴ ۳ ابن سعد ج۱ ص۱۴۱ ۴ سیرۃ ابن اسحاق بحوالہ ازالۃ الخفاء ج۱ ص۴ ۵ روض الانف۔ بحوالہ سیرۃ النبی ج۱ ص۱۴۰ ۔ ۶ موسیٰ بن عقبہ بحوالہ زہری۔ البدایہ والنہایہ ج۳ ص۸۴

جن کے سینوں میں دلوں کی جگہ پتھر بھرے ہوئے تھے۔ دفعتہً ایک قدرتی حل سامنے آگیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چچا ابوطالب کو خبر دی کہ کیڑوں نے معاہدہ کے تمام حرف چاٹ لئے ہیں۔ صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے۔ خواجہ ابوطالب نے یہ الہامی خبر سنی تو قریش کے سرداروں کے پاس پہنچے کہ آج ہمارا تمہارا معاملہ طے ہے۔ محمد نے یہ خبر دی ہے اگر یہ خبر جھوٹی ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں اور اگر سچی ہے تو جب معاہدہ ہی نہیں رہا تو اسکی پابندی کیسی۔

سرداران قریش نے یہ فیصلہ منظور کیا۔ ان کو یقین تھا کہ جیت ہماری ہوگی۔ مگر جب خزانہ کھول کر دستاویز نکالی گئی تو دیکھا "الصادق الامین" کی خبر حرف بحرف صحیح ہے سنگدلوں کے پیشواؤں نے پھر بھی یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ یہ محمد کا جادو ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) مگر اب وہ اپنے اصرار میں کامیاب نہ ہو سکے اور مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ اس قدرتی کرشمہ کے بعد ایسی فضا ہو گئی کہ بنو ہاشم شعب سے نکل کر مکہ میں آ گئے[1]

ایسے سخت امتحان میں روحانی ترقی کہاں تک ہو سکتی ہے وہ محتاج بیان نہیں چنانچہ اسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کا شرف عظیم حاصل ہوا۔ معراج میں پنج وقتہ نمازیں فرض ہوئیں۔ نماز کے آخر میں التحیات پڑھی جاتی ہے جس میں نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان بزرگوں پر جو اس امتحان میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ اُن کے طفیل میں تمام عباد صالحین پر سلام بھیجا جاتا ہے۔ السّلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصّالحین۔

پناہ کی دیواریں منہدم

قریش کا مقاطعہ جو بعثت مبارکہ کے ساتویں سال شروع ہوا تھا تین سال بعد (سنہ ۱۰ بعثت مبارکہ میں) ختم ہوا۔ چند ماہ بعد رمضان کا مہینہ آیا۔ اس مہینہ میں چند روز کے فرق سے خواجہ ابوطالب اور سیدہ خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کی وفات ہو گئی۔ سیدہ خدیجہ وہ خاتون تھیں جو

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۹۶ ج ۳۔

سب سے پہلے ایمان لائیں اور ابوطالب وہ شیخ قبیلہ تھے جو آخر تک ایمان نہیں لائے اور یہ اعلان کرتے ہوئے مرے کہ میں نے اپنے باپ دادا کا مذہب نہیں چھوڑا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں جاں نثار تھے۔

پناہ کی یہ دونوں دیواریں منہدم ہو گئیں، تو اب دشمنوں کا راستہ صاف تھا۔ عقبہ بن ابی معیط اور ابولہب جو بدترین موذی دشمن تھے اور دونوں پڑوسی تھے[1] ان کا طریقہ یہ تھا کہ راستہ میں کانٹے بچھوا دیتے۔ دروازہ میں غلاظت کا بھرا ہوا ٹوکرا ڈلوا دیتے تھے۔ ان کے چھوٹے ان سے بھی آگے تھے۔ وہ کاشانۂ نبوی میں گھس کر برتنوں کو خراب کرتے۔ پکتی ہوئی ہنڈیا کو اوندھی کر دیتے یا اس میں پلیدی ڈال دیتے تھے۔[2]

خدا جانے کتنی مرتبہ ایسا ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے تشریف لاتے۔ سر مبارک اور کپڑے گرد و غبار اور پلیدی سے آلودہ۔ صاحبزادیاں یہ حالت دیکھ کر دلگیر ہو رہی ہیں، کپڑے دھو رہی ہیں، سر مبارک صاف کر رہی ہیں۔ زبان سے بد دعا دیتی ہیں تو ارشاد ہوتا ہے۔ لاتبکی یا بُنَیّۃ فانّ اللّٰہ مانع اباک[3] (بیٹی دلگیر نہ ہو اللہ تمہارے باپ کا محافظ ہے)

پناہ کی تلاش

نبی کا بھروسہ خدا پر ہوتا ہے۔ اور شروع میں جب یہ حکم نازل ہوا تھا کہ "اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوتِ اسلام دو"[4] تو ساتھ ہی حضرت حق جل مجدہٗ نے یہ ہدایت بھی فرمائی تھی۔

> بھروسہ کر خدا، قادر و رحیم پر جو تم کو دیکھتا رہتا ہے جب تم کھڑے ہوتے ہو اور نمازیوں کے ساتھ تمہاری نشست و برخاست کو وہ دیکھتا رہتا ہے۔[5]

مگر چونکہ نبی کی زندگی کا ہر ورق امت کے لئے سبق ہوتا ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ پر مکمل اور کامل بھروسہ کے باوجود ظاہری ذرائع اور اسباب سے دامن نہیں جھٹکتا۔ کیونکہ اگر

---

[1] ابن سعد صفحہ ۱۲۴ ج ۱ [2] البدایۃ النہایہ صفحہ ۱۲۲ ج ۳ [3] ایضاً [4] سورۂ شعراء آیت ۲۱۴ (۲۶) [5] سورۂ شعراء آیت ۲۱۷ و ۲۱۸ (۲۶)

سلسلہ اسباب کو چھوڑ دیا جاتا تو اس عالم اسباب کا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا، بہر حال جب خواجہ ابو طالب کی وفات کے بعد قریش کو موقع مل گیا کہ جو کچھ وہ اب تک نہیں کر سکتے تھے اس کو کر گذریں تو آپ کو بھی ایسے ذریعہ کی تلاش ہوئی جو قانونِ عرب کے بموجب آپ کے لئے پناہ بن سکے۔

مگر مٹھی بھر مسلمانوں یا آلِ ہاشم کے علاوہ مکہ کا بچہ بچہ دشمن تھا اور کوئی ہمدرد بھی تھا تو کس کی ہمت تھی کہ قریش کے مقابلہ میں آپ کی ڈھال بن سکے۔ لہٰذا آپ نے مکہ سے باہر نظر دوڑائی۔

طائف کا سفر

طائف مکہ سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر ایک سرسبز پہاڑ ہے۔ نہایت زرخیز وہاں بڑے بڑے باغات اب بھی ہیں اور اس وقت بھی تھے۔ مکہ کے رئیسوں کی وہاں کوٹھیاں تھیں۔ قبیلہ ثقیف کا وہاں تسلط تھا۔ وہ عرب کا طاقتور قبیلہ مانا جاتا تھا۔ قریش بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔ اس قبیلہ سے اُن کی رشتہ داریاں بھی تھیں۔

رؤسا طائف اور ان کے جواب تین بھائی عبد یا لیل، مسعود اور حبیب یہاں کے رئیس اعظم اور قبیلہ ثقیف کے سردار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اُن پر پڑی کہ اگر وہ پناہ میں لے لیں تو آپ کو فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی میں آسانی ہو۔ چنانچہ آپ رمضان گذرنے کے بعد ماہ شوال میں طائف تشریف لے گئے[1]۔ دس روز وہاں قیام فرمایا[2]۔ عوام و خواص اور ہر ایک کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کی۔ رؤسا اور معززین کے مکانوں پر پہنچ کر گفتگو کی[3]۔ ان تینوں بھائیوں سے بھی ملاقات کی۔ اپنا مقصد واضح کیا۔ مگر کسی ایک نے

---

[1] یہ سفر بظاہر پیادہ ہوا۔ کسی سواری کا کوئی تذکرہ روایتوں میں نہیں ملتا۔ محمد میاں

[2] ابن سعد ص ۱۴۲ ج ۱ [3] ایضاً [4] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۵ ج ۳۔

بھی انسانیت سے جواب نہیں دیا۔

ایک نے کہا اگر خدا نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ خانہ کعبہ کے کپڑے کھسوٹ رہا ہے (اس کی عزت پامال کر رہا ہے۔)

دوسرے نے کہا۔ اللہ کو آپ کے سوا کوئی اور نہیں ملا تھا جس کو رسُول بنا کر بھیجتا۔

تیسرے نے کہا:۔ اللہ میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ کیونکہ جیسا تمہارا دعویٰ ہے اگر واقعی تم خدا کے رسُول ہو تو رسُول کی شان یہ نہیں ہے کہ اس سے بحث کی جائے اور اگر تم خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہو تو میری شان یہ نہیں ہے کہ میں جھوٹے سے بات کروں[1]

ان لوگوں کے بھونڈے جواب سُن کر آپ نے فرمایا کہ اتنی مہربانی کرو کہ میرے آنے کی خبر کسی کو نہ دو۔ آپ کو خیال ہوا کہ مکہ والوں کو میرے آنے اور اُن کے جوابوں کی خبر ہو گی تو وہ اپنی حرکتوں میں اور دلیر ہو جائیں گے۔ مگر ان بدنصیبوں نے اس فرمائش کی تعمیل اس طرح کی کہ طائف کے آوارہ گردوں کو اشارہ کر دیا۔ وہ آپ کے پیچھے پڑ گئے اور گستاخیاں کرنے لگے اور جب کسی طرح اُن سے جان چھڑا کر آگے بڑھے تو طائف کے لوگوں نے جو دونوں طرف صف بنائے کھڑے تھے ذاتِ اقدس پر دونوں طرف سے پتھر برسانے شروع کر دیئے سنگباری سے پنڈلیاں مجروح ہو گئیں۔ گھٹنے چور ہو گئے۔ بدن مبارک لہو لہان ہو گیا۔ ایک جاں نثار حضرت زید بن حارثہ ساتھ تھے۔ وہ کبھی آگے کبھی پیچھے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر تنہا کیا کر سکتے تھے۔ پتھروں سے ان کا سر بھی پھٹ گیا[2]۔ بالآخر کسی طرح آبادی سے باہر نکلے تو بیہوش ہو کر گر پڑے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اُٹھایا۔ قریب ہی کچھ پانی تھا۔ وہاں لے گئے تاکہ خون کے دھبے دھوویں۔ نعلِ مُبارک اتارنے چاہے تو خون سے اس طرح جم گئے تھے کہ اتارنا مشکل پڑا۔ طبیعت سنبھلی تو قریب کے ایک باغ میں تشریف لے گئے۔ ایک درخت کے سایہ میں تشریف فرما ہوئے اور اپنے معبُود کی بارگاہ میں مشغولِ دُعا ہو گئے[3]

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۱۳۵ ج۳ [2] طبقات ابن سعد ص۱۴۲ ج۱ [3] البدایہ والنہایہ ص۱۳۶ ج۳ ۔

بارگاہِ ربّ العزّت میں عجز و انکسار

پتھر برسانے والوں کے حق میں خیر اندیشی اور ہمدردی

اہلِ طائف کی وحشیانہ حرکتوں سے مجروح و مضروب" محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" انگور کی ٹٹی کے سایہ میں نڈھال بیٹھے ہیں۔ دل میں درد ہے۔ زخموں میں ٹیس۔ مگر پیشانی بارگاہِ ربّ العزت میں جھکی ہوئی ہے اور زبانِ مبارک[1] مصروفِ دعا ہے۔ (ترجمہ یہ ہے

میرے اللہ میں تجھ سے اپنی بے بسی کا شکوہ کرتا ہوں۔ میں لوگوں میں ذلیل ہو رہا ہوں۔ اس کا شکوہ تجھ ہی سے کرتا ہوں۔ اے سارے مہربانوں میں سب سے زیادہ مہربان۔

اُن کا رب نگران و مددگار تو ہی ہے جو دنیا میں کمزور سمجھے جاتے ہیں، جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، جن کے پاس وسیلے اور ذریعے نہیں ہوتے اور ہاں میرا رب تو ہی ہے، اے میرے پروردگار تو مجھے کن کے حوالے کر رہا ہے ان کے جو مجھ سے دُور ہیں! جو مجھ سے بات بھی کرتے ہیں تو منہ بگاڑ کر۔ یا اُن کو جو میرے دشمن ہیں۔ کیا تو نے میرے معاملہ کا مالک ان کو بنا دیا ہے۔

اے اللہ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے۔ خداوندا اگر مجھ پر تیرا عتاب نہیں ہے تو مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں ہے۔ خداوندا تیری عافیت کا دامن بہت وسیع ہے، میری سمائی تیری عافیت کی گود ہی میں ہے۔

تیرے چہرے کا وہ نور جس سے اندھیریاں روشنی بن جاتی ہیں جس کے ادنیٰ جلوے سے دنیا اور آخرت کے بگڑے ہوئے کام سنور جاتے ہیں میں اسی نور کی پناہ لیتا ہوں۔

---

[1] غور کیجئے کیا ایسا شخص (معاذ اللہ) کاذب یا ساحر یا شاعر ہو سکتا ہے؟

میں پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ مجھ پر تیرا غضب پڑے یا عتاب نازل ہو۔
تجھ ہی کو منانا ہے اور اس وقت تک منانا ہے جب تک تو راضی نہ ہو۔ اے اللہ
مجھ میں نہ طاقت ہے نہ زور ہے۔ جو کچھ طاقت ہے تیرا ہی صدقہ ہے۔ جو کچھ
قوت ہے وہ تیری ہی عطا ہے۔ میری کوئی تدبیر کارگر نہیں، کارساز تو ہی ہے۔
بگڑی کو بنانے والا تو ہی ہے۔

یہاں سے اٹھے۔ دل غمگین تھا۔ حسرت و افسوس کے دھوئیں سے دم گھٹ رہا تھا۔ سر جھکائے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے۔ کچھ دھیان پلٹا تو دیکھا پہاڑی سامنے ہے جس کو قرن الثعالب یا قرن المنازل کہتے ہیں۔ آپ یہاں ٹھٹکے۔ اوپر نظر اٹھی تو دیکھا۔ ایک بادل آپ پر چھایا ہوا ہے۔ بادل پر نظر ڈالی تو دیکھا حضرت جبرئیل امین جلوہ افروز ہیں اور فرما رہے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے سن لیا۔ دیکھ لیا، تم نے جو کچھ کہا۔ جو لوگوں نے جواب دیا جس طرح تم کو واپس کیا اور جو سلوک تمہارے ساتھ کیا وہ بھی دیکھ لیا۔ اب یہ پہاڑوں کے فرشتے (ملک الجبال) موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھیجا ہے۔ آپ حکم کیجئے۔ یہ تعمیل کریں گے۔

پھر ملک الجبال سامنے آیا۔ سلام عرض کیا۔ پھر کہا۔

یا محمد! تمہاری قوم کی تمام باتیں خدا نے سنیں۔ دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے۔ آپ جو چاہیں حکم کریں۔ میں تعمیل کروں گا۔ آپ حکم دیں مکہ کے دونوں طرف جو پہاڑ ہیں ان کو ملا کر ان تمام گستاخ، بے ادب لوگوں کو پیس ڈالوں[1]

ایک آزمائش وہ تھی کہ اہل طائف ہر طرف سے پتھر برسا رہے تھے۔ دوسری آزمائش یہ ہے کہ جبرئیل امین اور ملک الجبال ان سب کو پیس ڈالنے کی فرمائش کے منتظر ہیں۔ وہ امتحان تھا صبر و ضبط، تحمل اور استقلال کا۔ یہ امتحان ہے وسعت ظرف۔ فراخی حوصلہ اور دعوئ رحم و کرم کا۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۶ ج ۳

جس خدا نے آپ کو اس امتحان میں ثابت قدم رکھا۔ اس نے آپ کو اس امتحان میں بھی کامیاب فرمایا۔

فرشتے کی درخواست سن کر دل مبارک بیتاب ہو گیا۔ یہ خدا کی مخلوق جو نبی کی کھیتی ہے برباد کر دی جائے؟

آپ نے فرشتوں کو جواب دیا۔

ارجوان يُخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ اَصلابهم مَنْ يعبدُ اللّٰهَ ولا يشركُ به شيئًا۔[1]

اگر یہ بدنصیب راہِ راست پر نہ آئیں تو اُن کی نسل سے میں ناامید نہیں ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ ان کی نسل میں وہ ہوں گے جو خدا۔ واحد کی عبادت کریں گے اور شرک سے باز رہیں گے۔[2]

باغ کے مالک اور انکا غلام

یہ باغ عتبہ[3] اور شیبہ بن ربیعہ کا تھا جو مکہ کے مشہور رئیس تھے۔ یہ دونوں بھائی باغ میں موجود تھے۔ انھیں غیرت آئی کہ ان کے شہر کے ایک شخص کے ساتھ طائف والوں نے یہ سلوک کیا۔ مگر یہ ہمت پھر بھی نہیں ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر بات کرتے۔ انگوروں کے خوشے تھالی میں رکھ کر غلام کو دیئے کہ وہ ان مظلوم مہمانوں کے پاس لیجائے۔ جو سایہ میں بیٹھے ہوتے ہیں۔

---

[1] بخاری شریف ص۴۵۸ مسلم شریف ص۱۰۹ ج۲ [2] حضرت نوح علیہ السلام کو اس کی توقع نہیں تھی آپنے بارگاہ رب العزت میں یہ عرض کیا تھا انک ان تذرھم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرا کفارا (سورۂ نوح) اگر ان کو مہلت رہی تو یہ بندگان خدا کو گمراہ ہی کریں گے۔ اور صرف انہیں کو جنم دیں گے جو بدکار اور بدترین کافر ہوں گے۔ [3] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نانا۔ حضرت ابوسفیان کے خسر۔ غزوۂ بدر میں سب سے پہلے یہ دونوں بھائی اور عتبہ کا لڑکا ولید بن عتبہ ہی حضرت حمزہ حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ تفصیل سلسلہ غزوات میں ملاحظہ فرمایئے۔

غلام کا نام عداس تھا۔ مذہباً عیسائی تھا۔ وہ آپ کے پاس انگور لے کر آیا۔ آپ نے انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو زبان مبارک پر آیا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عداس۔ الرحمٰن الرحیم سُن کر چونکا۔ کہنے لگا۔ یہاں کے آدمی تو الرحمٰن الرحیم نہیں کہتے[1]۔

آپ نے فرمایا۔ تم کہاں کے ہو۔ عداس نے جواب دیا۔ میرا آبائی وطن "نینویٰ" تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ وہی نینوی جو میرے بھائی یونس (علیہ السّلام) کا وطن تھا۔

عداس۔ آپ حضرت یونس کو کیسے جانتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔ میرے اور ان کے درمیان "نبوت" کا رشتہ ہے وہ بھی اللہ کے نبی تھے۔ میں بھی اُسی خدا کا بھیجا ہوا نبی ہوں۔

عداس یہ سن کر تڑپ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پیر چومنے لگا۔ عتبہ اور شیبہ نے دور سے دیکھا تو کہنے لگے اس کو تو محمدؐ نے بگاڑ دیا۔

جب عداس واپس پہنچا۔ تو دونوں بھائیوں نے غلام سے پوچھا۔ تم یہ کیا حرکت کر رہے تھے۔

عداس۔ یہ نبی ہیں۔ ان سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ انہوں نے مجھے وہ باتیں بتائیں جو نبی ہی بتا سکتا ہے۔

دونوں رئیس۔ اس کی باتوں میں نہ آؤ۔ اپنے مذہب پر رہو۔ تمہارا مذہب اس کے دین سے بہت اچھا ہے[2]۔

مطعم بن عدی کی قدر دانی

طائف میں یہ سب کچھ ہوا۔ مگر وہ سوال پھر بھی رہ گیا جس کیلئے آپ نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ آپ نے مکہ پہنچنے سے پہلے یکے بعد دیگرے رؤسا مکہ اخنس بن شریق اور سہیل بن عمرو کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ حمایت

---

[1] ملاحظہ فرمائیے سورہ ۲۵ الفرقان کی آیت ۶۰ جب ان مشرکین مکہ سے کہا جاتا ہے کہ سجدہ کرو رحمٰن کو تو وہ (انجان بن کر کہتے ہیں) رحمٰن کون؟ [2] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۶ ج ۳۔

کا وعدہ کرلیں۔ مگر دونوں نے انکار کردیا کہ وہ قریش کے حلیف ہیں، وہ قریش کے خلاف کسی کو پناہ نہیں دے سکتے۔ پھر آپ نے اُس کے پاس پیغام بھیجا جس کے لئے یہ شرف مقدر تھا۔ یہ رئیس مکہ "مطعم بن عدی" تھا۔ اُس نے حمایت کا وعدہ بھی کیا اور یہ فرمائش بھی کی کہ آپ اس کے یہاں تشریف لائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مطعم کے یہاں تشریف لے گئے۔ رات اُن کے یہاں گذاری صبح ہوئی تو مطعم نے خود ہتھیار سجائے۔ اس کے چھ سات لڑکے تھے سب کو مسلح کیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر چلا۔ حرم کعبہ میں پہنچا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آپ طواف کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کیا۔ مطعم اور بیٹے حفاظت کرتے رہے۔ جب طواف سے فارغ ہوئے تو "مطعم" نے اعلان کر دیا کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم میری پناہ میں ہیں"۔

ابو سفیان مطعم بن عدی کے پاس آیا دریافت کیا۔ تم نے محمد کو اپنی پناہ میں لیا ہے یا اُن کا مذہب قبول کر لیا ہے۔ مطعم نے جواب دیا۔ میں نے مذہب نہیں بدلا صرف "محمد" کو پناہ دی ہے۔ ابو سفیان نے کہا۔ تب آپ کے اعلان کا احترام کیا جائے گا۔ [1]

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۱۳۷ ج ۳۔

یثرب - مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۱)

مکہ معظمہ سے شمال کی جانب تقریباً دو سو میل (سوا تین سو کیلومیٹر) کے فاصلہ پہ ایک زرخیز علاقہ میں آبادیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ان میں سب سے بڑی آبادی کا نام یثرب[1] ہے۔
اس کے دو طرف دو سنگلاخ ہیں ان کو لابتین[3] کہا جاتا ہے اور حرتین بھی کہلاتے ہیں۔
جانب مشرق میں تقریباً آٹھ میل تک چھوٹی چھوٹی آبادیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے ان کو عوالی کہا جاتا ہے۔ موضع قبا اسی طرف ہے[4]۔ دوسری جانب بھی اسی طرح کی آبادیاں ہیں ان کو اسافل کہا جاتا ہے[5]۔
یثرب کے نشیبی حصہ میں برسات میں پانی بھر جاتا ہے جس کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا

---

[1] وکانت یثرب ام قری المدینة وهی ما بین طرف قناة الی طرف الجرف وما بین المال الذی یقال له البرنی الی زبالة (وفاء الوفاء ص ج ۱)۔

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں قیام فرمایا تو اس کا نام مدینۃ النبی ہو گیا (صلی اللہ علیہ وسلم) کثرتِ استعمال نے مدینۃ النبی کو تو مختصر کر کے صرف مدینہ کر دیا مگر عاشقانِ رسول نے محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر کے بہت سے نام رکھ ڈالے۔ طابہ۔ طیبہ۔ محبوبہ۔ مبارکہ۔ عاصمہ۔ مرزوقہ۔ قاصمہ اکالۃ البلدان۔ غرض اس طرح نوّے سے زیادہ نام ہو گئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ وفاء الوفا ج ۱

[3] لابہ اور حرہ کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں۔ یعنی ایسا سنگلاخ جس کے پتھر اس طرح کے کالے ہوں جیسے کوئی پرانا پتھر مسلسل کائی چڑھنے سے کالا ہو جاتا ہے (مجمع البحار و قاموس) یہ کئی میل تک چلے گئے ہیں۔ ان پر نہ کاشت ہو سکتی ہے۔ نہ ان پر آبادی ہے۔ فوج بھی ان پر نہیں گذر سکتی۔ یہ دو طرف حفاظت کی قدرتی دیواریں ہیں۔ [4] مجمع البحار و معجم البلدان [5] معجم البلدان۔

مرطوب رہتی ہے۔ یہاں کا بخار "حمی یثرب" پورے عرب میں مشہور ہے۔ یثرب نام میں آب و ہوا کی خرابی کو بھی دخل ہے (کیونکہ ثرب جو یثرب کا ماخذ ہے۔ ملامت کرنے کے معنی میں آتا ہے) اس پورے علاقے میں کاشت ہوتی ہے۔ مگر خاص پیداوار کھجور ہے۔ کھجوروں کے بڑے بڑے باغات ہیں۔ یہاں کے کھجور دور دور جاتے ہیں۔

(۲)

کم و بیش ایک ہزار[1] سال پہلے۔ یمن سے اجڑ کر دو بھائی سرزمین حجاز میں داخل ہوئے اور یہاں آکر آباد ہو گئے۔ ان میں سے ایک کا نام "اوس" تھا دوسرے کا نام "خزرج" باپ کا نام حارثہ ماں کا نام قَیلہ۔ اس لئے اوس اور خزرج کی اولاد کو بنو قیلہ بھی کہتے ہیں[2]۔

اب (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مسعود میں) اوس اور خزرج دو قبیلے ہیں جن کی بہت سی شاخیں (بطن) الگ الگ نام سے مشہور ہیں۔ بنو نجار۔ بنو ساعدہ۔ بنو عمرو بن عوف وغیرہ) اس طرح یہ دو قبیلے بہت سے بطنوں میں بٹ گئے ہیں۔

یثرب کی آبادی تقریباً چھ ہزار[3] ہے۔ اور اتنی ہی آبادی عوالی اور اسافل کی ہے۔

ان سب کا ایک "دیوتا" ہے۔ "المناۃ الطاغیہ"

مشلّل مکہ اور یثرب کے بیچ میں ایک[4] مقام ہے۔ وہاں اس کا مندر ہے۔ یہ سب "المناۃ الطاغیہ" کے بھگت[5] ہیں۔ مگر اصل تیرتھ کعبہ ہے۔ وہاں ہر سال "حج" کو جاتے ہیں اور ان بتوں کی بھی پوجا کرتے ہیں۔ جو "قریش" نے کعبہ میں رکھ رکھے ہیں۔ قریش ان کے

---

[1] سیل عرم سے تباہ ہو کر یا بقول ابن ہشام (سیلِ عرم سے کچھ پہلے اس سیل کے متعلق پیشن گوئی سن کر سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۱۲) [2] معجم البلدان و فتح الباری وغیرہ۔ [3] ہجرت کے چوتھے سال غزوۂ احزاب میں تین ہزار مسلمانوں نے شرکت کی جب کہ ان میں کئی سو مہاجرین بھی شامل تھے اس سے یہاں کی آبادی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ [4] قدید کے قریب' دالفت یدا اسم موضع قریب بمکۃ معجم البلدان [5] بخاری شریف صفحہ ۲۲۲ و صفحہ ۲۴۱ وغیرہ۔

جہنت ہیں اور یہ سب اُن کے ہم مذہب اور اُن کے تابع ہیں۔ ان سب کی نسل بھی ایک ہی ہے کیونکہ یہ بھی حضرت اسمٰعیل اور حضرت ابراہیم علیہما السّلام کو اپنا مورثِ اعلیٰ[1] مانتے ہیں اور اس بنا پر رشتہ داریاں بھی ہیں۔ یہ سب کاشتکار اور زمیندار ہیں۔ عموماً ناخواندہ۔ جاہل۔ کسی وقت یہ اس پورے علاقہ کے فرماں روا تھے۔ اس زمانہ کے قلعوں کے اونچے اونچے آثار (کھنڈر) اس وقت بھی موجود ہیں۔ ان کو "اُطام یثرب[2]" کہا جاتا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اس کا نام "مدینۃ النبی" رکھ دیا گیا پھر کثرتِ استعمال کے باعث صرف "مدینہ" (دادام اللہ شرفہا) کہا جانے لگا۔

(۳)

اس علاقہ میں دوسری[3] نسل بنو اسرائیل[4] کی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو مانتے ہیں

[1] احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بخاری شریف ص۴۹۹ باب نسبۃ الیمن الی اسمٰعیل علیہ السّلام اور قریش سے ان کی رشتہ داری تھی اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اگرچہ ماہرین انساب کا خیال یہ بھی ہے کہ قحطان جو اہل یمن کا مورثِ اعلیٰ ہے وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی اولاد میں سے نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اوس اور خزرج۔ بنو اسمٰعیل یعنی عرب مستعربہ نہیں تھے بلکہ عرب عاربہ تھے۔

[2] مورخین نے بیان کیا ہے کہ یہ قلعے زیادہ تر یہود نے بنائے تھے۔ جب وہ تنہا اس علاقہ میں صاحب اقتدار تھے۔ اوس اور خزرج۔ یہودیوں کے دورِ اقتدار میں یہاں آئے۔ پہلے یہ صرف دو بھائی تھے پھر ان کی اولاد نے ترقی کی۔ یہود کو حسد ہوا۔ انہوں نے ان کو ختم کرنا چاہا۔ مگر نتیجہ الٹا نکلا۔ مقابلہ ہوا تو یہود کا اقتدار ختم ہو گیا اور اوس و خزرج کے قبائل اس علاقہ کے حکمران بن گئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو وفاء الوفاء ص۱۲۵ تا ص۱۳۴ ج ۱ اور معجم البلدان دیکھیے تفصیل بعد کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیے)

[3] یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے بھائی حضرت اسحاق علیہ السّلام کی اولاد ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السّلام کے فرزند رشید حضرت یعقوب علیہ السّلام تھے ان کو اسرائیل بھی کہا جاتا تھا (باقی بر صفحہ آئندہ)

اور یہودی کہلاتے ہیں۔ یثرب (مدینہ) کے اطراف میں تین تین چار چار میل کے فاصلہ پر اُن کے قبیلے آباد ہیں اُن میں سے مشہور یہ تین ہیں۔ بنو قینقاع۔ بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ یہ سب خوش حال ہیں۔ اُن کی آبادیاں قلعہ نما ہیں۔ شاداب باغات میں گھری ہوئیں ہر طرح سے محفوظ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان کی اولاد کو بنو اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام شام میں رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر میں اقتدار حاصل ہوا تھا تو حضرت یعقوب اور اُن کے لڑکے مصر چلے گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک ان کی تعداد کئی لاکھ ہو گئی تھی۔ لیکن اب اقتدار کے بجائے طوق غلامی ان کی گردن میں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر مصر سے نکلے۔ اول یہ پوری قوم تیہ میں رہی۔ پھر ان کا مرکز شام ہو گیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں اور مقدمہ سیرۃ مبارکہ۔

[۲] مدینہ میں بنو اسرائیل کی آمد اور اُن کا اقتدار: ایک روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کے مقابلہ میں کامیابی بخشی اور وہ تیہ میں جاکر مقیم ہوئے تو انہوں نے دوسرے علاقوں میں مجاہدین بھیجنے شروع کئے جو بزور شمشیر اپنے دین کی اشاعت کرتے تھے اور جو ان کے مذہب میں داخل نہ ہوتا۔ اس کو قتل کر دیتے تھے۔ ان مجاہدین کی ایک فوج یثرب بھیجی۔ اس نے یہی کیا کہ جو اُن کے مذہب میں داخل نہ ہوا اس کو قتل کر دیا۔ لیکن ایک شاہزادہ نہایت حسین تھا اس پر ان کو رحم آگیا۔ اس کو قتل نہیں کیا اور ساتھ لے کر حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی وفات ہو گئی۔ ان کے جانشین کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا کہ اس فوج نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت پر عمل نہیں کیا کہ واجب القتل نوجوان کو پناہ دے کر ساتھ لے آئے۔ جانشین نے ان کے بارہ میں مشورہ کیا۔ طے یہ کیا گیا کہ اس پوری فوج کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا جائے۔ یہ لوگ وہاں سے جلا وطن ہوئے تو انہوں نے یثرب کو اپنے قیام کے لئے منتخب کیا۔ جہاں وہ فتح حاصل کر چکے تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اہل روم کے حملہ کے وقت کچھ لوگ شام سے یہاں چلے آئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ بخت نصر نے جب یروشلم کو تباہ کیا تب یہ لوگ یثرب آئے۔

بہر حال روایتیں اگرچہ متعدد ہیں مگر علماء تاریخ نے ان کو متضاد قرار نہیں دیا کیونکہ (دیکھئے آئندہ صفحہ)

باغات کے علاوہ ان کے تجارتی سلسلے بھی ہیں اور ان کا سودی کاروبار بھی بہت پھیلا ہوا ہے۔ اپنی اپنی حیثیت میں یہ سب قبیلے آزاد ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی بھی یثرب کی آبادی کے لگ بھگ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان سب روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے جانشین کے زمانہ سے ان کی آمد شروع ہوئی اس کے بعد مختلف اوقات میں آمد ہوتی رہی۔ ان سیاسی محرکات اور اسباب کے علاوہ ایک مذہبی محرک بھی بیان کیا گیا ہے کہ کچھ بلخدا علماء یہود کو جب توریت کے اشارات سے معلوم ہوا کہ نبی آخرالزماں کا ظہور مدینہ میں ہوگا تو وہ یثرب منتقل ہو گئے کہ اگر ان کو نبی آخرالزماں کی زیارت نہ ہو سکے تو کم از کم ان کی اولاد اس سعادت وشرف سے مشرف ہو سکے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے بنو قریظہ یہی کہا کرتے تھے کہ اُن کے بزرگ انہیں پیشین گوئیوں کی بنا پر یہاں آ کر قیام پذیر ہوئے تھے۔

عروج: بنو اسرائیل (یہود) نے یہاں کافی ترقی کی۔ اس پورے علاقہ پر وہ چھا گئے۔ حکومت بھی تھی اور دولت بھی اُور نسلیں بڑھیں تو بیس اکیس قبیلے ان کے ہو گئے اور شام تک انہیں کی بستیوں کی کثرت ہو گئی۔ وادی قریٰ تیما خیبر اُن کے اہم اور خاص مرکز تھے اوس اور خزرج یہاں آباد ہوئے تو ان سے معاہدہ کر کے اور ان کے حلیف بن کر آباد ہوئے۔

زوال: یہودیوں میں ایک راجہ (ملک) ہوا جس کا نام "فطیون" تھا۔ یہ نہایت عیاش اور بدکار تھا۔ اس نے یہ حکم دیا کہ ہر ایک دلہن اس کے عشرت کدہ میں خراج عیش دے۔ یہود نے اس کو گوارہ کر لیا مگر جب اوس اور خزرج کی نوبت آئی تو انہوں نے سرتابی کی اس زمانہ میں قبیلہ خزرج کا ایک سردار مالک بن عجلان تھا۔ اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے نکلی اور اپنے بھائی مالک بن عجلان کے سامنے سے بے پردہ گذری۔ مالک کو غیرت آئی وہ اٹھ کر گھر میں آیا اور بہن کو سخت ملامت کی۔ بہن نے کہا ہاں۔ لیکن کل جو کچھ ہوگا وہ اس سے بھی سخت ہوگا دوسرے دن جب حسب دستور مالک کی بہن دلہن بن کر فطیون کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانہ کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ اندر چلا گیا اور فطیون کو قتل کر کے شام بھاگ گیا یہاں غسانیوں کی حکومت تھی اور ابوجبلہ حکمران تھا اسکو یہ تکلیف دہ حالات معلوم ہوئے تو وہ لشکر لیکر آیا اور اوس اور خزرج کو انعامات دیئے اور ایک عام دعوت کر کے روساء یہود کو مدعو کیا اور ان کو قتل کرا دیا اب یہود کا زور ٹوٹ گیا اوس و خزرج نے قوت حاصل کر لی مگر پھر ان دونوں قبیلوں میں جنگ شروع ہوئی جو سوسال سے زیادہ رہی۔ یہود نے ان کو لڑانے میں بھی اپنی تمام چالبازیاں ختم کر دیں اور انکو سودی رقم دیکر نکما بھی کر دیا۔ یہی حالت تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا (معجم البلدان۔ ابن ہشام۔ وفاء الوفاء وغیرہ)

ہے۔ ان کے یہاں تعلیم کا انتظام بھی ہے۔ ایک تعلیمی ادارہ "بیت المدارس" کے نام سے قائم ہے۔ جس میں توریت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یثرب کے عام باشندے ان کی تعلیمی برتری سے متاثر ہیں۔ یہاں تک کہ بعض خوش عقیدہ اپنے ہونہار بچوں کو یہود کے حوالے کر دیتے ہیں کہ علمی شائستگی حاصل کر سکیں۔

اوس اور خزرج کبھی بھائی برادر کی طرح رہے ہوں گے۔ مگر اب وہ جنگجو حریف ہیں اور تقریباً سوا سو برس سے برابر لڑائی کا سلسلہ جاری ہے۔ حال ہی میں نہایت خونریز لڑائی ہوئی جو "حرب بعاث" کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار کام آ چکے ہیں۔

یہودی ان لڑائیوں میں شریک نہیں ہوتے البتہ ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں۔ پھر اُن کی بدحالی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سودی قرض دیکر ان کی بہت سی جائدادیں قبضہ میں لے چکے ہیں۔

یثرب کے دو لیڈر اوس اور خزرج کے بڑے لوگوں میں اب صرف دو باقی رہ گئے تھے عبداللہ بن اُبَیّ بن سلول۔ قبیلہ خزرج کا رئیس اور لیڈر اور ابو عامر صیفی بن نعمان۔ قبیلہ اوس کا رئیس و امیر۔[1]

یثرب میں آنے والے نبی کا چرچا

توریت کی پیشین گوئیوں کے بموجب یہودی ایک آنے والے نبی کے منتظر تھے وہ اس کی علامتیں بھی بیان کیا کرتے تھے۔ ان یہودیوں میں کچھ خاندان وہ بھی تھے جن کے مورث اور اجداد اسی امید پر یہاں آکر آباد ہوئے تھے کہ نبی آخر الزمان کا ظہور اسی سرزمین میں ہوگا۔ مگر وہ تعصب، گروہ پرستی اور صرف اپنے گروہ کو سب سے اونچا اور خدا کا محبوب سمجھنے کا غلط

---

[1] وفاء الوفاء ص ۱۵۵ ج ۱

عقیدہ جو اُن کے ذہنوں میں رچا ہوا تھا اور ایک جذبہ بن گیا تھا اس نے اس خوش آئند تصور کو اور اس تمنا کو یقین کا درجہ دیدیا تھا کہ آنے والا نبی انہیں کے گروہ میں سے ہوگا۔[1] اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں بھی گھڑلی تھیں۔[2] وہ سمجھتے تھے کہ جیسے ہی وہ نبی ظاہر ہوگا ان کا اقبال نقطۂ عروج پر پہنچ جائے گا۔ چنانچہ مشرکین یعنی اوس اور خزرج سے کسی بات پر بحث ہوتی یا کسی موقع پر مشرکین کے سامنے زِچ ہونا پڑتا تو یہی روایتیں اور پیش گوئیاں بیان کرکے ان کو مرعوب کیا کرتے تھے، کہ "مستقبل کی سربلندی ہمارے لئے ہے۔" مشرکین اگرچہ ان کے ہم عقیدہ نہیں تھے مگر چونکہ جاہل تھے وہ متاثر ہوجاتے تھے۔ اس طرح اُن کے کان آنے والے نبی کے تذکرہ سے ناآشنا نہیں رہے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہی آشنائی ان کے لئے مشعل راہ بنی۔[3]

یثرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر

اوس اور خزرج کی طویل جنگ نے ایک فریق کو اتنا دبایا کہ اس نے کسی بڑے طاقتور قبیلہ کی مدد حاصل کرنی ضروری سمجھی۔ چنانچہ اس فریق کا ایک وفد زمانہ حج میں مکہ پہنچا اور اُس نے قریش کو اپنا مددگار اور حلیف بنانا چاہا۔ یہ وفد اس مقصد میں تو کامیاب نہیں ہوا۔ مگر یہ سعادت اس کو ضرور حاصل ہوگئی کہ اس کے ایک رکن (ایاس بن معاذ) داعئ حق کی صدائے حق کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ باقاعدہ مسلمان تو نہیں ہوئے مگر دعوتِ حق کے اثر سے اپنا دامن جھٹک بھی نہیں سکے

---

[1] ان کی یہ دلیل ایک حد تک معقول تھی کہ صدہا سال سے نبوت انہیں کے گروہ میں چلی آرہی ہے۔ یہاں تک کہ جتنے انبیاء علیہم السّلام کے نام ان کو معلوم تھے وہ سب اسرائیلی تھے۔ قرآن حکیم نے پوری اہمیت کے ساتھ یہود کے قومی جرائم شمار کراکر اس دلیل کی تردید کی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ یہ درست ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے تمام طبقات پر فضیلت دی تھی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے ان قومی جرائم نے ان کو اس فضیلت سے محروم کردیا۔ سورۂ نساء آیات ۴۵، ۴۶، ۱۵ تا ۵۰ و آیات ۱۵۲ تا ۱۶۱ وغیرہ

[2] دیکھو آیت ۱۵۳ سورۂ آل عمران [3] دیکھو آیت ۸۰ سورہ بقرہ۔

یہ وفد واپس یثرب پہنچا تو روئیداد سفر میں لامحالہ اس دعوت کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ ایاس اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔ مگر اُن کے خاندان والوں کا یقین یہ تھا کہ اُن کی وفات اسلام پر ہوئی ہے۔ کیونکہ وفات کے وقت اُن کی زبان پر لاالٰہ الا اللہ اور سبحان اللہ والحمد للہ اور اللہ اکبر کے کلمات جاری تھے[1]

یثرب میں اسلام

اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبدالقیس مدینہ کے عمائدین میں سے تھے۔ یہ مکہ کے رئیس اعظم عتبہ بن ربیعہ کے پاس مدد حاصل کرنے کیلئے پہنچے۔ عتبہ نے کہا ہم خود عجیب پریشانی میں مبتلا ہیں۔ ہمارے یہاں ایک شخص پیدا ہو گیا ہے۔ توحید کا قائل ہے۔ ہمارے دیوتاؤں کی تردید کرتا ہے۔ نمازیں بہت پڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں خدا کا رسُول ہوں۔ اس نے ہمارے سارے نظام کو درہم برہم کر رکھا ہے۔ ہمیں خود اپنے سے فرصت نہیں۔ ہم کسی کی مدد کیا کر سکتے ہیں۔

عتبہ کے اس شکوہ نے نفرت کے بجائے ان دونوں کے دلوں میں محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملاقات کی امنگ پیدا کر دی۔ یہ عتبہ سے رخصت ہوئے۔ ناکہ بندی کی وجہ سے پہنچنا مشکل تھا مگر ان دونوں نے کوشش کی اور کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ خدمت میں حاضر ہوئے۔ گفتگو کی۔ کلام پاک کی آیتیں سنیں۔ دعوت اسلام کو سمجھا۔ دماغ صاف تھا۔ دل صاف تھا۔ طبیعت حق کی طرف مائل تھی۔ اللہ کے کلام نے اثر کیا اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

مدینہ واپس پہنچے تو حضرت اسعد نے اپنے دوست ابوالہیثم بن تیہان سے اپنے مسلمان ہونے کا ماجرا سنایا۔ وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ ان دونوں کے متعلق یہ بھی روایت ہے کہ یہ پہلے ہی سے شرک سے بیزار اور توحید کی طرف مائل تھے[2]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۵ج ۱ [2] طبقات ابن سعد جلد اول صفحہ ۱۴۶۔

دو بزرگ اور تھے۔ رافع بن مالک ازرقی اور معاذ بن عفراء۔ یہ حج یا عمرہ کیلئے مکہ معظمہ آتے۔ اور کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تبادلہ خیالات کا موقع مل گیا۔ یہ دونوں بھی اسلام سے مشرف ہو گئے[1]

یثرب کی پہلی جماعت جس نے دعوتِ اسلام قبول کی

اہلِ طائف نے جس سعادت کی قدر نہیں کی' اہل یثرب کی خوش نصیبی نے اس کا استقبال کیا۔ طائف سے واپس ہو کر مطعم بن عدی کی پناہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ پہنچے تو حج کے مہینے شروع ہو چکے تھے۔ مراسم حج ادا کرنے کے دن آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستور کے بموجب قبائل کے کیمپوں اور زائرین کی مجلسوں میں پہنچکر تبلیغ شروع کی جس سرگرمی سے آپ تبلیغ کرتے تھے قریش کا تعاقب بھی اتنا ہی شدید ہوتا تھا۔ خصوصاً ابولہب کی سرگرمی نے دیوانگی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن قدرت کی کارفرمائیوں کا وہ مقابلہ نہ کر سکا۔ اسی گرما گرمی میں کچھ پاک نفوس ایسے بھی نکل آئے جنہوں نے متاعِ جان اس دعوت کے نذر کر دی۔

یہ یثرب کے چھ یا آٹھ آدمی تھے جو حج کے لئے آئے تھے اور اب مراسم حج کے بموجب ایک جگہ سروں کے بال منڈوا رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچے۔ کچھ موقع مناسب معلوم ہوا آپ نے اپنی دعوت پیش کرنی شروع کر دی۔ کلام اللہ شریف کی آیتیں تلاوت کیں۔ سننے والوں کی پاک روحیں متوجہ ہوئیں۔ اُن کے آپس میں کچھ باتیں اشاروں میں ہوئیں:

"یہودی جس نبی کی خبر دیا کرتے تھے' معلوم ہوتا ہے یہ وہی نبی ہیں بیشک یہ کلام سچا اور یہ دعوت برحق ہے۔ اب ہمیں ہمت کر کے پہل کر دینی چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو یہودی سبقت لے جائیں' اور اقبال مندی کا جو تاج ہمارے سروں کو بوسہ دینے کو تیار ہے' وہ یہودیوں کو میسر آجائے۔"

---

[1] طبقات ابن سعد جلد اوّل ص۱۴۶

اس طرح کی کچھ باتیں ہوئیں۔ پھر سب نے اپنی گردنیں قبولِ دعوت کیلئے خم کردیں۔ ان حضرات نے کلمہ شہادت پڑھ لیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری زندگی کا مقصد اسی دعوت کی اشاعت ہے۔ مکہ کی زمین میرے لئے تنگ ہو گئی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے میں آپ کے ساتھ یثرب چلوں اور یثرب کو دعوت و تبلیغ کا مرکز بنالوں۔ ان حضرات نے عرض کیا۔ ہم بسر و چشم تیار ہیں۔ مگر فی الحال آپ کا تشریف لے چلنا مصلحت کے خلاف ہے۔ ہمارے یہاں ابھی ایک سال پہلے بعاث کا نہایت سخت معرکہ ہو چکا ہے جس کے زخم اب تک ہرے ہیں۔ جذبات برانگیختہ ہیں اور دماغوں میں نفرت بھری ہوئی ہے اس حالت میں آپ کی دعوت صدا بصحرا ہوگی۔ کیونکہ اس وقت دونوں کا جمع ہونا ناممکن ہے آپ کسی بھی فریق سے رابطہ پیدا کریں گے تو دوسرا فریق دشمن بن جائیگا۔ آپ ہمیں موقع دیں۔ ہم یثرب پہنچکر جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں۔ خدا کرے کوئی اصلاح کی صورت پیدا ہو اور فضا ہموار ہو جائے تو آپ کا تشریف لے چلنا مفید ہوگا۔ ہم وعدہ کرتے ہیں۔ کہ آئندہ سال اسی مقام پہ حاضر ہوں گے اور امید ہے کہ اس وقت تک ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ آپ کو یثرب آنے کی دعوت دے سکیں۔

بات معقول اور ہمدردانہ تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمالی۔

ان کے اسماء گرامی یہ ہیں[1]:

رافع بن مالکؓ۔ عبادہ بن الصامتؓ۔ ابو عبدالرحمٰن یزید بن ثعلبہؓ۔ عویم بن ساعدہؓ

---

[1] (الف) ابن سعد نے چند روایتیں پیش کی ہیں اور ہر روایت میں کچھ نام شمار کرائے ہیں ہم نے مکرر نام حذف کردیئے ہیں ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ص۱۴۵ تا ص۱۴۷ ج ا الجزء الاول من کتاب الطبقات فی السیرۃ الشریفۃ النبویہ القسم الاول)

(ب) ان حضرات میں سے دو بزرگوں کا تعلق قبیلہ اوس سے ہے۔ ابو عبدالرحمٰن۔ یزید بن ثعلبہ اور عویم بن ساعدہ۔ رضی اللہ عنہما اور باقی چھ حضرات خزرجی ہیں۔

(ج) چھ یا آٹھ کی تعداد میں اگرچہ اختلاف ہے۔ مگر اس پر اتفاق ہے کہ ان سب حضرات نے جو اس وقت بیعت ہوئے تھے راہِ خدا میں قتل ہو کر درجہ شہادت حاصل کیا۔ الاستیعاب ص۱۶۹ تذکرہ رافع بن مالک۔

عوفؓ بن حارث بن عفرا۔ قطبہؓ بن عامر بن حدیدہ۔ عتبہؓ بن عامر بن نابی۔ جابرؓ بن عبداللہ بن رئاب۔

بیعتِ عقبہ اولیٰ

وعدہ پورا کرنے کی بہترین مثال ان چھ حضرات نے اپنے عمل سے پیش کی جو گذشتہ سال دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ باہمی نفرت اور بغض و عداوت کے دہکتے ہوئے ماحول میں ان حضرات نے ایسے سلیقہ سے کام لیا کہ معرکہ بعاث کے اشتعال انگیز تذکرہ کے بجائے ہر ایک گھر میں اسلام اور پیغمبر اسلام کا چرچا ہونے لگا اور جب حج کا زمانہ آیا تو بارہ افراد نے اپنے آپ کو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پیش کر دیا۔ مگر یہ پیشی نہایت رازداری کے ساتھ ہوئی۔ مکہ معظمہ سے چند میل کے فاصلہ پر منیٰ کا میدان ہے۔ جہاں ۱۰ ذی الحجہ سے ۱۲ ذی الحجہ تک زائرینِ بیت اللہ کا اجتماع ہوا کرتا ہے۔ اس وسیع میدان میں وہ جگہ بھی ہے جس کو عقبہ کہتے ہیں جو شہر مکہ سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر ہے[1]۔ اسی کے قریب ایک گھاٹی میں یہ حضرات جمع ہوتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔ نور کی چادر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی نورانی فضا میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں۔ جو سراسر نور ہیں۔ آپ خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں۔ سننے والوں کے دلوں کی گہرائیوں سے آمنّا کی صدا بلند ہوتی ہے۔ پھر ان سب سے چھ باتوں کا عہد لیا جاتا ہے۔

(۱) ہم صرف خدائے واحد کی عبادت کیا کریں گے کسی کو اس کا شریک نہیں مانیں گے (۲) چوری نہیں کریں گے (۳) زنا نہیں کریں گے (۴) اولاد کو قتل نہیں کریں گے (۵) کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے (جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے (۶) آپ جس اچھی بات کا حکم فرمائیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ (نافرمانی نہیں کریں گے)[2]

یہ معاہدہ عمل کرنے کے لئے تھا۔ عمل کرنے کے لئے معلم اور مربی کی ضرورت تھی۔ ان

---

[1] معجم البلدان [2] بخاری شریف ص۵۵۔

لوگوں نے معلم کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک باعمل معلم کو ان کے ساتھ کر دیا یہ سیدنا حضرت مصعب بن عمیر ہیں۔ دولت مند گھرانے کے چشم و چراغ۔ ناز و نعم میں پلے۔ جب گھوڑے پر سوار ہو کر چلا کرتے تھے تو آگے پیچھے ہٹو بچو کہتے ہوئے غلام دوڑا کرتے تھے۔ بدن پر سیکڑوں درہم سے کم کا لباس نہیں ہوتا تھا۔ جو طرح طرح کے عطر سے معطر ہوتا تھا۔ مگر جب دولتِ اسلام سے مالامال ہوئے تو دولتِ دنیا اُن کی نظر میں گرد بن گئی۔ روح نے وہ لذت پائی کہ ساز و سامان بار لگنے لگا۔ اب معلمِ خیر کا لباس ایک کمبل تھا۔

مدینہ پہنچ کر حضرت اسعد بن زرارہ کے یہاں ان کا قیام ہوا۔ اس وقت تک جتنا قرآن نازل ہو چکا تھا وہ لوگوں کو یاد کراتے۔ سمجھاتے۔ اس پر عمل کراتے۔ لوگ اُن کو مقری[1] کہا کرتے تھے

نیا دارِ ہجرت

اب تک حبش دارِ ہجرت تھا۔ اس بعیت کے بعد ایک دارِ ہجرت کا اضافہ ہو گیا۔ مکہ کو خیرباد کہنے والے اب یثرب آنے لگے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ارادۂ ہجرت

ماہ شوال ختم ہو رہا تھا۔ ذی قعدہ[2] شروع تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ اجازت لینے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔ کچھ توقف کیجئے۔ امید یہ ہے کہ مجھے بھی ہجرت کی اجازت مل جائے گی۔ حضرت ابو بکر نے یہ ارشاد سُنا تو تعجب[3] ہوا۔ مکرر دریافت کیا۔ کیا آپ کو یہ توقع ہے میرے ماں باپ آپ پر قربان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں اُمید تو یہی ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے اس سے زیادہ مسرت کی بات کیا ہو سکتی تھی کہ شرف رفاقت حاصل ہو۔ آپ نے اس وقت ارادہ ملتوی

---

[1] ابن سعد و استیعاب وغیرہ [2] بخاری شریف وغیرہ کی روایتوں میں یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چار ماہ تک ان سانڈنیوں کو گھر پر رکھ کر چارہ کھلاتے رہے جن کو آپ نے سفرِ ہجرت کیلئے خریدا تھا۔ سفر ہجرت ربیع الاول کے آغاز میں ہوا تو ان سانڈنیوں کو شوال کے آخر یا ذیقعدہ کے شروع میں خریدا ہوگا۔ [3] ابھی تک بعیت عقبہ ثانیہ نہیں ہوئی تھی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی گفتگو ہوئی اور حضرات انصار سے عہد لیا گیا۔

کر دیا اور اپنے آقا کے ساتھ سفر کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ فوراً دو عمدہ سانڈنیاں خرید لیں[1]۔ اور اس خیال سے کہ نہ معلوم کس وقت حکم ہو جائے۔ ان سانڈنیوں کو چرواہے کے حوالے نہیں کیا۔ بلکہ گھر پر کھڑا رکھا اور بازار سے چارہ خرید کر کھلاتے رہے۔ اس انتظار میں چار ماہ گذر گئے۔ اس اثنا میں بیعت عقبہ ثانیہ بھی ہوئی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

صدیق اکبرؓ نے دو سانڈنیاں ہی نہیں خریدیں بلکہ سفر کا نقشہ ذہن میں جما کر ضرورت کی تمام چیزیں فراہم کر لیں۔ حتیٰ کہ سفر میں ایک تحریر لکھنے کی ضرورت پیش آئی تو تحریر کا تمام سامان ساتھ تھا ٹھنڈے پانی کا اور نہ صرف پانی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پانی پلانے کے برتن کا بھی یہ انتظام تھا کہ اس کے مونھ پر کپڑا بندھا رہتا تھا۔ جیسا کہ سراقہ جعشم کے واقعہ میں آئندہ معلوم ہوگا۔ (انشاء اللہ)

بیعتِ عقبہ دوم

پچھلے سال چھ مسلمانوں کی کوشش سے یثرب کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا تھا۔ اس سال حضرت مصعب بن عمیر مقری رضی اللہ عنہ کی رہنمائی میں بارہ حضرات نے کوشش کی تو نہ صرف یثرب بلکہ یثرب سے باہر موضع قبا تک اسلام پہنچ گیا۔

اسلام کیا تھا؟ صرف کلمۂ توحید پڑھ لینا؟ بے شک قانونی اور فقہی نقطۂ نظر سے کسی کو مسلمان قرار دینے کے لئے یہی کافی ہے لیکن سیدنا مصعب بن عمیرؓ جس اسلام کا درس دے رہے تھے وہ قانونی نمائش سے بہت بلند تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر کا مکتب، مکتبِ عشق تھا۔ یہاں ایثار اور فدائیت کا درس دیا جاتا تھا۔ مشائخ طریقت کے یہاں "درجۂ فنا" آخری منزل ہے یہ حضرت مصعبؓ کی خانقاہ کا پہلا سبق ہوتا تھا۔

قرآنِ حکیم نے مومن کی شان یہ بتائی ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ[2]۔ اور آنحضرت

---

[1] بخاری شریف ص۵۵۳۔ [2] جو ایمان لائے وہ بہت مضبوط ہوتے ہیں اللہ کی محبت میں۔

صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ لایؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہٖ و الناس اجمعین۔

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی دعوت کی خصوصیت یہ تھی کہ جیسے ہی زبان پر کلمۂ توحید جاری ہوتا، دل کے خلوت کدہ میں عشق و محبت کی شمع روشن ہو جاتی۔ جو نہ صرف ظلمت دور کرتی بلکہ انانیت کو بھی فنا کر دیتی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب میں تشریف لانے کی دعوت دینا صرف ایک معزز مہمان کو بلانا نہیں تھا بلکہ ایک ہیبت انگیز اور حد سے زیادہ پُر خطر اقدام تھا آپ کو تشریف لانے کی دعوت دینا ایک عظیم ترین انقلاب کو دعوت دینا تھا یعنی ایسی حاکمیت کو تسلیم کرنا تھا، جس کے مقابلہ میں ہر ایک کی حاکمیت ختم ہو رہی تھی۔ اوس اور خزرج کے رؤسا اور شیوخ خصوصاً عبداللہ بن اُبی بن سلول رئیس خزرج اور ابو عامر بن صیفی بن نعمان رئیس اوس، جو نہ صرف حاکمیت بلکہ ملوکیت اور بادشاہت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ آپ کا مدینہ تشریف لے آنا اُن سب کے لئے پیغام ناکامی تھا، جو ان سب کے لئے مایوس کن تھا جو ان کی حاکمیت تسلیم کرانے کے لئے اتنے سرگرم اور پُر جوش تھے کہ عبداللہ بن اُبی بن سلول کے لئے شاہانہ تاج کی تیاری کی فرمائش بھی دے چکے تھے۔ دوسری طرف آپ کی تشریف آوری قریش کی ناکامی تھی اور تشریف آوری کی دعوت دینا قریش جیسی جماعت کے مقابلہ پر سینہ سپر ہونا تھا۔ جس کی عظمت کی چھاپ ہر ایک عربی بولنے والے کے دل پر تھی اور جس کی ناکامی پورے عرب کی ناکامی تھی۔ اس کے علاوہ اقتصادی مسائل بھی نہایت اہم تھے۔ مثلاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار جو اہل و عیال کو ساتھ لے کر آئیں گے ان کی ضروریاتِ زندگی کس طرح فراہم ہوں گی۔ یہ تمام مسائل تھے۔ جو ایمان لانے والے تھے وہ دانشمند تھے، ان تمام باتوں کو سمجھتے تھے مگر اُن کے ایمان کی حرارت اس طرح کے تمام خطرات کے لئے برقِ خرمن سوز تھی۔

عشق چوں خام ست باشد بستۂ ناموس و ننگ
پختہ مغز ان جنوں را کے حجاز بخیر پا ست

لہ کوئی مومن کہلانے کے لائق نہیں ہوتا جب تک میں اسکو باپ اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں۔

باہر کمال اندکے آشفتگی خوش ست
ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

یہ نومسلم تھے، ان کا اسلام نیا تھا۔ مگر یہ نیا اسلام سراسر عشق تھا جس نے محبوب کے لئے ہر ایک قربانی اور ایثار کو محبوب بنا دیا تھا۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

حج کا زمانہ آیا۔ اوس اور خزرج کے تقریباً پانچ سو افراد حج کے لئے روانہ ہوئے یہ اہلِ ایمان بھی اس عزم کے ساتھ روانہ ہوئے کہ محبوب رب العالمین کو دعوت دیں کہ وہ مکّہ کی خشک پہاڑیوں کو خیرباد کہیں اور یثرب کے سبزہ زار کو ایمان کا کشت زار بنائیں۔ لیکن یثرب کے سربراہ جو قریش کے ہم مشرب و ہم نوا تھے اس جرأت کے لئے تیار نہیں تھے جس میں قریش سے براہ راست تصادم تھا لہٰذا ان فداکاروں نے اپنے منصوبہ کو پوشیدہ رکھا۔ ان کی تعداد تہتر تھی[1] ان میں دو عورتیں تھیں تیس[2] نوجوان باقی ادھیڑ عمر۔

مکہ پہنچ کر بھی اس منصوبہ کو راز ہی رکھا اور راز داری کے ساتھ ہی تاریخ۔ وقت اور مقام طے کیا گیا۔

۱۱ ذی الحجہ[3] کی رات چاند آدھی مسافت طے کر چکا لوگ سو گئے تو طے کردہ خفیہ قرار داد کے موجب اسلام کے یہ جاں نثار فرداً فرداً روانہ ہوئے[4] اور اسی گھاٹی میں پہنچے جہاں گذشتہ سال بیعت ہوئی تھی۔ سرورِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے چچا عباس وہاں رونق افروز ہو چکے تھے یہ بھی خواجہ ابوطالب کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے بہی خواہ محافظ اور جان چھڑکنے

---

[1] ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۱ ابن اسحاق نے ان کے نام بھی شمار کرائے ہیں۔ ص ۲۰۳ تا ص ۲۶۹ ج ۱۰ - [3] وسط ایام التشریق لیلۃ النفر الاول اذا ھدأت الرجل (ابن سعد ص ۱۴۹ ج ۱) فتسلل تسلل القطا متخفین (ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۱) [4] سب سے پہلے رافع بن مالک زرقی رضی اللہ عنہ باریاب ہوئے۔ ابن سعد ص ۱۴۹ ج ۱

والے مددگار تھے اور اگرچہ عمر میں صرف دو سال بڑے تھے مگر خود کو اپنے عزیز بھتیجے کا سرپرست سمجھتے تھے اور تجارتی کاروبار کی وجہ سے باہر آنا جانا رہتا تھا تو قبائل سے واقف تھے شیوخ قبائل سے تعلقات تھے ان کو جانتے پہچانتے تھے۔ اس تعارف کے ساتھ خوبی یہ تھی کہ بات کرنے کا اچھا سلیقہ بھی تھا۔ چنانچہ جب آنے والے آگئے تو سلسلہ کلام آپ نے ہی شروع کیا۔

آپ جس ارادہ سے آئے ہیں یقین ہے کہ اس کی ذمہ داری کا بھی آپ صاحبان نے بخوبی اندازہ کر لیا ہوگا۔ محمدؐ کی حمایت پورے عرب کی مخالفت ہے۔ محمدؐ اپنے خاندان کے سب سے زیادہ باعزت رکن ہیں۔ خاندان کا ہر فرد اُن کی حفاظت کے لئے سربکف رہتا ہے جو اُن کے ہم نوا ہو گئے ہیں وہ ہم نوائی کی وجہ سے اور جو ان کے ہم نوا نہیں ہوئے ہیں وہ خاندانی حمایت، قرابت اور خود اُن کے اخلاق و کردار کی وجہ سے ان کے جاں نثار ہیں۔ محمدؐ کی حفاظت سے ہم نہ اکتائے ہیں نہ تھکے ہیں۔ محمدؐ نے خود ہی آپ کی دعوت منظور کی ہے اور وہ ہم سے الگ ہو کر آپ کے یہاں جانا چاہتے ہیں۔

آپ پوری طرح غور کر لیں۔ اپنی طاقت اور ہمت کا موازنہ کر لیں۔ پورے عرب کی متحدہ طاقت سے آپ کو مقابلہ کرنا ہوگا۔ سارا عرب ایک کمان سے آپ پر تیر برسائے گا۔ کیا آپ میں مقابلہ کی طاقت ہے۔ آپ صاحبان کو لڑائیوں کا تجربہ ہے۔ کیا آپ لوگ نامعلوم مدت تک پامردی اور استقلال سے پورے عرب کے مقابلے میں ثابت قدم رہ سکیں گے۔ صاف بات اچھی ہوتی ہے پوری طرح سوچ لو۔ جدا ہونے سے پہلے پختہ فیصلہ کر لو۔ بعد کی شرمندگی سے اس وقت کی صاف بات ہزار درجہ بہتر ہے۔[1]

ے تعمیر کعبہ کے وقت جب پتھر ڈھو رہے تھے تو آپ نے اسی بزرگانہ شفقت کی وجہ سے بھتیجے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرمائش کی تھی کہ لنگی کھول کر مونڈھے پر رکھ لیں تاکہ پتھر کی رگڑ نہ لگے۔

[1] ابن سعد ص ۱۴۹ ج ۱۔

حضرت عباس کی بات ختم ہوئی تو حضرت براء بن معرورؓ[1] نے مجمع کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا:
آپ نے جو فرمایا ہم پہلے سے ہی سمجھے ہوئے ہیں۔ ہم وفاداری، سچائی اور رسول اللہؐ کی حفاظت میں اپنی جانیں قربان کردینے کا عزم مصمم لے کر یہاں آئے ہیں۔ لیکن ہم چاہتے ہیں حضرت والا (جن کے لئے سر ہتھیلی پر رکھ کر ہم یہاں آئے ہیں) وہ خود فرمائیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام پاک کی چند آیتیں تلاوت فرمائیں۔ پھر فرمایا۔ میں
(الف) اپنے رب، (پروردگار) کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ صرف اسی "وحدہٗ لاشریک لہٗ" کی عبادت کرو۔ اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔

(ب) اپنی ذات اور اپنے صحابہ (ساتھیوں) کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں رہنے کو جگہ دو۔ ہماری مدد کرو۔ اور جس طرح تم خود اپنی جانوں کی حفاظت کرتے ہو ہماری بھی حفاظت کرو۔
ایک روایت میں ہے کہ جس طرح اپنے بچوں اور عورتوں کی حفاظت کرتے ہو ہماری حفاظت کرو۔

مجمع نے دریافت کیا۔ ہمیں کیا ملے گا۔ فرمایا[2]۔ "جنت[3]"

اس کے بعد جوابی تقریریں شروع ہوئیں۔

---

[1] یہ سب سے زیادہ سن رسیدہ اور اپنی جماعت کے سردار تھے سیدنا وکبیرنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ (سیرۃ ابن ہشام ص۲۶۴ ج۱) مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری سے ایک ماہ پہلے وفات پا چکے تھے۔ (فتح الباری)

لطیفہ: جب یہ حضرت (براء بن معرور) یثرب سے روانہ ہوئے تو راستہ میں سوال پیدا ہوا کہ نماز کس رخ پڑھنی چاہیے۔ شام کا رخ کرکے یا کعبہ کا رخ کرکے۔ سب کی رائے ہوئی کہ شام کی طرف۔ مگر حضرت براء نے طے کیا کہ وہ کعبہ کی طرف نماز پڑھا کریں گے۔ راستہ بھر یہی رہا کہ ساتھی شام کی طرف نماز پڑھتے رہے اور یہ کعبہ کی طرف۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے استفتا کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی طرف نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ سیرۃ ابن ہشام ص۲۶۴۔۲۶۵ ج۱

[2] مسند امام احمد ص۱۲۰ ج۴ وسیرۃ ابن ہشام ص۲۶۶ ج۱ [3] کسی دنیاوی ترقی یا برتری کا وعدہ نہیں ہے جو کچھ ہو آخرت کے لئے ہو، صرف اسی کا وعدہ ہے اور یہی نصب العین ہے۔ محمد میاں عفی عنہ۔

(۱) سید القوم حضرت براء بن معرور نے دست مبارک پر اپنا ہاتھ رکھا اور عرض کیا:

یقیناً ہم اسی طرح حفاظت کریں گے۔ ہم کسی کے مقابلہ سے جان چرانے والے نہیں ہیں۔ ہم ابناء الحروب ہیں، لڑائیوں کی گود میں پلے ہیں۔ آباء و اجداد سے یہی ترکہ میں ملا ہے۔

(۲) عباس بن عبادہ بن نضالہ انصاری۔ مجمع کو خطاب کرتے ہوئے۔

حضرات آپ سمجھتے ہیں کیا ہو رہا ہے۔ ہم عہد کر رہے ہیں کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حمایت میں پوری دنیا کا مقابلہ کریں گے۔ ہر ایک گورے اور کالے کے مقابلے میں سینہ سپر ہوں گے جانیں قربان کریں گے۔ مال لٹائیں گے۔ ہمارے سردار مارے جائیں گے۔ کیا ہم تیار ہیں۔ اگر ایسا نہ کر سکیں تو کل کے بجائے آج الگ ہو جائیں۔ آج دامن بچا لینا کل کی رسوائی سے بہت بہتر ہے۔

(۳) حضرت ابوالہیثم بن تیہان۔ یا رسول اللہؐ گستاخی معاف۔ ایک بات واضح کرنی ہے۔ یہودیوں اور دوسرے قبائل سے ہمارے تعلقات ہیں۔ یہ تعلقات اب باقی نہیں رہیں گے۔ مگر ایسا تو نہ ہو گا کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب فرمادے آپ ہمیں چھوڑ کر اپنے لوگوں میں چلے جائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ سنے تو مسکراتے ہوئے فرمایا۔

یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کا خون میرا خون۔ آپ کی ناکامی میری ناکامی میں آپ کا آپ میرے۔ جن سے تمہاری جنگ اُن سے میری جنگ۔ جن سے تمہاری صلح اُن سے میری صلح۔

اسکے بعد سلسلہ بیعت شروع ہوا حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے بیعت کی۔[1]

---

[1] ابن اسحاق کا بیان ہے کہ بنو نجار کا دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے حضرت اسعد بن زرارہ نے بیعت کی اور بنو عبدالاشہل کہتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت ابوالہیثم بن تیہان نے بیعت کی۔ مگر ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ حضرات بہت پہلے مسلمان ہو چکے تھے اس وقت ان حضرات نے مکرر بیعت کی۔ نئے بیعت کرنے والوں میں اس وقت حضرت براء ہی تھے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بیعت میں اسی عہد کو دہرایا گیا جو پہلی بیعت (عقبۂ اولیٰ) کی بیعت کے وقت کیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ اللہ کا کسی کو شریک نہیں گردانیں گے۔ چوری نہیں کریں گے زنا نہیں کریں گے۔ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔ کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے۔ جس اچھی بات کا حکم کیا جائے گا، تعمیل کریں گے۔ نافرمانی نہیں کریں گے۔[1]

اس کے علاوہ یہ بھی عہد لیا گیا۔

کسی کو ناحق قتل نہیں کریں گے۔[2] لوٹ نہیں ڈالیں گے۔[3] ہر موقع پر حق بات کہیں گے۔ کسی

---

[1] سورۂ ممتحنہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائش کی گئی ہے کہ جو عورتیں ہجرت کرکے آئیں ان سے آپ بیعت لیجئے اس بیعت میں انہیں چھ چیزوں کا تذکرہ ہے۔ اس مناسبت سے اس بیعت کو بیعت نسا کہتے ہیں مردوں سے اس موقع پر انہیں باتوں کا عہد کرایا گیا۔ اسکے بعد بہت سے موقع آئے ہیں۔ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص اس موقع کے لحاظ سے صحابۂ کرام سے بیعت لی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اس پر بیعت لی اور عہد کرایا کہ کسی سے کوئی سوال نہیں کریں گے ایک مرتبہ اس پر بیعت لی کہ ہر ایک کے حق میں خیر خواہی کریں گے (بخاری شریف ص۱۴) یا مثلاً حدیبیہ کے موقع پر بیعت لی گئی، جس کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے کہ مر جائیں گے مگر میدان سے نہیں ہٹیں گے۔

[2] لا نقتل النفس التی حرم اللہ الا بالحق۔ ولا ننتہب ولا نعصی بالجنۃ۔ بخاری شریف ص ۵۵۰-۵۵۱

[3] یاد رکھیے غنیمت کو لوٹ نہیں کہا جا سکتا۔ لوٹ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے جس طرح مثلہ (ناک کان کاٹ ڈالنے) سے منع فرمایا ایسے ہی النہبہ (لوٹ) سے منع فرمایا۔ اس پر بیعت لی کہ لوٹ نہیں ڈالیں گے (بخاری شریف ص۳۳۶) لوٹ ڈالنے والے کے متعلق فرمایا۔ لیس منا (سیکا ابوداؤد شریف) گویا وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ لوٹ کا مقصد ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ خوف خدا جماعتی نظم یا امانت اور دیانت کا کوئی ضابطہ لوٹ میں نہیں ہوتا۔ غنیمت میں یہ تمام باتیں شرط ہوتی ہیں۔ غنیمت میں جو کچھ لیا جاتا ہے وہ پوری احتیاط اور دیانتداری کے ساتھ جمع کرایا جاتا ہے۔ ایک شخص میدان جنگ میں مارا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ھو فی النار یہ دوزخ میں گیا۔ صحابہ کو تعجب ہوا۔ سامان کی تلاشی لی تو ایک عبا (اچکن) برآمد ہوئی جو مال غنیمت میں سے بلا اجازت اس شخص نے رکھ لی تھی (بخاری شریف ص۴۴۲)۔ انتہا یہ کہ جوتے کے تسمے کے متعلق بھی یہی ارشاد ہوا شراک او شراکین من نار۔ بخاری شریف ص۶۰۰۔ غنیمت کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ غنیم کے مال کو سرکاری طور پر ضبط کر لینے کا نام غنیمت ہے۔ کچھ نا آشنا ادب مصنف جو بظاہر اپنا درجہ حضرات صحابہؓ سے کم رکھنا نہیں چاہتے وہ غنیمت کیلئے بے تکلف لوٹ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ معاذ اللہ.....

کی مذمت و ملامت کا خوف ہمیں کبھی بھی حق بات کہنے سے نہیں روک سکے گا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اثیرب تشریف لے آئیں گے تو اپنی اولاد اور خود اپنی جانوں کی طرح اُن کی حفاظت کریں گے[1]۔ ان سب باتوں کا بدلہ جنت ہو گا[2]۔

بارہ نقیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جماعت میں بارہ نقیب منتخب فرمائے تاکہ حالات[3] کی نگرانی رکھیں۔ ان کے نام خود انصار نے پیش کئے تھے۔ ان میں سے نو خزرج کے تھے اور تین اَوس کے۔ بروایت ابن اسحاق اُن کے نام یہ ہیں:

ابوامامہ۔ اسعد بن زرارہ۔ سعد بن ربیع۔ عبداللہ بن رواحہ۔ رافع بن مالک۔ براَ بن معرور۔ عبداللہ بن عمرو بن حرام۔ عبادہ بن صامت۔ سعد بن عبادہ۔ منذر بن عمرو بن خنیس۔ اُسید بن حضیر۔ سعد بن خثیمہ۔ رفاعہ بن عبدالمنذر۔

جلسہ ختم ہوا۔ سب حضرات اپنی اپنی قیام گاہوں پر خاموشی سے واپس ہو گئے۔ طے یہ ہوا کہ صبح سویرے الگ الگ اپنی اپنی قیام گاہ سے مدینہ روانہ ہو جائیں گے۔

حضرات نقبا کا تعارف اور مختصر حالات

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کنیت ابوامامہ۔ یہ سب سے کم عمر تھے مگر اسلام میں سب سے مقدم جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے سب سے پہلے یثرب میں اسلام کا تعارف انہیں کے ذریعہ ہوا۔ پھر ہر بیعت کے موقع پر حاضر اور ہر بیعت میں شریک رہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مبلغ اور معلم بن کر آئے تو انہیں کے یہاں قیام رہا۔ دعوت و تبلیغ میں اُن کے شریک رہے نماز جمعہ کا سلسلہ بھی آپ نے ہی شروع کیا۔ مگر عمر نے وفا نہیں کی۔ ابھی مسجد نبوی کی تعمیر ہو رہی تھی۔

---

[1] بیہقی بحوالہ البدایہ والنہایہ ص ۱۶۳ ج ۳ [2] بخاری شریف ص ۵۵۱ [3] لیکونوا علی قومہم بما فیہم (ابن ہشام ص ۲۶۰ ج ۱) [4] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۶۰ ج ۱ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے ایک قصیدہ میں ان سب ناموں کو جمع کر دیا ہے (ص ۲۶۰ ج ۱ ابن ہشام)

کہ وفات ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بار بار مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے۔ علاج میں بھی شریک مشورہ رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد مدینہ میں سب سے پہلے انہیں کی وفات ہوئی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ سب سے پہلی نماز جنازہ تھی جو پڑھائی گئی (الاستیعاب و اصابہ) یہودیوں نے طعنہ دیا کہ محمد اپنے ساتھی کو نہ بچا سکے تو اور کیا کر سکیں گے۔ (مسند احمد)

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف مہاجر سے مؤاخاۃ (برادرانہ رشتہ) قائم فرمایا تو حضرت سعد نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ میں انصار میں سب سے زیادہ خوش حال اور صاحب جائداد ہوں۔ آدھی جائداد آپ کی ہے اور میری دو بیویاں ہیں اُن میں سے جس کو آپ مناسب سمجھیں مجھے بتا دیں' میں طلاق دے دوں گا آپ نکاح کر لینا۔ حضرت عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اہل اور مال میں برکت دے مجھے تو (زیادہ چلنے والا) بازار بتا دیجئے۔ میدان اُحد میں معرکہ ٹھنڈا ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سعد بن ربیع کو تلاش کرو۔ یہ میدان میں پڑے ہوئے تھے، بارہ زخم جسم مبارک پر تھے۔ حضرت اُبی بن کعب جو تلاش کرنے گئے تھے ان سے کہا کہ آقا، دو جہاں سے میرا سلام عرض کر دینا اور مسلمانوں کو یہ پیغام پہنچا دینا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ رہ گیا اور سرتاج دو عالم شہید ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی کوئی معذرت قابل قبول نہیں ہو گی۔ حضرت ابوبکر کے دور خلافت میں ان کی صاحبزادی آئیں تو حضرت ابوبکر نے اپنی چادر بچھا دی اس پر ان کو بٹھایا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا یہ اُن کی صاحبزادی ہیں جو مجھ سے بھی بہتر تھے اور تم سے بھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے راہ خدا میں قربان ہو گئے اور میں بھی زندہ ہوں اور تم بھی زندہ ہو (الاصابہ)

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ

شاعر تھے۔ ان کے ترانے بڑے شوق سے سنے جاتے تھے اور پڑھے جاتے تھے۔ خود

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دلچسپی ہوتی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسب معاہدہ عمرہ کرنے کیلئے تشریف لے گئے تو مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے یہ ترانہ پڑھتے جارہے تھے۔

خلوا بنی الکفار عن سبیلہ　　الیوم نضربکم علی تنزیلہ

ضرباً یزیل الهام عن مقیلہ　　ویذهل الخلیل عن خلیلہ

ترانہ کا مفہوم یہ ہے کہ۔ کافر بچو! راستہ سے ہٹ جاؤ۔ آج ہم بزور شمشیر اپنے آقا کو یہاں اتاریں گے۔ ہماری شمشیر زنی ایسی ہوگی جو کھوپڑیوں کو گردنوں سے اڑا دے گی اور دوست کو دوست سے جدا کردے گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مقداد بن الاسود سے رشتہ اخوت قائم کیا تھا وہ بھی ایسے ہی جوشیلے تھے۔ جاں باز عبداللہ بن رواحہ نے غزوہ موتہ میں جام شہادت نوش کیا۔ رضی اللہ عنہ۔

حضرت رافع بن مالک رضی اللہ عنہ

سب سے پہلے مسلمان ہونے والے ہیں۔ پہلی بیعت میں بھی شریک تھے۔ جس میں چھ یا آٹھ آدمیوں نے بیعت کی تھی۔ پھر بارہ اور ستر میں بھی شریک تھے۔ جتنا قرآن اس وقت تک نازل ہوا تھا سب حفظ کرلیا تھا۔ غزوۂ اُحد میں درجہ شہادت حاصل کیا۔ (استیعاب واصابہ)

حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ

جب یہ قافلہ مکہ جارہا تھا تو راستہ میں اور ساتھیوں نے بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھی مگر انہوں نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی ہجرت کرکے مدینہ میں تشریف لائے تھے کہ اُن کی وفات ہوگئی مگر وفات کے وقت وصیت کردی کہ ترکہ کا ایک ثلث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کردیا جائے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے صاحب خیر ہیں جنہوں نے تہائی ترکہ کی وصیت کی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ

غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوسکے بہت صدمہ ہوا۔ غزوۂ اُحد ہوا تو تمنا پوری ہوئی۔ بیٹے کو بٹھا کر رات ہی کو سمجھا دیا۔ مجھے اُمید ہے کہ میں کل کو سب سے پہلے جان فدا کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مجھے سب سے زیادہ تم محبوب ہو۔ تم سب سے پہلے میرا قرض ادا کرنا اور اپنی بہنوں کا خیال رکھنا بہنیں سات تھیں۔ جابر اُن کے سعادت مند صاحبزادے تھے۔ یہودی کا قرض تھا۔ خیال تھا کہ باغ کے پھل سے قرض ادا نہیں ہوسکے گا لہذا کچھ اب وصول کرے کچھ بعد میں۔ مگر یہودی راضی نہیں ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفارش کی تب بھی راضی نہیں ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باغ میں تشریف لے گئے، ٹوٹے ہوئے کھجوروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ ان سب کے پاس پہنچ کر ملاحظہ فرمایا۔ پھر حکم دیا کہ تمام قرض ادا کردو۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت تھی کہ تمام قرض ادا کردیا۔ اور کھجوروں کے ڈھیر جوں کے توں باقی رہ گئے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے برادرانہ رشتہ قائم فرمایا۔ تمام معرکوں میں شریک رہے۔ ۳۵ھ میں وفات ہوئی۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ

قبیلۂ خزرج کے سردار، رئیس گھرانے کے چشم و چراغ بہت بڑے حوصلہ مند سخی۔ باپ دادا بھی ایسے ہی رئیس اور سخی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھر کو بیت جُود فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو انہوں نے بیعت نہیں کی۔ مگر کوئی مخالفت بھی نہیں کی۔ بلکہ وطن چھوڑ کر شام چلے گئے "حوران" میں قیام کیا۔ وفات دفعتہً ہوگئی۔ غسل خانہ میں مُردہ پائے گئے۔ یہ ۱۱ھ کا واقعہ ہے یا ۱۴ھ یا ۱۵ھ کا۔ (علی اختلاف الاقوال) الاستیعاب۔

حضرت منذر بن عمرو بن خنیس رضی اللہ عنہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے برادرانہ رشتہ قائم فرمایا۔ بیر معونہ کے

حادثہ میں شہید ہوئے۔ یہ ستر حضرات جو اس موقعہ پر شہید کئے گئے وہ انہیں کی قیادت میں سفر کر رہے تھے (الاستیعاب و بخاری وغیرہ) یہ سب حضرات خزرجی تھے۔ قبیلہ اوس کے یہ تین حضرات تھے۔ مندرجہ ذیل

حضرت اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ قبیلہ اوس کے سردار بہت بڑے سخی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ۲۰ھ یا ۲۱ھ میں وفات ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے وصی تھے۔ چار ہزار دینار قرض چھوڑا جس کو حضرت فاروق اعظم نے باغ کی آمدنی سے ادا کیا (الاستیعاب) غزوہ بدر میں مشیر خاص تھے۔

حضرت سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبا میں قیام تھا تو عام نشست ان کے یہاں ہوتی تھی۔ جو حضرات مہاجرین تن تنہا آتے تھے وہ بھی انہیں کے یہاں ٹھیرتے تھے۔ جب غزوہ بدر کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہونے لگے تو باپ (خیثمہ) اور بیٹے (سعد) نے طے کیا کہ ہم میں سے ایک مکان پر رہے ایک ساتھ جائے۔ پھر باپ بیٹے میں بحث ہوئی کہ کون ساتھ جائے۔ بحث ختم کرنے کیلئے قرعہ ڈالا تو قرعہ میں بیٹے (حضرت سعد) کا نام نکلا۔ باپ نے بیٹے سے اپیل کی کہ اپنا حق مجھے دیدیں اور مجھے جانے دیں تو بیٹے نے کہا کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں آپ کیلئے اپنا حق بخوشی چھوڑ دیتا۔ مگر یہ راہ خدا میں قربان ہونے اور رضا مولیٰ حاصل کرنے کا معاملہ ہے اس میں تو میں اپنا حق نہیں چھوڑ سکتا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گئے اور جام شہادت نوش جان کیا۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین)

حضرت رفاعہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ ابولبابہ کنیت۔ یہ کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ غزوہ بدر اور غزوہ سویق کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو انہیں کو مدینہ کا ناظم امور (والی) بنا گئے۔ غزوہ خندق کے بعد بنو قریظہ کا مسئلہ پیش ہوا جنہوں نے غزوہ خندق کے وقت غداری کی تھی۔ بنو قریظہ منتظر تھے کہ ان کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائیگا ابولبابہ سے دریافت کیا تو انھوں نے گردن کی طرف اشارہ کیا کہ سب ذبح ہوں

کو قتل کیا جائیگا۔ پھر احساس ہوا کہ میں نے راز فاش کر دیا تو مسجد شریف میں آکر اپنے آپ کو کھنبے سے باندھ دیا اور کھانا پینا سب بند۔ نماز کے وقت ان کی صاحبزادی آکر ان کو کھول دیتی تھیں تو نماز میں شریک ہو جاتے تھے۔ چھ روز تک اور بعض روایتوں کے بموجب چودہ پندرہ دنوں تک اسی طرح بندھے رہے۔ پھر سورۃ توبہ نازل ہوئی، آپ کو بشارت دی گئی اور کھولنے کا ارادہ کیا گیا۔ آپ نے منع کر دیا کہ میں قسم کھا چکا ہوں کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود نہ کھولیں گے، میں نہیں کھلوں گا۔ چنانچہ خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے ان کو کھولا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان کی وفات ہوئی۔ بغیر کھائے پئے بندھے رہنے کا اثر ظاہری جسم پر یہ پڑا کہ قوتِ سماعت ختم ہو گئی تھی۔ الاستیعاب۔

قریش کا تعاقب

یہ اجلاس جو پہاڑ کی گھاٹی میں ریت کے فرش پر چاند کی چاندنی میں کیا گیا تھا بہت ہی خفیہ تھا۔ جانے والے بھی ایک ایک کر کے گئے تھے اسی طرح نہایت خاموشی سے واپس ہوئے۔ لیکن پچھتر[1] آدمیوں کی نقل و حرکت چھپنے والی نہیں تھی۔ لوگوں نے بھانپا۔ کچھ بھنک قریش کے کانوں میں بھی پڑی۔ فوراً دوڑے اور جیسے ہی صبح ہوئی تحقیقات شروع کر دی۔ اہل مدینہ کے خیموں میں پہنچے اور کہا۔

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ اس لئے آتے ہیں اور کوئی ایسا معاہدہ کر چکے ہیں کہ اس صابی۔ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ساتھ لے جائیں گے اور ہمارے مقابلہ پر محاذ قائم کریں گے۔ ہم آگاہ کئے دیتے ہیں "محمد" کو لے جانا ہمارے لئے چیلنج ہوگا۔ طاقت آزمائی ہو تو ایسا کرو۔"

رؤسا مدینہ عبداللہ بن ابی بن سلول وغیرہ سے قریش کے تعلقات تھے انہیں سے تعارف تھا۔ انہیں سے تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا گیا اور انہیں سے یہ باتیں کہی گئیں ان میں سے کوئی بھی اس بیعت میں شریک نہیں ہوا تھا نہ ان کو خبر تھی۔ انہوں نے قسمیں کھا کھا کر انکار کیا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول نے کہا۔ میری قوم اگر ایسا کرتی تو وہ یقیناً مجھ سے مشورہ کرتی۔ ورنہ کم از کم خبر ضرور

---

[1] بشمول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و حضرت عباس رضی اللہ عنہ۔

دیتی۔ یہ ممکن نہیں میری اطلاع بغیر کوئی ایسا عمل ہو جائے۔

یہ انکار کرنے والے سچے تھے۔ لیکن بیعت کرنے والوں کو فکر تھی کہ ان سے دریافت کیا گیا تو کیا جواب دیں گے۔ وہ خاموش تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ دفعۃً حضرت کعب بن مالک کی نظر ایک قریشی رئیس زادے حارث بن ہشام مخزومی" کی نئی جوتیوں پر پڑ گئی جو قیمتی اور خوبصورت تھیں۔ انہیں مذاق کرنے اور لوگوں کی توجہ ہٹانے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے عبداللہ بن ابی بن سلول کو مخاطب کر کے کہا۔ دیکھئے جوتیاں ایسی ہونی چاہئیں۔ آپ رئیس مدینہ اور قوم کے سردار ہیں۔ آپ بھی ایسی ہی جوتیاں پہنا کیجئے۔ اس مزاحیہ فقرہ کو حارث نے طنز سمجھا۔ اس نے دونوں جوتیاں نکال کر کعب کی طرف پھینک دیں۔ لو تم پہنو۔ ضرور پہنو۔ خدا کی قسم ضرور پہنو۔

حضرت کعب فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی نے دیکھا کہ حارث کو ناگواری ہوئی ہے تو اس نے مجھے ڈانٹا۔ تم نے خواہ مخواہ ان کو ناراض کر دیا۔ ان کی جوتیاں واپس کر دو۔ میں نے کہا۔ یہ دے چکے ہیں اب میں واپس نہیں کروں گا اور دل میں سوچا یہ فال نیک ہے۔ عنقریب وہ وقت آئے گا کہ میں ان تکلفات کو ان لوگوں سے ختم کر دوں گا۔

بہر حال اس طنز اور مذاق میں اصل بات رل گئی۔ ہماری جان بچ گئی۔ ہم سے کسی نے نہیں پوچھا جب یہ لوگ ہمارے خیموں سے باہر نکل گئے تو طے شدہ پروگرام کے بموجب بیعت کرنے والے حضرات نے کھسکنا شروع کیا۔ قریش کو پھر احساس ہوا۔ وہ پھر دوڑے۔ مگر ہم سب نکل چکے تھے۔ دو آدمی کسی طرح باقی رہ گئے تھے ان کو راستہ میں پکڑ لیا۔ یہ قبیلہ خزرج کے رئیس سعدؓ بن عبادہ تھے اور اسی قبیلہ کے دوسرے صاحب منذر بن عمرو۔ یہ دونوں نقیب بھی منتخب ہوئے تھے۔ حضرت منذر پھر بھی کسی طرح بچکر نکل آئے۔ لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نہ نکل سکے۔ اونٹ کے کجاوہ میں سے چمڑہ کا تسمہ نکال کر ان کی مشکیں کس دیں۔ ان کے سر پر بڑے بڑے بال تھے۔ مارتے پیٹتے اور ان کے بڑے بال کھینچتے ہوئے مکہ میں لے گئے۔ وہاں لوگوں نے بہت ذلیل کیا مارا پیٹا۔ کسی نے موہنہ پر بھی تھوک دیا۔

انہیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص آیا۔ بظاہر نہایت سنجیدہ نیک خصلت، شریف صورت تھا مجھے خیال آیا کہ یہ مجھ پر رحم کریگا اور میری جان چھڑا دیگا۔ مگر ؎

بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی

میرے پاس پہنچا تو اس نے رحم کے بجائے بڑے زور سے کھینچ کر طمانچہ مارا۔ تب میں نے سوچا کہ ان انسان نما وحشیوں میں کم از کم مسلمانوں کے حق میں شرافت کا نام ونشان نہیں رہا۔ ایک اور شخص جو غالباً یہ حرکتیں دیکھتے دیکھتے تھک گیا تھا۔ اس نے کہا کیا مکہ میں تمہارا کوئی حلیف نہیں ہے۔ تب مجھے خیال آیا۔ میں نے کہا۔ میرے بہت سے حلیف ہیں۔ جبیر بن مطعم بن عدی سے میرے تجارتی تعلقات بھی ہیں، حارث بن حرب بن اُمیّہ سے بھی میرے تعلقات گہرے ہیں۔ آپ کی عنایت ہوگی۔ اُن میں سے کسی کو خبر کردو۔ یہ شخص گیا۔ حرم کعبہ کے قریب ہی اُن سے مُلاقات ہوگئی۔ ان کو میرا نام بتایا۔ یہ دونوں آئے اور ان ظالموں سے مجھے نجات دلائی[1]

---

[1] طبقات ابن سعد صفحہ ۱۵۰ ج ۱ یہ تفصیل امام المغازی ابن اسحاق کی روایت سے ماخوذ ہے۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۰ ج ۱

مکہ معظمہ میں اصول کا (پروگرام)

ہاتھ نہیں اٹھا سکتے

تیرہ سال مکہ معظمہ میں گذرے۔ اس طویل مدت میں پروگرام یہ تھا:

۱۔ کُفُّوا اَیدِیَکُم[1] — ہاتھ روکو

۲۔ اَقِیمُوا الصَّلوٰۃ — نماز قائم کرو (اللہ سے تعلق مضبوط کرو)

۳۔ اٰتُوا الزَّکوٰۃ[2] — زکوٰۃ ادا کرو۔

۴۔ وَاَقرِضُوا اللّٰہَ قَرضًا حَسَنًا[3] — اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دیتے رہو۔

مگر اس موقع پر جب بیعت اس پر بھی لی گئی کہ حضرات انصار جس طرح اپنی جانوں اور اپنی اولاد کی حفاظت کرتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی حفاظت کریں گے تو امام المغازی ابن اسحاق رحمۃ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ اس طرف اشارہ تھا کہ ہاتھ روکنے کا پروگرام آئندہ نہیں رہے گا۔ بلکہ ہاتھ اٹھانے کی بھی اجازت ہوگی[4] چنانچہ جب بیعت ہو چکی تو ایک منچلے بہادر

---

[1] سورہ نسا آیت ،، [2] یہ پہلے گذر چکا ہے کہ مکہ معظمہ میں زکوٰۃ کا حکم تو ہوا مگر اس کا نصاب مقرر نہیں کیا گیا۔ نصاب مدینہ طیبہ میں ۲ھ میں مقرر کئے گئے۔ پس مکہ معظمہ میں زکوٰۃ اور قرض حسن کا فرق محض مصرف کے لحاظ سے تھا یعنی غریبوں اور مسکینوں کو جو کچھ دیا جاتا وہ زکوٰۃ اور غلاموں کو خرید کر رہا کرنا یا دوسرے ملی اور اجتماعی کاموں میں خرچ کو قرآن حکیم میں قرض سے تعبیر فرمایا گیا۔ حاصل یہ کہ جو کچھ ہو خرچ کر ڈالو اور جو کچھ خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سے بہتر ملیگا۔ (واللہ اعلم بالصواب) [3] سورۃ المزمل آیت ۲۰ [4] سورہ حج اگرچہ مدنی ہے مگر ماہرین قرآن کی ایک جماعت کی تحقیق یہ ہے کہ اِذنِ قتال کی آیت ۳۸ (اُذِنَ للذین یقاتلون۔ تا آخر) مکہ معظمہ ہی میں نازل ہو چکی تھی یعنی الفاظ بیعت میں جس کی طرف اشارہ تھا اسکے متعلق صریح حکم بھی مکہ معظمہ ہی میں نازل ہو چکا تھا۔ البتہ ابھی عمل کا حکم نہیں ہوا تھا عمل کا حکم جب ہوا جب مدینہ منورہ میں طاقت مجتمع ہو گئی اور محاذ قائم ہو گیا (واللہ اعلم بالصواب) ماخوذ از سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۰۸ ج ۱ ۔

حضرت عباس بن عبادہ بن فضلہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر اجازت ہو تو ہم صبح ہی کو ان لوگوں کو تلوار کے ہاتھ دکھا دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابھی مجھے اس کا حکم نہیں ملا ہے[1]۔

---

[1] یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی احتیاط اور اطاعت شعاری تھی کہ صرف اجازت سے آپ نے فائدہ اٹھانا مناسب نہیں سمجھا بلکہ حکم صریح کے منتظر رہے جو مدینہ میں مرکز قائم ہونے کے بعد ملا۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو

ہجرت مدینہ کی اجازت

فتنہ کفر سے بچنے اور اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے کی خاطر کسی امن کی جگہ جا کر پناہ لینے کا سلسلہ پہلے سے جاری تھا۔ اسی غرض سے ایک جماعت حبشہ گئی تھی اور حضرت ابو سلمہ، حضرت عامر بن ربیعہ، حضرت عبداللہ بن جحش بن رُماب وغیرہم کو جب معلوم ہوا کہ یثرب میں ان کو امن مل سکتا ہے تو وہ بیعتِ عقبہ سے پہلے ہی یثرب چلے آئے تھے۔[1]

پھر جب مدینہ کے چند افراد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی تو آپ نے اس خواہش کا بھی اظہار فرمایا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس ان کے ساتھ چلیں۔ مگر مدینہ کی فضاء خانہ جنگی کے باعث خراب تھی تو ان حضرات نے اس وقت تعمیل فرمائش سے معذرت کر دی تھی لیکن یہ سب باتیں اس وقت تک اس بناء پر تھیں کہ وہاں امن مل جانے کی توقع تھی۔ لیکن جس مقصدِ عظیم کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی اس کو سامنے رکھ کر کس مقام کو مرکز بنایا جائے جو ضرورت کے وقت ایک مضبوط محاذ بھی ثابت ہو سکے یہ اب تک طے نہیں ہوا تھا۔ اسی اثناء میں ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تین مقامات بتائے گئے ہیں کہ ان میں سے کسی کو منتخب کر لو۔ مدینہ۔ بحرین۔ یا قنسرین۔[2] ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ سے ہجرت کر کے ایک ایسے مقام پر جا رہا ہوں جہاں کھجور کے باغات ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ مقام یمامہ ہو گا یا ہجر۔[3] لیکن جس طرح اہلِ مدینہ نے اسلام کا استقبال کیا۔ اُس نے طے کر دیا کہ یہ مرکز وہ ارض پاک ہے۔ جس کو یثرب کہا جاتا تھا۔ جس نے بعد میں مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا غیر فانی اسم گرامی اختیار کیا۔ انتہا یہ کہ مقام عقبہ پر جو

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۱۸۱ ج ۲ فتح الباری ص ۱۸۱ ج ۷ [2] ترمذی شریف و فتح الباری ص ۱۸۱ ج ۷ [3] بخاری شریف ص ۵۵۱

آخری بیعت ہوئی اس میں باقاعدہ وعدہ ہوگیا کہ حضرات مہاجرین وہاں پہنچیں گے اور اہل مدینہ ان کا انتظام کریں گے۔ چنانچہ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی بلکہ ایک اصول طے ہوگیا کہ جو دائرہ اسلام میں داخل ہو اس پر لازم ہے کہ وہ مدینہ منورہ کو اپنا قیام گاہ بنائے[1]۔

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ (روئے انور صلی اللہ علیہ وسلم) کے عاشق جاں نثار اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام۔ یہ ان دونوں سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ مگر اسی اصول کی پابندی نے ان کو ہجرت پر مجبور کیا[2]۔ چنانچہ بیعتِ عقبہ کے بعد ہجرت کرنے والوں میں حضرت بلال، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت سعد کے اسماء گرامی سب سے پہلے ہیں۔ ان کے بعد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیس نفر کے قافلہ کے ساتھ تشریف لائے اور قبا میں رفاعہ بن عبد المنذر کے یہاں فروکش ہوئے[3]۔ پھر رفتہ رفتہ جس کو موقع ملا وہ مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچتا رہا۔ (رضی اللہ عنہم)

شوق استقبال

حضرات انصار نے اس دعوت پر ہی اکتفا نہیں کی جو بیعتِ عقبہ کے سلسلہ میں دے چکے تھے۔ بلکہ بیعت کے بعد جب مدینہ واپس آگئے تو یہاں سے چند حضرات مکہ تشریف لے گئے اور حضراتِ مہاجرین کے ساتھ واپس ہوئے ان کو مہاجر انصاری کہا جاتا ہے[4]۔

---

[1] قرآن حکیم نے سچا مومن اسی کو قرار دیا جو ہجرت کرکے آئے یا ہجرت کرنے والوں کے لئے قیام کا انتظام کرے اور راہِ خدا میں جان اور مال سے جہاد کرے۔ (سورۂ انفال کی آخری آیت)

[2] فتح الباری صفحہ ۲۰۶ ج ۲ [3] ایضاً صفحہ ۲۰۹ ج ۲ [4] ان حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ حضرت ذکوان بن عبد قیس۔ حضرت عقبہ بن وہب بن کلدہ۔ حضرت عباس بن عبادہ بن فضلہ۔ حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہم (ابن سعد صفحہ ۱۵۲ ج ۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا کی تلقین اور ہجرت کا اشارہ

سورۂ اسراء کی چند آیتیں یہ ہیں۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّيْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا۔ (آیات ۷۸ تا ۸۰)

ترجمہ: اے رسول نماز قائم کر سورج ڈھلنے کے وقت سے لے کر رات کے اندھیرے کے وقت تک (ظہر، عصر، مغرب، عشاء کے وقتوں میں) اور نماز فجر میں خاص اہتمام سے قرآن پڑھو۔ بلاشبہ صبح کے وقت تلاوت قرآن ایک ایسی تلاوت ہے۔ جس میں حاضری زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے[2] اور اے نبی رات کا کچھ حصہ (یعنی پچھلا حصہ) شب بیداری میں بسر کر یہ تیرے لئے ایک مزید عمل ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تعالےٰ تجھے ایسے مقام

---

[1] آفتاب پرستوں کی عبادت طلوع آفتاب کے وقت ہوتی ہے اور توحید پرستوں کی عبادت اس سے پہلے ہوتی ہے۔ یا اس وقت جب ان معبودانِ باطل کا زوال ہوتا ہے۔

[2] رات اور دن کے کارپرداز فرشتے اس وقت جمع ہوتے ہیں۔ (بخاری شریف صہ ۶۸۶ ج ۲)

میں پہنچادے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو (جس کی تعریف کی جاتی ہے) اور تیری
دُعا یہ ہونی چاہیئے کہ اے پروردگار (مجھے جہاں کہیں پہونچا تو) سچائی کے ساتھ پہونچا
اور (جہاں کہیں سے نکال تو) سچائی کے ساتھ نکال۔ اور مجھے اپنے حضور سے
قوت عطا فرما ایسی قوت کہ (ہر حال میں) مددگاری کرنے والی ہو۔

(آیات ۷۸ تا ۸۰ سورۃ ۱۷ اسراء)

تشریحات: (۱) سورۂ اسراء جس کا آغاز معراج کے واقعہ سے ہوا۔ اسی کے نویں رکوع کی یہ آیات ہیں جن میں اس دعا کی تلقین ہوئی ہے ربّ ادخلنی مدخل صدق۔ (جہاں سے نکالنا ہو سچائی کے ساتھ نکال اور جہاں پہونچانا ہو سچائی کے ساتھ پہونچا۔ جن میں بقول ابن عباس (رضی اللہ عنہما) ہجرت کا ایماء ہے۔

(۲) معراج شریف ابتلاء اور آزمائش کے اس نازک دور میں ہوئی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے حامی اور مددگار یعنی بنو ہاشم۔ شعب ابی طالب میں پناہ گزین اور محصور تھے اور اہل مکہ اور بالفاظ دیگر پوری دنیا آپ سے بائیکاٹ کئے ہوئے تھی۔

اسی شب میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔ جن کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے۔ ان کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم اور عمل متواتر سے فرمائی۔

شعب ابی طالب میں محصور ہونے کا دور۔ اور اس کے بعد کے سال وہ تھے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کی مظلومیت، لاچارگی اور بے مائیگی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی ایسی حالت میں کون اُمید کر سکتا تھا کہ انہیں مظلومیوں سے فتح اور کامرانی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن وحی الٰہی نے صرف فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہیں تھی بلکہ ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوع انسان کے لئے عظمت اور ارتفاع کی سب سے آخری منزل ہے۔ عسیٰ ان یبعثک ربّک مقاما محمودا۔

---

[۱] ترمذی شریف کتاب التفسیر صفحہ ۱۴۲ ج ۲۔

فضل و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیتِ خلائق کی عالمگیر اور دائمی عظمت حاصل ہو جائے کوئی عہد ہو۔ کوئی ملک ہو۔ کوئی نسل ہو۔ لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستائش ہوگی ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہوگی۔ محمود یعنی سرتاسر محمود ہستی ہو جائے گی۔

ماشئت قل فیہ فانت مصدق فالحب یقضی

والمحاسن تشھد۔

جو تعریف تم کرنا چاہو کرلو۔ تمہاری تعریف درست اور تم راست گو ہوگے

محبت کا یہی تقاضا ہے اور محاسن و کمالات اس کی شہادت دیتے ہیں

یہ مقام انسانی عظمت کی انتہا ہے اس سے زیادہ اونچی جگہ اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی اس سے زیادہ انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی سعی اور ہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ سکتی ہے لیکن یہ بات نہیں پا سکتی کہ روحوں کی ستائش اور دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے خالق کائنات اس کی مدح کرے اور وہ کائنات انسانی کی اس وقت مدد کرے۔ جس وقت ہر ایک نفس خواہ وہ نفس عوام ہو یا نفس خواص کسی ولی مقرب کا نفس ہو یا کسی اولوالعزم نبی مرسل کا نفس۔ نفسی نفسی پکار رہا ہو۔

(۳) جس اولوالعزم نبی اور رسول کے بلند ترین درجات کا زینہ معراج تھا اور سطحِ اعلیٰ مقام محمود۔ اسی کی حیات مقدسہ کا اہم واقعہ "ہجرت" ہے۔

یہ ترکِ وطن معاذ اللہ جان بچانے کے لئے نہیں تھا بلکہ اس جہادِ عظیم کے لئے تھا جس کا ثمرہ مقام محمود ہے۔

یعنی رحمتِ کاملہ اور امن عالم کی وہ مقدس دعوت جس کا نام اسلام ہے جس کے مبلغین اور داعیانِ کرام کی تربیت تیرہ سال تک مکہ کی سنگلاخ امتحان گاہ میں ہوتی رہی، اب وقت آیا ہے کہ اس کو وقفِ عام کیا جائے اور ایک شہر یا ایک علاقہ یا ملک کی تنگنائی سے نکال کر پورے عالم کو اس سے آشنا کیا جائے اور وہ تمام مشقتیں برداشت کی جائیں اور تمام مصیبتیں جھیلی جائیں

جن کی نذر پیش کرنا ایسی غیر معمولی عظیم الشان دعوت کے لئے ضروری ہے جس کی بنا پر رہتی دنیا تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف ہوتی رہے اور قیامت کو مقامِ محمود کا شرف اعظم حاصل ہو۔

یہ ترکِ وطن۔ اسی جہادِ عظیم کے لئے تھا، اسی لئے یہ ایک ایسا شرف تھا کہ اگر اللہ رب العالمین کو منظور نہ ہوتا کہ یہ شرف عطا کیا جائے تو محبوب رب العالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) مکی یا ہاشمی اور قریشی ہونے کے بجائے حضرات انصار میں سے ہوتے[1]

اسی ہجرت نے اس موقف کی بنیاد رکھی جہاں سے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا۔ یا ایھا الناس اِنِّی رَسُولُ اللہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا اَلَّذی لہ ملک السمٰوٰت والارض (سورہ اعراف آیت ۱۵۸)

(اے افرادِ نسلِ انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہت اسی کی ہے۔

مسجد جو اسلامی تعلیمات کے بموجب حیاتِ اجتماعی کی علامت بلکہ شرطِ اوّل ہے! اس ہجرت کے بعد ہی وہ پہلا دن میسر آیا جس میں تاسیسِ مساجد کا سلسلہ شروع کیا گیا[2] اسی پہلے دن کو اسلام کی نشأت اجتماعی کا پہلا دن مانا گیا جس سے اسلامی سنہ (سنہ ہجری) کا آغاز کیا گیا[3]

---

[1] لولا الھجرۃ لکنت امرأً من الانصار۔ بخاری شریف ص ۵۳۳ [2] قال اللہ تعالیٰ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ قال السھلی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ حَلَّ النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم بدار الھجرۃ (تفسیر مظہری) [3] بخاری شریف ص ۵۶۰ حدیث سہل رض)

مخالفین کا منصوبہ

اِنَّهُمْ یَكِیْدُوْنَ كَیْدًا وَّاَكِیْدُ كَیْدًا فَمَهِّلِ الْكٰفِرِیْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَیْدًا۔ (سورہ طارق)[1]

وہ ایک منصوبہ بنا رہے ہیں اور میں ایک منصوبہ بنا رہا ہوں۔ سو ڈھیل دیجئے منکروں کو تھوڑے دن ڈھیل دے دیجئے[2]

وَاِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ۔ وَیَمْكُرُوْنَ وَیَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ۔

سورہ الانفال آیت ۲۹

اور (اے نبی) وہ وقت یاد کرو جب (مکہ میں) کافر تیرے خلاف اپنی چھپی تدبیروں میں لگے تھے کہ تجھے باندھ کر ڈال دیں[3]۔ یا قتل یا جلاوطن کر دیں اور وہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی مخفی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْكَ مِنْهَا تا۔ تَحْوِیْلًا۔ سورہ آیت ۷۶-۷۷۔

اور انہوں نے اس میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی کہ تجھے اس سرزمین (ملک

---

[1] قال ابن عباس هذا وعید من الله عز وجل وقد اخذهم الله یوم بدر (تفسیر مظہری)

[2] البتہ وہ لگے ہیں ایک داؤ کرنے میں اور میں لگا ہوں ایک داؤ کرنے میں۔ سو ڈھیل دے منکروں کو۔ ڈھیل دے ان کو صبر کر (حضرت شاہ عبد القادر)

[3] تجھ کو بٹھا دیں۔ (حضرت شاہ صاحبؒ)

عرب) سے عاجز کرکے نکال دیں اور اگر وہ ایسا کر بیٹھے تو یاد رکھ) تیرے نکل لے جانے کے پیچھے) مہلت نہ پاتے مگر بہت تھوڑی (وہ سب تباہ کر دیئے جاتے) ہم تجھ سے پہلے جو پیغمبر بھیج چکے ہیں ان سب کے معاملہ میں ہمارا قاعدہ یہی رہا ہے اور ہمارے ٹھیرائے قاعدے کو تو بدلتا ہوا نہ پائے گا۔

تشریح : جس قوم نے اپنا نصب العین یہ بنا رکھا تھا کہ اسلام کا نام و نشان مٹا ڈالے اس کی ناکامی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی تھی کہ جس کو وہ مٹانا چاہتی تھی وہ بڑھ رہا تھا پھیل رہا تھا۔ اس کی حفاظت اور ترقی کے مرکز قائم ہو رہے تھے۔

عرب سے باہر افریقہ میں (مملکتِ حبش میں) مسلمانوں کی ایک جماعت پہنچی ہوئی تھی وہ ایک مرجع اور ایک مرکز[1] بن گئی تھی۔ قریش کا نمائندہ وفد جو اس کو اکھاڑنے کے لئے گیا تھا وہ ناکام ہو چکا تھا۔ اب تازہ ناکامی یہ تھی کہ یثرب میں اور خاص ان میں جو نہ صرف قریش کے ہم عقیدہ اور پیرو تھے بلکہ ان میں قریش کی رشتہ داری اور قرابت بھی تھی، اسلام کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کے عزم اور حوصلہ کے ساتھ فدا کاروں کی ایک جماعت منظم ہو چکی تھی۔ وہ سخت جان جو دس بارہ سال تک مکہ میں ہر طرح کی مصیبتیں جھیل کر اور امتحان و آزمائش کی بھٹی میں تپ کر کندن ہو چکے تھے وہ مکہ سے نکل نکل کر یثرب پہنچ رہے تھے اور اس طرح ایک محاذ مضبوط ہو رہا تھا۔ اس پر قریش کے رہنما جتنے بھی خوف زدہ ہوں جتنے بھی چراغ پا ہوں کم تھا۔ کیونکہ زندگی اور موت کا سوال جو پہلے چلمن کے پیچھے سے جھانک

---

[1] حضرتِ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور اُن کے تقریباً تیس ساتھی یمن سے بذریعہ جہاز روانہ ہوئے۔ کہ خدمتِ مبارک میں حاضر ہو کر اسلام قبول کریں مگر بادِ مخالف نے جہاز کو بندرگاہ حجاز کے بجائے افریقہ کی بندرگاہ پر پہنچا دیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت حبش میں موجود ہے تو اس کے پاس پہنچے اور اسلام قبول کرکے اس کے ساتھ رہنے لگے اور فتح خیبر کے موقع پر ۷ھ میں وہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں باریاب ہوئے۔ (بخاری شریف ص۵۴۲ وغیرہ)

رہا تھا، اب بے نقاب ہو کر سامنے آچکا تھا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ قریش کے تمام سردار سر جوڑ کر بیٹھیں اور پوری سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کریں۔ چنانچہ مکہ کے تاریخی پنچایت گھر یا کونسل ہاؤس (دار الندوہ) میں خاص اجلاس طلب کیا گیا۔ ارکانِ ندوہ کے علاوہ دوسرے ہمنوا رہنماؤں کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ ایجنڈا غور طلب اور فیصلہ طلب مسئلہ یہی تھا کہ اسلام اور اس کے داعی کا قصہ کس طرح ختم کیا جائے۔

ربیع الاول کے پہلے ہفتہ میں یہ اجتماع ہوا اور پوری سنجیدگی سے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ چند تجویزیں پیش کی گئیں۔

(۱) محمد[1] (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بیڑیاں پہنا کر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے باندھ کر ڈال دو۔[2]

نجد کا ایک شخص جو وہاں وقت پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ اس سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مقبولیت بڑھے گی، لوگوں کی ہمدردیاں زیادہ ہوں گی۔ اور بہت ممکن ہے اس کے ساتھی کسی طرح اُس کو چھڑا کر لے جائیں۔ اس سے قریش کی بدنامی اور ہوا خیزی ہوگی۔

(۲) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو وطن سے نکال دو۔[3] تمہیں چھٹی مل جائے گی۔ تم اپنا نظام قائم کر سکو گے اور موجودہ انتشار ختم ہو جائے گا۔

نجدی شیخ۔ بہت غلط رائے ہے، وہ ایسا ہوشیار ہے اور اس کے کلام میں ایسی طاقت

---

[1] پیش کرنے والا۔ رئیس قریش ابو البختری۔ مقتول غزوہ بدر۔ [2] لِیُثْبِتُوْکَ۔

[3] اَوْ یُخْرِجُوْکَ (قرآن حکیم) نیز آخری آیت وان کادوا لیستفزونک من الارض۔ پوراترجمہ اوپر گذر چکا ہے اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز بھی کافی اہمیت اختیار کر چکی تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان اور عاجز کر کے سرزمین عرب سے ہی نکال دیں بظاہر اس پر عمل اس لئے نہیں ہوا کہ اس میں یہ خطرہ محسوس کیا گیا کہ یہ جہاں پہنچ جائیں گے وہاں اپنا مرکز قائم کر کے حملہ کر دیں گے اور قریش کو تباہ کر دیں گے۔ مگر ارشاد ربانی کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت حق جل مجدہٗ اس قوم عرب یا قبیلہ قریش کو برباد کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے یہ تجویز منظور نہیں کی گئی کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو سنت اللہ یہ ہے کہ وہ قوم برباد ہو جاتی ہے جو اپنے نبی کو جلا وطن کر دے۔

ہے کہ جہاں جائے گا اپنا جتھا بنا لے گا۔ تمہارے لئے عذاب بن جائے گا۔

(۳) ابو جہل۔ میری تو قطعی رائے یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام تمام کر دیا جائے باقی یہ خطرہ کہ اس کے ولی (بنو ہاشم) انتقام لیں گے اور اس طرح قبائلی جنگ بھڑک اٹھے گی۔ تو اس سے نجات کی صورت یہ ہے کہ کسی ایک قبیلہ کے آدمی قتل نہ کریں۔ بلکہ ہر ایک قبیلہ سے آدمی منتخب کئے جائیں۔ یہ سب مل کر حملہ کریں۔ اس صورت میں خون کی ذمہ داری سب پر ہوگی بنو ہاشم اس اجتماعی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ لا محالہ دیت اور خون بہا طے ہو گا۔ جس کو ہم لا محالہ سب مل کر ادا کریں گے۔

تمام اراکین نے ابو جہل کی تجویز سے اتفاق کیا اور اس کی تیاری شروع کر دی[1]۔

---

[1] البدایۃ والنہایہ ص۱۷۵ و ص۱۷۶ ج ۳ وغیرہا من کتب السیر۔

مخرجِ صدق مکّہ سے ہجرت اور امدادِ خداوندی

اَخرِجنِی مُخرَجَ صِدقٍ ۔ (سورہ ۱۷ اسرائیل آیت ۸۰)

(اے رب جہاں سے تو مجھ کو نکالے تو سچائی کے ساتھ نکال)

اِلَّا تَنصُرُوہُ فَقَد نَصَرَہُ اللّٰہُ اِذ اَخرَجَہُ الَّذِینَ کَفَرُوا ۔

(سورہ ۹ توبہ آیت ۴۰)

اگر تم مدد نہ کرو گے رسُول کی تو اللہ نے اس کی مدد کی ہے جب نکالا اسکو کافروں نے

گرمیوں کا موسم، ستمبر کی ۱۳ تاریخ[1]، ربیع الاوّل کی یکم۔ پیر کا دن۔ مکہ والے گرمیوں میں مکان سے باہر ڈیوڑھیوں کے سامنے یا راستہ کے کنارے پر چارپائیاں بچھا لیتے ہیں اور آدھی رات تک گپ شپ کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ ہے کہ تہائی رات تک نمازِ عشاء سے فارغ ہو جاتے ہیں پھر کچھ سورتوں کی تلاوت فرماتے ہوئے باوضو بستر پر اور عموماً کھری چارپائی پر آرام فرماتے ہیں۔ اس وقت کچھ آنکھ لگ جاتی ہے۔ صحن میں آپ تنہا ہی ہوتے ہیں یا آپ کی زوجہ مطہرہ۔ لیکن آج خلافِ معمول آرام نہیں فرما رہے اور آج آپ تنہا بھی نہیں ہیں۔ آپ کے چچازاد بھائی (حضرت علی رضی اللہ عنہ) جن کی عمر تقریباً بائیس ۲۲ سال ہے وہ بھی حاضر ہیں۔ اور کچھ باتیں ہو رہی ہیں۔

---

[1] جو حضرات سفرِ ہجرت کے رفقاء یا اس سفر کے مددگار تھے انہوں نے تاریخ یا دن نہیں بیان کیا۔ دوسرے حضرات نے بیان کیا ہے۔ چونکہ ڈائری یا روزنامچہ کا رواج نہیں تھا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تقویمات (جنتریوں) میں اختلاف رہتا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر تاریخوں کے بیان میں اختلاف ہو گیا۔

ہم نے تقویم ہجری و عیسوی مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی صاحب ایم اے (عثمانیہ) کے لحاظ سے یہ تاریخ اور دن مقرر کیا ہے (واللہ اعلم بالصواب)

جیسے خساب سجھا رہے ہیں۔

دوسری طرف عجیب بات یہ ہے کہ مکان سے باہر کچھ آدمی آرہے ہیں' تلواریں ان کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ نہایت خاموشی سے آتے ہیں اور دروازے کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ دس بارہ آدمی آگئے ہیں ان میں ابوجہل بھی ہے ابولہب بھی۔ اور عقبہ بن ابی معیط اور امیہ بن خلف بھی۔ اُن میں سے کوئی اٹھتا ہے اور کواڑوں کی دراز سے اندر جھانکتا ہے۔

اب آدھی رات گزر چکی ہے۔ آخری پہر شروع ہو گیا ہے۔ پورے مکہ پر سناٹا چھا گیا۔ یہ کافر جو باہر آگئے تھے۔ غالباً کھڑے کھڑے تھک گئے اس لئے قطار لگا کر دروازہ کے سامنے بیٹھ گئے ہیں دفعتہً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹاتے ہیں۔ اپنی چادر ان کے اوپر ڈال دیتے ہیں۔ پھر دروازہ سے باہر تشریف لاتے ہیں۔ سورہ یٰسین تلاوت فرما رہے ہیں اور جب کافروں کی برابر پہنچتے ہیں تو یہ آیت زبان مبارک پر ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ
سَدًّا فَأَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (سورہ یٰسین ۳۶ آیت ۹)

(ترجمہ) کردی ہم نے ان کے آگے دیوار اور اُن کے پیچھے دیوار پھر اوپر سے ڈھانک دیا۔ سو اُن کو نظر نہیں آتا۔

اب نہیں کہا جا سکتا کہ ان کافروں کو نیند آگئی تھی یا جیسا کہ آیت کا مفہوم ہے ان کی آنکھوں کے سامنے دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ لیکن جو اطمینان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے قدرت نے کوئی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ جس کو آپ محسوس فرما رہے ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ اطمینان کی بھی انتہا ہو گئی کہ آپ یونہی نہیں گذر جاتے بلکہ دستِ مبارک میں مٹی لیتے ہیں اور ہر ایک کے سر پر مٹی رکھتے ہوئے تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ نبی کا اعتماد۔ وثوق اور یقین ہے خدا پر اور خدا کے کلام پاک پر۔[1]

---

[1] ابن سعد و ابن ہشام (وغیرہ)

خدا پر بھروسہ اور اطمینان کی دوسری مثال۔ یہ نوجوان (علی رضی اللہ عنہ) پیش کر رہے ہیں کہ وہ بستر پر آرام سے لیٹے ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ آج کی شب، شب مقتل ہے۔ دشمن اسی لئے اکٹھے ہو رہے ہیں کہ اس بستر والے کو ذبح کریں، آرام گاہ کو ذبح خانہ بنائیں۔ بستر والا نہ ہو تو جو بستر پر ہو گا وہ ذبح ہو گا۔ مگر یا تو اللہ کی حفاظت پر اطمینان کامل ہے۔ یا دیدار محبوب کے شوق مضطر نے موت کو بھی محبوب بنا دیا ہے۔

اگر مشاہدۂ دوست از پس مرگ است
حیات خضر و مسیحا نصیب دشمن باد

یہی تسکین بخش اطمینان ہے کہ جیسے ہی لیٹتے ہیں سو جاتے ہیں۔ خدا جانے کتنی دیر تک یہ دشمن جو تلواریں لئے ہوئے تھے غافل بیٹھے رہے! انھیں ایک شخص نے آ کر چونکایا جس نے خبر دی کہ جس کو تم قتل کرنے آئے تھے وہ نکل گیا اور تمہاری غفلت کی انتہا ہے کہ خاک تمہارے سروں پر ہے اور تمہیں خبر نہیں! اب یہ گھبرا کر اٹھے۔ سروں پر ہاتھ پھیرے تو خاک آلود تھے۔ یقین ہو گیا کہ یہ شخص سچ کہتا ہے۔ دروازہ دیکھا تو وہ بھی کھلا ہوا تھا۔

کسی کے مکان میں گھسنا بہت معیوب تھا مگر یہ لوگ ضابطۂ اخلاق سے دامن جھاڑ کر خاص منصوبہ کے تحت آئے تھے اور اب ناکامی کی جھونجل بھی تھی۔ غصہ اور جوش میں اندر گھس گئے دیکھا کہ ایک سن رسیدہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم فداہٗ روحی) کی جگہ خواجہ ابوطالب کا سب سے چھوٹا لڑکا "علی" بستر پر دراز خراٹے لے رہا ہے۔

سو اس باختہ دشمنوں نے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ پوچھا "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ مجھے کیا خبر؟ جواب صحیح تھا، انہیں خبر نہیں تھی۔ بہت پوچھ گچھ کی ڈرایا۔ دھمکایا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کچھ نہیں بتا سکے۔

یہاں سے دوڑے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے۔ ایک لڑکی (بڑی صاحبزادی حضرت اسماء) سامنے آئی۔ پوچھا۔ تمہارے باپ کہاں ہیں؟ مجھے خبر نہیں۔ لڑکی نے

جواب دیا۔ ابوجہل نے اس معصومہ کے اتنی زور سے طمانچہ مارا کہ کان کی بالی گر گئی[1]

جب ان بدبختوں کو یقین ہو گیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا تو اس کی تلاش میں دوڑے۔ مکہ کی گلی گلی چھان ماری اور جب کہیں پتہ نہ چلا تو فوراً منادی کرادی کہ جو محمد اور اس کے ساتھی کو زندہ گرفتار کرکے لائے یا ان کا سر لائے اس کو (ایک دیت کے بموجب) سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔ سو اونٹ کا انعام معمولی نہیں تھا۔ انعام کے شوق میں بہت سے من چلے دوڑے مگر کامیابی کسی کو بھی نہیں ہوئی۔ کیونکہ رب محمد۔ اپنے محمد کی مدد کر رہا تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)[2]

یہی تو ہے ارشادِ خداوندی۔ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی) اور وہ جو دعا بتائی گئی تھی جس کا ایک جز تھا۔ وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيْرًا (اور مجھے اپنے حضور سے قوت عطا فرما ایسی قوت جو ہر حال میں میری مددگار ہو) تو اس اطمینان سے زیادہ جس سے پوری طرح مسلح ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بستر سے اٹھے اور روانہ ہوتے تھے۔ سلطانِ نصیر[3] کیا ہو سکتا ہے۔

صادق و امین کی امانتداری

دشمنوں نے اگرچہ یہ خطاب[4] اب چھوڑ دیا تھا۔ مگر آپ کی صداقت و امانت ان دشمنوں کی خاطر نہیں تھی بلکہ اس لئے

---

[1] ابن سعد و ابن ہشام وغیرہ [2] بخاری شریف ص۵۵۴ [3] ایسی قوت جو ہر حال میں مددگار ہو۔

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ عجیب بات ہے اللہ تعالیٰ نے میرے نام کو سب و شتم سے بچا لیا ان کو میرا نام لینا گوارا نہیں ہوتا یہ مذمم کو برا بھلا کہتے ہیں۔ حالانکہ میں محمد ہوں میرا نام مذمم نہیں۔ بخاری شریف ص۵۰۱

[4] یہ خطاب استعمال نہیں کرتے تھے مگر آپ کی صداقت و امانت سے انکار نہیں تھا۔ مانتے تھے۔ جانتے تھے۔ پہچانتے تھے کہ آپ صادق و امین ہیں۔ اسی پر تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (سورہ مومنون) (کیا ان لوگوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں ہے کہ اس کا انکار کرتے ہیں) قرآن حکیم نے اصل مرض کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انداداً من دون اللہ (معبودانِ باطل) کی محبت ان لوگوں سے یہ حرکتیں کراتی تھی۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا (باقی بر صفحہ آئندہ)

تھی کہ آپ کی فطرتِ مبارکہ کا جوہر تھی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو سمجھا رہے تھے وہ ان امانتوں کا حساب ہی تھا جو انہیں دشمنوں کی آپ کے پاس تھیں، جو اب منصوبہ قتلِ ناحق کو کامیاب بنانے کے درپے تھے۔ آپ نے اس خطرناک اور ہیبت ناک فضا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسی لئے چھوڑا تھا کہ جن کی امانتیں ہیں ان کو واپس کر کے اور پوری طرح حساب سمجھا کر تشریف لائیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تین دن بعد روانہ ہوتے جب امانتیں ادا کر چکے اور حساب سمجھا چکے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورۂ بقرہ ۲۰۴) (کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو مانتے ہیں جن کو انھوں نے خدا کا شریک ٹھیرا رکھا ہے اور ان سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہیئے اور جو ایمان والے ہیں وہ بہت سخت ہوتے ہیں اللہ کی محبت میں۔ حبِ انداد یعنی معبودانِ باطل کی محبت اور خدا کی محبت میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اللہ سے محبت کرنے والا ہٹ دھرمی نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ کا حکم ہے کہ ہر موقع پر عدل و انصاف سے کام لو۔ حق کی شہادت دینے والے ہو کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ اور معبودانِ باطل کا کوئی حکم ہی نہیں اگر ہے تو باطل پرستی لہٰذا وہ جو کچھ کر بیٹھے کم ہے۔

غار ثور میں قیام اور ضروری انتظامات

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔

صرف دو تھے دو میں سے ایک اللہ کے رسول تھے۔ جب کہ دونوں غار میں تھے اور اللہ کے رسول اپنے صاحب (ساتھی) سے کہہ رہے تھے غمگین نہ ہو۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

انبیأ علیہم السلام خدا پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے متوکل بلکہ آداب توکل کے معلم اور متوکلین کے امام و پیشوا ہوتے ہیں۔ اس غیر معمولی توکل اور اعتماد کے نتیجہ میں غیبی تائید اور نصرتِ خداوندی کی وہ غیر معمولی صورتیں بھی پیش آتی رہتی ہیں جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں جن کو معجزہ کہا جاتا ہے اس کے باوجود وہ ظاہری اور مادی اسباب کو نظر انداز نہیں کرتے کیونکہ وہ صرف خانقاہ نشین درویش نہیں ہوتے ان کی زندگی صرف ان کے لئے نہیں ہوتی وہ نوعِ انسان کے معلم ہوتے ہیں اور ان کی زندگی پوری نوعِ انسان کیلئے سبق ہوتی ہے مکان سے نکلتے وقت قدرت نے خاص طرح کی مدد کی مگر آپ نے اور آپ کے رفیقِ خاص نے روپوش رہنے اور خفیہ روانگی کا جو نظام قائم کیا تھا وہ اُمت کیلئے بہترین سبق ہے۔ اس کی تفصیل خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے۔

دارالندوہ کا وہ اجلاس جس میں آپ کے متعلق غیر معمولی تجویز منظور کی گئی اور مشترک طور پر شہید کرنے کا منصوبہ طے کیا گیا۔ وہ غالباً صبح کے وقت ہوا۔ اس کی اطلاع بطور تائید غیبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فوراً ہی ہوگئی[1] اور فوراً ہی آپ نے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ

---

[1] ابن سعد کی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ منصوبہ طے کر کے لوگ منتشر ہوگئے (اجلاس ختم ہوگیا) جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ یہ خبر سنائی اور کہا کہ آج کی شب اپنے اس بستر پر آرام نہ فرمائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے ص۱۵۳ ج ۱ اس تفصیل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اجلاس صبح کے وقت ہوا۔ ۲ بخاری شریف ص۵۵۲ تا ۵۵۴

روزانہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ مگر صبح یا شام کو۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ ٹھیک دوپہر کے وقت تشریف لا رہے ہیں۔ سر مبارک پر کپڑا ڈالے ہوئے ہیں چہرہ مبارک کو بھی کچھ کپڑے سے چھپائے ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خبر دی گئی۔ فوراً حاضر ہوتے یا رسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان یہ ناوقت تشریف آوری کیسی ؟

ارشاد ہوا۔ کچھ بات کرنی ہے۔ تنہائی ہونی چاہیئے۔ کوئی غیر آدمی ہو تو اُسے ہٹا دو۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ غیر کوئی نہیں۔ دو لڑکیاں ہیں۔ ایک آپ کی خادمہ عائشہ۔ دوسری اس کی بہن اسماء۔

فرمایا تمہیں معلوم ہے ؟ مجھے ہجرت کی اجازت مل گئی ہے۔[1]

صدیق اکبر۔ یہ خادم ساتھ رہے گا[2] آپ پر میرے باپ قربان یا رسول اللہ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ بہت اچھا۔

یہ اجازت ایسی بشارت تھی کہ فرطِ مسرت سے حضرت ابوبکر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا کہ خوشی میں آنسو آجاتے ہیں۔[3]

پھر صدیق اکبر نے عرض کیا۔ دو سانڈنیاں تیار ہیں۔ ان میں سے ایک منظور فرمایئے۔

---

[1] یعنی آج یہ سفر اس لئے نہیں ہے کہ دشمنوں نے قتل کا منصوبہ بنا رکھا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اب تک ہجرت کی اجازت نہیں تھی۔ آج مل گئی ہے۔ اور اگر دارالندوہ کا اجلاس رات کے وقت ہوا تھا تو اگرچہ اس کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فوراً مل گئی تھی مگر دوپہر تک آپ نے روانگی کا قصد اس لئے نہیں کیا کہ اب تک ہجرت کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اب جیسے ہی اجازت ملی آپ نے تیاری شروع کر دی واللہ اعلم بالصواب [2] یہ ہے عشقِ رسول۔ اہل و عیال مال اور جائداد وغیرہ کا کوئی تصور سامنے نہیں تھا۔ قلب مضطر کی تڑپ صرف یہ ہے الصحابۃ بابی انت یا رسول اللہ (بخاری شریف ص ۵۵۳) آپ کی رفاقت۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان یا رسول اللہ [3] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹۱ ج ۱ - [4] یہ پہلے گذر چکا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چار ماہ پہلے یہ سانڈنیاں خرید چکے تھے اور اس خیال سے کہ نہ معلوم کس وقت حکم ہو جاتے ان اونٹنیوں کو چرواہے کے سپرد نہیں کیا تھا بلکہ گھر پر کھڑا کر کے ان کو چارہ کھلاتے رہے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ ضرور۔ مگر قیمت لینی ہوگی۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے بڑی تیزی سے سامانِ سفر کی تیاری شروع کردی اور جلدی جلدی میں جو ناشتہ تیار ہو سکتا تھا، وہ تیار کرلیا۔[2] پھر ہم نے چمڑے کے تھیلے میں ناشتہ بھر دیا۔ ایک مشکیزے میں پانی بھر دیا۔ لیکن تھیلے کا منہ بند کرنے کیلئے کپڑے کی ضرورت تھی اور مشکیزے میں بھی تسمہ نہیں تھا۔[3] جس سے اس کو اٹھایا جا سکے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی ہمشیرہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے فوراً اپنے نطاق[4] کے دو حصے کر لئے۔ ایک میں کھانے کا تھیلہ باندھ دیا۔ دوسرے میں مشکیزہ باندھ دیا تاکہ اس کو اٹھایا جا سکے۔[5]

روانگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دولت کدہ سے روانہ ہو کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے۔ پھر یہ دونوں مکان کی پشت کی طرف سے کھڑکی سے نکل کر کوہ ثور کی طرف روانہ ہوگئے جو مکہ معظمہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے اور جس کی چوٹی پر یہ غار ہے جس نے غارِ ثور کے نام سے غیرفانی شہرت حاصل کی۔[6]

---

[1] واقدی کی روایت یہ ہے کہ ان دونوں کی قیمت آٹھ سو درہم تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سانڈنی منظور فرمائی وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی قشیر سے خریدی تھی اس کا نام قصواء رکھا گیا۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری میں آخر تک رہی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بہت کم زندہ رہی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اس کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ فتح الباری ص۱۸۴ ج۷

[2] پراٹھے نہیں تھے صرف ابلا ہوا یا بھنا ہوا بکری کا گوشت تھا۔ (فتح الباری بحوالہ واقدی ص۱۸۴ ج۷

[3] لیس فیھا عصام (سیرۃ ابن ہشام ص۲۹۲ ج۱) [4] نطاق خاص قسم کا تہبند ہوتا تھا اس کا عرض تقریباً ڈھائی میٹر (۱۰۰ انچ) ہوتا تھا۔ اس کو بیچ میں سے باندھ دیا جاتا۔ پھر اوپر کا حصہ نیچے لٹکا دیا جاتا جس سے یہ دہرا ہو جاتا تھا۔ مجمع البحار و فتح الباری ص۱۸۴ ج۷ [5] یہ ایثار عند اللہ مقبول ہوا۔ چنانچہ آپ کا خطاب ذات النطاقین ہوگیا (بخاری شریف ص۵۵۴) [6] سیرۃ ابن ہشام ص۲۹۱ ج۱ البدایۃ والنہایہ ص۱۸۰ ج۳۔

جب آپ روانہ ہوئے تو یہ دُعا زبانِ مبارک پڑھی۔[1]

اَلحمدُ للہ الّذی خَلَقَنِیْ وَلَمْ اَکُ شَیْئًا اَللّٰھُمَّ اَعِنّیْ عَلٰی ھَوْلِ الدُّنیا وَبَوائقِ الدھرِ وَمَصَائِبِ اللَّیَالِی والایام ۔ اَللّٰھُمَّ اصْحَبْنِیْ فِی سَفَرِیْ وَ اخْلُفْنِیْ فِیْ اَھْلِیْ وَبَارِکْ لِیْ فیما رَزَقْتَنِیْ وَلَکَ فذللنی وعلی صالح خلقی فقوّمنی والیک ربّ فحبّبنی والی الناس فلا تکلنی ربّ المُستَضعَفِیْن وانت ربّی اعوذ بوجھک الکریم الذی اشرقت لہ السمٰوٰت والارض

---

[1] سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۹ جلد ۱ البدایۃ والنہایۃ صفحہ ۱ جلد ۳

[2] ترجمہ۔ اس خدا کی حمد جس نے مجھے پیدا کیا، درآنحالیکہ میں کچھ بھی نہیں تھا (مجھے نیست سے ہست کیا) اے اللہ میری مدد فرما، دنیا کی دہشت، زمانہ کے ہلاکت انگیز واقعات رات اور دنوں (گردش روز و شب) کی مصیبتوں کے مقابلہ پر اے اللہ تو میرا ساتھی بن میرے سفر میں اور میرا قائم مقام بن میرے اہل و عیال میں میرے بعد (میری غیبوبت میں تو ان کا محافظ اور نگران رہ) اور اے اللہ جو تو مجھ کو رزق دے اس میں برکت عطا فرما اور اے اللہ صرف اپنی ذات کے لئے ہی ایسا کر مجھے اپنا مطیع اور اپنے سامنے عاجز بنا کسی اور کے سامنے مجھے عاجز اور ذلیل نہ کر۔ اے اللہ نہایت صالح اور مناسب اعمال پر میری تربیت فرما۔ افعالِ خیر کے بہترین سانچے میں مجھے ڈھال دے۔ اور اے میرے رب صرف اپنی طرف کی محبت ہی میرے اندر بھر دے اور جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے اے اللہ مجھے تو ان کے حوالے مت کر۔ اے کمزوروں کے رب تو ہی میرا رب ہے۔ میں تیری اس باعزت ذات کی (جس کی برکت سے آسمان اور زمین روشن ہیں اور جس سے تمام تاریکیاں فنا ہو جاتی ہیں اور جس کے فضل و کرم سے پہلے لوگوں اور بعد والوں کا سب کا معاملہ درست ہوا) پناہ لیتا ہوں اس سے کہ میرے اوپر تیرا غضب اور تیری ناراضگی نازل ہو۔ میں تیری پناہ لیتا ہوں اس سے کہ تیرا انعام مجھ کو نصیب نہ ہو یا اس سے کہ تیرا عتاب دفعتًہ مجھ پر نازل ہو جائے اور پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ تیری معافی جو مجھے میسر ہے اس میں تبدیلی آجائے اور میں ایسی ہر چیز سے پناہ چاہتا ہوں جو تیری ناراضی کا سبب ہو۔ انجام کار تیرے ہی لئے ہے میں جہاں تک میرے امکان میں ہے خیر اور بھلائی ہی کی کوشش کرتا ہوں (مگر) تیرے بغیر نہ کوئی طاقت ہے نہ کوئی قوت ہے جو کچھ قوت و طاقت ہے وہ تجھ سے ہی ہے۔"

میں پہنچا دے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو اجس کی تعریف کی جاتی ہے اور تیری
دُعا یہ ہونی چاہیئے کہ اے پروردگار (مجھے جہاں کہیں پہونچا تو) سچائی کے ساتھ پہونچا
اور (جہاں کہیں سے نکال تو) سچائی کے ساتھ نکال۔ اور مجھے اپنے حضور سے
قوت عطا فرما ایسی قوت کہ (ہر حال میں) مددگاری کرنے والی ہو۔

(آیات ۷۸ تا ۸۰ سورۃ ۱۷ اسراء)

تشریحات: (۱) سورۂ اسراء جس کا آغاز معراج کے واقعہ سے ہوا۔ اسی کے نویں رکوع کی یہ آیات ہیں جن میں اس دعا کی تلقین ہوئی ہے رب ادخلنی مدخل صدق۔ (جہاں سے نکالنا ہو سچائی کے ساتھ نکال اور جہاں پہونچانا ہو سچائی کے ساتھ پہونچا۔ جن میں بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما ہجرت کا ایماء ہے۔

(۲) معراج شریف ابتلاء اور آزمائش کے اس نازک دور میں ہوئی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے حامی اور مددگار یعنی بنو ہاشم شعب ابی طالب میں پناہ گزین اور محصور تھے اور اہل مکہ اور بالفاظ دیگر پوری دنیا آپ سے بائیکاٹ کئے ہوئے تھی۔

اسی شب میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔ جن کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے۔ ان کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم اور عمل متواتر سے فرمائی۔

شعب ابی طالب میں محصور ہونے کا دور۔ اور اس کے بعد کے سال وہ تھے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کی مظلومیت، لاچارگی اور بے مائگی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی ایسی حالت میں کون اُمید کر سکتا تھا کہ انہیں مظلومینوں سے فتح اور کامرانی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن وحی الٰہی نے صرف فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی غیر معمولی عظمت نہیں تھی بلکہ ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوع انسان کے لئے عظمت اور ارتفاع کی سب سے آخری منزل ہے۔ عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا۔

لہ ترمذی شریف کتاب التفسیر ص ۱۴۲ ج ۲۔

فضل و کمال کا ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیتِ خلائق کی عالمگیر اور دائمی عظمت حاصل ہو جائے کوئی عہد ہو۔ کوئی ملک ہو۔ کوئی نسل ہو۔ لیکن کروڑ ہا دلوں میں اس کی ستائش ہوگی ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہوگی۔ محمود یعنی سر تا سر محمود ہستی ہو جائے گی۔

ماشئت قل فیہ فانت مصدق فالحب یقضی

والمحاسن تشہد۔

جو تعریف تم کرنا چاہو کرلو۔ تمہاری تعریف درست اور تم راست گو ہوگے

محبت کا یہی تقاضا ہے اور محاسن و کمالات اس کی شہادت دیتے ہیں

یہ مقام انسانی عظمت کی انتہا ہے اس سے زیادہ اونچی جگہ اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی اس سے زیادہ انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی سعی اور ہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ سکتی ہے لیکن یہ بات نہیں پا سکتی کہ روحوں کی ستائش اور دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے خالق کائنات اس کی مدح کرے اور وہ کائنات انسانی کی اس وقت مدد کرے۔ جس وقت ہر ایک نفس خواہ وہ نفس عوام ہو یا نفسِ خواص کسی ولی مقرب کا نفس ہو یا کسی اولوالعزم نبی مرسل کا نفس۔ نفسی نفسی پکار رہا ہو۔

(۳) جس اولوالعزم نبی اور رسول کے بلند ترین درجات کا زینہ معراج تھا اور سطح اعلیٰ مقام محمود۔ اسی کی حیات مقدسہ کا اہم واقعہ "ہجرت" ہے۔

یہ ترکِ وطن معاذ اللہ جان بچانے کے لئے نہیں تھا بلکہ اس جہادِ عظیم کے لئے تھا جس کا ثمرہ مقام محمود ہے۔

یعنی رحمتِ کاملہ اور امن عالم کی وہ مقدس دعوت جس کا نام اسلام ہے جس کے مبلغین اور داعیانِ کرام کی تربیت تیرہ سال تک مکہ کی سنگلاخ امتحان گاہ میں ہوتی رہی، اب وقت آیا ہے کہ اس کو وقفِ عام کیا جائے اور ایک شہر یا ایک علاقہ یا ملک کی تنگنائی سے نکال کر پورے عالم کو اس سے آشنا کیا جائے اور وہ تمام مشقتیں برداشت کی جائیں اور تمام مصیبتیں جھیلی جائیں

جن کی نذر پیش کرنا ایسی غیر معمولی عظیم الشان دعوت کے لئے ضروری ہے جس کی بنا پر رہتی دنیا تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف ہوتی رہے اور قیامت کو مقامِ محمود کا شرف اعظم حاصل ہو۔ یہ ترکِ وطن۔ اسی جہادِ عظیم کے لئے تھا، اسی لئے یہ ایک ایسا شرف تھا کہ اگر اللہ رب العالمین کو منظور نہ ہوتا کہ یہ شرف عطا کیا جائے تو محبوب رب العالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) ہاشمی اور قریشی ہونے کے بجائے حضرات انصار میں سے ہوتے[1]

اسی ہجرت نے اس موقف کی بنیاد رکھی جہاں سے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا۔ یا ایھا الناس اِنِّی رَسُولُ اللّٰہِ اِلَیکُمْ جمیعاً الّذی لہ ملک السمٰوٰت والارض (سورہ اعراف آیت ۱۵۸)

(اے افرادِ نسلِ انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہت اسی کی ہے۔

مسجد جو اسلامی تعلیمات کے موجب حیاتِ اجتماعی کی علامت بلکہ شرطِ اوّل ہے اس ہجرت کے بعد ہی وہ پہلا دن میسر آیا جس میں تاسیسِ مساجد کا سلسلہ شروع کیا گیا[2] اسی پہلے دن کو اسلام کی نشأت اجتماعی کا پہلا دن مانا گیا جس سے اسلامی سنہ (سنہ ہجری) کا آغاز کیا گیا[3]

لہ لولا الھجرۃ لکنت امرأ من الانصار۔ بخاری شریف ص۵۳۴ ۲ قال اللہ تعالیٰ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْویٰ مِنْ اوّل یوم قال السھلی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ حَلَّ النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم بدار الھجرۃ (تفسیر مظہری) ۳ بخاری شریف ص۵۶۰ حدیث سہل

مخالفین کا منصوبہ

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا۔ (سورہ ۸۶ طارق)

وہ ایک منصوبہ بنا رہے ہیں اور میں ایک منصوبہ بنا رہا ہوں۔ سو ڈھیل دیجئے منکروں کو تھوڑے دن ڈھیل دے دیجئے[1]

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ۔ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔

سورہ ۸ الانفال آیت ۲۹

اور (اے نبی) وہ وقت یاد کرو جب (مکہ میں) کافر تیرے خلاف اپنی چھپی تدبیروں میں لگے تھے کہ تجھے باندھ کر ڈال دیں[2]۔ یا قتل یا جلا وطن کر دیں اور وہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی مخفی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا تا۔ تَحْوِيْلًا۔ سورہ ۱۷ آیت ۷۶۔ ۷۷۔

اور انہوں نے اس میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی کہ تجھے اس سرزمین (ملک

---

[1] قال ابن عباس ھذا وعید من اللہ عز وجل و قد اخذھم اللہ یوم بدر (تفسیر مظہری)

[1] البتہ وہ لگے ہیں ایک داؤ کرنے میں اور میں لگا ہوں ایک داؤ کرنے میں۔ سو ڈھیل دے منکروں کو۔ ڈھیل دے ان کو صبر کر (حضرت شاہ عبد القادرؒ)

[2] تجھ کو بٹھا دیں۔ (حضرت شاہ صاحبؒ)

عرب سے عاجز کرکے نکال دیں اور اگر وہ ایسا کر بیٹھتے تو (یاد رکھ) تیرے نکل لے
جانے کے پیچھے (مہلت نہ پاتے مگر بہت تھوڑی (وہ سب تباہ کر دیئے جاتے)
ہم تجھ سے پہلے جو پیغمبر بھیج چکے ہیں ان سب کے معاملہ میں ہمارا قاعدہ یہی رہا ہے
اور ہمارے ٹھہرائے قاعدے کو تو بدلتا ہوا نہ پائے گا۔

تشریح: جس قوم نے اپنا نصب العین یہ بنا رکھا تھا کہ اسلام کا نام و نشان مٹا ڈالے اس کی ناکامی اس سے زیادہ کیا ہوسکتی تھی کہ جس کو وہ مٹانا چاہتی تھی وہ بڑھ رہا تھا پھیل رہا تھا۔ اس کی حفاظت اور ترقی کے مرکز قائم ہو رہے تھے۔

عرب سے باہر افریقہ میں (مملکت حبش میں) مسلمانوں کی ایک جماعت پہنچی ہوئی تھی وہ ایک مرجع اور ایک[1] مرکز بن گئی تھی۔ قریش کا نمائندہ وفد جو اس کو اکھاڑنے کے لئے گیا تھا وہ ناکام ہو چکا تھا۔ اب تازہ ناکامی یہ تھی کہ یثرب میں اور خاص ان میں جو نہ صرف قریش کے ہم عقیدہ اور پیرو تھے بلکہ ان میں قریش کی رشتہ داری اور قرابت بھی تھی، اسلام کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کے عزم اور حوصلہ کے ساتھ فداکاروں کی ایک جماعت منظم ہو چکی تھی۔ وہ سخت جان جو دس بارہ سال تک مکہ میں ہر طرح کی مصیبتیں جھیل کر اور امتحان و آزمائش کی بھٹی میں تپ کر کندن ہو چکے تھے وہ مکہ سے نکل نکل کر یثرب پہنچ رہے تھے اور اس طرح ایک محاذ مضبوط ہو رہا تھا۔ اس پر قریش کے رہنما جتنے بھی خوف زدہ ہوں جتنے بھی چراغ پا ہوں کم تھا۔ کیونکہ زندگی اور موت کا سوال جو پہلے چلمن کے پیچھے سے جھانک

---

[1] حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور اُن کے تقریباً تیس ساتھی یمن سے بذریعہ جہاز روانہ ہوئے۔ کہ خدمتِ مبارک میں حاضر ہوکر اسلام قبول کریں مگر بادِ مخالف نے جہاز کو بندرگاہِ حجاز کے بجائے افریقہ کی بندرگاہ پہنچا دیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت حبش میں موجود ہے تو اس کے پاس پہنچے اور اسلام قبول کرکے اس کے ساتھ رہنے لگے اور فتح خیبر کے موقع پر ۷ھ میں وہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں باریاب ہوتے۔ (بخاری شریف ص۶۰۶ وغیرہ)

رہا تھا، اب بے نقاب ہو کر سامنے آ چکا تھا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ قریش کے تمام سردار سر جوڑ کر بیٹھیں اور پوری سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کریں۔ چنانچہ مکہ کے تاریخی پنچایت گھر یا کونسل ہاؤس (دار الندوہ) میں خاص اجلاس طلب کیا گیا۔ ارکانِ ندوہ کے علاوہ دوسرے ہمنوار ہنماؤں کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ ایجنڈا (غور طلب اور فیصلہ طلب مسئلہ) یہی تھا کہ اسلام اور اس کے داعی کا قصہ کس طرح ختم کیا جائے۔

ربیع الاول کے پہلے ہفتہ میں یہ اجتماع ہوا اور پوری سنجیدگی سے مسئلہ پر غور کیا گیا چند تجویزیں پیش کی گئیں۔

(۱) محمد[1] (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بیڑیاں پہنا کر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے باندھ کر ڈال دو[2]۔

نجد کا ایک شخص جو وہاں وقت پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ اس سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مقبولیت بڑھے گی، لوگوں کی ہمدردیاں زیادہ ہوں گی۔ اور بہت ممکن ہے اس کے ساتھی کسی طرح اُس کو چھڑا کر لے جائیں۔ اس سے قریش کی بدنامی اور ہوا خیزی ہوگی۔

(۲) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو وطن سے نکال دو[3]۔ تمہیں چھٹی مل جائے گی۔ تم اپنا نظام قائم کر سکو گے اور موجودہ انتشار ختم ہو جائے گا۔

نجدی شیخ۔ بہت غلط رائے ہے، وہ ایسا ہوشیار ہے اور اس کے کلام میں ایسی طاقت

---

[1] مبتِ کرنے والا۔ رئیس قریش ابو البختری۔ مقتول غزوہ بدر۔ [2] لِيُثْبِتُوكَ۔

[3] اَوْ يُخْرِجُوكَ (قرآن حکیم) نیز آخری آیت وان کادوا لیستفزونک من الارض۔ پورا ترجمہ اوپر گذر چکا ہے اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز بھی کافی اہمیت اختیار کر چکی تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان اور عاجز کر کے سرزمین عرب سے ہی نکال دیں بظاہر اس پر عمل اس لئے نہیں ہوا کہ اس میں یہ خطرہ محسوس کیا گیا کہ یہ جہاں پہنچ جائیں گے وہاں اپنا مرکز قائم کر کے حملہ کر دیں گے اور قریش کو تباہ کر دیں گے۔ مگر ارشاد ربانی کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت حق جل مجدہٗ اس قوم عرب یا قبیلہ قریش کو برباد کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے یہ تجویز منظور نہیں کی گئی کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو سنت اللہ یہ ہے کہ وہ قوم برباد ہو جاتی ہے جو اپنے نبی کو جلا وطن کر دے۔

ہے کہ جہاں جائے گا اپنا جتھا بنا لے گا۔ تمہارے لئے عذاب بن جائے گا۔

(۳) ابو جہل۔ میری تو قطعی رائے یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام تمام کر دیا جائے باقی یہ خطرہ کہ اس کے ولی (بنو ہاشم) انتقام لیں گے اور اس طرح قبائلی جنگ بھڑک اُٹھے گی۔ تو اس سے نجات کی صورت یہ ہے کہ کسی ایک قبیلہ کے آدمی قتل نہ کریں۔ بلکہ ہر ایک قبیلہ سے آدمی منتخب کئے جائیں۔ یہ سب مل کر حملہ کریں۔ اس صورت میں خون کی ذمہ داری سب پر ہوگی بنو ہاشم اس اجتماعی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ لامحالہ دیت اور خون بہا طے ہوگا۔ جس کو ہم لامحالہ سب مل کر ادا کریں گے۔

تمام اراکین نے ابو جہل کی تجویز سے اتفاق کیا اور اس کی تیاری شروع کر دی۔ [1]

---

[1] البدایۃ والنہایہ ص۱۷۵ و ص۱۷۶ ج ۳ وغیرہا من کتب السیر۔

مخرجِ صدق مکّہ سے ہجرت اور امدادِ خداوندی

اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ ۔ (سورہ ۱۷ اسرائیل آیت ۸۰)

(اے رب جہاں سے تو مجھ کو نکالے تو سچائی کے ساتھ نکال)

اِلَّا تَنْصُرُوْہُ فَقَدْ نَصَرَہُ اللّٰہُ اِذْ اَخْرَجَہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔

(سورہ ۹ توبہ آیت ۴۰)

اگر تم مدد نہ کرو گے رسُول کی تو اللہ نے اس کی مدد کی ہے جب نکالا اسکو کافروں نے

گرمیوں کا موسم، ستمبر کی ۱۲ تاریخ، ربیع الاوّل کی یکم[1]۔ پیر کا دن۔ مکہ والے گرمیوں میں مکان سے باہر ڈیوڑھیوں کے سامنے یا راستہ کے کنارے پر چارپائیاں بچھا لیتے ہیں اور آدھی رات تک گپ شپ کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ ہے کہ تہائی رات تک نمازِ عشاء سے فارغ ہو جاتے ہیں پھر کچھ سورتوں کی تلاوت فرماتے ہوئے باوضو بستر پر اور عموماً کھری چارپائی پر آرام فرماتے ہیں۔ اس وقت کچھ آنکھ لگ جاتی ہے۔ صحن میں آپ تنہا ہی ہوتے ہیں یا آپ کی زوجہ مطہرہ۔ لیکن آج خلافِ معمول آرام نہیں فرما رہے اور آج آپ تنہا بھی نہیں ہیں۔ آپ کے چچازاد بھائی (حضرت علی رضی اللہ عنہ) جن کی عمر تقریباً بائیس ۲۲ سال ہے وہ بھی حاضر ہیں۔ اور کچھ باتیں ہو رہی ہیں۔

---

[1] جو حضرات سفرِ ہجرت کے رفقاء یا اس سفر کے مددگار تھے انہوں نے تاریخ یا دن نہیں بیان کیا۔ دوسرے حضرات نے بیان کیا ہے۔ چونکہ ڈائری یا روزنامچہ کا رواج نہیں تھا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تقویمات (جنتریوں) میں اختلاف رہتا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر تاریخوں کے بیان میں اختلاف ہو گیا۔

ہم نے تقویم ہجری و عیسوی مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی صاحب ایم اے (عثمانیہ) کے لحاظ سے یہ تاریخ اور دن مقرر کیا ہے (واللہ اعلم بالصواب)

جیسے خساب سمجھا رہے ہیں۔

دوسری طرف عجیب بات یہ ہے کہ مکان سے باہر کچھ آدمی آرہے ہیں، تلواریں ان کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ نہایت خاموشی سے آتے ہیں اور دروازے کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ دس بارہ آدمی آگئے ہیں ان میں ابوجہل بھی ہے ابولہب بھی۔ اور عقبہ بن ابی معیط اور امیہ بن خلف بھی۔ اُن میں سے کوئی اٹھتا ہے اور کواڑوں کی درازسے اندر جھانکتا ہے۔

اب آدھی رات گزر چکی ہے۔ آخری پہر شروع ہوگیا ہے۔ پورے مکہ پر سناٹا چھاگیا۔ یہ کافر جو باہر آگئے تھے۔ غالباً کھڑے کھڑے تھک گئے اس لئے قطار لگا کر دروازہ کے سامنے بیٹھ گئے ہیں دفعتہً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹاتے ہیں۔ اپنی چادر ان کے اوپر ڈال دیتے ہیں، پھر دروازہ سے باہر تشریف لاتے ہیں۔ سورۂ یٰسین تلاوت فرما رہے ہیں اور جب کافروں کی برابر پہنچتے ہیں تو یہ آیت زبان مبارک پر ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (سورہ یٰسین ۳۶ آیت ۹)

(ترجمہ) کر دی ہم نے ان کے آگے دیوار اور اُن کے پیچھے دیوار پھر اوپر سے ڈھانک دیا۔ سو اُن کو نظر نہیں آتا۔

اب نہیں کہا جا سکتا کہ ان کافروں کو نیند آگئی تھی یا جیسا کہ آیت کا مفہوم ہے ان کی آنکھوں کے سامنے دیوار کھڑی کردی گئی تھی۔ لیکن جو اطمینان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے قدرت نے کوئی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ جس کو آپ محسوس فرما رہے ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) اطمینان کی بھی انتہا ہوگئی کہ آپ یونہی نہیں گذر جاتے بلکہ دست مبارک میں مٹی لیتے ہیں اور ہر ایک کے سر پر مٹی رکھتے ہوئے تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ نبی کا اعتماد۔ وثوق اور یقین ہے خدا پر اور خدا کے کلام پاک پر۔[1]

---

[1] ابن سعد و ابن ہشام (وغیرہ)

خدا پر بھروسہ اور اطمینان کی دوسری مثال۔ یہ نوجوان (علی رضی اللہ عنہ) پیش کر رہے ہیں کہ وہ بستر پر آرام سے لیٹے ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ آج کی شب، شب مقتل ہے، دشمن اسی لئے اکٹھے ہو رہے ہیں کہ اس بستر والے کو ذبح کریں، آرام گاہ کو ذبح خانہ بنائیں۔ بستر والا نہ ہو تو جو بستر پہ ہو گا وہ ذبح ہو گا۔ مگر یا تو اللہ کی حفاظت پر اطمینان کامل ہے۔ یا دیدار محبوب کے شوق مضطر نے موت کو بھی محبوب بنا دیا ہے۔

اگر مشاہدۂ دوست از پس مرگ است

حیات خضر و مسیحا نصیب دشمن باد

یہی تسکین بخش اطمینان ہے کہ جیسے ہی لیٹتے ہیں سو جاتے ہیں۔ خدا جانے کتنی دیر تک یہ دشمن جو تلواریں لئے ہوئے تھے غافل بیٹھے رہے! انھیں ایک شخص نے آکر چونکایا جس نے خبر دی کہ جس کو تم قتل کرنے آئے تھے وہ نکل گیا اور تمہاری غفلت کی انتہا ہے کہ خاک تمہارے سروں پر ہے اور تمہیں خبر نہیں! اب یہ گھبرا کر اٹھے۔ سروں پر ہاتھ پھیرے تو خاک آلود تھے۔ یقین ہو گیا کہ یہ شخص سچ کہتا ہے۔ دروازہ دیکھا تو وہ بھی کھلا ہوا تھا۔

کسی کے مکان میں گھسنا بہت معیوب تھا مگر یہ لوگ ضابطۂ اخلاق سے ان جھاڑ کر خاص منصوبہ کے تحت آئے تھے اور اب ناکامی کی جھونجل بھی تھی۔ غصہ اور جوش میں اندر گھس گئے دیکھا کہ ایک سن رسیدہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم فداہٗ روحی) کی جگہ خواجہ ابو طالب کا سب سے چھوٹا لڑکا "علی" بستر پر دراز خراٹے لے رہا ہے۔

سو اس باختہ دشمنوں نے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ پوچھا "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ مجھے کیا خبر؟ جواب صحیح تھا، انہیں خبر نہیں تھی۔ بہت پوچھ گچھ کی ڈرایا۔ دھمکایا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کچھ نہیں بتا سکے۔

یہاں سے دوڑے ہوئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے۔ ایک لڑکی (بڑی صاحبزادی حضرت اسماء) سامنے آئی۔ پوچھا۔ تمہارے باپ کہاں ہیں؟ مجھے خبر نہیں۔ لڑکی نے

جواب دیا ابوجہل نے اس معصومہ کے اتنی زور سے طمانچہ مارا کہ کان کی بالی گر گئی۔[1]

جب ان بدبختوں کو یقین ہو گیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا تو اس کی تلاش میں دوڑے۔ مکہ کی گلی گلی چھان ماری اور جب کہیں پتہ نہ چلا تو فوراً منادی کرادی کہ جو محمد اور اس کے ساتھی کو زندہ گرفتار کر کے لائے یا ان کا سر لائے اس کو ایک دیت کے بموجب سو اونٹ انعام میں دئیے جائیں گے۔ سو اونٹ کا انعام معمولی نہیں تھا۔ انعام کے شوق میں بہت سے من چلے دوڑے مگر کامیابی کسی کو بھی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ربِ محمد۔ اپنے محمد کی مدد کر رہا تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)

یہی تو ہے ارشادِ خداوندی۔ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی) اور وہ جو دعا بتائی گئی تھی جس کا ایک جز تھا۔ وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيْرًا (اور مجھے اپنے حضور سے قوت عطا فرما ایسی قوت جو ہر حال میں میری مددگار ہو) تو اس اطمینان سے زیادہ جس سے پوری طرح مسلح ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بستر سے اٹھے اور روانہ ہوئے تھے۔ سلطانِ نصیر[3] کیا ہو سکتا ہے۔

صادق وامین کی امانتداری دشمنوں نے اگرچہ یہ خطاب[4] اب چھوڑ دیا تھا۔ مگر آپ کی صداقت وامانت ان دشمنوں کی خاطر نہیں تھی بلکہ اس لئے

---

[1] ابن سعد وابن ہشام وغیرہ [2] بخاری شریف ص۵۵۵ [3] ایسی قوت جو ہر حال میں مددگار ہو۔

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ عجیب بات ہے اللہ تعالیٰ نے میرے نام کو سب وشتم سے بچالیا ان کو میرا نام لینا گوارا نہیں ہوتا یہ مذمم کو برا بھلا کہتے ہیں۔ حالانکہ میں محمد ہوں میرا نام مذمم نہیں۔ بخاری شریف ص۵۰۱

[4] یہ خطاب استعمال نہیں کرتے تھے مگر آپ کی صداقت وامانت سے انکار نہیں تھا۔ مانتے تھے۔ جانتے تھے۔ پہچانتے تھے کہ آپ صادق وامین ہیں۔ اسی پر تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (سورہ مومنون) (کیا ان لوگوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں ہے کہ اس کا انکار کرتے ہیں) قرآن حکیم نے اصل مرض کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اندادًا من دون اللہ (معبودان باطل) کی محبت ان لوگوں سے یہ حرکتیں کراتی تھی۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا (باقی برصفحہ آئندہ)

تھی کہ آپ کی فطرتِ مبارکہ کا جوہر تھی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو سمجھا رہے تھے وہ ان امانتوں کا حساب ہی تھا جو انہیں دشمنوں کی آپ کے پاس تھیں، جو اب منصوبۂ قتلِ ناحق کو کامیاب بنانے کے درپے تھے۔ آپ نے اس خطرناک اور ہیبت ناک فضا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسی لئے چھوڑا تھا کہ جن کی امانتیں ہیں ان کو واپس کرکے اور پوری طرح حساب سمجھا کر تشریف لائیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تین دن بعد روانہ ہوتے جب امانتیں ادا کر چکے اور حساب سمجھا چکے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورۃ بقرہ ۲۰۴) (کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو مانتے ہیں جن کو انھوں نے خدا کا شریک ٹھیرا رکھا ہے اور ان سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں۔ جیسی خدا سے کرنی چاہیئے اور جو ایمان والے ہیں وہ بہت سخت ہوتے ہیں اللہ کی محبت میں۔ حُبِ انداد یعنی معبودانِ باطل کی محبت اور خدا کی محبت میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اللہ سے محبت کرنے والا ہٹ دھرمی نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ کا حکم ہے کہ ہر موقع پر عدل و انصاف سے کام لو۔ حق کی شہادت دینے والے ہو کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ اور معبودانِ باطل کا کوئی حکم ہی نہیں اگر ہے تو باطل پرستی لہٰذا وہ جو کچھ کر بیٹھے کم ہے۔

غارِ ثور میں قیام اور ضروری انتظامات

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔

صرف دو تھے دو میں سے ایک اللہ کے رسول تھے۔ جب کہ دونوں غار میں تھے اور اللہ کے رسول اپنے صاحب (ساتھی) سے کہہ رہے تھے غمگین نہ ہو۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

انبیاء علیہم السلام خدا پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے متوکل بلکہ آداب توکل کے معلم اور متوکلین کے امام و پیشوا ہوتے ہیں۔ اس غیر معمولی توکل اور اعتماد کے نتیجہ میں غیبی تائید اور نصرتِ خداوندی کی وہ غیر معمولی صورتیں بھی پیش آتی رہتی ہیں جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں جن کو معجزہ کہا جاتا ہے اس کے باوجود وہ ظاہری اور مادی اسباب کو نظر انداز نہیں کرتے کیونکہ وہ صرف خانقاہ نشین درویش نہیں ہوتے ان کی زندگی صرف ان کے لئے نہیں ہوتی وہ نوعِ انسان کے معلم ہوتے ہیں اور ان کی زندگی پوری نوعِ انسان کیلئے سبق ہوتی ہے مکان سے نکلتے وقت قدرت نے خاص طرح کی مدد کی مگر آپ نے اور آپ کے رفیق خاص نے روپوش رہنے اور خفیہ روانگی کا جو نظام قائم کیا تھا وہ اُمت کیلئے بہترین سبق ہے۔ اس کی تفصیل خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔

دارالندوہ کا وہ اجلاس جس میں آپ کے متعلق غیر معمولی تجویز منظور کی گئی اور مشترک طور پر شہید کرنے کا منصوبہ طے کیا گیا۔ وہ غالباً صبح کے وقت ہوا۔ اس کی اطلاع بطور تائید غیبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فوراً ہی ہو گئی[1] اور فوراً ہی آپ نے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔

سیدہ[2] عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ

---

[1] ابن سعد کی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ منصوبہ طے کر کے لوگ منتشر ہو گئے (اجلاس ختم ہو گیا) جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ یہ خبر سنائی اور کہا کہ آج کی شب اپنے اس بستر پر آرام نہ فرمائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے ص ۱۵۳ ج ۱۔ اس تفصیل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اجلاس صبح کے وقت ہوا [2] بخاری شریف ص ۵۵۲ تا ۵۵۴

روزانہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ مگر صبح یا شام کو۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ ٹھیک دوپہر کے وقت تشریف لا رہے ہیں۔ سر مبارک پر کپڑا ڈالے ہوئے ہیں چہرہ مبارک کو بھی کچھ کپڑے سے چھپائے ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خبر دی گئی۔ فوراً حاضر ہوتے یا رسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان یہ ناوقت تشریف آوری کیسی ؟

ارشاد ہوا۔ کچھ بات کرنی ہے۔ تنہائی ہونی چاہیئے۔ کوئی غیر آدمی ہو تو اسے ہٹا دو۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ غیر کوئی نہیں۔ دو لڑکیاں ہیں۔ ایک آپ کی خادمہ عائشہ۔ دوسری اس کی بہن اسماء۔

فرمایا تمہیں معلوم ہے ؟ مجھے ہجرت کی اجازت مل گئی ہے۔[1]

صدیق اکبر۔ یہ خادم ساتھ رہے گا۔[2] آپ پر میرے باپ قربان یا رسول اللہ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ بہت اچھا۔

یہ اجازت ایسی بشارت تھی کہ فرطِ مسرت سے حضرت ابوبکر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا کہ خوشی میں آنسو آجاتے ہیں۔[3]

پھر صدیق اکبر نے عرض کیا۔ دو سانڈنیاں[4] تیار ہیں۔ ان میں سے ایک منظور فرمایئے۔

---

[1] یعنی آج یہ سفر اس لئے نہیں ہے کہ دشمنوں نے قتل کا منصوبہ بنا رکھا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اب تک ہجرت کی اجازت نہیں تھی۔ آج مل گئی ہے۔ اور اگر دارالندوہ کا اجلاس رات کے وقت ہوا تھا تو اگرچہ اس کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فوراً مل گئی تھی مگر دوپہر تک آپ نے روانگی کا قصد اس لئے نہیں کیا کہ اب تک ہجرت کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اب جیسے ہی اجازت ملی آپ نے تیاری شروع کر دی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ [2] یہ ہے عشقِ رسول۔ اہل و عیال، مال اور جائداد وغیرہ کا کوئی تصور سامنے نہیں تھا۔ قلب مضطر کی تڑپ صرف یہ ہے الصحابۃ بابی انت یا رسول اللہ (بخاری شریف) آپ کی رفاقت۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان یا رسول اللہ [3] سیرۃ ابن ہشام ص۴۹۱ ج ۱۔ [4] یہ پہلے گذر چکا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چار ماہ پہلے یہ سانڈنیاں خرید چکے تھے اور اس خیال سے کہ نہ معلوم کس وقت حکم جلدی ان اونٹنیوں کو چرولاہے کے سپرد نہیں کیا تھا بلکہ گھر پر کھڑا کر کے ان کو چارہ کھلاتے رہے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ ضرور۔ مگر قیمت[1] لینی ہوگی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے بڑی تیزی سے سامانِ سفر کی تیاری شروع کردی اور جلدی جلدی میں جو ناشتہ[2] تیار ہو سکتا تھا، وہ تیار کر لیا۔ پھر ہم نے چمڑے کے تھیلے میں ناشتہ بھر دیا۔ ایک مشکیزے میں پانی بھر دیا۔ لیکن تھیلے کا منہ بند کرنے کیلئے کپڑے کی ضرورت تھی اور مشکیزے میں بھی تسمہ نہیں[3] تھا۔ جس سے اس کو اٹھایا جا سکے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی ہمشیرہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے فوراً اپنے نطاق[4] کے دو حصے کر[5] لئے۔ ایک میں کھانے کا تھیلہ باندھ دیا۔ دوسرے میں مشکیزہ باندھ دیا تاکہ اس کو اٹھایا جا سکے۔

روانگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دولت کدہ سے روانہ ہو کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے۔ پھر یہ دونوں مکان کی پشت کی طرف[6] سے کھڑکی سے نکل کر کوہ ثور کی طرف روانہ ہو گئے جو مکہ معظمہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے اور جس کی چوٹی پر یہ غار ہے جس نے غارِ ثور کے نام سے غیر فانی شہرت حاصل کی۔

---

[1] واقدی کی روایت یہ ہے کہ ان دونوں کی قیمت آٹھ سو درہم تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سانڈنی منظور فرمائی وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی قشیر سے خریدی تھی اس کا نام قصواء رکھا گیا۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری میں آخر تک رہی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بہت کم زندہ رہی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اس کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ فتح الباری ص۱۸۰ ج۷

[2] پراٹھے نہیں تھے صرف ابلا ہوا یا بھنا ہوا بکری کا گوشت تھا۔ (فتح الباری بحوالہ واقدی ص۱۸۰ ج۷

[3] لیس فیھا عصام (سیرۃ ابن ہشام ص۲۹۲ ج۱) [4] نطاق خاص قسم کا تہبند ہوتا تھا اس کا عرض تقریباً ڈھائی میٹر (۱۰ انچ) ہوتا تھا۔ اس کو بیچ میں سے باندھ دیا جاتا۔ پھر اوپر کا حصہ نیچے لٹکا دیا جاتا جس سے یہ دہرا ہو جاتا تھا۔ مجمع البحار و فتح الباری ص۱۸۰ ج۷ [5] یہ ایثار عند اللہ مقبول ہوا۔ چنانچہ آپ کا خطاب ذات النطاقین ہو گیا (بخاری شریف ص۵۵۱) [6] سیرۃ ابن ہشام ص۲۹۱ ج۱ البدایۃ والنہایۃ ص۱۸۰ ج۲۔

جب آپ روانہ ہوئے تو یہ دعا زبانِ مبارک سے پڑھی۔[1]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ وَلَمْ اَكُ شَیْئًا اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی هَوْلِ الدُّنْیَا وَبَوَائِقِ الدَّهْرِ وَمَصَائِبِ اللَّیَالِیْ وَالْاَیَّامِ ۔ اَللّٰهُمَّ اصْحَبْنِیْ فِیْ سَفَرِیْ وَاخْلُفْنِیْ فِیْ اَهْلِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْمَا رَزَقْتَنِیْ وَلَكَ فَذَلِّلْنِیْ وَعَلٰی صَالِحِ خُلُقِیْ فَقَوِّمْنِیْ وَاِلَیْكَ رَبِّ فَحَبِّبْنِیْ وَاِلَی النَّاسِ فَلَا تَكِلْنِیْ رَبَّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وَاَنْتَ رَبِّیْ اَعُوْذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِیْمِ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَهُ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ

---

[1] سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۹ ج ۱ البدایۃ والنہایۃ صفحہ ۱۰ ج ۳ [2] ترجمہ: اس خدا کی حمد جس نے مجھے پیدا کیا اور آگے اگر میں کچھ بھی نہیں تھا مجھے نیست سے ہست کیا۔ اے اللہ میری مدد فرما، دنیا کی دہشت، زمانہ کے ہلاکت انگیز واقعات رات اور دنوں (گردش روز و شب) کی مصیبتوں کے مقابلہ پر اے اللہ تو میرا ساتھی بن میرے سفر میں اور میرا قائم مقام بن میرے اہل و عیال میں میرے بعد (میری غیبوبت میں تو ان کا محافظ اور نگران رہ) اور اے اللہ جو تو مجھ کو رزق دے اس میں برکت عطا فرما اور اے اللہ صرف اپنی ذات کے لئے ہی ایسا کر کہ مجھے اپنا مطیع اور اپنے سامنے عاجز بنا کسی اور کے سامنے مجھے عاجز اور ذلیل نہ کر۔ اے اللہ نہایت صالح اور مناسب اعمال پر میری تربیت فرما۔ افعالِ خیر کے بہترین سانچے میں مجھے ڈھال دے۔ اور اے میرے رب صرف اپنی طرف کی محبت ہی میرے اندر بھر دے اور جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے اے اللہ مجھے تو ان کے حوالے مت کر۔ اے کمزوروں کے رب تو ہی میرا رب ہے۔ میں تیری اس باعزت ذات کی (جس کی برکت سے آسمان اور زمین روشن ہیں اور جس سے تمام تاریکیاں فنا ہو جاتی ہیں اور جس کے فضل و کرم سے پہلے لوگوں اور بعد والوں کا سب کا معاملہ درست ہوا) پناہ لیتا ہوں اس سے کہ میرے اوپر تیرا غضب اور تیری ناراضگی نازل ہو۔ میں تیری پناہ لیتا ہوں اس سے کہ تیرا انعام مجھ کو نصیب نہ ہو یا اس سے کہ تیرا عتاب و فتنہ مجھ پر نازل ہو جائے اور پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ تیری معافی جو مجھے میسر ہے اس میں تبدیلی آ جائے اور میں ایسی ہر چیز سے پناہ چاہتا ہوں جو تیری ناراضی کا سبب ہو۔ انجام کار تیرے ہی لئے ہے میں جہاں تک میرے امکان میں ہے خیر اور بھلائی ہی کی کوشش کرتا ہوں (مگر) تیرے بغیر نہ کوئی طاقت ہے نہ کوئی قوت ہے جو کچھ قوت و طاقت ہے وہ تجھ سے ہی ہے۔"

جس طرح اس کا پورا سفر غیبی اشاروں پر ہوا تھا اس کے ارحم الراحمین رب نے یہاں بھی ایسی صورت کردی کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسی کی دل شکنی نہ ہو آپ نے خود ہی ناقہ کی مہار چھوڑ دی اور اصرار کرنے والوں سے بھی یہی فرمایا کہ وہ مہار چھوڑ دیں یہ ناقہ مامور ہے، جہاں بیٹھ جائے گی وہیں قیام ہوگا۔

لہ پہلے گذر چکا ہے کہ صحابہ کرام ہجرت کر رہے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم کے منتظر تھے اور جب من جانب اللہ اجازت ہوگئی تو آپ فوراً دوپہر ہی میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے اور فرمایا کہ مجھے اجازت ہوگئی ہے فوراً ہی روانگی کا پروگرام بنالیا اور پھر یہ سفر ہی نہیں بلکہ دار ہجرت کا تعین بھی الہام ربانی سے ہوا تھا۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ ٢ ابن سعد ص ج ۱ و فتح الباری ص ۱۹۶ ج ۷ علامہ شبلی کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی۔ آپ نے یہ واقعہ حذف کردیا۔ میزبانی کے سلسلہ میں جو بحث ہوتی تھی صرف اس کا ذکر فرمایا کہ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ دولت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی۔ اور حاشیہ میں ناقہ کے واقعہ کی تردید کرتے ہوئے مسلم شریف کی ایک حدیث سے استدلال کیا جس میں راوی نے بہت اختصار سے کام لیا ہے اور لطف یہ ہے کہ قرعہ اندازی کا تذکرہ اس روایت میں نہیں ہے مزید براں اس روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کو مدینہ پہنچے فقدمنا المدینۃ لیلاً علامہ نے اس کو نظر انداز فرمادیا۔ علامہ نے مسلم شریف کے باب الہجرۃ کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ مسلم شریف میں باب الہجرۃ کوئی نہیں اس کا عنوان حدیث الہجرۃ ہے اور علماء محدثین کی اصطلاح میں اس کو حدیث الرحال بھی کہا جاتا ہے امام مسلم رحمہ اللہ نے جلد ثانی کے آخر میں اس کو نقل کیا ہے۔ ص ۴۱۹ ج ۲ اور واقعہ یہ ہے کہ بسلسلہ قیام چند مرحلے پیش آئے تھے۔ مثلاً سب سے پہلے قبیلہ کا انتخاب۔ پھر قبیلہ میں وہ جگہ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مستقل قیام فرمائیں۔ جہاں مکان بنایا جائے یا مسجد بنائی جائے پھر مکان بننے تک عارضی قیام۔ عارضی قیام کے بعد کھانے وغیرہ کا انتظام اصطبل کا انتخاب جہاں سواری رکھی جائے۔ ان تمام مرحلوں پر بحث ہوئی اور ہر ایک جاں نثار نے سعادت حاصل کرنی چاہی۔ بحث کے بعد معاملہ طے ہوا۔ کبھی قرعہ سے کبھی الہام ربانی سے کبھی کسی اور صورت سے۔ آئندہ سطور میں یہ تمام مراحل ترتیب وار بیان کئے گئے ہیں۔ وللہ الحمد۔

ناقہ چلتی رہی یہاں تک کہ قبیلہ بنی نجار آ گیا۔ اس قبیلہ میں جب ناقہ اس جگہ پہنچی جہاں مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے تو ناقہ بیٹھ گئی۔ آپ نے فرمایا ھذا انشاء اللہ منزل[1]۔ یہیں انشاء اللہ قیام ہو گا۔ (مکان بنے گا)

ابھی آپ اترے نہیں تھے کہ ناقہ کھڑی ہو گئی۔ کچھ چلی۔ پھر آ کر اسی جگہ بیٹھ گئی۔ اور اپنی گردن زمین پر پھیلا دی[2]۔

بنی نجار کو یہ سعادت میسر آئی تو بچہ بچہ کے دل کی کلی کھل گئی۔ لڑکیوں نے فوراً ایک شعر موزوں کر لیا۔

نحن جوار من بنی نجار   یا حبذا محمد من جار

(ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں (یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے پڑوسی بنے) محمد کیسے اچھے پڑوسی ہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ محمد ہمارے پڑوسی ہیں۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہِ شفقت فرمایا۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔

سب نے یک زبان ہو کر کہا ای واللہ یا رسول اللہ (ہاں خدا کی قسم یا رسول اللہ)۔

ارشاد ہوا[3]

انا واللہ احبکم ۔ انا واللہ احبکم ۔ انا واللہ احبکم

خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے

اب قیام کا مسئلہ پیش ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہمارے رشتہ داروں[4] میں

---

[1] بخاری شریف ص۵۵۵ [2] ابن ہشام ص۲۹ ج۱ [3] البدایہ والنہایہ ص۲ ج۳ بحوالہ بیہقی۔ [4] بخاری شریف ص۵۵۵ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے ننہالی رشتہ دار اسی قبیلہ کے تھے تو آپ نے یہ فرمایا ای بیوت اھلنا اقرب۔ ہمارے رشتہ داروں میں سے کس کا مکان قریب ہے۔ اس وقت آقائے دو جہان کی زبان مبارک سے قرابتداری کا اظہار ان رشتہ داروں کیلئے بہت بڑا اعزاز تھا جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے آپ نے اس کا اظہار بھی فرمایا مگر یہ بھی صحیح نہیں کہ ناقہ کا واقعہ پیش نہیں آیا اور آپ نے رشتہ داری کی بنا پر بنو نجار کو منتخب فرمایا۔ ورنہ پھر قرعہ اندازی کی بھی ضرورت نہیں تھی جس کو علامہ شبلی نے بہت اہمیت دی ہے۔

کس کا مکان قریب ہے۔ یہ خوش نصیبی حضرت خالد[1] بن زید ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو میسر تھی۔ آپ فوراً بول اُٹھے۔ انا یا نبی اللہ ھذہ داری وھذا بابی (میں حاضر ہوں یا رسول اللہ یہ میرا مکان ہے۔ یہ میرا دروازہ ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ حضرات انصار نے آپس میں قرعہ ڈالا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام کس کے یہاں ہوگا اس میں بھی حضرت ابو ایوب ہی کا اسم گرامی برآمد ہوا تھا۔[2]

قیام کا مسئلہ طے ہوگیا تو ارشاد ہوا۔

فانطلق فھی لنا مقیلا[3] تشریف لے جائیے ہمارے قیلولہ کا انتظام کر دیجئے۔

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے اندر جا کر آرام فرمانے کا انتظام کیا۔ پھر ان کو لیگئے اور آرام کرلیا۔[4]

حضرت زید[5] بن ثابت رضی اللہ عنہ ہمیشہ خوش ہوا کرتے تھے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] اصل نام خالد۔ پسر زید۔ کنیت ابو ایوب۔ یہ اپنی اس کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ [2] اصابہ صفحہ ۹ ج ۲ بحوالہ احمد۔ علامہ شبلی نے اسی روایت کو لے کر ناقہ وغیرہ کے تمام واقعات کو حذف کردیا جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ حالانکہ اس روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل حضرات انصار نے از خود کیا تھا اور بہت ممکن ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں رونق افروز ہونے سے پہلے کیا ہو کیونکہ روایت میں مدینہ میں تشریف آوری کا ذکر ہے۔ قبیلہ بنو نجار میں رونق افروز ہونے کا ذکر نہیں ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں روی احمد طریق جبیر بن نفیر عن ابی ایوب قال لما قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ اقترعت الانصار ایھم یؤویہ فقرعھم ابو ایوب۔ یعنی حضرات انصار نے خود قرعہ اندازی کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کون مکان دیگا (کس کے یہاں قیام ہوگا) تو سب کے مقابلہ میں ابو ایوب کا نام قرعہ میں برآمد ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی موافقات صحابہ کی ایک مثال ہے۔ یعنی صحابہ کرام نے بھی وہی فیصلہ کیا جو پہلے مشیت خداوندی طے کر چکی تھی۔ بعد کے الہام یا وحی نے اس کی توثیق کردی۔ واللہ اعلم۔ [3] بخاری شریف صفحہ ۵۵۶ [4] فتح الباری صفحہ ۲۰۱ [5] یہ وہی زید بن ثابت ہیں جو آگے چل کر کاتب وحی اور جامع قرآن اور بہت بڑے فقیہہ اور ماہر فرائض ہوئے۔ ایسے ذہین کہ سریانی زبان اور سریانی خط پندرہ روز میں سیکھ لیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ والدہ محترمہ کا اسم گرامی نوار تھا دختر مالک یہ بھی نجاریہ تھیں۔ (اصابہ و الاستیعاب)۔

حضرت ابوایوب کے یہاں جیسے ہی تشریف لے گئے سب سے پہلا ہدیہ میری والدہ کا تھا جو آپ نے خود بھی تناول فرمایا اور حاضرین کو بھی اس میں شریک کیا۔ میری والدہ نے روٹیوں پر گھی لگا کر دودھ میں چورا اور ایک بڑے بادیہ میں بھر کر میرے ہاتھ بھیجا۔ یہ میری سعادت تھی کہ سب سے پہلا ہدیہ یہی پیش ہوا میں نے عرض کیا کہ میری والدہ نے یہ ہدیہ بھیجا ہے تو آپ نے دُعا فرمائی بارك الله فيك (اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے) پھر حاضرین کو بلا کر سب کے ساتھ ہدیہ تناول فرمایا اور ابھی میں دروازہ سے نکلا نہیں تھا کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے یہاں سے ثرید آ گیا۔ آپ نے اسے بھی منظور فرمایا پھر اگرچہ آپ مہمان ابوایوب رضی اللہ عنہ کے تھے مگر روزانہ تین چار انصار کے یہاں سے نمبروار کھانے کا ہدیہ آتا رہتا تھا۔[1] دسترخوان مبارک پر چار یا پانچ کھانے والے ضرور ہوتے تھے۔ کبھی پندرہ سولہ بھی ہو جاتے تھے۔[2]

حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ خود بھی کھانا پکواتے دسترخوان پر اگرچہ شریک طعام نہیں ہوتے تھے مگر جو کھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے آتا تھا اس کو کھاتے اور خاص اس جگہ سے کھاتے جہاں آثار، دو جہان کی انگلیوں کے نشان معلوم ہوتے تھے۔[3]

کسی نے حضرت ابوایوب کے یہاں سے تحقیق کرنی چاہی کہ آپ کے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام ہے آپ مزاج سے واقف ہو گئے ہوں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کونسا کھانا پسند ہے کونسا ناپسند۔ جواب ملا خود سے آپ نے کبھی کسی کھانے کی فرمائش نہیں کی اور جو کھانا پیش کیا گیا کبھی اُس کی برائی نہیں کی۔[4]

---

[1] ابن سعد صفحہ ۱۹۱ جلد ۱ خصوصاً حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہما کے یہاں سے تو روزانہ طشت بھر کر کھانا آتا تھا۔ وفاء الوفا صفحہ ۱۹۰ جلد ۱ [2] ایضاً۔ [3] علامہ نووی نے اسی حدیث سے چند مسئلے اخذ کئے ہیں (۱) ہر موقع اور ہر جگہ پر برتن کا صاف کرنا مستحب نہیں ہے۔ بلکہ اگر پیچھے ہوئے کو کھانے یا پینے والے ہیں تو برتن میں کچھ چھوڑ دینا مستحب ہے (۲) خصوصاً جب معلوم ہو کہ لوگ اس کو تبرک سمجھ کر کھائیں گے (۳) یا کھانا کم ہو اور دوسرے کھانے والے موجود ہوں (۴) یا جیسا کہ بعض جگہ ہوتا ہے کہ پورا کھانا مہمان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور اہل خانہ بعد میں بچا ہوا کھانا کھاتے ہیں بظاہر حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کا یہی طریقہ تھا۔ (نووی علی مسلم صفحہ ۱۸۳ جلد ۲) [4] وفاء الوفاء صفحہ ۱۹۰ جلد ۱ ایک مرتبہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے یہاں سے طفیشل آیا (خاص قسم کا شوربا ہوتا تھا) آپ نے بڑے ذوق سے اسکو تناول فرمایا اور کچھ نوش جان بھی فرمایا۔ پھر ہم بھی اپنے یہاں اس طرح شوربا تیار کیا کرتے تھے۔ وفاء الوفاء صفحہ ۱۹۰ جلد ۱۔

تفصیل آگے آتی ہے۔ انشاء اللہ

قصوا کا قیام اور حضرت اسعد کا والہانہ جذبہ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ جو بیعت عقبہ اولیٰ میں شریک تھے اور تبلیغی و تعلیمی کوششوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ معلم (حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ) کے شریک رہے تھے ان کا مکان بہت وسیع تھا حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا قیام انہیں کے یہاں رہا تھا۔ ان کے علاوہ اور حضرات بھی جو تشریف لاتے تھے۔ ان کے یہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔

جب انہوں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں طے ہو گیا ہے تو ناقہ کی مہار پکڑی اور اپنے یہاں لے گئے[1] کہ یہ بھی ایک شرف اور جذبہ شوق کو تسکین دینے والی ایک سعادت تھی۔

متعلقین کی آمد مدینہ میں آکر آپ نے حضرت زید بن حارثہ اور حضرت ابو رافع[2] (رضی اللہ عنہما) کو دو اونٹ اور پانچسو درہم دیکر مکہ بھیجا کہ متعلقین کو لے آئیں۔ صاحبزادیوں میں حضرت رقیہ حضرت عثمان کے ساتھ حبش میں تھیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اُن کے شوہر ابوالعاص بن ربیع نے آنے نہیں دیا۔ بس حضرت زید کے ساتھ ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا اور دو صاحبزادیاں ام کلثوم اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہما آئیں ان کے علاوہ حضرت زید اپنی اہلیہ ام ایمن اور اپنے فرزند اُسامہ کو بھی ساتھ لے آئے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ[3] کو بھی حضرت زید کے ساتھ

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۱۱ [2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے قبطی تھے [3] حضرت عبداللہ بن ابی بکر حضرت عائشہ رض کے سوتیلے اور حضرت اسماء کے حقیقی (ماں شریک) بھائی تھے۔ غزوۂ فتح مکہ اور غزوۂ حنین میں شریک رہے جب غزوۂ حنین کے بعد طائف پر حملہ کیا گیا تو اُن کے ایک تیر لگا اس کا زخم اوپر سے مندمل ہو گیا۔ مگر اندر ہی اندر پھوڑا بن گیا تقریباً دو سال تک یہ پھوڑا رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً سات ماہ بعد شوال ۱۱ھ ہجری میں حضرت ابو بکر رض کے دورِ خلافت میں پھوڑے کے پھٹنے سے ان کی وفات ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن کے لئے ایک حلہ (باقی بر صفحہ آئندہ)

بھیجا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلقین کو وہ اپنے ساتھ لائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ان کے ساتھ آئیں۔ ان سب کو حارثہ بن نعمان[1] کے مکان میں ٹھہرایا گیا۔[2]

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: لایا گیا تھا یعنی یمن کی بنی ہوئی دھاریدار چادروں کا جوڑا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کفن سفید سوتی کپڑے کا بنایا گیا۔ یہ حُلّہ کام میں نہیں آیا تو حضرت عبداللہ نے اپنے کفن کے لئے نو دینار میں خرید لیا تھا لیکن وفات کے وقت وصیت کر دی کہ اس کا کفن نہ بنایا جائے کیونکہ اگر اس کپڑے کا کفن اچھا ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کفن اسی کا ہوتا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کو منتخب نہیں کیا گیا تو میں بھی اس کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا۔ یہ تھا نازک احساس عاشقانِ اتباعِ سنت کا۔ رضی اللہ عنہ (الاستیعاب)

[1] حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی تھے۔ کسی سائل کو دروازہ سے محروم نہیں جانے دیتے تھے اور جو کچھ دیتے وہ خود اپنے ہاتھ سے دیتے تھے۔ آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی تو جہاں ان کی نشست رہتی تھی وہاں سے دروازہ تک ایک رسی باندھ لی تھی۔ دروازہ میں کھجوروں کا ٹوکرا رکھا رہتا تھا۔ جب سائل آتا تو یہ رسی پکڑ کر دروازہ تک جاتے اور خود اپنے ہاتھ سے فقیر کو دیتے تھے۔ بچوں نے عرض کیا کہ یہ خدمت ہم انجام دے سکتے ہیں۔ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ مناولۃ المسکین تقی میتۃ السوء (یعنی مسکین کو خود اپنے ہاتھ سے دینا بُری موت سے محفوظ رکھتا ہے) ایک مرتبہ حضرت جبرئیل امین انسانی شکل میں نزول فرما ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی پیغام پہنچایا۔ حاضرین کو نہ پیغام کی خبر ہوئی نہ حضرت جبرئیل کی تشریف آوری کی۔ مگر حضرت حارثہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ یہ صاحب کون تھے جو آپ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ یہ حضرت حارثہ کی مخصوص فضیلت تھی کہ آپ نے حضرت جبرئیل کو دیکھ لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تعجب بھی ہوا اور ایک امتی کی اس فضیلت پر مسرت بھی ظاہر فرمائی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں وفات ہوئی۔ رضی اللہ عنہ۔ الاستیعاب۔

[2] طبقات ابن سعد صـ۱۶۱ ج ۱۔

نیا دور۔ غیر محدود میدانِ عمل

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ِالَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورۂ ۷ الاعراف آیت ۱۵۷)

(اے پیغمبر تم لوگوں سے کہو) اے افرادِ نسلِ انسانی (اے بنی نوعِ انسان) میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کے لئے ہے۔ (آیت ۱۵۷ سورۂ ۷)

(۱)

وہ آفتاب جو مشرقِ مکہ سے طلوع ہوا تھا جس کی کرنیں اب تک فاران کی چوٹیوں سے ٹکرا رہی تھیں، مدینہ کے خطِ استوا، پر پہنچا تو وہ آفتابِ نیم روز تھا۔ ویسے بھی دعوت و تبلیغ کے دس[1] سال پورے ہو چکے تھے اور آنے والے سال بھی دس ہی تھے۔

(۲)

اس کا دائرۂ عمل نوعِ انسان کے کسی خاص گروہ[2] یا طبقہ تک تو کبھی محدود نہیں ہوا۔ البتہ ظاہری وسائل و ذرائع کی بنیاد پر اس کا مخاطب اب تک اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا[3] تھا اور اب اس کا موقف وہ ہے جو وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ[4]

---

[1] نبوت کے ابتدائی تین سال میں دعوت و تبلیغ کا حکم عام نہیں تھا (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)۔ [2] جیسا کہ بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کا دائرہ عمل گروہ بنی اسرائیل تھا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل ہی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ سورۂ ۶۱ صف آیت ۵ و ۶۔ [3] سورۂ ۶ الانعام آیت ۹۲ سورۂ ۴۲ الشوریٰ آیت ۷ ام القریٰ مکہ۔ من حولها۔ جو اس کے اطراف میں ہیں۔ [4] یعنی آپ کے مبعوث کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پوری نوعِ انسان کو (وہ عرب ہوں یا عجم، کالے ہوں یا گورے) ان برکتوں کی بشارت سنا دو جو ایمان و عمل سے حاصل ہوتی ہیں اور انکارِ حق کے جو برے نتیجے ہوتے ہیں ان سے متنبہ اور آگاہ کر دو۔

نَذِیْرًا[۱]" کا مطلع اور مظہر ہے۔

(۳)

سکندرِ اعظم جیسے فاتحِ عالم کی تاریخ کا پہلا باب یہ ہوگا کہ اس نے ایسی زبردست فوجی طاقت کس طرح فراہم کی جو فاتحِ عالم بن سکی۔ اس کی فوج کی خصوصیات کیا تھیں اور وہ خود کس درجہ کا صاحبِ شجاعت اور صاحبِ حوصلہ تھا۔ لیکن وہ فردِ کامل جو پوری بنی نوع انسان کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا تھا اس کی تاریخ و سیرت کا پہلا باب یہ ہونا چاہیئے کہ وہ کیا اصول تھے کیا طریقہ کار تھا اور کون سے اخلاق تھے جو وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ[۲] کی غرض و غایت کو پورا کر سکے۔ (آنے والے صفحات میں انہیں سوالات کے جوابات ہیں)۔

وَمَا تَوْفِيْقِىْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ

---

[۱] سورہ ۳۴ سبا آیت ۲۸۔ [۲] آپ کو یہ آخری پیغام دیکر نہیں بھیجا گیا مگر اس لئے کہ رحم کرنا تھا تمام جہانوں پر۔ پس آپ کی ذات سراسر رحمت کیونکہ جو پیغام آپ کے ذریعہ بھیجا گیا وہ سرتاسر رحمت ہے۔

دعوت الی اللہ

داعی کے اوصاف و خصائل اور خصوصیات

(۱)

ارشادِ ربانی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا. وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا. وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا. وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا.

سورہ ۳۳ احزاب آیت ۴۸

اے نبی یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ کو (ان خصوصیتوں کے ساتھ مبعوث کیا ہے کہ) آپ شاہد ہیں (ایمان و عمل کے بہتر نتائج اور ان کی برکتوں کی) بشارت دینے والے (انکارِ حق کے برے نتیجوں سے) آگاہ اور متنبہ کرنے والے اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والے۔ اور (آپ ایک) چراغ ہیں نور پھیلانے والے (روشن کرنے والے) اور (اے نبی) اہلِ ایمان کو بشارت دیدے کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے بڑا فضل (اعزاز) ہے اور کہنا نہ مان منکروں اور منافقوں (دغا بازوں) کا اور نظر انداز کر دے ان کی ایذا رسانی کو اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ کافی کارساز ہے۔

(۲)

توریت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت دی گئی تھی:

یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا وَ حِرْزًا لِّلْاُمِّیِّیْنَ۔ اَنْتَ عَبْدِیْ وَ رَسُوْلِیْ وَ سَمَّیْتُكَ المتوکّلَ لیس بفظٍ ولا غلیظٍ ولا صخّابٍ فی الاسواق ولا یدفع بالسیئۃ السیئۃَ ولٰکن یعفو ویغفر۔ ولن یقبضہ اللہ حتّٰی یقیم بہ الملّۃَ العوجاءَ۔ بان یقولوا لا الٰہ الا اللہ وتفتح بہا اعینٌ عمیٌ واذانٌ صمٌّ وقلوبٌ غلفٌ

(بخاری شریف ص۲۸۵)

اے نبی یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ کو ان خصوصیتوں کے ساتھ مبعوث کیا ہے کہ آپ شاہد ہیں (ایمان وعمل کے بہتر نتائج اور اُن کی برکتوں کی) بشارت دینے والے (انکار حق کے بُرے نتیجوں سے) آگاہ ومتنبہ کرنے والے۔ پناہ اور محافظ ان کے جن کے یہاں پہلے کوئی نبی نہیں آیا تھا، تم میرے بندے ہو۔ اور میرے رسول ہو میں نے تمہارا نام رکھا ہے المتوکل (اس متوکل کی شان یہ ہے) نہ بدخلق ہے۔ نہ سخت دل۔ نہ بازاروں میں شور وشغب کرنے والا (یعنی نہ بازاری قسم کا غیر سنجیدہ) برائی کا جواب برائی سے نہیں دیتا بلکہ درگذر کرتا ہے اور بخش دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس وقت تک (اس کی جان)

---

[۱] حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص توریت کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ حضرت عطاء بن یسار رضی اللہ عنہ نے ان سے دریافت کیا توریت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے یا نہیں، اگر ہے تو آپ کے کیا اوصاف بیان کئے گئے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عمرو نے توریت کے حوالہ سے یہ اوصاف بیان فرمائے۔ بخاری ص۲۸۵۔ باب کراہیۃ الصخب فی الاسواق کتاب البیوع۔

قبض نہیں کرے گا۔ جب تک کہ اس کے ذریعے اس ملت کو ٹھیک نہ کر دے، جس کو ٹیڑھا کر دیا گیا ہے۔ ٹھیک اس طرح کرے کہ وہ قائل ہو جائیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کلمہ سے ان کی اندھی آنکھیں، بہرے کان اور وہ دل جن پہ غلاف چڑھے ہوئے ہیں کھول دیئے جائیں۔

مندرجہ بالا قرآن پاک کی آیت اور توریت کی بشارت میں آپ کی چند خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

(۱) **شاھد**۔ گواہی دینے والا۔ شہادت[1] اور گواہی کا مدار مشاہدہ پر ہوتا ہے۔ یعنی قیاس اور گمان و تخمینہ کی بناء پر گواہی نہیں دی جاتی۔ بلکہ گواہی اس چیز کی دی جاتی ہے۔ جو خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہو یا اپنے کانوں سے سُنی ہو یہی وجہ ہے کہ شاہد کو اس چیز کا یقین[2] ہوتا ہے، جس کی وہ شہادت دے رہا ہے۔ اگر یقین نہ ہو محض گمان اور قیاس ہو تو شہادت دینا صحیح نہیں ہے۔ پس یہ لفظ "شاہد" ایک فلسفی اور نبی میں امتیاز پیدا کر دینے والا ہے۔ فلسفی کے پاس ایمان و یقین نہیں ہوتا۔ فلسفی کا سرمایہ محض فکر[3] ہوتا ہے (سوچ وچار۔ غور وخوض) یا تجربہ[4]

---

[1] الشہادۃ قول صادر عن علم حصل بمشاهدۃ بصیرۃ او بصر (المفردات فی غریب القرآن للراغب رحمہ اللہ)۔ [2] انما حقیقۃ الشہادۃ ھو تیقن الشیئ وتحققہ من شہادۃ الشیئ۔ (حضور) عینی شرح بخاری فی شرح کلمۃ الاذان اشھد ان لا الٰہ الا اللہ۔ ص ۶۲۵/۲ ج ۲۔ [3] یونان اور ہندوستان کے فلاسفۂ قدیم کے پاس محض فکر تھا۔ اسی فکر سے انہوں نے آسمانوں کی تحقیق کی۔ ان میں تارے گڑے ہوئے سمجھے اور زمین کو ساکن اور آسمان کو متحرک مانا وغیرہ وغیرہ۔ آج ان سب باتوں کی تردید کی جا رہی ہے۔ حالانکہ یہی باتیں تھیں جن پر ایمان لانا فلاسفہ کے نزدیک ضروری تھا۔

[4] ماہرین سائنس کے پاس صرف تجربہ ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بقول شاعر:

اے برادر بے نہایت درگہیست ہر چہ بروے میرسی بروے مایست

غور و خوض یا تجربہ سے جو نتیجہ برآمد ہو، اس پر ایسا یقین نہیں ہوتا کہ وہ قسم[1] کھا سکے۔

نبی۔ اس عالم کے فنا ہونے۔ قیامت اور محشر کے برپا ہونے پر قسم کھا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کو یقین[2] ہوتا ہے کہ اس عالم کا آخری انجام قیامت ہے۔ فلسفی کے قیاس اور فکر میں اس عالم کا جو انجام بھی ہو وہ اس پر قسم نہیں کھا سکتا۔ کیونکہ اس کے پاس یقین کی مضبوطی اور ایمان کی روشنی نہیں ہے۔ اس کے پاس ظن۔ گمان ہے۔ تخمینہ اور اندازہ سے وہ یہی کہے گا۔ میری تحقیق یہ ہے ممکن ہے غلط ہو۔ چونکہ فلسفی نورِ یقین سے محروم ہوتا ہے تو وہ اپنے نظریہ کی دعوت بھی نہیں دیتا اور خود اس کا حوصلہ بھی پست رہتا ہے۔ نہ اس میں ذوقِ ایثار ہوتا ہے نہ شوقِ فدائیت نہ جذبۂ قربانی۔

اس کے برخلاف نبی جو کچھ کہتا ہے۔ وہ شرح صدر[3] سے کہتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس یقین کا نور اور ایمان کی روشنی ہوتی ہے۔ وہ علم اور انکشاف کے اس دیدبان اور مینارہ پر ہوتا ہے۔

---

[1] پس سائنس کی تمام تحقیقات ظنیات ہیں۔ خود ماہرین سائنس کو اعتراف ہوتا ہے۔ کہ ان کی آج کی تحقیقات حرف آخر نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی نیا انکشاف اس تمام تحقیق کو فریب نظر قرار دے دے۔ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون سورہ ۶ الانعام آیت ۱۱۶ و سورہ ۱۰ یونس آیت ۶۶۔

[2] اس کا مدار وحی پر ہوتا ہے۔ یعنی اعلام خداوندی پر جو سراسر یقین ہوتا ہے۔ کیونکہ خالق سے بڑھ کر اپنی مخلوق کا حال کسی کو نہیں معلوم ہو سکتا۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ سورہ ۶۷ الملک آیت ۱۴

[3] ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس ولقد جاءھم من ربھم الھدی سورہ ۵۳ النجم آیت ۲۳ وہ (فلسفی یا مشرکین) اپنے ظن کی اتباع کرتے ہیں اور ان خیالات کی جو ان کے نفس پیدا کرتے ہیں (اور اس کو عقیدہ کی حیثیت دے دیتے ہیں۔ نیز ارشاد ہے۔

ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئاً (سورہ ۵۳ آیت ۲۸)

وہ (فلسفی اور ماہرین سائنس اپنے فکر یا اپنے تجزیہ کی بنا پر اور مشرکین اپنے دلوں کی چاہ اور ان عقائد اور خیالات کے بموجب جو خاندانوں میں پشتہا پشت سے چلے آرہے ہیں اور دلوں میں رچ گئے ہیں۔ ظن کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں اور جہاں حق کی غیر فانی سچائی اور اصل حقیقت کی ضرورت ہو وہاں یہ وہم و گمان کام نہیں آتا۔

جہاں سے وہ غنیم کی فوجوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے جبکہ اہل شہر کو غنیم کا تصور بھی نہیں ہوتا اور فلسفی نے اگر کسی طرح اندازہ لگالیا ہو کہ دشمن کی فوجیں قریب آگئی ہیں اور اس اندازہ کے عقلی دلائل بھی اس کے پاس ہوں تب بھی وہ اپنے اندر وہ جذبہ نہیں پاتا جو اس کو قربانی پر آمادہ کر دے نہ اس کے دل میں وہ دہشت ہوتی ہے جو اس کو بے چین اور مضطرب کر دے۔ کیونکہ اس کا یہ اندازہ تذبذب کی دلدل سے پاک اور آزاد نہیں ہوتا۔

جو شخص اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے کہ آگ کی خندق اس کے سامنے ہے اور وہ اس کے کنارے اس طرح کھڑا ہے کہ آگے قدم بڑھاتا ہے تو وہ ٹھیک خندق میں جاتا ہے۔ وہ صرف اپنے قدم کو آگے بڑھنے سے نہیں روکے گا بلکہ وہ پوری قوت صرف کر دے گا کہ وہ اپنی جگہ جا رہے اس کا قدم آگے نہ بڑھ سکے اور جس قوت سے وہ اپنے قدم کو آگے بڑھنے سے روکے گا اسی ہی قوت سے وہ دوسروں سے بھی اصرار کرے گا کہ اس طرف نہ بڑھیں۔ اگر اس کو مزاحمت کرنی پڑے تو وہ مزاحمت میں بھی کمی نہیں کرے گا۔ یہاں تک کہ اگر اس مزاحمت میں اس کی جان بھی جاتی ہے تو وہ اس کو شہادت سمجھے گا کہ اس نے بے شمار مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کی اور اپنی ایک جان دیکر بہت سی جانیں بچا دیں۔

یہ جذبہ یہ جوش اور ولولہ فلسفی میں نہیں ہوتا۔ جبکہ نبی ہر آن اور ہر لمحہ اس جذبہ سے سرشار رہتا ہے۔ لفظ شاہد نے جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یقین کامل[1] اور ایمان مکمل کی خبر دی اس نے یہ بھی بتا دیا کہ داعی کے لئے لازم ہے کہ اس کے پاس وثوق کامل اور اعتماد ہو اور وہ متاع یقین کا سرمایہ دار ہو۔

---

[1] یہی یقین کامل اس شہادت کی بنیاد ہو گا جو انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں کے حق میں نافرمان قوموں کے برخلاف اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جملہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں جملہ اقوام عالم کے برخلاف قیامت کے روز دیں گے۔ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا سورہ ۴ نساء آیت ۴۰۔

(۲) **مُبَشِّرًا** - بشارت دینے والا۔ لفظ بشارت "بُشرہ" سے ماخوذ ہے۔ کھال کے بیرونی اور ظاہری حصّہ کو بشرہ کہتے ہیں۔ غیر معمولی خبر کا اثر بشرہ پر بھی پڑتا ہے۔ خوشی کی خبر سے بشرہ کِھل جاتا ہے اور رنج کی خبر سے ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ بسا اوقات بُشرہ کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔

(۳) **نَذِيرًا**[1] مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرنے والا۔ یہ دو لفظ اس دعوت کی اہمیت و عظمت کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں۔ یعنی اس کو مان لینا غیر معمولی خیر و برکت کا ذریعہ ہو گا (جو بشارتِ عظیم ہے اہلِ ایمان کے لئے) اور انکار کرنا ایسا عمل ہو گا جس کا نتیجہ تباہ کن اور ہلاکت انگیز ہو گا۔ (یہ تنبیہہ اور انذار و اعلام ہے اہل کفر کے لئے۔

(۴) **داعیًا الی اللّٰہ** - اللہ کی طرف بلانے والا۔

خدا کا نام لینے والے بہت ہیں۔ اسی طرح خدا کا نام لیکر تبلیغ کرنے والے بھی بہت ہیں۔ مگر کیا وہ واقعی خدا کی طرف بُلاتے ہیں۔ یا اپنے ذاتی نظریات و خیالات کو منشاء، قدرت اور حکم خدا سمجھے ہوئے ہیں اور ان کی طرف لوگوں کو بُلاتے ہیں۔ یا یہ صورت ہے کہ اپنی اغراض کی خاطر دعوت و تبلیغ کا بازار لگا رکھا ہے اور دین کے نام پر دنیا کما رہے ہیں۔ داعیًا الی اللہ کے بعد باذنہ کے لفظ نے وضاحت کر دی کہ آپ جو پیغام یا تعلیم پیش کرتے ہیں وہ منجانب اللہ ہے اور اس کے حکم سے ہے۔ آپ کے ذاتی نظریات نہیں ہیں۔

(۵) کسی مملکت کا پیغام مملکت کی طرف سے نہیں مانا جاتا۔ جب تک پیغام دینے والا مجاز نہ ہو۔ سفراء پہلے سندِ سفارت پیش کرتے ہیں اُس کے بعد ان کو اجازت ہوتی ہے کہ اس مملکت میں سفارتی فرائض انجام دے سکیں۔ باذنہ کے لفظ نے ایک سند عطا فرما دی کہ آپؐ کو اللہ کی طرف سے مجاز کی حیثیت حاصل ہے گویا اس فرض اور اس خدمت کے لئے آپ لائسنس دار ہیں۔

---

[1] النذر الانذار اخبار فیہ تخویف کما ان التبشیر اخبار فیہ سرور۔ (المفردات فی غریب القرآن۔

(۶) سراجاً منیرا۔ چراغ روشنی بخشنے والا۔

کہتے ہیں کہ آفتاب سراسر آگ ہے۔ اور چاند اگرچہ روشن ہے مگر اس کا نور اپنا نہیں۔ وہ آفتاب کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن چراغ کی چند خصوصیتیں ایسی ہیں جو نہ آفتاب میں ہیں نہ چاند میں۔

سب سے پہلی خصوصیت وہ سوز و گداز ہے جو نہ آفتاب کو میسر ہے نہ چاند کو۔ دوسری خصوصیت یہ کہ چراغ شریک محفل ہوتا ہے۔ جب کہ آفتاب اور چاند بزم انسان سے لاکھوں میل دور ہیں۔

تیسری خصوصیت فیض رسانی اور تکمیل تربیت ہے۔ آپ چراغ کی ٹمٹماتی بتی سے بھی ہزار ہا چراغ جلا سکتے ہیں اور قندیل روشن کر سکتے ہیں۔ جبکہ آفتاب جہاں تاب نے آج تک کسی دوسرے کو آفتاب نہیں بنایا اور نہ چاند اپنے وجود سے کوئی دوسرا چاند بنا سکا۔

(۴) چراغ کی حقیقت: مٹی یا روئی کا وہ گالا ہے۔ جس سے اس کی بتی بنائی جاتی ہے مٹی میں آگ نہیں لگتی روئی آگ پکڑتی ہے۔ مگر شعلہ نہیں بنا سکتی۔ پس چراغ کی ہستی اور اس کی روشنی کا سرمایہ وہ تیل ہے جو چراغ روشن کرنے والا اس کے ظرف میں بھر دیتا ہے۔

یہ ہیں چراغ کی خصوصیتیں۔ ان خصوصیتوں کے ملاحظہ کے بعد آیت پر نظر ثانی فرمایئے۔ آیت میں داعیاً الی اللہ کے بعد سراجاً منیراً فرما کر اس حقیقت کو طشت از بام فرما دیا۔ کہ

(الف) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا سرمایہ وحی الٰہی کا وہ روغن ہے جو اس کے تن بدن سے پیوست ہے بلکہ وہ روغن کہ داعی کا تن بدن اس کی تراوٹ میں غرق ہے۔ اس کا نور تمام تر اسی کا فیض[1] ہے۔

(ب) داعی کی دعوت شاعرانہ تفریح نہیں بلکہ شعلہ ہے اس سوزش[2] کا جو اس کے

---

[1] مَا یَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى - سورہ والنجم وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما انا قاسم واللہ یعطی [2] لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ - سورہ شعراء۔

بدن کو پگھلا رہی ہے۔ یہ سوزش، ہمدردی نوع انسان کی سوزش ہے۔ انسان اپنے اعمال کے نتائج سے غافل ہے یہ نبی اُن کو دیکھ رہا ہے اور پگھل رہا ہے۔[1]

(ج) اہلِ محفل مشغول ہیں مگر چراغ اپنا کام برابر کر رہا ہے۔[2]

(د) سورج اور چاند روشنی بخشتے ہیں۔ مگر ایثار اور قربانی کا سبق نہیں دیتے۔ یہ خصوصیت چراغ کی ہے کہ اس کی بتی جل کر فنا ہو رہی ہے اور ہر ایک داعی کو داعیانہ جہاد میں فنا ہونے کا سبق دے رہی ہے۔ یعنی داعی کی دعوت اس وقت نور بخش ہو سکتی ہے جبکہ خود داعی سوز و گداز بن جائے۔ اپنے تن بدن کو مقاصد دعوت کے لئے قربان کر دے۔ اور اس ایثار اور قربانی کو اپنے وجود کا مقصد اعظم اور اپنے ظہور کی آخری غرض و غایت بنا لے (حقیقت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت اسی لفظ سراجاً منیراً میں سموئی ہوئی ہے آپ سیرتِ مقدسہ کا جتنا گہرا مطالعہ کریں گے آپ کا ضمیر اس کی شہادت دیتا رہے گا۔

(۵) ارشادِ ربانی ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ سورہ ۳۳ احزاب آیت ۴۰

ترجمہ: نہیں ہیں محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ۔ لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین[3] ہیں (سب کے ختم پر ہیں)۔

---

[1] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ آپ وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے۔ فرمایا مجھے سورہ ہود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا (شمائل ترمذی ص) ان سورتوں میں ان ناعاقبت اندیش انسانوں کے نتائج بد بیان کئے گئے ہیں جنھوں نے انبیا کی دعوت سے گریز کر کے کفر کی راہ اختیار کی۔ ان نتائج کے صدمہ نے آپکو بوڑھا بنا دیا۔ [2] يَآ اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔۔۔ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (سورہ مائدہ آیت ۱۰) [3] خاتم کے معنی ہیں مہر، اسی لئے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے ترجمہ یہ کیا ہے۔ مہر سب نبیوں پر۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

یعنی بقول حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ، اللہ کے رسول ہیں۔ اس حساب سے سب آپ کے بیٹے ہیں (موضح القرآن) اگر آپ کے بعد کوئی اور نبی آتا تو نوع انسان کا یہ تعلق اس سے ہو جاتا مگر چونکہ آپ خاتم الانبیاء ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا۔ تو آپ کا یہ تعلق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ اسی سورۃ احزاب میں پہلے یہ ارشاد ہوا ہے۔ النبی اولیٰ بالمؤمنین مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ ۔ ع ۱ ۔ آیت ۶ ۔

ترجمہ: نبی سے لگاؤ ہے، ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے اور اس کی عورتیں اُن کی (مومنین کی) مائیں ہیں۔

تشریح: آیت کا اشارہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت باپ سے بھی زیادہ ہے۔ اسی لئے جب ازواج مطہرات کو اُمت کی مائیں قرار دیا گیا تو یہ نہیں فرمایا گیا کہ آپ اُمت کے باپ ہیں۔ کیونکہ باپ کی شفقت رشتۂ پدری میں محدود ہوتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت ان حدود سے بہت بالا ہے۔ ہمارے الفاظ اس کی کوئی حد بیان نہیں کر سکتے البتہ عمل سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ اگر کوئی مفلس مسلمان وفات پا جائے اور ترکے کے بجائے اس کے ذمہ قرض ہو اور اس کے لاوارث بچے ہوں جن کا کوئی پرسان نہ ہو تو اس کا قرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ادا فرمائیں گے اور اس کے بچوں کی ذمہ داری بھی آنحضرت صلی اللہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ، یعنی جس طرح مہر آخر میں ہوتی ہے اور مہر لگا دینے کے معنی ہوتے ہیں ختم کر دینا۔ اور اس سلسلہ کو بند کر دینا، ایسے ہی آپ کے بعد نبی بنانے کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ کوئی نبی نہیں بنایا جائے گا۔ باقی عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری ہو گی تو آپ کی نبوت نئی نہیں ہو گی بلکہ آپ کی نبوت وہی ہو گی جو آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے تقریباً چھ سو سال پہلے عطا ہوئی تھی۔ آپ کی نبوت وہی ہے البتہ دورِ محمدی میں آپ تشریف لائیں گے تو شریعت محمدیہ پر عمل کریں گے۔ کیونکہ اس دور کا تقاضا یہی ہے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

علیہ وسلم کے اوپر ہوگی۔ آپ اُن کے مربی بھی ہوں گے اور متکفل بھی ہونگے۔ لیکن اگر کوئی مسلم ترکہ چھوڑ کر وفات پاتا ہے تو اس کا ترکہ اُس کے وارثوں پر تقسیم ہوگا رشتہ کا باپ ترکہ میں حصہ دار ہوتا ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ترکہ میں سے کوئی حصہ نہیں لیا۔ البتہ لاوارث بچوں کی اور مرنے والے کے قرض کی ذمہ داری لے لی (بخاری شریف وغیرہ) اس لئے کہ آپ کی شفقت، شفقتِ پدری کی حدود سے آگے بڑھی ہوئی تھی۔

ہدایات

وہ نبی جس کو ان خصوصیات کے ساتھ مبعوث کیا گیا تھا۔ اس آیت کے دوسرے حصہ میں اس کو چند ہدایات فرمائی گئی ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) پہلی ہدایت۔ اہلِ ایمان کو بشارت دیدیجئے کہ اُن کے لئے اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل (اعزاز) ہے۔

تشریح اس ہدایت میں۔ (الف) جس طرح طریقہ دعوت و تبلیغ کی تلقین ہے کہ داعی الی اللہ کو تخویف و ترہیب (ڈرانے دھمکانے اور مرعوب کرنے) کے بجائے ترغیب اور تشویق کا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے یعنی خدا کے قہر و غضب کے تذکرہ سے پہلے ان نعمتوں اور ان فوائد کو ذہن نشین کرانا چاہیئے جو دعوت کے قبول کرنے پر صاحب ایمان کو میسر آئیں گے۔

(ب) اور جس طرح حوصلہ افزائی ہے ان اہلِ ایمان کی جو دعوت قبول کر رہے ہیں۔

(ج) اسی طرح پیشین گوئی ہے اُن امتحانات کی جو دعوت قبول کرنے والوں کے ہوا کرتے ہیں جنکی بنا پر اللہ کے یہاں اُن کا اعزاز[۱] ہوتا ہے۔ سورہ ۲ (بقرہ) آیت ۲۱۴ میں فرمایا گیا ہے[۲]۔

کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ (محض ایمان کا زبانی دعوے کر کے) تم جنت میں

---

[۱] یعنی جب فضل و اعزاز کی بشارت ہے تو لامحالہ ان امتحانات کی بھی پیشین گوئی ہے جن میں کامیاب ہونے پر فضل و اعزاز کا تمغہ ملتا ہے۔ [۲] ام حسبتم ان تدخلوا (الی قولہ) قریب (سورۂ ۲ بقرہ ع ۲۶)

داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تو تمہیں وہ آزمائشیں پیش ہی نہیں آئی ہیں، جو تم سے پہلے لوگوں کو پیش آ چکی ہیں۔ ہر طرح کی سختیاں اُنہیں بھگتنی پڑیں، ہولناک مصائب سے اُن کو جھنجوڑا گیا، یہاں تک کہ اللہ کے رسُول اور جو لوگ ایمان لائے تھے پکار اُٹھے، اے نصرتِ خداوندی تیرا وقت کب آئے گا۔ (تب اچانک پردہ غیب چاک ہوا اور خداوند عالم کی نصرت یہ کہتی ہوئی نمودار ہو گئی، ہاں گھبراؤ نہیں خدا کی نصرت تم سے دور نہیں ہے۔ آیت ۲۱۴/۲۔

اس عام ضابطۂ قدرت کے علاوہ خاص اس اُمّت کو بھی آگاہ کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ بقرہ کی آیات[1] ۱۵۴ تا ۱۵۷ جن کا ترجمہ یہ ہے۔

(یاد رکھو یہ ضرور ہونا ہے کہ ہم تمہارا امتحان لیں۔ خطرات کا خوف۔ بھوک کی تکلیف۔ مال و جان کا نقصان۔ پیداوار کی تباہی۔ وہ آزمائشیں ہیں جو تمہیں ضرور پیش آئیں گی۔ پھر جو لوگ صبر کرنے والے ہیں انہیں (فتح و کامرانی کی) بشارت دے دو یہ وہ لوگ ہیں جب کبھی کوئی مصیبت اُن پر آتی ہے (تو بے قرار و بدحواس ہونے کے بجائے ذکرِ الٰہی سے اپنی رُوح کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اور ان کی زبانِ حال کی صدا یہ ہوتی ہے کہ) اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔ ہم اللہ کے ہیں (ہماری زندگی اور موت۔ رنج و غم۔ سود و زیاں۔ جو کچھ بھی ہے سب اللہ کے لئے ہے اور ہم سب کو بالآخر مرنا اور) اس کی طرف لوٹنا ہے۔ سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اُن کے پروردگار کے الطاف و کرم ہیں جن پر ان کے رب کی رحمت اترتی ہے اور یہی ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ (سورہ بقرہ آیت ۱۵۴ تا ۱۵۷)

(۲) دوسری ہدایت۔ اور کہنا نہ ماننا منکروں اور منافقوں کا۔

---

[1] وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ الی قولہ تعالیٰ المھتدون۔ سورۃ بقرہ ع ۱۹

سورہ ۷۶ (دہر) کی آیت ۲۴ میں یہ ارشاد ہے۔

آپ اپنے پروردگار کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہیئے اِن (دشمنانِ دین) میں سے کسی گنہگار اور ناشکرے کا کہنا نہ مانیئے۔

بیشک داعی الی اللہ اللہ کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہے گا۔ وہ غیر اللہ کے حکم کی تعمیل نہیں کرے گا۔ ان سے قطع تعلق کریگا۔ مگر یہ قطع تعلق خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہوگا۔ دل آزاری کیساتھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ جس رب کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہا ہے اس کا حکم یہ بھی ہے کہ "یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو۔ اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہوجاؤ۔" (سورہ ۷۳ (مزمل) آیت ۱۰)

(۳) تیسری ہدایت ۔ دَعۡ اَذَاھُمۡ ۔ نظر انداز کردے ان کی ایذارسانی کو یعنی معاف کرو۔ درگذر کرو۔ صبر وضبط اور تحمل سے کام لو۔ داعی الی اللہ کی یہی شان ہے اور یہی اس کا فرض ہے۔

چنانچہ سورہ ۳ (آل عمران) کی آیت ۸۵ ا میں فرمایا گیا ہے[1]۔

(یاد رکھو) ایسا ہونا ضروری ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ۔ یہ بھی ضرور ہونا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین عرب سے تمہیں دکھ پہنچانے والی باتیں بہت کچھ سننی پڑیں۔ اگر تم نے صبر کیا (یعنی مصیبتوں میں ثابت قدم رہے)

---

[1] حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت جس کو بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں ص۶۵۵ اور باب کنیۃ المشرک میں ص۹۱۶ پر تفصیل سے نقل کیا ہے اس کے آخری الفاظ سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت تک تھا جب تک جہاد کی اجازت نہیں ہوئی تھی اس کے بعد یہ حکم نہیں رہا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں یہ حکم ہمیشہ کے لئے ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں جہاں یہ حکم ہے فاذا انسلخ الاشھر الحرم فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم۔ آیت ۵ (جب حرمت کے مہینے گذر جائیں تو (جنگ کی حالت قائم ہوجائے گی اس وقت) مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو) اس آیت کے بعد اگلی آیت یہ ہے۔ (باقی برصفحہ آئندہ)

اور تقویٰ کا طریقہ اختیار کیا۔ (اللہ تعالیٰ کے احکام کی پوری تعمیل کی اور نافرمانی سے پوری احتیاط برتی) تو بلاشبہ یہ ہوں گے بہت بڑے حوصلہ کے کام۔

(۴) چوتھی ہدایت۔ اللہ پر بھروسہ کر۔

یعنی جملہ ذرائع استعمال کر۔ ذرائع کا مہیا کرنا بھی فرض ہے۔ مگر بھروسہ ذرائع پر نہ ہو۔ بھروسہ خدا پر ہو کہ ہدایت بخشنا اس کا کام ہے وہی جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔

انك لا تهدى من احببت ولكن الله يهدى من يشاء وهو اعلم بالمهتدين۔ سورہ ۲۸ القصص آیت ۵۶۔

تم جس کو چاہو راہِ راست پر نہیں لگا سکتے اللہ جس کو چاہے راہِ راست پر لگا دیتا ہے اور ہدایت پانے والوں کا پورا علم اُسی کو ہے۔

سیرۃ مبارکہ کا اہم اور اصل جزو دعوت ہے۔ داعی کی حیثیت سے آپ کے اوصاف و خصائل سطور بالا میں بیان کیے گئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر دعوت کے آداب اور طریقہ کار بھی بیان کر دیا جائے۔ یہ بھی سیرت مبارکہ کا سب سے مقدم باب ہے۔ آئندہ سطور میں آداب اور وہ طریقہ کار بیان کیا جا رہا ہے۔ جو وحیِ الٰہی نے مقرر فرمایا ہے۔ واللہ الموفق وھو المستعان

بقیہ صفحہ گذشتہ: وان احد من المشركين استجارك آیت ۶ (یعنی اے نبی اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آئے اور تم سے امان مانگے تو اسے ضرور امان دو یہاں تک کہ وہ (اچھی طرح) اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اُسے امن کے ساتھ اس کے ٹھکانے پر پہنچا دو (اسلام قبول کرے یا نہ کرے)

دراصل حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا تعلق پورے واقعہ سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب تک جہاد کی اجازت نہیں ہوئی تھی اور صرف صبر ہی کی ہدایت تھی تو اس وقت تک عبداللہ بن ابی بن سلول اور ان کی پارٹی کے آدمی کھلے بندوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کیا کرتے تھے جو بسا اوقات توہین آمیز ہوتی تھی اور جب جہاد کی اجازت ہو گئی اور غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو فتح بھی حاصل ہو گئی تو ان لوگوں نے ظاہرداری کے لئے اسلام قبول کر لیا اور کھلم کھلا مخالفت کے بجائے در پردہ سازشیں شروع کر دیں۔

آداب دعوت وطریقہ کار

(۱)

(الف) اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ (تا) وَالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۔

سورہ ۱۶ نحل رکوع ۱۶

ترجمہ: (اے نبی) اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اس طرح کہ حکمت (اور دانشمندی) کی باتیں بیان کرو۔ اور اچھے طریقہ پر پند اور نصیحت کرو اور مخالفوں سے بحث ونزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ وہی طریقہ سب سے بہتر (اور زیادہ سے زیادہ حسن وخوبی) کا طریقہ ہو۔ تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کون راہِ راست پر ہے اور مخالفوں کی سختی کے جواب میں اگر سختی کرو تو چاہیئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی اور اگر تم نے صبر کیا (یعنی جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا) تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لئے صبر ہی بہتر ہے اے پیغمبر صبر کر اور تیرا صبر کرنا نہیں ہے مگر اللہ کی مدد سے اور ان لوگوں کے حال پر غم نہ کھا۔ نہ ہی ان کی مخالفانہ تدبیروں سے دل تنگ ہو۔ یقیناً اللہ انہیں کا ساتھی ہے جو متقی ہیں۔ اور نیک عملی میں سرگرم رہتے ہیں۔

سورہ ۱۶ نحل آیت ۱۲۵ تا ۱۲۸

(ب) خذ العفو ۔ تا ۔ سمیع علیم۔ سورہ اعراف رکوع ۲۴

ترجمہ: درگذر اور معافی کا طریقہ اختیار کر۔ نیک کام کو کہہ۔ اور کنارہ کر جاہلوں (نادانوں) سے اور اگر اُبھارے تجھ کو شیطان کی چھیڑ (یعنی اگر ایسا ہو کہ کسی بات پر جھونجل آجائے جو یقیناً شیطان کی حرکت ہوگی۔ داعی الی اللہ کو جھونجل نہ آنی چاہیئے) تو فوراً

اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ، اس کی پناہ پکڑو۔ جو بخل کو ختم کر دو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔

سورہ ۷، الاعراف آیت ۱۹۹

تشریح: ذہنی صلاحیت ہر ایک کی یکساں نہیں ہوتی۔ کوئی صاحب علم و دانش ہوتا ہے۔ کوئی سادہ طبیعت اور کوئی کھود کرید اور بحث و مباحثہ کا شوقین ہوتا ہے۔ ان آیات کا اشارہ یہ ہے کہ داعی الی اللہ کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ مخاطب کی ذہنیت کو پرکھے اگر وہ صاحب علم و دانش ہے تو اس کو عالمانہ اور دانشمندانہ دلائل حکمت سے سمجھائے۔ عوام کے لئے ہمدردانہ نصیحت اور وعظ و پند سے کام لے۔ اور بحث کے شوقین سے بحث بھی کر سکتا ہے۔ مگر اس طرح کہ پہلے مخاطب کو سمجھے پھر وہ انداز اختیار کرے جو حق بات کے سمجھنے اور سمجھانے کا ہوتا ہے، جس سے مخاطب میں یقین پیدا ہو۔ اس کے دل کی گرہ کھلے ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے اس کا دل دکھے۔ اپنی حق پرستی کا زعم اور گھمنڈ اور اس کی باطل پرستی کی تحقیر و تذلیل کا انداز ہرگز نہ ہو۔ دل پر خوف خدا غالب رہے کہ دلوں کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔ گمراہ اور ہدایت یافتہ کو وہی خوب پہچانتا ہے۔ اپنے انجام کی خبر کسی کو نہیں۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کس کا انجام کیا ہوگا۔ داعی الی اللہ کے لئے یہ بھی درست نہیں کہ وہ مخالف کی مخالفانہ حرکتوں سے دل تنگ ہو اس کے مزاج میں جو بخل بھی نہ آنی چاہیئے اگر مخالف کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے تو اجازت ہے کہ اس کا جواب دے سکتے ہو مگر نپا تلا۔ کہ اس میں داعی اور مبلغ کی طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو۔ مگر صرف یہ اجازت ہے۔ داعی کی شان یہ نہیں کہ وہ بدلہ لے۔ اس کا کام ہے عفو۔ درگزر اور ضبط و تحمل۔ صبر۔ اس کا یہ صبر اللہ کے لئے ہے اور اللہ کی مدد سے ہے۔ لہٰذا داعی کا فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ اس کے ظرف میں وسعت، نگاہ میں بلندی عطا فرما کر اس کی مدد کرے۔ اس کو یقین رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ احتیاط اور تقویٰ سے کام لے رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے، اس

کا حامی اور مدد گار ہے۔

(۲)

لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡۤ اَمۡوَالِکُمۡ۔ تا ۔ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ۔ سورۃ آل عمران ۱۹۶

ترجمہ: ایسا ضرور ہونا ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ۔ یہ بھی ضرور ہونا ہے کہ اہلِ کتاب اور مشرکین کی طرف سے تمہیں دُکھ پہنچانے والی باتیں بہت کچھ سننی پڑیں، اگر تم صبر (ضبط و تحمّل) سے کام لو اور پرہیزگاری کرو۔ (تقوے سے کام لو، احکامِ حق کی نافرمانی سے بچو) تو یہ ہیں ہمت کے کام۔

سورہ ۳ آلِ عمران آیت ۱۸۵

داعی کے اوصاف و خصائل کے سلسلہ میں تیسری ہدایت گذر چکی ہے "دَعۡ اَذَاھُمۡ" نظر انداز کر دے ان کی ایذا رسانی کو۔

سوال یہ ہو سکتا ہے کہ نظر انداز کب تک کرتا رہے اس کا جواب اس آیت سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کب تک کی کوئی حد ہی نہیں۔

چاہتے ہو کہ حق کا بول بالا ہو تو یہ تمنا آسان نہیں ہے۔ باطل تمہارے مقابلہ میں ضرور آئے گا۔ پوری قوت سے آئیگا۔ اور آتا رہے گا۔ جب تک دنیا میں نور و ظلمت، اندھیری اور اُجالا ہے، حق و باطل کی جنگ بھی جاری ہے اور پیروانِ دعوتِ حق کے لئے یہ امتحانات بھی باقی ہیں۔

داعی الی اللہ کی کامیابی یہی ہے کہ ان امتحانات میں وہ کامیاب ہو۔ ہدایت دینا اور بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لانا خدا کا کام ہے۔

السّعی منّی والاتمام من اللہ

(۴)

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو دعوت اور طریقہ دعوت

اہل کتاب

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء - تا - من دون اللہ - سورہ آل عمران رکوع ۷ -

ترجمہ: اے نبی۔ تم اہل کتاب سے (یہود اور نصاریٰ) سے کہدو۔ اے اہل کتاب (اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ دو) اُس بات (اصول) کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لئے یکساں طور پر تسلیم شدہ ہے یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی کی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں ہم میں سے ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے گویا خدا کو چھوڑ کر اسے اپنا پروردگار بنالیا ہے۔ سورہ ۳ آل عمران آیت ۶۴

وجہ اختلاف

ولکل امۃ جعلنا منسکا - تا - بما تعملون -

سورہ ۲۲ الحج رکوع ۹

(اے نبی) ہم نے ہر اُمت کے لئے عبادت کا ایک طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے جس پر وہ چل رہی ہے۔ بس لوگوں کو اس معاملہ میں (یعنی اسلام کے طور طریق میں) تجھ سے جھگڑنے کی کوئی وجہ نہیں۔ تو اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو دعوت دے (کہ اصل دین یہی ہے) یقیناً تو ہدایت کے سیدھے راستہ پر چل رہا ہے۔ اگر (اس پر بھی) لوگ تجھ سے جھگڑا کریں تو کہدے کہ اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ تم جن باتوں میں آپس میں اختلاف کر رہے ہو۔ قیامت کے دن وہ تمہارے درمیان فیصلہ کر کے حقیقت حال آشکارا کر دیگا۔

سورہ ۲۲ الحج آیت ۶۶ تا ۶۸

تشریح: ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا اسلوب اور طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ:

(الف) ان باتوں کو مقدم رکھا جائے جن کو مخاطب بھی مانتے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ ہونی چاہیئے غیر اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرنا چاہیئے کہ معلوم ہو کہ خدا کو چھوڑ کر ان کو معبود مان لیا ہے۔ اس کو اہل کتاب بھی مانتے ہیں۔ لہذا پہلے اسی پر زور دیا جائے۔

(ب) یہ سمجھایا جائے کہ اللہ ایک ہے تو اس کا دین بھی ایک ہی ہے۔ اس کی بنیادی باتیں بھی ایک ہی ہیں۔ عبادت کا حکم ہمیشہ رہا۔ اختلاف اس کے طور و طریق میں ہوا۔ کیونکہ ہر ایک عہد اور ہر ایک دور اور ہر ایک قوم کی حالت یکساں نہیں تھی۔ جس کی جیسی حالت اور جیسی صلاحیت اور قابلیت تھی اس کے مطابق اس کو طور طریق دیا گیا جو ہر دور میں ترقی کرتا اور آگے بڑھتا رہا۔ بس یہ اختلاف فطری اور قدرتی تھا جو واقع ہوا۔

(ج) دعوت دینے والے کے دل میں دوسرے مذہب کے طریقوں کا یہ احترام ہو کہ وہ سمجھے کہ بنیادی طور پر وہ من جانب اللہ تھے تو اس سے اس کے انداز دعوت میں لامحالہ لچک ہوگی۔ دوسری طرف جن کو دعوت دی جا رہی ہے ان کو بھی اس دعوت سے وحشت نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ سمجھے گا کہ یہ دعوت پہلی بنیادوں کو اکھاڑ نہیں رہی بلکہ ان کو اپنی جگہ تسلیم کرتے ہوئے تعمیر میں اضافہ کر رہی ہے۔

(د) ان حقیقتوں کو ذہن نشین کرانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مخاطب یہ اثر لیں گے کہ جب سابق امتوں میں اُن کی صلاحیتوں کے موجب عبادت کے قواعد و قوانین میں فرق ہوتا رہا ہے تو ترقی یافتہ حالات کے مطابق اگر کوئی طریقہ معین کیا گیا۔ جو مکمل اور آخری طریقہ ہے تو وہ بھی قابل تسلیم ہونا چاہیئے۔ اس سے وحشت نہ کرنی چاہیئے۔

(ہ) پس تقاضا انصاف یہ ہے کہ سابق اُمتوں کے لوگ (اہل کتاب) اس دعوت کو اختلاف اور نزاع کا نشانہ نہ بنائیں بلکہ اس کو پرکھیں۔ حقیقت پسندی سے کام لیں اور صداقت کو تسلیم کریں۔[1]

(و) لیکن اگر مخاطب لوگ تمام حقیقتوں کو پس پشت ڈال کر نزاع کرنا اور جھگڑنا ہی پسند کریں

---

[1] اس سلسلہ میں ملاحظہ فرمایئے انسان اور انسانیت منزل بہ منزل - (دیباچہ سیرت مبارکہ)

تو داعی الی اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ بھی ان کی طرح ضد۔ عناد اور نزاع میں پڑے۔ بلکہ وہ "اللہ اعلم بما تعملون"[1] کہہ کر الگ ہو جائے اور اُن کا معاملہ خدا کے حوالے کر دے۔ کہ قیامت کے دن وہی ان نزاعات کا فیصلہ کرے گا۔ (واللہ اعلم)

اہلِ شرک

اتبع ما اُوحِیَ الیک ۔تا۔ بما کانوا یعملون۔

سورہ ۶ الانعام رکوع ۱۳

ترجمہ: (اے نبی،) تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر وحی کی گئی ہے۔ تم اس کی پیروی کرو۔ کہ کوئی معبود نہیں ہے۔ مگر صرف اسی کی ذات۔ اور کنارہ کرو مشرکین سے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو (وہ اس کی قدرت رکھتا ہے کہ انسان کو اس طرح بنا دیتا کہ سب ایک ہی راہ پر چلنے والے ہوتے اور) یہ لوگ شرک نہ کرتے (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ مشیت خداوندی کا یہی فیصلہ ہوا کہ ہر انسان اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے۔ پس تمہارا کام یہی ہے کہ سچائی کی راہ دکھا دو (انہیں جبراً اپنی راہ پر چلانا تمہارا کام نہیں ہے) ہم نے تمہیں نہ تو اُن پر پاسبان بنایا ہے (کہ ان کی رائے اور عمل کی نگرانی کرو) اور نہ تمہارے حوالہ ان کی ذمہ داری ہے (کہ ان کے نہ ماننے کا کوئی الزام تم پر آئے)۔

اور (مسلمانو!) جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کے معبودوں کے متعلق بدکلامی نہ کرو کہ پھر وہ بھی حد سے بڑھ کر بے سوچے سمجھے خدا کو بُرا بھلا کہنے لگیں۔ ہم نے اسی طرح ہر قوم کے لئے اس کے کاموں کو خوش نما بنا دیا (کہ ہر قوم اپنی راہ رکھتی ہے اور اپنی ہی راہ اُسے اچھی دکھائی دیتی ہے) پھر آخر سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے۔ اس وقت وہ ان سب پر ان کے کاموں کی حقیقت کھول دے گا۔ جو وہ (دنیا میں) کرتے رہے ہیں۔

سورہ ۶ الانعام آیت ۱۰۵ تا ۱۰۷

---

[1] تمہارے عمل کو جو تم کرتے ہو خدا خوب جانتا ہے۔

تشریح: یعنی یہ تو حقیقت ہے کہ شرک ظلم عظیم ہے[1]۔ شرک کرنے والا خدا پر ظلم نہیں کرتا بلکہ خود اپنے اوپر بہت بڑا ظلم کرتا ہے کہ اپنی عظمت اور اپنی خودداری کو خود ہی پامال کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بلندی پر ہو پھر خود اپنے آپ کو پستی کے گڑھے میں گرا دے۔ جہاں اس کو مردار خور پرندے تکا بوٹی کر دیں یا ہواؤں کے جھونکوں کی لپیٹ میں آکر برباد ہو جائے[2]۔ اس ظلم عظیم کا نتیجہ لامحالہ یہ ہے کہ مشرک کے لئے بخشش کی گنجائش نہیں[3]۔ اور مشرک کا جنت میں داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا[4]۔ لیکن ان تمام قباحتوں اور نفرت انگیز خرابیوں کے باوجود داعی الی اللہ کے انداز میں نفرت اور تحقیر و تذلیل کی جھلک نہ ہونی چاہیے وہ جب دعوت دے تو اس کی نظر اس پر ہونی چاہیے کہ اس کائنات میں رنگ برنگی اس کے خالق اور پروردگار کی حکمت و قدرت کاملہ کا تقاضہ ہے۔ اس چمن کی رونق ہی گلہائے رنگارنگ سے ہے اور اس کی زیبائش نہیں نکھرتی جب تک اس میں خاردار درخت اور پودے نہ ہوں۔ پھر ظاہر ہے کہ پھول پھول ہے۔ کانٹا کانٹا ہے۔ پھول کا جو مقام ہے وہ کانٹے کو میسر نہیں ہو سکتا۔ مگر چمن کی کیاریوں میں جس طرح پھول کا پودا۔ اپنی تازگی میں مست ہے۔ کانٹے کا جھاڑ بھی مگن ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سارا چمن اسی کا ہے اور اسی کے لئے ہے۔ اس جھاڑ سے اگر پوچھا جائے تو اسے اس کا احساس نہیں کہ وہ کانٹا ہے اور دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہے اسے اگر اس کا احساس ہوتا تو وہ چمن کی کیاری کے پاس بھی نہ جاتا۔ بلکہ اس کی نظر میں کچھ اپنی خوبیاں ہیں۔ اس کو احساس ان خوبیوں کا ہے۔ اسی لئے وہ چمن کی کیاری میں پھول کے پودے سے زیادہ سینہ زور ہے اور اپنی آن میں مست ہے۔ پس داعی الی اللہ کا فرض ہے کہ دعوت اور تبلیغ کے وقت وہ اس فلسفۂ قدرت کو سامنے رکھے۔ اگر وہ کانٹے کی اصلاح چاہتا ہے تو اس کو خار ہونے کا طعن دیکر اصلاح نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی اصلاح جب ہوگی جب اس ذہنیت کی

---

[1] سورہ ۳۱ لقمان آیت ۱۳ [2] سورہ ۲۲ الحج۔ آیت ۳۱ [3] سورہ ۴ نساء آیت ۱۱۵۔
[4] سورہ ۷ الاعراف آیت ۴۰۔

اصلاح ہو کہ وہ کانٹا ہے۔ مگر اپنے آپ کو پھول کا ہمدوش سمجھتا ہے بلکہ خیابان پر پھول سے زیادہ اپنا حق جتاتا ہے۔

آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو انسان کو بھی حیوانات کی طرح بنا دیتا کہ سب اپنی حالت میں ایک ہی طرح کے ہوتے لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا اس نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر گروہ اپنی اپنی رائے اور اپنی اپنی پسند رکھتا ہے اور ہر گروہ کی نظر میں وہی کام اچھا ہے جو وہ کر رہا ہے۔ تمہاری نظر میں اس کی راہ کتنی ہی بری ہو لیکن اس کی نظر میں وہ ایسی ہی اچھی ہے جیسی تمہاری راہ تمہاری نظر میں پس ضروری ہے کہ اس بارے میں برداشت اور رواداری سے کام لو جو لوگ شرک و بت پرستی میں مبتلا ہیں تم انہیں دعوتِ حق دو۔ مگر برا بھلا نہ کہو۔ اگر تم ان کے بتوں کو برا بھلا کہو گے تو وہ بھی خدا کو برا بھلا کہیں گے نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم انھیں گالیاں دو گے وہ تمہیں دیں گے۔ طلبِ حق کی بات نہیں رہے گی گالی گلوچ کی بات ہو جائے گی۔

لامذہب عقل پرست اور خدا کے منکر (معاذ اللہ)

ھو الذی یسیرکم فی البر والبحر۔ تا۔ تعملون۔ سورۃ یونس۔ رکوع ۳ آیت ۲۱،۲۲

ترجمہ: وہی ہے جس نے تمہارے لئے سطح زمین پر اور سمندر میں سیر و سیاحت کا سامان کر دیا ہے۔ پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ تم جہازوں میں سوار ہوتے ہو اور جہاز موافق ہوا پا کر تم کو لے اڑتے ہیں۔ مسافر خوش ہوتے ہیں کہ کیسی اچھی ہوا چل رہی ہے! پھر اچانک ہوائے تند کے جھونکے آ پہنچتے ہیں اور ہر طرف سے موجیں اٹھ اٹھ کر گھیر لیتی ہیں اور مسافر خیال کرتے ہیں کہ بس اب ان میں گھر گئے (اور بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی)، تو اس وقت انہیں (خدا یاد آتا ہے) وہ دین کے اخلاص کے ساتھ اسے پکارنے لگتے ہیں۔ اے خدا اگر اس مصیبت سے نجات دے دے تو ہم ضرور تیرے شکر گذار ہوں گے۔ پھر (دیکھو) جب اللہ

انہیں نجات دیدیتا ہے تو اچانک (اپنا عہد و پیمان بھول جاتے ہیں اور ناحق ملک میں سرکشی اور فساد کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو تمہاری سرکشی کا وبال خود تمہاری جانوں پر پڑنے والا ہے۔ یہ دنیا (چند روزہ) زندگی کے فائدے ہیں۔ اُٹھا لو پھر تمہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اس وقت ہم تمہیں بتائیں گے کہ جو کچھ دنیا میں کرتے رہے، اُس کی حقیقت کیا تھی۔ (آیت ۲۱ و ۲۲ سورہ ۱۰)

تشریح۔ یہ ایک ایسی مثال ہے، اس طرح کی صورتیں انسان کو زندگی کے اُتار چڑھاؤ میں اکثر پیش آتی رہتی ہیں کہ تمام ذرائع اور وسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ کوئی سہارا باقی نہیں رہتا فطرتِ انسان اس وقت بیدار ہوتی ہے۔ وہ لامحالہ ایک ان دیکھی ہستی کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ جس کو وہ قادر، کارساز اور بگڑی کا بنانے والا سمجھتی ہے، وہی خدا ہے۔

قرآن شریف کا تقریباً ایک تہائی حصہ اس طرح کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے، جن میں خود انسان کے مشاہدات، تجربات اور خود اس کے وجدانی جذبات کو پیش کر کے خداوند عالم کے وجود اور اس کی صفاتِ قدسیہ کو ثابت کیا گیا ہے اور داعی الی اللہ کے لئے ناقابلِ تردید دلائل کا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے۔ مثلاً بحری سفر ہی کی ایک مثال دوسرے عنوان سے سورہ بنی اسرائیل میں دی گئی ہے۔ ترجمہ یہ ہے۔

(ترجمہ) (اے لوگو) تمہارا رب وہ ہے جو تمہاری کاربرآریوں کے لئے سمندر میں جہاز چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو (بحری راستوں سے فائدے اٹھاؤ) بلاشبہ وہ تم پر بڑی ہی رحمت کرنے والا ہے۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم سمندر میں ہوتے ہو اور مصیبت آلگتی ہے تو اس وقت وہ تمام ہستیاں تم سے کھو جاتی ہیں جنہیں تم پکارا کرتے ہو، صرف ایک اللہ ہی کی یاد باقی رہ جاتی ہے۔ پھر جب وہ تمہیں مصیبت سے نجات دے دیتا اور خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو اس سے گردن موڑ لیتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان

بڑا ہی ناشکرا ہے۔ پھر کیا تمہیں اس سے امن مل گیا ہے کہ وہ تمہیں خشکی کے کسی گوشے میں دھنسا دے۔ یا تم پر پتھر برسانے والی آندھیاں بھیج دے اور تم اس حالت میں کسی کو اپنا مددگار نہ پاؤ۔ یا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تمہیں دوبارہ ویسی ہی مصیبت میں ڈال دے اور رہوا کا ایک سخت طوفان بھیجدے اور تمہاری ناشکری کی پاداش میں تمہیں غرق کر دے، پھر کسی کو نہ پاؤ جو اس کے لئے ہم پر دعویٰ کرنے والا ہو۔ اور البتہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور خشکی اور تری دونوں کی قوتیں اس کے تابع کر دیں کہ اسے اٹھائے پھرتی ہیں اور اچھی چیزیں اس کی روزی کے لئے مہیا کر دیں۔ نیز جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہے ان میں سے اکثر پر اسے برتری دے دی۔ پوری برتری جیسی کہ ہونی چاہیئے۔ آیت ۶۵ تا ۷۰، سورہ ۱۷ بنی اسرائیل۔

طرزِ عمل

(الف) لا اکراہ فی الدین ۔ سورۂ بقرہ رکوع ۲۴ آیت ۲۵۵ ۔

نہیں کوئی زور (جبر و قہر یا زبردستی) دین کی بات میں[2]۔ کیونکہ دین کا مدار[3] اس پر ہے کہ دل مان لے[4]۔ اور تسلیم کرلے۔ جبر و قہر سے زبانی اقرار کرایا

---

[1] ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ۔

[2] اذ الاکراہ الزام الغیر فعلاً لا یرضی بہ الفاعل وذالا یتصور الا فی افعال الجوارح اما الایمان فھو عقد القلب والقیاد لا یوجد بالاکراہ (تفسیر مظہری) وغیرہ

[3] ایک مسلمان اگر اسلام سے برگشتہ ہوکر معاذ اللہ کفر اختیار کرتا ہے تو اس کی وہ سزا ہے جو باغی کی ہوتی ہے یعنی وہ واجب القتل ہے، لیکن ایسا شخص جس سے جبراً قہراً اقرار کرالیا گیا وہ اگر اسلام سے منحرف ہوتا ہے تو کتب فقہ میں صراحت کردی گئی ہے کہ اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ہدایہ اخیرین میں ہے ولو اکرہ علی الاسلام حتی حکم بالاسلام ثم رجع لم یقتل (کتاب الاکراہ) یعنی اگر مجبور کرکے مسلمان بنالیا گیا یہاں تک کہ اسلام کے احکام اُس پر جاری ہوگئے (مثلاً مسلمان رشتہ دار کا ترکہ اس کو مل گیا یا کسی مسلمان عورت سے اس کا نکاح کرادیا گیا وغیرہ) پھر اس نے اسلام سے رجوع کرلیا اور عدالت میں بھی یہی بیان دیدیا کہ اس کو جبراً مسلمان بنایا گیا تھا تو مرتد کی سزا (قتل) اس کو نہیں دی جائے گی۔ شرح سیر کبیر میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے اقرار المکرہ باطل سواء کان الاکراہ بالحبس او القتل (شرح سیر کبیر ص۲۲۰ ج۴) یعنی جس سے زبردستی کچھ کہلوالیا گیا اس کا یہ اقرار باطل (قطعاً ناقابلِ اعتبار) ہے خواہ اس کو قید کی دھمکی دی گئی ہو یا قتل کی۔

[4] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ قبیلہ بنی سالم بن عوف کے ایک انصاری صاحب جن کا اسم گرامی حصین تھا ان کے دو لڑکے مسلمان نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ وہ اپنے لڑکوں کو مجبور کریں کہ وہ اسلام لے آئیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ لا اکراہ فی الدین (تفسیر مظہری وغیرہ) دین کی بات میں زور زبردستی نہیں۔

جاسکتا ہے۔ دل سے منوایا نہیں جاسکتا۔ کوشش یہ کرو کہ دل کی آنکھیں کھلیں۔ گمراہی کو گمراہی اور ہدایت کو ہدایت سمجھنے لگے۔

(ب) ادفع بالتی ھی احسن۔ تا۔ ولی حمیم۔ سورہ ۴۱ حم السجدہ ۵ آیت ۳۴

برائی کا جواب دو ایسی صورت میں کہ وہی صورت سب سے اچھی (اخلاقاً سب سے زیادہ مؤثر) ہو تو تم دیکھو گے کہ جس سے تمہاری دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا۔ جیسے مخلص دوست (سرگرم محبت) آیت ۳۴ سورہ ۴۱

(ج) وان عاقبتم۔ تا۔ للصابرین۔ سورہ ۱۶ نحل رکوع ۱۶ آیت ۱۲۶

اور اگر مخالفوں کی سختی کے جواب میں سختی کرو تو چاہیئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی اور اگر تم نے صبر کیا (جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا) تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لئے صبر ہی بہتر ہے۔ آیت ۱۲۶ سورہ ۱۶

تشریح: (۱) قانون یہ ہے۔

جزاء سیئۃٍ سیئۃٌ مثلھا (آیت ۴۰ سورہ ۴۲ شوریٰ)

برائی کی سزا اسی جیسی برائی ہے

(۲) داعی الی اللہ اگر اس ضابطہ پر عمل کرتے ہوئے سختی کے جواب میں بالکل اتنی ہی اور اس جیسی ہی سختی کرے تو اس کے جواز سے انکار نہیں ہے مگر اس سے برائی اور سختی کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ جواب میں جو چیز وجود میں آرہی ہے وہ بھی سختی اور برائی ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ابتداءً نہیں ہے جواباً ہے۔

(۳) جب کوئی شخص مقام دعوت اپناتے ہوئے ہے تو یہ ناپ تول اس کی شان کے شایان نہیں ہے اس کی شایانِ شان یہ ہے کہ وہ ضبط و تحمل اور صبر سے کام لے اور جواب وہ دے جو اس کی شان کے لحاظ سے بہت ہی بہتر ہو۔

(۴) داعی الی اللہ کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ایسی صورت اختیار کرے اور اس کی

کوشش کرے کہ برائی کا سلسلہ ختم ہو جس کی شکل مثلاً یہ ہے کہ جو دشمن ہیں وہ سرگرم محبت دوست بن جائیں۔

(۵) یہ بات بہت اونچی ہے۔ ہر شخص اس درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس اونچے درجے کو وہی حاصل کر سکتا ہے جو بڑا صاحب نصیب ہو۔ ۔ آیت ۳۵ سورہ ۱۱ حٰم سجدہ

بدی را بدی سہل باشد جزا
اگر مردی اَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَا

خلاصہ

(۱) داعی جس بات کی دعوت دے ضروری ہے کہ اس کے متعلق اس کو پورا یقین ہو جیسے مشاہدہ کرنے والے کو اپنے مشاہدہ کا یقین ہوتا ہے اور وہ اس پر شاہد ہوتا ہے۔

(۲) ضروری ہے کہ داعی کی فطرت با احساس ہو۔ ہمدرد اور غم خوار ہو۔ اس کے اندر شفقت ہو۔ درد ہو۔ سوز ہو۔ گداز ہو۔ وہ شمع یا چراغ کی طرح ہو۔

(۳) دعوت اس کے درد کا فغاں ہو۔ اس کے سوز دروں کا شعلہ ہو۔

(۴) داعی مشفق طبیب کی طرح ہو۔ اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ داعی اس شفقت اور اس ہمدردی اور خیر خواہی کا پیکر اور مجسمہ ہو جو شفقت و ہمدردی باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔

(۵) باپ کی تمنائیں اچھی ہی ہوتی ہیں وہ اپنی اچھی تمناؤں کا خواب دیکھتا ہے تو اولاد کو بشارت بھی دیتا ہے کہ یہ کرلو گے تو اعلیٰ درجہ پالو گے اور یہ بات بہت ہی درد اور دکھ کی ہوتی ہے کہ اولاد ناہنجار اور بدکار ہو یہ اس کی بدکاری کو دیکھ کر گھٹے۔ رنجیدہ ہو اور اولاد کو اُسکی بدکاری کے خطرناک نتائج پر بار بار آگاہ اور متنبہ کرے۔

پس باپ اپنی فطری تمناؤں کے لحاظ سے پہلے مبشر ہوتا ہے اور نذیر مجبوراً ہوتا ہے۔ یہی شان داعی کی بھی ہوگی۔ وہ پہلے مبشر ہوگا اور نذیر بدرجہ مجبوری ہوگا۔

(۶) دعوت کا انداز بھونڈا اور دانشمندانہ ہو۔ وہ مخاطب کو جانچے۔ تولے پرکھے پھر اس

کی صلاحیت کے موجب دعوت کا طرز اختیار کرے۔ اہلِ دانش سے دانش مندانہ۔ عوام سے ان کے حال کے موجب وعظ و پند اور خیر خواہانہ نصیحت کا اسلوب اختیار کرے اور جو بحث کے شوقین ہوں ان سے گفتگو مدلل ہو۔

(۷) مخاطب کے مذہب کے لحاظ سے دعوت کا انداز جدا جدا ہوگا۔ اہلِ کتاب کو دعوت اور طرح دی جاتے گی مشرک کو اس کے موجب۔ اور منکرینِ خدا، عقل پرستوں سے افہام وتفہیم کا طرز و انداز جدا ہوگا[1]

(۸) داعی کے مزاج میں ضبط و تحمل ہو۔ وہ گستاخیوں اور سختیوں کو برداشت کرے۔ کڑوی بات کا جواب میٹھے بول سے دے۔ مخاطب کو موافق اور دشمن کو دوست بنائے۔

(۹) داعی الی اللہ کا تعلق اپنے رب سے (جس کی طرف وہ دعوت دے رہا ہے) مضبوط ہو۔ اس کا اعتماد اور بھروسہ خدا پر ہو۔ وہ دعوت کو اپنا ایک فریضہ سمجھے جس کی ادائیگی اس کے ذمہ ہے۔ نتیجہ خدا کے حوالے کردے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داعی اعظم بلکہ تمام داعیانِ حق کے امام و مقتدا تھے قرآن پاک کی مندرجہ بالا آیتیں اور اس طرح کی بہت سی آیتیں شہادت دے رہی ہیں کہ داعی الی اللہ کے جملہ اوصاف و خصوصیات بدرجہ اتم و اکمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر موجود تھے۔ (کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن (عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا) بلکہ حق یہ ہے کہ آپکی ذات با جود منبع اور مرکز تھی۔ اوصاف داعی اور خصوصیات دعوت اس سے اخذ کئے جاتے ہیں

حضرت حق جل مجدہٗ نے جب آپ کو تمام امتوں اور پوری کائنات انسانی کیلئے داعی بنایا تو ہر ایک فرقہ اور ہر ایک گروہ سے خطاب کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ قرآن حکیم ان سب کا مجموعہ ہے۔ چند مثالیں اوپر گذر چکی ہیں

---

[1] نمبر ۶، ۷، پر عمل جب ہی ہو سکے گا جب مخاطب کے مذہب سے واقفیت ہو۔ دعوت و تبلیغ کا نظام قائم کرنا اجتماعی فریضہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک داعی جملہ مذاہب سے واقف ہو لیکن جس حلقہ کو دعوت کیلئے منتخب کیا جائے اس کیلئے داعی معین ہوں اور وہ اس حلقہ کے مذہبی رجحانات، معاشرتی رسوم و میلانات اور جذبات سے واقف ہوں۔

دعوت الی اللہ کی دشوار گذار گھاٹی

جہاد فی سبیل اللہ

یقیناً دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں کوئی جبر و قہر اور کوئی زبردستی نہ ہونی چاہیئے۔ بے شک داعی حق کا کام صرف یہ ہے کہ دلوں کے دروازوں پر دستک دیدے۔ اگر کوئی نہیں کھولتا تو بلا شبہ اس کو حق نہیں کہ کسی دروازے کو زبردستی کھولے یا کسی دریچے کو توڑے۔

یہ بھی درست ہے کہ داعی الی اللہ کو صبر و تحمل اور مسلسل برداشت سے کام لینا چاہیئے لوہے کے کنگھے سے اس کا گوشت کھرچا جائے۔ اس کی بوٹیاں نوچی جائیں۔ اس کو کھولتے ہوئے کڑھائے میں ڈال دیا جائے۔ اس کے سر پہ آرہ رکھ کر پورا بدن چیر کر دو ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ تو اس کا کمال یہی ہے کہ وہ ضبط و تحمل۔ صبر اور برداشت سے کام لے۔ ظالم کے حق میں یہی دعا کرے اَللّٰھُمَّ اھدِ قومی فَاِنَّھُم لَا یعلمون (اے اللہ میری قوم کو سیدھا راستہ دکھا دے وہ مجھے جانتے نہیں ہیں) لیکن اگر شکل یہ ہو کہ مخلوقِ خدا ظلم کی چکی میں پیسی جا رہی ہو۔ رائے کی آزادی سلب کر لی گئی ہو۔ پیٹ کو اگرچہ آسودگی میسر ہو۔ مگر ضمیر کی آزادی پر تالے پڑے ہوئے ہوں۔ طائرِ فکر کو آہنی قفس میں گھونٹ دیا گیا ہو۔ ایک شخص کا ضمیر ایک بات کو حق سمجھتا ہو۔ وہ مضطراور بے چین ہو کر اس حق کو قبول کرے مگر اس کو مجبور کیا جا رہا ہو کہ وہ ضمیر کے فیصلہ پر عمل نہ کرے وہ حق کو حق نہ سمجھے بلکہ غلط اور باطل کو حق سمجھے۔ اگر وہ اپنے ضمیر کے فیصلہ پر عمل کرے اور باطل کے دائرے سے نکلنا چاہے تو پہلے اپنی جان سے ہاتھ دھولے۔ پہلے پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالے۔ پھر قدم بڑھانے کا ارادہ کرے۔

اگر صورتِ حال یہ ہو تو کیا داعی حق کا فرض اب بھی یہی ہو گا کہ وہ ظلم کے شعلوں کو بھڑکتا ہوا دیکھتا رہے اور ان کو بجھانے کی کوشش نہ کرے۔ وہ مظلوموں کو جھلستا ہوا دیکھے، ان کی آہیں

سنے اور اپنی جگہ سمٹا ہوا بیٹھا رہے ظالم کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر اس وحشت انگیز صورت حال کو ختم کرنے کے لئے داعی کے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہے تو اس کی دعوت کا پروگرام ناقص ہے۔ ادھورا ہے۔ ناقابل قبول ہے۔

اگر داعی کی دعوت کا تعلق کسی خاص گروہ سے ہے اور وہ اسی گروہ کے نجات دہندہ کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ تب بھی ممکن ہے کہ اس گروہ کے علاوہ باقی مخلوق سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ کوئی ظالم ہو یا مظلوم۔ لیکن اگر داعی سارے جہان کا درد اپنے دل میں لیکر آیا ہے۔ اس کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا رشتہ پوری نوع انسان اور نوع انسان کے ہر طبقہ سے جڑا ہوا ہے۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ تمام دنیا جہان کے لئے رحمت ہو ہر ایک کے درد کا درماں اور ہر ایک کے دکھ کا علاج ہو تو لامحالہ اس کا فرض ہو گا کہ وہ ظلم کی اس چیرہ دستی کو ختم کرے اور مظلوموں کی آہ وبکا اور گریہ وزاری کو قلب مضطر کے کانوں سے سنے وہ ان کی فریاد رسی کے لئے اٹھے اور اس عزم کے ساتھ اٹھے کہ

یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

یہی وہ جد وجہد ہے جو داعی پر بحیثیت داعی فرض ہے اور جس کو اسلام جہاد فی سبیل اللہ کہتا ہے۔

تمام جہانوں کا رب اور ساری مخلوق کا پروردگار اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ ۔ تا ۔ نصیرا۔ سورہ نساء آیت ۷۵

اور (مسلمانو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد ہیں کتنی ہی عورتیں ہیں، کتنے ہی بچے ہیں (جو ظالموں کے ظلم سے عاجز آکر) فریاد کر رہے ہیں، خدایا ہمیں اس بستی[1] سے جہاں کے باشندوں

---

[1] نزول آیت کے وقت یہ حالت مکہ کی تھی کہ وہاں بہت سے مسلمان مشرکین مکہ کے ظلم وستم کا تختہ مشق بنے

نے ظلم پر کمر باندھ لی ہے نجات دلا۔ اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے اور کسی کو مددگاری کے لئے کھڑا کر دے۔ (آیت ۷۵، سورہ ۴)

یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ کیا اس کو دعوت الی اللہ کا ایک نہایت ضروری شعبہ نہیں کہا جائیگا اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دعوت الی اللہ بے دست و پا رہے گی۔ جب تک اس میں قوت مقابلہ نہ ہو جو ظالم کے ہاتھ رک سکے اور مظلوموں کو نجات دلانے کے لئے اقدام بھی کر سکے۔

یہ جہاد کب تک رہے گا؟ رب العالمین نے اس کی یہ حد بیان فرمائی ہے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ۔

(سورۃ الانفال رکوع ۵ آیت ۳۸)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہوئے تھے، ابوجہل کے حقیقی بھائی حضرت سلمہ اُن کے ماں شریک بھائی عیاش بن ابی ربیعہ۔ اور مکہ کے رئیس اعظم ولید بن مغیرہ کے لڑکے کہ ان کا نام بھی ولید ہی تھا (ولید ابن الولید) مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کو باندھ کر ڈال دیا گیا تھا کہ ہجرت نہ کر سکیں۔ اس طرح اور بھی عورتیں اور مرد تھے جو مجبور و مقہور تھے اور مکہ سے نکل نہیں سکتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں ان کے لئے دعا کیا کرتے تھے (بخاری شریف ص۱۱۰ تا ص۱۳۶ و ص۹۴۲ وغیرہ) لیکن ظاہر ہے آیت میں مکہ کی قید نہیں۔ جب بھی اور جہاں بھی یہ صورت حال ہو تو مسلمانوں کو جہاد کی ہدایت کی گئی ہے۔ بیشک دور حاضر کا بین الاقوامی قانون یہ ہے کہ کسی مملکت کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کسی دوسرے ملک کو حق نہیں ہے، مگر ظاہر ہے یہ بین الاقوامی قانون انسانی ہمدردی اور خلق خدا کے فلاح و بہبود کے جذبہ سے ناآشنا ہے۔ کیونکہ دور حاضر کی حکمران قوموں کا نصب العین صرف یہ ہے کہ ان کا اقتدار باقی رہے اور عظمت کے جس مینارہ پر وہ رونق افروز ہیں اس میں جنبش نہ آئے۔ بیشک ان قوموں کے افراد میں خلق خدا کی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے اور اسی جذبہ کی بنا پر ان کے یہاں بہت سے خیراتی ادارے اور بڑے بڑے خیراتی فنڈ قائم ہیں۔ مگر ان کی حکومتوں کا نصب العین نہ خلق خدا کی خدمت ہے نہ انسانی ہمدردی نہ کوئی اخلاق اور روحانی دعوت اُن کے مقاصد میں داخل ہے۔ یہی سبب ہے کہ ممالک کی اندرونی تحریکات خواہ کتنی ہی انسانیت کش اور ہلاکت انگیز ہوں۔ مگر بین الاقوامی پنچایت کوئی مداخلت نہیں کرتی۔ اسلام اس سنگدلی کو برداشت نہیں کرتا۔

اُن سے لڑتے رہو یہاں تک کہ ظلم و فساد[1] باقی نہ رہے اور دین کا سارا معاملہ[2] اللہ ہی کے لئے ہو جائے (انسان کا ظلم اُس میں[3] مداخلت نہ کر سکے)۔

---

[1] آیت میں لفظ فتنہ ہے۔ یعنی لڑتے رہو جب تک فتنہ نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر یہ فرمائی۔ کان الاسلام قلیلا کان الرجل یفتن فی دینہ اما قتلوہ واما یعذبوہ حتیٰ کثر الاسلام فلم تکن فتنۃ۔ بخاری شریف ص۶۴۸۔ یعنی مسلمان تھوڑے تھے۔ جو شخص مسلمان ہوتا وہ اپنے دین کے بارے میں مصیبت میں مبتلا ہو جاتا تھا یا اس کو قتل کر دیتے تھے یا عذاب میں مبتلا کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اسلام کی کثرت ہو گئی تو یہ فتنہ نہ رہا۔ یعنی مخالفین دین کا ظلم و فساد نہیں رہا۔

[2] یعنی اعتقاد کی آزادی حاصل ہو جائے اور دین کا معاملہ جس کا تعلق صرف اللہ سے ہے۔ خدا اور انسان کا باہمی معاملہ ہو جائے، انسان کے ظلم و تشدد کی مداخلت باقی نہ رہے۔

[3] اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ ملک جہاں اس طرح کا بیجا دباؤ اور ظلم و زیادتی ہو وہ اسلامی حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے باجگذار ہو جائے یا وہ افراد جو اس طرح کے ظلم میں شریک اور اس کے معاون و مددگار ہیں اسلامی حکومت کے تحت میں آکر حفاظتی ٹیکس (جزیہ) ادا کرنے لگیں حکومت ان کی جان و مال کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہو جائے۔ سورہ ۹ توبہ آیت ۲۸ میں اس کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ (اس کی تفصیل جلد دوم میں ملاحظہ فرمایئے)

خطابات وعمومی ارشادات

مکہ معظمہ سے تشریف لاکر چند روز قبا میں قیام رہا۔ پھر جمعہ کے روز قبا سے روانہ ہوئے تو قبیلۂ بنی سالم بن عوف کے میدان[1] میں جمعہ کی نماز پڑھی[2]۔ پھر آپ مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے ان مقامات پر آپ نے جو تقریریں فرمائیں مورخین نے ان کو جمع کیا ہے۔ دو تقریریں ابن اسحاق نے نقل کی ہیں[3]۔ ان کا ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱)

ایہا الناس۔ (اے لوگو) خوب سمجھ لو۔ کچھ پہلے سے بھیج دو۔ جو خود تمہارے کام آئیگا۔ خدا کی قسم یقیناً ایسا ہوگا کہ ہر شخص پر (قیامت کی) بے ہوشی طاری ہوگی (جس کے پاس جو کچھ ہے یہیں رہ جائے گا) بکریوں والا بکریاں چھوڑ جائے گا۔ ان کا کوئی گلہ بان نہ ہوگا۔ وہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوگا۔ یقیناً ایسا ہوگا کہ اس کا پروردگار براہِ راست اس سے خطاب فرمائے گا۔ نہ کوئی بیچ میں ترجمان ہوگا نہ کوئی رکاوٹ کی چیز درمیان میں حائل ہوگی (جو اس کے لئے آڑ بن سکے) اس کا پروردگار کہے گا۔ کیا میرے رسول نے تمہارے پاس پہنچکر تبلیغ نہیں کی تھی (کیا یہ تمام باتیں تمہیں نہیں بتا دی تھیں۔ کیا میں نے تجھ کو مال نہیں دیا تھا۔ کیا تیرے اوپر میں نے اپنا فضل نہیں کیا تھا۔ بس بتا تو خود اپنے لئے کیا لے کر آیا ہے۔ یہ

---

[1] اس میدان کا نام وادی رانوانا ہے۔ البدایہ والنہایہ ص۲۱۲ ج۳

[2] اس موقع پر جو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا حافظ ابن کثیر نے ابن جریر کے حوالہ سے اس کو نقل کیا ہے ملاحظہ ہو ص۲۱۲ البدایہ والنہایہ جلد ۳ یہ طویل خطبہ ہے اس کے کچھ حصے خطبات ماثورہ میں بھی دیئے گئے ہیں۔

[3] سیرۃ ابن ہشام ص۳۰۰ و ص۳۰۱ ج ۱۔

شخص اپنے دائیں دیکھیگا۔ اپنے بائیں دیکھے گا، اس کی دولت کا کہیں نام و نشان نہ ہوگا۔ وہ آگے کی طرف نظر ڈالے گا۔ وہاں دہکتے ہوئے جہنم کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پس دیکھو۔ دوزخ کی آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ جو کچھ امکان میں ہو خرچ کرو اور اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ کچھ نہ ہو چھوارے کا ایک ریزہ ہو۔ وہی خرچ کرو۔ جس کے پاس یہ بھی نہ ہو وہ میٹھے بول۔ اچھی بات سے غریبوں کی دلداری کرے۔ اس کا بھی اس کو ثواب ملے گا۔ نیکی کا ثواب دس گنے سے شروع ہوتا ہے۔ اور سات سو گنے تک پہنچتا ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

(۲)

بیشک تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد مانگتا ہوں، ہم اپنے نفسوں کی شرارت سے اور اپنے اعمال بد کے شر سے خدا کی پناہ لیتے ہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ ہدایت کے راستے کھول دے، پھر کوئی اس کو گمراہ نہیں کر سکتا۔ اور جس کو بھٹکا دے تو کوئی نہیں جو اس کو سیدھی راہ پر لگا سکے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔ بیشک سب سے اچھا کلام کتاب اللہ ہے۔ یقیناً وہ شخص کامیاب ہے۔ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو سجا دے اور جس کو اللہ تعالیٰ کفر سے ہٹا کر اسلام میں داخل کر دے۔ یقیناً وہ شخص کامیاب ہے جس نے انسانوں کے کلام اور ان کے قصوں کے مقابلے میں اللہ کے کلام کو منتخب کیا ہو۔ کیونکہ کلام اللہ ہی سب سے بہتر بات۔ سب سے بہتر کلام۔ اور سب سے بلیغ قصہ ہے (دیکھو) اس سے محبت کرو۔ جو اللہ سے محبت کرتا ہے (دیکھو) خدا سے

محبت کرو۔ دل کی گہرائی سے۔ اپنے دلوں کو اسی میں لگادو۔ اللہ کے کلام اور اللہ کے ذکر سے نہ اکتاؤ۔ تمہارے دلوں میں یہ سختی ہرگز نہ ہو کہ تم اس کی یاد سے غافل ہو جاؤ۔

(یاد رکھو اور سمجھ لو) اللہ تعالیٰ جو مخلوق پیدا کرتا ہے اس میں سے کچھ کو منتخب کر کے اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے۔ جو اعمال اس کو پسند ہیں۔ جن بندوں کو وہ پسند کرتا ہے۔ جو بات اس کو پسند ہے۔ اس نے نام لے کر ان کو بتادیا ہے اور معین کر دیا ہے (تم بھی اسی کو پسند کرو) اس نے حلال اور حرام کو کھول کر بتا دیا ہے۔ بس اللہ کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ گردانو۔ پورا پورا تقویٰ کرو۔ تمہاری زبان سے جو باتیں نکلتی ہیں ان میں یہ خوبی پیدا کرو۔ کہ اُن سے اللہ تعالیٰ کی تصدیق ہو۔ وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوں۔ اللہ کی بھیجی ہوئی روح (ذاتِ اقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے درمیان ہے' اس سے پوری پوری محبت کرو۔ تمہاری فطرت اپنے رب سے ایک عہد کئے ہوئے ہے (کہ رب وہی ہے اس کے سوا کوئی رب نہیں ہے) اس عہد کو پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا غضب اس پر نازل ہوتا ہے کہ اس عہد و پیمان کو توڑا جائے۔ جو فطرت انسان اپنے رب سے کئے ہوئے ہے۔

مدینہ طیبہ میں سب سے پہلا خطبۂ جمعہ

حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ نے ابن جریر کے حوالے سے وہ پورا خطبہ نقل کیا ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی سالم بن عمرو بن عوف میں نماز جمعہ کے وقت ارشاد فرمایا تھا۔ ہم اس خطبہ کو تبرکاً پورا نقل کرتے ہیں اس کے بعد ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے۔ اگر صاحبان جمعہ کے روز یہ خطبہ پڑھیں تو نورٌ علی نور و سعادت بالا سعادت کا مصداق ہو۔

خطبة التقویٰ:

(الحمد للہ) احمدہ واستعینہ واستغفرہ واستھدیہ واؤمن بہ ولا اکفرہ واعادی من یکفرہ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ وان محمداً عبدہٗ ورسولہ ارسلہ بالھدیٰ والنور والموعظۃ علی فترۃ من الرسل وقلۃ من العلم وضلالۃ من الناس وانقطاع من الزمان ودنو من الساعۃ وقرب من الاجل۔ من یطع اللہ ورسولہٗ فقد رشد ومن یعصھما فقد غوی وفرط وضل ضلالاً بعیداً۔ واوصیکم بتقوی اللہ فانہ خیر ما اوصٰی بہ المسلم المسلم ان یحضہ علی الاخرۃ وان یامرہ بتقوی اللہ فاحذروا ما حذرکم اللہ من نفسہ ولا افضل من ذالک نصیحۃً ولا افضل من ذالک ذکری وان تقوی اللہ لمن عمل بہ علی وجل ومخافۃ من ربہ عون صدق علی ما تبغون من امر الاخرۃ و من یصلح الذی بینہ وبین اللہ من امرہ فی السر والعلانیۃ۔ لا ینوی بذالک الا وجہ اللہ یکن لہ ذکراً فی عاجل امرہ وذخراً فیما بعد الموت حین یفتقر المرء الی ما قدم وما کان من سوی ذلک یود لو ان بینہ و بینہٗ امداً بعیداً۔ ویحذرکم اللہ نفسہ واللہ رؤفٌ بالعباد والذی

قَوْلَہٗ وَاَنْجَزَ وَعْدَہٗ لَا خُلْفَ لِذٰلِكَ وَاِنَّہٗ یَقُوْلُ مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ
لَدَیَّ وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ؕ فَاتَّقُوا اللّٰہَ فِیْ عَاجِلِ اَمْرِکُمْ
وَاٰجِلِہٖ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَۃِ فَاِنَّہٗ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ تُوَقّٰی مَقْتَہٗ
وَتُوَقّٰی عُقُوْبَتَہٗ وَسَخْطَہٗ وَاِنَّ تَقْوَی اللّٰہِ تُبَیِّضُ الْوُجُوْہَ وَتُرْضِی
الرَّبَّ وَتَرْفَعُ الدَّرَجَۃَ فَخُذُوْا بِحَظِّکُمْ وَلَا تُفَرِّطُوْا فِیْ جَنْبِ
اللّٰہِ فَقَدْ عَلَّمَکُمْ بِکِتَابِہٖ وَنَھَجَ لَکُمْ سَبِیْلَہٗ لِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ
صَدَقُوْا وَیَعْلَمَ الْکَاذِبِیْنَ ؕ فَاَحْسِنُوْا کَمَا اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ
وَعَادُوْا اَعْدَآئَہٗ وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ھُوَ اجْتَبٰکُمْ
وَسَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ لِیَھْلِکَ مَنْ ھَلَکَ عَنْۢ بَیِّنَۃٍ وَّیَحْیٰی مَنْ
حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَۃٍ ؕ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ؕ فَاَکْثِرُوْا ذِکْرَ اللّٰہِ
وَاعْمَلُوْا لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ ؕ فَاِنَّہٗ مَنْ یُّصْلِحْ مَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اللّٰہِ
یَکْفِہِ اللّٰہُ مَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ النَّاسِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰہَ یَقْضِیْ عَلَی
النَّاسِ وَلَا یَقْضُوْنَ عَلَیْہِ وَیَمْلِكُ مِنَ النَّاسِ وَلَا یَمْلِکُوْنَ
مِنْہُ ؕ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ ؕ

ترجمہ: میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد کی درخواست کرتا ہوں۔ گناہوں کی مغفرت چاہتا ہوں اور نیک ہدایت کی التجا کرتا ہوں۔ میں اس پہ ایمان لاتا ہوں۔ میں اس ذاتِ برحق کا منکر نہیں ہوں۔ میں اس کا دشمن ہوں جو اس ذاتِ برحق کا انکار کرے۔ مَیں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ مَیں شہادت[1] دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

[1] اپنے رسول اور نبی ہونے پر یقین رکھنا نبی اور رسول کو بھی ضروری ہے۔ گورنر فرائضِ منصبی جب ہی ادا کرسکتا ہے۔ جب اس کو اپنے گورنر ہونے کا یقین ہو اور خود بھی اپنے آپ کو گورنر مانتا ہو۔ اس کے بغیر اپنے فرائض کا احساس نہیں کرسکتا۔ یہ تکبر نہیں ہے۔ بلکہ اعتراف ہے۔

اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس رسول۔ محمد کو ہدایت، دین حق نور کامل اور پند و نصیحت اور حکمت و دانش کی نعمتیں سپرد کر کے ایسے وقت مبعوث فرمایا کہ صدیاں گذر گئی تھیں۔ سلسلۂ رسالت منقطع ہو چکا تھا۔ علم مولیٰ ناپید اور مفقود تھا۔ گمراہی کی گرم بازاری تھی۔ نور ہدایت پر اندھیری چھائی ہوئی تھی (دوسری طرف حالت یہ ہے کہ) یہ دنیا جس کو زمانہ کہتے ہیں اس کا سلسلہ ازل سے چل رہا ہے اب ٹوٹنے کے قریب ہے۔ قیامت سر پر ہے اور اس عالم کی آخری میعاد ختم ہو رہی ہے (اب اللہ تعالیٰ کا کوئی اور پیغام آنے والا نہیں ہے) اب جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت اور کامیابی حاصل کر لی اور جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت سے روگردانی کر رہا ہے۔ وہ گمراہ ہے اپنا فرض ادا کرنے میں حد سے زیادہ کوتاہی کر رہا ہے۔ اور صحیح راستہ سے بہت دور بھٹک رہا ہے۔

اے لوگو! میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنے کی وصیت[1] کرتا ہوں۔ اور دیکھو سب سے بہتر نصیحت جو ایک مسلمان دوسرے کو کرے یہی ہے کہ اس کو آخرت پر آمادہ کرے (یعنی ایسے کاموں کا شوق دلائے جو مرنے کے بعد کارآمد ہوں) اور یہ کہ خدا ترسی کی ہدایت کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ پرہیزگاری اور پارسائی کی زندگی اختیار کریں۔

اے لوگو! ان باتوں سے پرہیز کرو جن سے بچنا اور پرہیز کرنا اتنا ضروری ہے کہ خود اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے ان سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ اس سے افضل کوئی نصیحت ہو سکتی ہے اور نہ کوئی تذکیر

---

[1] یعنی دردمندانہ نصیحت جس میں وہ اخلاص ہو جو ایک مرنے والے کے قول میں ہو سکتا ہے۔ جب آخری منزل میں ہوتا ہے اور عقوبت کا نظارہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔

اور یاد دہانی اس سے زیادہ ضروری اور مفید ہو سکتی ہے۔

دیکھو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنا اور اس طرح تقویٰ کرنا کہ دِل لرز رہا ہو اور خوفِ خدا ذہن ودماغ پر چھایا ہوا ہو۔ یہ تقویٰ ایک عمل کرنے والے کے لئے بہت بڑا معاون اور بہت بڑا مددگار اور نہایت مخلص رفیق ہے۔

اور جو شخص ظاہر و باطن میں اپنا معاملہ اللہ سے درست کرلے، جس سے مقصود محض رضاء خداوندی ہو۔ کوئی دنیاوی غرض اور مصلحت پیشِ نظر نہ ہو۔ تو یہ ظاہر و باطن کی مخلصانہ اصلاح دنیا میں اس کے لئے باعزت یادگار، اور مابعد الموت کے لئے بہترین ذخیرہ ہے۔ جس وقت انسان ان اعمال کا سب سے زیادہ ضرورتمند ہوگا جو اس نے پہلے سے بھیجے ہوں۔

(دیکھو) (خدا ترسی اور ظاہر و باطن کی اصلاح کی کوشش کار آمد چیزیں یہی ہیں جو مرنے کے بعد انسان کی بہترین رفیق ہوں گی) ان کے علاوہ جو بھی ہے۔ وہ انسان کے لئے یہاں تک بے کار ہے کہ قیامت کے روز انسان تمنا کرے گا کہ کاش اس عمل کے اور میرے درمیان مدت دراز کی مسافت ہوتی۔

یاد رکھو! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے اس کی بے انتہا مہربانی اور اس کے بے پایاں رحم وکرم ہی کا تقاضا ہے کہ وہ خود اپنی ذات کا تم کو خوف دلا رہا ہے (کہ تم غافل۔ لاابالی۔ نفس پرست نہ ہو کر اللہ کے عذاب کے مستحق ہو جاؤ کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہوتا ہے۔ اس کی طاقت بھی بے پایاں ہے جس کو عذاب دینا چاہے تو کوئی نہیں جو اس کے عذاب کو روک سکے۔)

اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے کہ اس کا قول حق ہے۔ جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے۔ جو وعدہ کرتا ہے پورا کرتا ہے اس میں خلاف نہیں ہوتا۔ اس کا ارشاد ہے کہ اس کی بات پلٹی نہیں جاتی اور وہ بندوں پر ظلم بھی نہیں کرتا۔

پھر وہی بات ہے. اللہ سے تقویٰ کرو. موجودہ وقت اور حالت میں بھی اور مستقبل میں بھی. پوشیدہ بھی اور علانیہ بھی .جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ فرماتا ہے اور اس کے اجر کو بڑھاتا ہے. جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرے وہ کامیاب. پورا پورا کامیاب. بہت بڑی کامیابی کے ساتھ کامیاب.

غرض یہ ہے کہ بہر صورت خوفِ خدا کو سامنے رکھو. خوفِ خدا وہ اکسیر ہے جو عذابِ خدا سے بچاتا ہے اُس کی سزا اور اس کی ناراضی سے محفوظ رکھتا ہے. اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنا اور خوفِ خدا وہ تریاق ہے جو چہرہ کو روشن کر دیتا ہے، رب کو راضی کرتا ہے اور درجہ کو بلند کرتا ہے. پس جہاں تک ممکن ہو تقویٰ کا حصہ پورا پورا حاصل کرو اور دیکھو بارگاہ رب العزت کے حق میں کوتاہی مت کرو. اللہ تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم کی قدر کرو کہ اُس نے اپنی کتاب میں تمہیں کامل و مکمل تعلیم دی ہے. تمہارے لئے واضح طور پر راستہ مقرر کر دیا. اللہ تعالیٰ نے یہ اس لئے کر دیا کہ جھوٹے اور سچے کھل کر سامنے آجائیں. پس جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا ہے. تم بھی احسان کرو. تمہارا احسان یہ ہے کہ خود اپنے افعال اور اعمال کو درست کرو. اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے دوستی رکھو. اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن جانو. اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں پر جوش اور سرگرم جدوجہد پوری طرح کرتے رہو. وہی رب العزت ہے. وہی مولا برحق ہے. جس نے تمہیں اپنے دینِ کامل کے لئے منتخب فرمایا. تمہارا نام "مسلم" رکھا تاکہ جو برباد ہو تو اس حالت میں برباد ہو کہ کھلی ہوئی حجت اس کے سامنے ہو. اس کو یہ عذر نہ ہو کہ اس کے سامنے بات واضح نہ ہو سکی اور جو زندہ رہے تو اس طرح زندہ رہے کہ اپنے زندہ رہنے کی دلیل اور حجت اس کے پاس ہو. ولا حول ولا قوۃ الا باللہ (اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ہماری نہ کوئی فکری

طاقت ہے نہ عملی قوّت)

دیکھو مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو۔ اور مابعد الموت کے لئے عمل کرتے رہو۔ (اور پوری طرح سمجھ لو) کہ جو بندہ اس رشتہ کو درست کر لیتا ہے جو اس کے اور اس کے پروردگار کے مابین ہے تو خود اللہ تعالیٰ ذمہ دار بن جاتا ہے کہ اُن معاملات کو درست کر دے جو اس بندے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں۔

(بات صاف ہے) اللہ تعالیٰ کی حکومت ہے۔ وہ انسانوں پر حکومت کرتا ہے اور انسانوں کے حق میں اپنے فیصلے نافذ کرتا ہے۔ انسان اپنے پروردگار کے مالک نہیں ہیں۔ نہ انہیں خالق ارض وسما کی کسی بات پر کوئی قابو ہے۔ کبریائی اور عظمت صرف اللہ کے لئے ہے۔ ہم میں نہ کوئی طاقت ہے نہ قوت ہے جو کچھ قدرت و خلافت ہے وہ خدا کی مہربانی اور اس کی مدد سے ہے جو بلند و بالا اور بہت بڑی شان والا ہے۔

مقام فکر اور دلیل صداقت

اِن تمام خطبوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈالیے۔ موضوع خطاب کیا ہے۔ بار بار زور کس بات پر دیا جا رہا ہے۔

خدا کا خوف۔ اللہ سے ظاہر و باطن ہر طرح سے ڈرتے رہنا۔ ظاہر و باطن کی اصلاح۔ اللہ کو یاد رکھنا اور کثرت سے یاد کرنا۔

غور فرمائیے یہ خطبے کب دیئے جا رہے ہیں؟ یہ خطبے خاص اس وقت جب مخالفین تحریک اور دشمنانِ اسلام کی منصوبہ بند کوششوں سے جان بچا کر سانس لینے کا پہلا موقعہ ملا ہے جبکہ آپ کا سر قلم کرنے والوں یا گرفتار کرنے والوں کے لئے بڑے سے بڑے انعام کا اعلان فضا میں گونج رہا ہے۔

اوّل سے آخر تک خطبوں کے ایک ایک حرف پر نظر ڈال لیجئے۔ کیا کہیں کوئی ایک لفظ۔ کوئی اشارہ۔ کوئی کنایہ بھی ان دشمنوں کی طرف ہے؟

ان تیرہ سالہ زندگی کی بے پناہ اور مسلسل مصیبتوں کا جو خود اپنے عزیزوں اور اہلِ قبیلہ کی طرف سے ڈالی گئی تھیں کیا کوئی ذکر ہے؟

غور فرمائیے۔ وسعتِ ظرف۔ علو حوصلہ۔ بلندیٔ ہمت۔

سوچئے۔ کیا ایسی ذات بابرکات کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس نے خدا کے نام پر جھوٹ بولا۔ (معاذ اللہ)

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے

نئے میدانِ عمل میں پہلے کام

(۱)

تعمیر مساجد و اقامتِ صلوٰۃ

(۱) لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۔

سورہ ۹ توبہ ۴ ۱۳ - آیت ۱۰۸

البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اوّل دن[1] سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ اس کی پوری پوری حق دار ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو (اور بندگان الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں) اس میں ایسے لوگ (آتے) ہیں۔ جو پسند کرتے ہیں کہ پاک صاف رہیں اور اللہ تعالیٰ (بھی) پاک صاف رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔ (آیت ۱۰۸ سورہ ۹)

(۲) اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ

---

[1] اوّل یوم۔ کے معنی یہی کئے گئے ہیں کہ اوّل یوم وجودہ یا اوّل یوم بنادہ۔ یعنی وجود میں آنے کے پہلے دن سے یا تعمیر کے پہلے دن سے۔ لیکن یہاں یہ نکتہ بھی نظرانداز نہ ہونا چاہیئے کہ یوم کے معنی دَور کے بھی آتے ہیں۔ کما فی قولہ تعالیٰ۔ خلق الارض فی یومین۔ (المفردات فی غریب القرآن) یعنی ہجرت کے بعد جو دور شروع ہوا اُس کے آغاز میں۔ اور یہی سبب ہے کہ اس اوّل یوم کو تاریخ یعنی سنہ ہجری کا پہلا دن مانا گیا۔ افاد السہیلی ان الصحابۃ رضی اللہ عنہم اخذوا التاریخ من قولہ تعالیٰ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ علی التقویٰ مِن اوّل یوم۔ (فارالوفاء ص ۲۴۰ ج ۱) یعنی صحابہ کرام نے لمسجد اسس علی التقویٰ من اوّل یوم سے ہی استدلال کرتے ہوئے سنہ ہجری کا آغاز اس دن سے کیا ہے۔

الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ۔ فَعَسٰی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ۔ سورہ ۹ توبہ ع ۳

فی الحقیقت مسجدوں کو آباد کرنے والا تو صرف وہ ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے۔ نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ مانے۔ جو لوگ ایسے ہیں انہیں سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ہدایت یاب (سعادت اور کامیابی کی راہ پانے والے) ہوں گے۔ آیت ۱۸ سورہ ۹

(۳) وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ۔

سورہ ۲ بقرہ ع ۵

نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ ادا کرو اور سر نیاز خم کرو ان کے ساتھ جو اللہ کی بارگاہ میں سر جھکا رہے ہیں۔ آیت ۴۳ سورہ ۲

مسجدِ قبا قبا کا قیام عارضی تھا مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لمحہ اس فرض کی انجام دہی میں صرف نہ ہوتا جس کے لئے وہ خدا کے رسول اور پیغامبر بنائے گئے تھے۔

اقامۃ دین[1]۔ جو انبیاء علیہم السلام کا نصب العین ہوتا ہے اس کا پہلا کام ہے اقامۃ الصلوٰۃ یعنی ایسا ماحول بنانا اور ایسی جماعت تیار کرنا جس کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز اور جس کے دل کا چین ذکر اللہ ہو۔

قبا پہنچ کر سب سے پہلے آپ نے اس فرض کو انجام دیا۔ اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے جو نمبر اول میں تحریر کی گئی ہے۔

جماعت: خدا پرستی یعنی خدا واحد کی عبادت آپ کی فطرت تھی۔ شب معراج میں خاص

---

[1] یعنی دین کے منشاء اور مقصد کو صحیح طور سے سمجھنا اس کے تمام پہلوؤں کا خیال رکھنا اور پوری مستعدی سے اس کو جامۂ عمل پہنانا۔

نوعیت کی تعلیم دی گئی اور اگلے روز حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نازل ہو کر پانچوں وقت کی نمازوں کی عملی تعلیم بھی دیدی۔ دو روز تک پانچوں وقت کی نمازیں پڑھا کر جس طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ارکان اور اوقاتِ نماز کی تعلیم دی۔ جماعت اور نماز با جماعت کا طریقہ بھی بتا دیا۔ لیکن جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں رہے تسلسل کے ساتھ نماز با جماعت کا موقع نہیں مل سکا۔ جہاں اسلام کا نام لینا ہی مشکل تھا وہاں جماعت کا سلسلہ کس طرح قائم ہو سکتا تھا۔ مدینہ کے حضرات اسلام سے مشرف ہوتے۔ اُن کی تعلیم کے لیئے خاص خاص حضرات کو بھیجا گیا۔ یہاں کچھ حلقے مسلمانوں کے قائم ہوئے تو نمازوں کی جماعتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

پھر ان حضرات نے اپنے ہی اجتہاد سے ہفتہ میں ایک روز عمومی جماعت کے لیئے بھی مقرر کر لیا اور سرورِ کائنات رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ معظمہ میں تھے کہ نماز جمعہ کی فرضیت بھی نازل ہو گئی۔ جس نے حضرات صحابہ کے اجتہاد کی تصدیق کر دی۔ صحابہ کرام کا یہ اجتہاد وہ تھا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فخر کیا کرتے تھے کہ یہود و نصاریٰ نے ہفتہ میں ایک دن عمومی اجتماع کے لیئے مقرر کیا مگر وہ منشاءِ خداوندی کے مطابق نہیں تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اُس نے ہمیں اس دن کی توفیق بخشی جو منشاءِ خداوندی کے عین[1] مطابق تھا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی مسجد تعمیر نہیں ہوئی تھی اور تاریخ اسلام اب تک بجز ایک مسجد کے جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مکہ معظمہ میں اپنے مکان کے سامنے میدان[2] میں بنالی تھی، کسی اور مسجد کی تعمیر سے ناآشنا تھی، کوئی مکان کچھ میدان یا کسی میدان کا کوئی حصہ نماز کے لیئے مقرر کر لیا جاتا تھا۔ وہاں لوگ نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ عموماً بکریوں کے باڑے[3] میں کسی حصہ کو نماز

---

[1] ھذا یومھم الذی فرض علیھم فاختلفوا فیہ فھدانا اللہ الحدیث (بخاری شریف باب فرض الجمعہ ص ۱۲۰)

ھذا یومھم الذی فرض علیھم۔ یعنی الفرد المنتشر الصادق بالجمعہ فی حقنا والسبت والاحد فی حقھم (فاختلفوا فیہ فھدانا اللہ لہ) ای لھذا الیوم کما ھو عند اللہ (حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۲ ج ۲) [2] بخاری شریف ص ۵۵۲

[3] یہ باڑے رہائشی مکانوں کے قریب ہوتے تھے اور عام لوگ انہیں باڑوں میں رہا بھی کرتے تھے۔

کے لئے مخصوص کر لیا کرتے تھے۔ ورنہ جہاں وقت آتا نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

قبا کا قیام عارضی تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ کتنے روز قیام رہا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ صرف تین روز قیام رہا۔ مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس عارضی قیام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی بنیاد ڈال دی[1]۔ کلثوم بن ہدم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے میزبان تھے انہیں کا ایک میدان تھا۔ جس میں کھجور سکھائے جاتے تھے۔ اسی میدان میں یہ مسجد تعمیر کی گئی۔ سب سے پہلے آپ نے پتھر رکھا۔ دوسرا پتھر حضرت صدیق اکبر اور تیسرا فاروق اعظم سے رکھوایا۔ (رضی اللہ عنہم) پھر جملہ صحابہ نے حصہ لیا۔ خود ہی مزدور تھے اور خود ہی معمار۔ مزدوروں میں خود آقائے دو جہان بھی شامل رہے۔ بھاری بھاری پتھر اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا مٹی بدن اطہر پر پڑتی۔ کوئی صحابی آگے بڑھ کر پتھر لے لیتا تو آپ دوسرا اٹھا لیتے تھے[2]۔

مسجد کی تعمیر کے ساتھ آداب معاشرت اور اخلاق کی تعمیر بھی ہوئی حتیٰ کہ کلام اللہ شریف میں جب مسجد کا تذکرہ فرمایا تو ساتھ ساتھ اہل مسجد کی بھی تحسین فرمائی۔ فیہ رجال یحبون ان یتطھروا (اس میں وہ لوگ ہیں جو محبت کرتے ہیں۔ اس بات سے کہ پاک صاف رہیں) پھر ان کو شرف لازوال اور فخر دائم یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کا پروانہ بھی عطا ہو گیا۔ واللہ یحب المطھرین (اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں پاک صاف رہنے والوں سے)

مسجد مدینہ
مسجد النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام

قبا سے مدینہ تشریف آوری ہوئی تو جس جگہ ناقہ بیٹھا تھا، وہی جگہ مسجد کے لئے منتخب کی گئی۔

یہ جگہ ایک میدان کے کنارہ پر تھی۔ قبیلہ بنی نجار کے حضرات یہاں نماز پڑھا کرتے تھے[3]۔ زمین

---

[1] واسس المسجد الذی اُسّس علی التقویٰ۔ بخاری شریف ص۵۵۵ وفاء الوفاء کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل بعد میں ہوئی۔ مدینہ میں قیام فرمانے کے بعد آپ صحابہ کرام کے ساتھ قبا تشریف لائے اور مسجد کی تعمیر کرائی۔ وفاء الوفاء ج۱ ص۱۸۹۔

[2] وفاء الوفاء ج۱ ص۱۹۰۔ [3] حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے یہاں ایک دیوار بیت المقدس کے رخ پر بنادی تھی یہیں جمعہ کی نماز بھی پڑھا کرتے تھے۔ سایہ کی کوئی چیز دیوار پر نہیں تھی۔ ابن سعد ج۱ ص۲ ہماری اصطلاح میں ایسی مسجد کو فنائی مسجد کہتے ہیں۔ عیدگاہیں عموماً ایسی ہی ہوتی ہیں۔

کے مالک یہاں کھجوریں بھی سکھالیا کرتے تھے۔ میدان کے باقی حصہ میں کھجور کے درخت کھڑے تھے۔ کچھ پرانی قبریں اور کچھ مکانوں کے کھنڈر تھے۔ ایک طرف کچھ نشیب تھا وہاں پانی بھر جاتا تھا اس خرابہ کی قسمت جاگی۔ سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو مسجد کے لئے منتخب فرمایا۔ یہ طول و عرض میں سو سو گز سے کچھ زائد تھا۔

سہل اور سہیل کے والد رافع بن ابی عمرو کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت اسعد بن زرارہ ان کے مربی تھے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ میدان ان ہی یتیموں کا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ بلا کسی معاوضہ کے مسجد کے لئے پیش کردیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کی پیش کش بڑے آدمیوں سے بھی منظور نہیں فرمایا کرتے تھے یتیم بچوں سے کیسے منظور فرمالیتے۔ آپ کے اصرار کرنے پر یہ مالک ہبہ کرنے کے بجائے فروخت کرنے پر راضی ہوئے۔ دس دینار قیمت تجویز کی گئی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ قیمت ادا کر کے زمین مسجد کے لئے وقف کردی۔ (رضی اللہ عنہم)

زمین ہموار کی گئی۔ پانی سینچ دیا گیا۔ قبروں سے ہڈیاں نکلیں ان کو الگ دبا دیا گیا۔ درخت کٹوائے گئے۔ بنیاد کھودی گئی۔ تعمیر شروع ہوئی۔ یہاں بھی صحابہ کرام ہی مزدور تھے وہ ہی معمار سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بھی برابر کے شریک تھے۔

عجیب غریب پُرتقدس جذبہ سے کام ہو رہا تھا۔ پتھر اٹھائے جاتے تو یہ رجز پڑھا جاتا تھا

لہ ابن سعد ص ج ۲ لہ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ضرورت ظاہر فرماتے اس پر بطور ہدیہ وہ چیز آپ کو پیش کی جاتی تو بطور ہدیہ اس کو منظور نہیں فرماتے تھے بلکہ قیمت ادا فرماتے تھے، جیسے مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک ناقہ پیش کیا تو آپ نے قیمتاً منظور فرمایا۔ البتہ بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طلب کے کوئی ہدیہ پیش کیا جاتا تو اس کو منظور فرما لیتے تھے۔ سہ ابن سعد ص ج ۲ غزوۂ خیبر کے بعد جب مسجد بڑھائی گئی تو اس کے لئے جو زمین خریدی گئی تھی اس کی قیمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ادا فرمائی۔ ترمذی شریف مناقب عثمان ص ۲۰۹ ج ۲، مگر اب زمین کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی اس ٹکڑے کی قیمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار اور ایک روایت ہے کہ پچیس ہزار ادا کی ہے۔ وفاء الوفاء ص ۲۴۱

هذا الحمال لا حمال خيبر هذا ابر ربنا و اطهر

خیبر (جو کھجوروں کی منڈی ہے وہاں سے بھی بوجھ اٹھایا جاتا ہے اور لادا جاتا ہے یہ بوجھ اُس جیسا نہیں ہے (بلکہ) اے ہمارے رب تو جانتا ہے یہ اُس سے بہت اچھا نیکی والا اور بہت پاکیزہ ہے۔

کبھی یہ رجز پڑھا جاتا اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک بھی ساتھ ساتھ ترنم فرما ہوتی تھی[1]

اللّٰهُمَّ لا خير الا خير الآخرة فانصر الانصار والمهاجرة[2]

کبھی اس میں یہ ترمیم فرما لیتے

اللّٰهُمَّ ان الاجر اجر الآخرة فارحم الانصار والمهاجرة[2]

یہ مسجد اگرچہ دوسری ہے۔ مگر اس لحاظ سے اولیت اس کو ہی حاصل ہے کہ جو آبادی مستقل قیام کے لئے طے فرمائی گئی اس میں پہلی مسجد یہی ہے۔ اس بنا پر حسب ارشاد رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ کا اصل مصداق یہی ہے۔ کیونکہ قبا صرف نزول گاہ تھا اور جو مستقل قیام گاہ اور قبۃ الاسلام تھا وہ یہی مقام ہے جہاں ناقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گردن پھیلا دی تھی اور جہاں تبع یمن[3] نے سیکڑوں سال پہلے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے

---

[1] بخاری شریف ص۵۵۵ و ابن سعد ص۲ ج۲ [2] اے اللہ صرف آخرت کی بھلائی ہی بھلائی ہے پس مدد فرما انصار کی اور مہاجرین کی [2] اے اللہ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا اجر ہی اجر ہے۔ جو مقصود و مطلوب ہونا چاہیئے۔ پس رحم فرما انصار اور مہاجرین پر۔ [3] تبع بن الاقرن۔ یمن کا بادشاہ تھا۔ اس کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے ان کو تبع ہی کہا گیا۔ انہیں میں سے ایک تبع ایک فوجی مہم کے سلسلہ میں "یثرب" بھی پہنچا۔ وہ یہاں قتل عام کر کے اس آبادی کو ختم کرنا چاہتا تھا کہ اہل علم نے اس کو خبر دی کہ "نبی آخرالزمان" کا یہ دارالہجرۃ ہوگا۔ وہ متاثر ہوا۔ برباد کرنے کے ارادہ کو ملتوی کیا اور یہاں ایک مکان تعمیر کرا دیا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائیں تو یہاں قیام فرمائیں اور ایک تحریر بھی لکھ کر دے دی جو (باقی برصفحہ آئندہ)

نزول گاہ تعمیر کر چکا تھا۔ پس مسجد النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اولیت قیام گاہ مستقل کی اولیت[1] ہے اور مسجد قبا کی اولیت عارضی قیام گاہ کی اولیت۔ عارضی اور مستقل میں جو فرق ہونا چاہیئے۔ وہ یہاں بھی کارفرما ہے۔

تعمیر اس وقت بیت المقدس کی جانب نماز پڑھی جاتی تھی۔ لہذا قبلہ اسی طرف یعنی شمال کی جانب رکھا گیا۔ اس طرف کی دیوار ستر ہاتھ لانبی بنائی گئی دوسری جانب ساٹھ ہاتھ[2]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نسلاً بعد نسل محفوظ رہی اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچی۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس تبع کا نام اسعد تھا۔ کنیت ابوکرب۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں دو شعر بھی کہے تھے۔

شهدت على احمد انه ۔۔۔ رسول من الله بارى النسم

فلو مد عمرى الى عمره ۔۔۔ لكنت وزيرا له وابن عم

ترجمہ: میں شہادت دیتا ہوں کہ احمد اس خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہوں گے جو جانوں کا پیدا کرنیوالا ہے۔ اگر میری عمران کے زمانہ تک دراز ہو گئی تو میں ان کا وزیر بھی ہوں گا (سلسلہ نسب کے لحاظ سے) ابن عم بھی۔

معارف ابن قتیبہ ص۲۱۱ و وفاء الوفا ص۱۳۴ ج۱۔

[1] ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آغاز کے لحاظ سے اگرچہ مسجد قبا اول ہے کہ اس کی تعمیر پہلے شروع ہوئی۔ لیکن تکمیل کے لحاظ سے مسجد مدینہ مقدم ہے۔ ملاحظہ ہو۔ وفاء الوفاء ص۱۹۹ ج۱۔ [2] یعنی جنوب اور شمال کی دیواریں ستر ستر ہاتھ اور مشرق و مغرب کی دیواریں ساٹھ ساٹھ ہاتھ۔ وفاء الوفاء ص۲۳۳ ج۱ و ص۲۴۳ ج۱ ایک ہاتھ دو بالشت (وفاء الوفاء ص۲۴۲ ج۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور مسعود ہی میں غزوۂ خیبر کے بعد مسجد میں توسیع فرمائی تو طول و عرض تقریباً سو سو ہاتھ ہو گیا اور عمارت مربع ہو گئی (وفاء الوفاء ص۲۴۳ ج۱ و ص۲۵۱ ج۱ و ص۲۵۳ ج۱) اور اس توسیع کیلئے زمین کی ضرورت تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعلان فرمایا کہ کوئی بندۂ خدا اس زمین کو خرید تا ہے اس معاوضہ پر کہ اس کو جنت میں اس سے اچھا مکان ملے گا۔ بسعادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی اور انہوں نے فوراً اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ چنانچہ اس کی قیمت دس ہزار اور ایک روایت کے بموجب پچیس ہزار اپنے پاس سے ادا کی۔ ترمذی شریف ص۲۱۱ ج۲ وفاء الوفاء ص۲۴۱ ج۱۔

بنیادیں پتھروں سے بھری گئیں۔ تین ہاتھ کی اونچائی تک دیواریں بھی اسی پتھر سے چنی گئیں ان کے اوپر کچی اینٹوں[1] کی تعمیر کی گئی۔ البتہ دروازوں کے بازو پتھروں کے رہنے[2]۔ ساٹھ ہاتھ زمیں گز اونچی چھت کے سہارے کے لئے بیچ میں کھمبے (ستون) کھڑے کئے تین تین کھمبوں کی دو لائنیں ایک طرف (شرقی جانب میں) اور دو لائنیں غربی جانب میں دونوں لائنوں کے بیچ کا حصہ وسیع رکھا گیا[3]۔ میدان میں سے جو کھجور کاٹے گئے تھے ان کے کھمبے اگلی لائن میں لگائے گئے جو قبلہ کی جانب تھی[4]۔ چھت میں نیچے بلیاں رکھ کر ان کے اوپر کھجور کے پٹھے (شاخیں جن پر پتے ہوتے ہیں) پتوں سمیت بچھا دیئے گئے۔ ان کے اوپر ہلکی ہلکی مٹی پھیلا دی گئی۔ اور چھپر کی طرح ڈھلوان رکھی گئی۔ مگر پھر بھی بارش ہوتی تو ٹپکتی تھی۔ نیچے پختہ فرش نہیں تھا صرف ہموار زمین تھی۔ پانی ٹپکتا تو کیچ ہو جاتی تھی۔

---

[1] طبقات ابن سعد صفحہ ۲ جز ۲ [2] بخاری شریف صفحہ ۶۱ وفاء الوفاء صفحہ ۲۳۳ [3] وفاء الوفاء صفحہ ۲۳۸ جز ۱ صفحہ ۲۵۲ جز ۱ صفحہ ۲۴۸ جز ۱ [4] بخاری شریف صفحہ ۶۱ وفاء صفحہ ۲۳۳ جز ۱ [5] وفاء الوفاء صفحہ ۲۴۲ جز ۱ اس عمارت کے لئے کوئی چندہ نہیں کیا گیا حضرات صحابہ نے پیش کرنا چاہا اور درخواست کی کہ باقاعدہ چھت ڈلوا دی جائے، فرمایا نہیں۔ عریش کعریش موسیٰ خشیبات وثمام والشان اعجل - یعنی موسیٰ علیہ السلام کے چھپر کی طرح (یہ چھت ہوگی) کہ نیچے لکڑیاں (بلیاں) ان کے اوپر پھونس (پھر فرمایا) انسان کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ عجلت لئے ہوئے (نازک ہے) ابن سعد صفحہ ۲ جز ۲ و وفاء الوفاء صفحہ ۲۴۲ جز ۱۔ [6] عن ابن شہاب کانت سواری المسجد فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جذوعاً من جذوع النخل وکان سقفہ جریدا۔ وخوصاً لیس علی السقف کثیر طین اذا کان المطر امتلأ المسجد طیناً انما ھو کھیئۃ العریش۔ (وفا صفحہ ۲۴۲ و ابن سعد صفحہ ۲ جز ۲)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال شب قدر کے متعلق فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ میں پانی اور کیچڑ میں سجدہ کر رہا ہوں۔ اس وقت بادل کا نام ونشان نہ تھا مگر دفعۃً رات کو بارش ہوئی تو واقعی صبح کو پانی اور کیچڑ میں سجدہ کرنا پڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک پر بھی مٹی لگی ہوئی تھی۔ بخاری شریف صفحہ ۲۷ وفاء الوفاء صفحہ ۲۴۲۔

اسی لئے کچھ دنوں بعد چھت پر مٹی زیادہ کردی گئی اور فرش پر بھی کنکریاں بچھادی گئیں[۱]۔ چھت کی اونچائی سات ہاتھ (ساڑھے تین گز یعنی ۱۰½ فٹ)

تین طرف دروازے رکھے گئے۔ قبلہ کی طرف کوئی دروازہ نہیں تھا۔ جنوب اور مشرق و مغرب کی جانب دروازے تھے[۲]۔ کچھ دنوں بعد جب بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا (جو مدینہ سے جنوب کی جانب ہے) تو اس طرف کی دیوار کا دروازہ بند کردیا گیا اور جانب شمال کی دیوار جو پہلے دیوار قبلہ تھی اس طرف دروازہ کھول دیا گیا[۳]۔ اور اسی دیوار سے متصل وہ سائبان بنادیا گیا۔ جو صُفہ کہلاتا تھا۔ جو ان صحابہ کا مسکن تھا۔ جن کے اہل و عیال نہیں ہوتے تھے اور تعلیم روحانی تربیت نیز رضاکارانہ خدمات کی غرض سے یہاں رہا کرتے تھے۔ معاش کے لئے دن کو لکڑیاں چن لیتے

---

[۱] وفاء الوفاء صفحہ ۲۴۲ جلد ۱ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اپنے دورِ خلافت میں مسجد کی تعمیر کرائی تو فرش باقاعدہ کنکریوں کا کرادیا۔ وفاء صفحہ ۲۴۰ جلد ۱ [۲] وفاء الوفاء صفحہ ۲۳۹ جلد ۱ اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ اونچائی صرف پانچ ہاتھ تھی یعنی ڈھائی گز۔ اس کی تائید حسن بصری رحمہ اللہ کے قول سے ہوتی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ عریش موسیٰ (موسیٰ علیہ السلام کے چھپر) کی بلندی اتنی تھی کہ اگر کھڑے ہو کر ہاتھ اونچا کرتے تو چھپر کو لگ جاتا تھا۔ وفاء صفحہ ۲۴۲ مگر بظاہر سات ہاتھ والی روایت زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ تعلیم کی غرض سے منبر پر کھڑے ہو کر نماز پڑھی تھی (بخاری شریف صفحہ ۵۵ و صفحہ ۱۲۵) صرف پانچ ہاتھ کی بلندی پر اس طرح نماز پڑھنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ اسی مسجد میں کھجور کے گچھے (خوشے) بھی اصحاب صفہ کے لئے لٹکا دیئے جاتے تھے (بخاری شریف صفحہ ۶۰ و فتح الباری ونسائی قولہ عزوجل ولا تیمموا الخبیث منہ صفحہ ۳۴۵ مجتبائی) اس سے بھی سات ہاتھ کی بلندی کی تائید ہوتی ہے۔ باقی عریش موسیٰ کی تشبیہ کا مقصد یہ ہے کہ چھت عام قاعدہ کے مطابق نہیں تھی بہت نیچی تھی اور حقیقت یہی ہے کہ اتنے طویل و عریض ہال کے لئے سات ہاتھ کی چھت بہت نیچی مانی جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب) [۳] وفاء الوفاء صفحہ ۲۴۰ جلد ۱ و ابن سعد صفحہ ۲ جلد ۲ [۴] ایضاً و فاء صفحہ ۲۴ جلد ۱ [۵] وفاء الوفاء صفحہ ۲۶۲ جلد ۱ ان حضرات کو مسجد ہی میں سونے کی اجازت تھی۔ ابن سعد صفحہ ۱۳ جلد ۲ و بخاری صفحہ ۶۳۔

تھے مگر رات کی تاریکی میں تلاوت قرآن اور نوافل کے قندیل روشن رکھتے تھے[1]

ابتدا میں منبر نہیں تھا تو ایک ستون کی برابر میں مٹی کی چوکی (چبوتری) بنادی گئی تھی[2] آقا دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم اسی پر رونق افروز ہو کر خطاب فرمایا کرتے تھے اور ستون پر سہارا لگا لیا کرتے تھے[3]

---

[1] بخاری شریف ص ۵۸۰ ۔ [2] منبر من طین ۔ وفا الوفا ر ص ۲۴ ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ میں بلا امتیاز کے تشریف فرما ہوتے تھے ۔ کوئی اجنبی آتا تو اس کو معلوم نہ ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں تو ہم نے چاہا کہ آپ کے لئے ایک نشست کی جگہ بنادیں کہ کوئی اجنبی بھی آئے تو اُسے معلوم ہو جائے لہذا ہم نے ایک دکان (چبوترہ) بنادیا مٹی کا آپ اس پر تشریف رکھا کرتے تھے ۔ فتح الباری ص ۹۵ تحت قولہ بارزاً فی حدیث جبرائیل باب سوال جبریل ۔ [3] ایک خاتون نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا غلام بڑھئی (نجار) ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے ایسی چیز بنوا دوں جس پر آپ آرام سے تشریف رکھیں ۔ پیچھے تکیہ بھی لگا لیں اور خطاب کے وقت زحمت نہ ہو ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اس عرضداشت پر کوئی التفات نہیں فرمایا لیکن جب مجمع زیادہ ہونے لگا تو حضرات صحابہ نے بھی محسوس کیا کہ اس طرح خطاب فرمانے میں زحمت ہوتی ہے تو کوئی ایسی چیز بنوادی جائے کہ آپ اس پر تکیہ بھی لگا سکیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابہ کا مشورہ منظور فرمایا (وفا الوفا ص ۲۴۶ ج ۱) تو اسی خاتون سے فرمائش کی (بخاری ص ۶۴ و ص ۱۲۵) چنانچہ جنگل سے جو غابہ کے نام سے مشہور تھا ۔ جھاؤ کی لکڑی لائی گئی اور یہ چیز بنوائی گئی جس کو منبر کہا گیا ۔ جس کے کل تین درجے تھے ۔ یعنی دو سیڑھیاں جو ایک ایک بالشت گہری تھیں ۔ تیسرا حصہ جس سے پیٹھ لگائی جاسکتی تھی ۔ دو بالشت تھا ۔ اس طرح کل طول چار بالشت تھا (دو ہاتھ) اور چوڑائی میں سوا دو بالشت ۔ (وفا الوفا ص ۲۸۴ ج ۱) اس منبر کو دیوار قبلہ سے کچھ ہٹا کر رکھا گیا کہ دیوار اور منبر کے درمیان سے بکری گذر سکتی تھی ۔ (بخاری ص ۷۲ یعنی ایک ہاتھ سے کچھ زائد کہ آدمی بھی آڑا ہو کر نکل سکتا تھا وفا الوفا ص ۲۹۰ ج ۱) اس طرح منبر کے کنارے سے لیکر دیوار تک تقریباً سوا تین ہاتھ (ڈیڑھ گز) کا فاصلہ ہوتا تھا ۔ یہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کرتے تھے ۔ یعنی آپ کے مصلے شریف کا طول تقریباً سوا تین ہاتھ تھا ۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خانہ کعبہ کے اندر نفلیں پڑھی تھیں تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی روایت یہ ہے کہ آپ سامنے کی دیوار سے تقریباً تین ہاتھ کے فاصلہ پر کھڑے ہوئے تھے ۔ وفا الوفا ص ۲۹۰ ج ۱ و بخاری شریف ص ۷۲ چنانچہ علماء نے یہی مستحب قرار دیا ہے کہ سترہ یا دیوار ۔ اور نمازی کے قدم کے درمیان صرف اتنا ہی فاصلہ رہنا چاہیئے کہ سجدہ ہو سکے ۔ ابوداؤد شریف ۔ باب لدنو من السترہ یعنی تقریباً ڈیڑھ گز)

گریۂ حنانہ وہ کھجور کا تنہ (کھمبا) جس کی برابر مٹی کی چبوتری پر تشریف فرما ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطاب فرمایا کرتے تھے۔ سید الانبیاء محبوب رب العالمین (تعالیٰ شانہٗ) نے جب اس سے الگ منبر پر رونق افروز ہوکر خطاب فرمایا۔ اور اس وجہ سے وہ کھمبا آپ کے پُرتقدس قرب اور ذکر اللہ کی روح پرور و جاں بخش آواز سے محروم ہوگیا تو قدرت کے ایک عجیب و غریب کرشمہ نے اہل ایمان کے ایمان کو تازہ اور عقل پرستوں کے توہمات کو حیرت زدہ کر دیا۔

حضرات صحابہ نے اسی بے حس و حرکت اور بے جان سوکھے کھمبے سے ایک رقت انگیز آواز سنی جس سے کلیجہ پھٹا جاتا تھا (بخاری ص۲۸۱) کچھ ایسی آواز تھی جیسے اونٹنی اپنے بچہ کی یاد میں بلبلاتی ہے۔ (بخاری ص۵۰۶) رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ستون کا یہ درد انگیز گریہ سُنا۔ تو منبر سے اتر کر کھمبے کے پاس تشریف لائے اس پہ دست مبارک رکھا، تب یہ کھمبا بچوں کی طرح ہچکیاں لیتا ہوا آہستہ آہستہ خاموش ہوا (بخاری ص۲۸۱ و ص۱۲۵) رحمتِ عالم جانِ جہاں نے اس سوختہ دل فراق زدہ کی مزید دلداری فرماتے ہوئے فرمایا۔ کیا چاہتے ہو؟ اس مسجد میں اسی جگہ تم پھلدار ہو جاؤ یا جنت کا حصہ چاہتے ہو۔ جہاں تمہارا پھل اہل جنت تناول کریں۔ اس نے دارِ بقا کو دارِ فنا پر ترجیح دی۔ گویا اس بے زبان نے زبانِ درد سے عرض کیا۔ انّ الدار الاٰخرۃ ھی خیر و ابقیٰ۔ چنانچہ اس کھمبہ کو مسجد کے فرش خام میں منبر کے قریب اس جگہ دبا دیا گیا۔ جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ مابین منبری و بیتی روضۃ من ریاض الجنۃ۔

(ماخوذ از وفاء الوفاء ص۱۰۶ و خصائص الکبریٰ باب حنین الجذع ص۷۵ ج ۲)

حجرات اُمہات المومنین مسجد کی تعمیر سے فراغت ہوئی تو مسجد سے متصل ہی ازواجِ مطہرات کے لئے مکان بنوائے۔ اس وقت تک حضرت سودہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما نکاح میں آچکی تھیں۔ اس لئے دو ہی حجرے بنوائے۔ جب اور ازواجِ مطہرات آتی گئیں تو اور مکانات بنتے گئے۔[1]

---

[1] وفاء الوفاء ص۳۲۵ ج ۱۔

مسجد سے متصل حضرت حارثہ بن نعمان کی جائداد تھی ہر ایک مکان کے لئے وہی اپنی جائداد کا ٹکڑا پیش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ تمام جائداد محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے نذر کر دی[1] مسجد کی طرح چار حجرے بھی کچی اینٹوں کے تھے۔ اوپر کھجور کے پٹھوں اور پتوں کی چھت چھوٹے سے صحن کے گرد کھجور کی ٹہنیوں (پٹھوں) کی دیواریں جن پر مٹی لھیس دی گئی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ کا ایک کواڑ تھا۔ باقی کے دروازوں پر ٹاٹیاں تھیں۔ پانچ حجرے ایسے بنائے گئے۔ کہ ان میں کچی اینٹیں بھی نہیں لگائی گئیں۔ بلکہ ٹٹیاں کھڑی کر کے ان پر مٹی لھیس دی گئی اور اوپر کھجور کے پٹھوں اور پتوں کی ہلکی سی چھت ڈال دی گئی۔ ان کے دروازوں پر نہ ٹاٹیاں تھیں نہ کواڑ۔ بلکہ ٹاٹ یا کمبل کے پردے پڑے رہتے تھے جو طول میں تین ہاتھ اور عرض میں ایک ہاتھ سے کچھ زائد تھے۔ چھتیں ایسی نیچی کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا دور تھا۔ جب میں ذرا بڑا ہو گیا تھا میں ان حجروں میں جاتا، تو کھڑے ہو کر ان حجروں کی چھتوں کو ہاتھ لگا لیا کرتا تھا۔ رات کو گھروں میں چراغ جلانے کا رواج نہیں تھا۔ لہٰذا ان حجروں میں رات کو صرف نور حق کی روشنی رہتی تھی۔

---

[1] وفا الوفا ص۳۲۲ ج۱ روایت میں منزل کا لفظ ہے کانت لحارثۃ بن نعمان منازل قرب المسجد (کہ حضرت حارثہ کے مکانات مسجد کے قریب تھے اور جب ضرورت پیش آتی تو حضرت حارثہ ایک مکان نذر کر دیا کرتے تھے) مگر چونکہ یہ بھی ثابت ہے کہ ہر ایک زوجہ کے لئے حجرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوایا تو منزل سے مراد منزل کی جگہ ہو گی بنا بنایا مکان مراد نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[2] کانت بیوتاً من لبن و لھا حجر من جرید مطرورۃ بالطین ابن سعد ص۱۸۱ الجزء الاول من القسم الثانی طبقات ابن سعد۔

[3] عرعر یا سال کی لکڑی کا۔ [4] وفاء الوفاء ص۳۲۵ ج۱ [5] طبقات الجزء الاول من القسم الثانی ص۱۸۱ [6] ایضاً طبقات ص۱۸۲ ج۱

[7] بخاری شریف ص۵۶ ج۱۔

۸۸ھ میں اموی خلیفہ ولید[1] بن عبدالملک نے مسجد نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کی توسیع کی تو ان مبارک حجروں کو مسجد میں شامل کر لیا۔

ابو امامہ حضرت سہل بن حنیف فرمایا کرتے تھے کاش ان حجروں[2] کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا تاکہ لوگ دیکھتے کہ جس نبی کے دستِ مبارک پر تمام خزانوں کی کنجیاں رکھ دی گئی تھیں اس نے خود اپنے لئے کیا پسند کیا تھا[3]۔

صُفّہ و اصحابِ صُفّہ پہلے گذر چکا ہے کہ تبدیلی قبلہ کے بعد نماز جنوب کی جانب رُخ کر کے پڑھی جانے لگی تو اس طرف کی دیوار میں جو دروازہ تھا وہ بند کر دیا گیا اور پہلی دیوار قبلہ (شمالی دیوار) میں دروازہ کھول دیا گیا۔ اس سے متصل چبوترہ بنا دیا گیا اور اس پر سائبان ڈال دیا گیا۔ اسی کو صُفّہ[4] کہا جاتا تھا۔ نادار مسلمان جن کے اہل و عیال نہیں ہوتے تھے اُن کا مسکن یہی ہوتا تھا۔ توکل ان کا سرمایہ ہوتا تھا۔ سوال کرنا ممنوع[5]۔ تعلیم، رُوحانی تربیت اور رضاکارانہ خدمات اُن کے فرائض اور مشاغل ہوتے تھے۔

---

[1] متوفی ۹۶ھ ظالم خلیفہ مانا گیا ہے مگر ابن ابی عیلہ کہا کرتے تھے اللہ تعالیٰ ولید پر رحم فرمائے اس کے کچھ کارنامے بہت شاندار ہیں۔ مثلاً مسجد نبوی کی توسیع نیز جامع دمشق کی تعمیر اسی کے زمانہ میں اندلس (اسپین) فتح ہوا۔ نیز ہندوستان میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ دیبل (موجودہ کراچی) اسی کے زمانہ میں فتح ہوا۔ مجھے وہ چاندی کے بادیئے دیا کرتا تھا کہ میں بیت المقدس کے فقیروں میں جا کر تقسیم کر دوں (تاریخ الخلفاء ص ۱۵۶) [2] ان جھونپڑیوں اور چھپروں کے تنکوں کو اہلِ مدینہ رگِ جان سمجھتے تھے۔ جب ولید کا حکم پہنچا کہ ان کو مسجد میں شامل کیا جائے تو اہلِ مدینہ بیتاب ہو گئے اور پھر اس طرح تڑپ کر رو دیئے کہ کبھی کسی کو اس طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا گیا تھا نہ کبھی اتنے زیادہ لوگوں کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ (ابنِ سعد ص ۱۸۱ ج ۲ و وفا ص ۳۲۶ ج ۱ ـ [3] ابن سعد ص ۱۸۱ ج ۲ و وفاء الوفاء ص ۳۲۶ ج ۱ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابر تابعین نے اسی جذبہ کا اظہار فرمایا۔ [4] قال عیاض الصفّۃ بضم الصاد وتشدید الفاء ظُلّۃٌ فی مؤخر مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یأوی الیہا المساکین۔ وفاء الوفاء ص ۳۲۱ ج ۱ [5] اس سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک دلچسپ واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا (باقی بر صفحہ آئندہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر اصحاب صفہ کو دیکھا کہ ان کے پاس چادر تک نہ تھی فقط تہ بند تھا یا صرف کمبل جس کو اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے۔ کمبل بھی اس قدر چھوٹا کہ کسی کی آدھی پنڈلیوں تک پہنچتا تھا کسی کے ٹخنوں تک نماز میں ستر کھلنے کا خطرہ ہوتا تو ہاتھ سے تھامے رکھتے تھے[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانے کی چیز صدقہ میں آتی تو ان کو دے دیتے۔ خود تناول نہیں فرماتے تھے۔ کیونکہ صدقہ آپ کے لئے حرام تھا۔ جو چیز بطور ہدیہ آتی تو ان کو بلا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے[2]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ میں بھوک کی وجہ سے اپنے جگر کو زمین پر ٹیک دیا کرتا تھا۔ پیٹ کو زمین سے چپٹا دیا کرتا تھا اور میں بھوک کی وجہ سے پتھر پیٹ پر باندھ لیا کرتا تھا۔ ایک روز سر راہ جا کر بیٹھ گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس طرف سے گزرے (سوال کرنا ممنوع تھا تو میں نے ایک لطیف طریقہ اختیار کیا کہ) ایک آیت دریافت کر لی (کہ جب میری طرف متوجہ ہوں تو شاید میرے فاقہ کا بھی ان کو اندازہ ہو جائے اور) مجھے لیجا کر کھانا کھلا دیں مگر حضرت ابوبکرؓ نے وہ آیت بتادی اور تشریف لے گئے۔ پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ میں نے ان سے بھی آیت دریافت کی۔ حضرت عمرؓ نے بھی آیت بتادی اور روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ آئے جن کی کنیت ابوالقاسم تھی (جن کی شان ہی یہ تھی کہ وہ خیر و برکت کے قاسم (تقسیم کرنے والے) فطرت انسان کے نبض شناس تھے) آپ نے جیسے ہی نظر ڈالی آپ پہچان گئے۔ مجھ سے فرمایا ساتھ آؤ۔ میں ساتھ ہو لیا۔ آپ مکان پر تشریف لے گئے وہاں ایک قدح (بادیہ) میں دودھ رکھا ہوا تھا۔ جو کسی نے ہدیہ میں بھیجا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ ابوہریرہ اصحاب صفہ کو بلاؤ۔ آپ کا یہ حکم میرے نفس پر شاق گذرا کہ تھوڑا سا دودھ جس کو میں تنہا پی سکتا ہوں اس کے لئے اصحاب صفہ کو بلایا جا رہا ہے۔ پھر مجھ سے ہی کہا جائے گا کہ پلاؤ۔ یہ وسوسہ ذہن میں آرہا تھا مگر مجبور تھا تعمیل حکم کرنی تھی۔ چنانچہ اصحاب صفہ آئے۔ مجھے حکم ہوا میں نے یکے بعد دیگرے ہر ایک کو دودھ پلایا۔ جب سب کو پلا چکا تو مجھے حکم ہوا کہ تم پیو میں نے پیا۔ فرمایا اور پیو پھر فرمایا اور پیو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اب بالکل گنجائش نہیں رہی۔ تب آپ نے یہ بادیہ خود لیا اور بسم اللہ پڑھ کر باقی نوش فرمایا۔ بخاری شریف صفحہ ۹۵۵ [1] بخاری شریف صفحہ ۶۳ جلد ۱ و فتح الباری صفحہ ۴۲۶ جلد ۱ [2] ترمذی شریف باب فی معیشت اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم صفحہ ۵۹ جلد ۲۔

یہ حضرات فاقہ سے نہیں گھبراتے تھے. کیونکہ خود اپنے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھتے کہ کئی کئی وقت گذر جاتے اور فاقہ نہیں ٹوٹتا. بھوک سے کبھی اتنا ضعف ہو جاتا کہ نماز کی حالت میں گر پڑتے۔ لوگوں کو خیال ہوتا کہ دورہ پڑ گیا ہے. حالانکہ دورہ فاقہ کا ہوتا تھا[1]

کبھی آنحضرت صلی اللہ وسلم اُن کو انصار پر تقسیم فرما دیتے کہ اپنے مقدور کے بموجب ہر شخص ایک ایک دو دو کو لیجائے اور ان کو کھانا کھلائے[2]۔

مسجد مبارک کے دو ستونوں میں ایک رسی بندھی رہتی تھی. کھجوروں کے موسم میں حضرات انصار کھجوروں کے گیچھے (خوشے) اپنے باغات سے لاکر لٹکا دیتے تھے جو کھجور ٹپک جاتا اس کو لکڑی سے جھاڑ کر کھالیا کرتے تھے[3]. ان بہادر و جاں باز فقراء اور درویشان باوقار کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشارت دیا کرتے تھے۔

لو تعلمون مالکم عند اللہ لاَحببتم ان تزدادوا فقرًا وحاجۃً[4]

اگر تم جان جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہارے لئے کیا تیار ہے تو تم آرزو کرو کہ ہمارا یہ فقر و فاقہ اور بڑھ جائے۔

ان حضرات کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی[5]۔

---

[1] ترمذی شریف باب فی معیشت اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص۵۹ ج۲ [2] یہ بھی صورت ہوتی کہ آپ فرما دیتے کہ جن کے یہاں دو کھانے والے ہوں وہ تیسرے کو لیجائے اور جس کے یہاں کھانے والے چار ہوں وہ دو کو لیجائے اور ساتھ کھانا کھلائے. ایک روز آپ نے اسی طرح اصحاب صفہ کو تقسیم فرما دیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں چار کھانے والے تھے. خود حضرت ابوبکر ان کے صاحبزادے اور اہلیہ اور ایک خادم مگر آپ اپنے ساتھ تین کو لے گئے. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سات اصحاب کو لے گئے (بخاری شریف ص۸۴ و ص۵۰۶ وغیرہ [3] وفاء الوفاء ص۳۲۴ ج۱ [4] ایضاً ص۳۲۲ ج۱ و ترمذی شریف باب فی معیشۃ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص۵۹ ج۲ [5] عارف سہروردی نے عوارف میں لکھا ہے کہ اصحاب صفہ کی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے. حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں سب کا تذکرہ کر دیا ہے. فتح الباری ص۲۱۵ ج۱۱. علامہ شاطبی نے بہت دلچسپ بحث کی ہے کہ صفہ سے خانقاہ پر استدلال نہیں کیا جا سکتا. کیونکہ ان حضرات کا یہ قیام اور قیام گاہ ضرورت کی بناء پر تھا یہ کوئی مستقل ادارہ نہیں تھا (الاعتصام)

نمازِ جنازہ کی جگہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو جس کسی بیمار کی نزعی کیفیت ہوتی (مرنے کے قریب ہوتا) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی جاتی۔ آپ تشریف لاتے اس کے لئے دُعا فرماتے۔ وہ شخص وفات پا جاتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ تجہیز و تکفین آپ کے سامنے ہی ہوتی اور آپ دفن کے وقت تک وہاں رہتے۔ اس میں آپ کو بہت دیر ہو جاتی تھی۔ اس کا ہمیں احساس ہوا تو ہم نے یہ کر لیا کہ وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دیتے۔ آپ تشریف لاتے، نمازِ جنازہ پڑھاتے پھر کبھی واپس تشریف لے جاتے اور کبھی دفن ہونے تک وہاں تشریف رکھتے۔ پھر ہمیں محسوس ہوا کہ آپ کو اس میں بھی زحمت ہوتی ہے تو یہ طے کر لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ دی جائے گی بلکہ جنازہ لے کر خود آپ کی خدمت میں پہنچ جایا کریں گے۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا۔ جب جنازہ لیکر کاشانۂ نبوت پر پہنچتے تو قریب ہی ایک جگہ تھی وہاں آپ نمازِ پڑھاتے پھر یہی معمول ہو گیا۔ کہ اسی خاص جگہ پر نمازِ جنازہ پڑھائی جاتی تھی حتیٰ کہ اس جگہ کا نام ہی موضع الجنائز پڑ گیا۔[1]

---

[1] طبقات ابن سعد ص۱۱ جلد اوّل قسم ثانی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی تھا کہ موضع الجنائز میں نماز پڑھایا کرتے تھے جیسا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ نے باب الصلوٰۃ علی الجنائز بالمصلّٰی والمسجد میں پیش کی ہیں ص۱۷۷ مگر بعض مرتبہ کسی عارض کی وجہ سے مسجد میں بھی نماز پڑھ لی ہے (فتح الباری ص۱۵۵/۳ باب مذکور) اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا مذہب یہ ہے کہ کسی خاص ضرورت کے بغیر مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے۔ البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ جائز قرار دیتے ہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

نماز باجماعت

عبادت۔ عربی لفظ ہے جس کا ترجمہ پوجا کیا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت ہے غایۃ التذلل یعنی انتہا درجہ عاجزی۔ بے چارگی۔ بے بسی۔ اسی کے اظہار کو عبودیت کہتے ہیں۔ اپنے مالک اور خالق کے سامنے اپنی بے بسی اور عاجزی کے اظہار کے لئے جماعت کی ضرورت نہیں، بلکہ گوشۂ خلوت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ پُرکیف اور پُرخلوص وہ عاجزی ہوتی ہے۔ جو تنہائی میں ہو جہاں بندہ تصورِ معبود میں غرق ہو۔ معبود اور مالک کے سوا کسی کا وجود تو کیا کسی کا تصور بھی نہ ہو اسلام نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً۔ سورہ ۷ الاعراف آیت ۵۴

پکارو اپنے رب کو عاجزی کرتے ہوئے (گڑگڑاتے ہوئے) (پوشیدہ طور پر)

دوسرے موقع پر ارشاد ہے:۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ۔ تا۔ من الغافلین (سورہ ۷ الاعراف آیت ۲۰۵)

یاد کر اپنے رب کو دل ہی دل میں عاجزی اور نیازمندی کے ساتھ ڈرتے ڈرتے اور زبان سے بھی آہستہ آہستہ بغیر پکارے صبح شام اور ایسا نہ ہو کہ تم ان

---

[1] فرائض کے علاوہ نوافل میں سنت یہی ہے کہ اپنے مکان میں پڑھی جائیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سید الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ افضل کیا ہے۔ مکان میں یا مسجد میں۔ ارشاد ہوا۔ تم دیکھتے ہو میرا مکان مسجد سے کتنا قریب ہے اس کے باوجود اپنے مکان میں نماز پڑھوں یہ مجھے زیادہ محبوب ہے، بمقابلہ مسجد میں نماز پڑھنے کے اِلّا یہ کہ فرض نماز ہو۔ (ابن ماجہ) ارشاد ہوا مکان میں نماز پڑھنا نور ہے لہذا اپنے مکانات کو منور کرو۔ (ابن خزیمہ) ارشاد ہوا کچھ نمازیں۔ (نفلیں) گھروں میں پڑھا کرو۔ اپنے مکانات کو قبریں نہ بنالو۔ (بخاری شریف وغیرہ) ایک ارشاد یہ ہے کہ جہاں لوگ نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں (مثلاً مسجد) ایسی جگہ نماز پڑھی جائے۔ اس کے مقابلہ میں گھر میں نماز پڑھنے کی وہی فضیلت ہے جو فرض نماز کی فضیلت نفل نماز پر ہے۔ ترغیب ترہیب (بحوالہ بیہقی)۔

میں ہو جاؤ جو غافل رہتے ہیں۔

لیکن جس طرح اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عبادت کو مکمل کیا۔ مثلاً پہلی امتوں میں کسی اُمت کی نماز میں صرف سجدہ ہوتا تھا۔ رکوع نہیں ہوتا تھا کسی اُمت کی نماز میں صرف رکوع۔ اور کسی اُمت کی نماز میں صرف قیام ہوتا تھا۔ کھڑے دعائیں پڑھا کرتے تھے۔ نہ سجدہ کرتے نہ رکوع۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جس نماز کی تعلیم دی گئی اس میں قیام اور قعدہ بھی ہے اور سجدہ اور رکوع بھی۔ پھر جس طرح ظاہری ارکان کے لحاظ سے مکمل ہے۔ معنیٰ کے لحاظ سے بھی مکمل ہے کہ سب سے پہلے اللہ اکبر کہا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور عظمت کا اقرار۔ پھر اس کی حمد و ثنا[1]۔ اور اس کے ارشادات[2] اور آیات الٰہیہ کی تذکیر۔ پھر جملہ نقائص سے اس کی پاکی[3] و عظمت۔ اس کی پروردگاری اور بلندی و برتری کا اعتراف

---

[1] سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض یا واجب ہے جسکے شروع میں ہے الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم۔ مالک یوم الدین اور اس سورۃ کی اہمیت یہ ہے کہ حدیث میں اس سورت کو نماز سے تعبیر کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصفا نصف تقسیم کر دیا ہے اور میرے بندے کیلئے وہ ہے جو وہ مانگتا ہے تقسیم کی تفصیل یہ ہے کہ بندہ کہتا ہے۔ الحمد للہ رب العالمین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندہ نے میری حمد کی۔ پھر بندہ پڑھتا ہے الرحمٰن الرحیم تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثنا کی۔ پھر بندہ کہتا ہے مالک یوم الدین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری عظمت بیان کی۔ پھر بندہ کہتا ہے ایاک نعبد وایاک نستعین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے اور میرے درمیان مشترک ہے اور بندہ کی درخواست منظور ہے۔ پھر بندہ کہتا ہے اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ بندے نے اپنے لئے درخواست کی ہے اس کی درخواست منظور ہو گی۔ مسلم شریف ص ۱۷۰۔

[2] سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن پاک کا کچھ حصہ پڑھنا ضروری ہے۔ قرآن پاک میں احکام بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور توحید و رسالت کے دلائل بھی۔ مشاہدات یا تاریخی واقعات کے ذریعہ پیش کئے گئے ہیں۔

[3] سبحان ربی العظیم رکوع میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ۔

اور اس بات کا اظہار کہ وہ حمد کرنے والوں کی حمد سنتا ہے[1]۔ پھر بارگاہِ ربِ ذوالجلال میں جملہ تعظیمات[2] کی پیش کش۔ اس کے رسول پر درود و سلام۔ پھر اپنے لئے دُعا۔

اس ظاہری اور معنوی تکمیل کے ساتھ ایک خصوصیت یہ ہے کہ انفرادی عمل کو اجتماعی عمل بنایا گیا اور جو کام الگ الگ کرنے کا تھا اس میں سب کی شرکت لازم کر دی گئی یعنی پانچ وقت کی نمازیں جن کا پڑھنا ہر ایک عاقل بالغ مسلمان کے لئے ہر حالت[3] میں ضروری ہے۔ جن کو فرض کہا جاتا ہے ان کے متعلق نہایت تاکید[4] سے حکم ہوا کہ سب مِل کر ایک ساتھ پڑھیں ایک پڑھانے والا ہو (امام) باقی سب اس کی پیروی کرنے والے (مقتدی)

اس جماعت کا ایک مرکز[5] ہونا چاہیئے۔ جس کو "مسجد" کہا جاتا ہے۔ پنج وقتہ نمازوں میں ایک مخصوص اور محدود حلقہ (مثلاً محلہ) کے خدا پرستوں کا اجتماع ہونا چاہیئے ہفتہ میں ایک مرتبہ

---

[1] رکوع سے کھڑے ہوتے ہوئے۔ سمع اللہ لمن حمدہ (وہ اس کی سنتا ہے جو اس کی حمد کرتا ہے۔

[2] التحیات للہ والصلوٰت [3] مسافر ہو یا مقیم۔ بیمار ہو یا تندرست [4] اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات آگے آئیں گے (انشاء اللہ) یہاں قرآن پاک کے اسلوب سے سبق لیجیئے۔ قرآن پاک میں جہاں نماز کا حکم ہوا ہے۔ عموماً جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطی وقوموا للہ قانتین۔ سورہ بقرہ آیت ۲۳۸۔ اقیموا وجوھکم عند کل مسجد سورہ ۷۔ اعراف آیت ۲۸ یا ایھا الذین اٰمنوا ارکعوا واسجدوا سورہ ۲۲ حج آیت ،، وغیرہ ذلک نیز صلوا (نماز پڑھو) کے بجائے جگہ جگہ اقیموا الصلوٰۃ ارشاد ہوا ہے۔ اقامۃ الصلوٰۃ۔ یہی ہے کہ نماز ایسی شان سے پڑھی جائے کہ دینداری اور خدا پرستی کی فضا بنے۔ کلمۃ اللہ سربلند ہو۔ شانِ حق نمایاں ہو۔

[5] قرآن حکیم نے اس مرکز کو یہ اہمیت دی کہ ستر پوشی کا حکم دیا تو نماز کو مسجد سے تعبیر کیا۔ ارشاد ہے۔ خذوا زینتکم عند کل مسجد۔ سورہ ۷ الاعراف آیت ۳۱ (لے لو اپنی آراستگی مسجد کے وقت (یعنی ہر نماز کے وقت) یعنی باقاعدہ نماز وہی ہے۔ جو اس طرح ہو کہ آپ آراستہ ہو کر مسجد میں جائیں۔

اس سے وسیع پیمانہ پر اور اسلامی تہوار یعنی عید بقرعید کے موقع پر اس علاقہ کے تمام حلقوں کا مشترک اجتماع، آبادی سے باہر کسی وسیع مقام پر ہونا چاہیئے۔

جماعت کے فوائد بیشک بندہ اور خدا کے درمیان جو تعلق اور رشتہ ہے اس کے تسلیم کرنے اور اس کو بروئے کار لانے کے لئے مظاہرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر یہ تو ضروری ہے کہ بندگانِ خدا میں یادِ خدا کا جذبہ پیدا ہو۔ خدا پرستی کا رواج ہو پرستش حق کی فضا بنے۔ اللہ تعالیٰ کا نام کھلم کھلا لیا جائے۔ اُس کی عظمت و معبودیت کی شان دکھائی جائے۔ تاکہ جو خدا کو بھولے ہوئے ہیں انہیں اللہ یاد آئے، جو اپنے رب سے ٹوٹے ہوئے ہیں وہ اپنا رشتہ رب سے جوڑیں۔ ظاہر ہے یہ مبارک مقاصد اجتماع[1] کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے

تعلیم و تبلیغ اور اصلاح کے نقطۂ نظر سے فائدہ یہ ہے کہ دوسروں کو ترغیب ہوتی ہے۔ شہری زندگی میں خدا پرستی کا رواج ہوتا ہے اس کا شوق بڑھتا ہے۔ معاشی اور سماجی لحاظ سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مل جل کر کام کرنے کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ تعاون اشتراک عمل کی رسم پڑتی ہے اور جب "ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں محمود و ایاز" تو اُخوت اور مساوات بھی نظریہ کی حد سے آگے بڑھ کر میدانِ عمل میں جلوہ گر ہوتی ہے اور جب ایک صف میں کندھے سے کندھا ملا کر سیدھے کھڑے ہوتے ہیں کہ نہ کوئی آگے نکلا ہوا ہو نہ کوئی پیچھے ہٹا ہو۔ ہر ایک کا ٹخنہ دوسرے کے ٹخنہ کی سیدھ میں ہو۔ اور یہ سب خواہ ان کی تعداد لاکھوں ہو، ایک ہی امام

---

[1] امام ابو حنیفہؒ نے اس اجتماع میں ایک وحدت تسلیم کی کہ امام کو اصل قرار دیا اور مقتدیوں کو اس کا تابع قرأت فاتحہ اور قرأتِ قرآن کا فریضہ امام ادا کرے گا۔ اس کی قرأت سب کی قرأت ہوگی۔ من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ (الحدیث)

[2] ارشادِ خداوندی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ (تا) مرصوص (سورہ صف) اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے۔ ان سے جو راہِ خدا میں اس طرح صف باندھ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو۔ میدان جنگ میں یہ مقابلہ ظاہری دشمن سے ہوتا ہے اور نماز میں یہ مقابلہ باطنی دشمن یعنی شیطان اور شیطانی جذبات سے ہوتا ہے۔

کی آواز پر کبھی ہاتھ کانوں تک اُٹھائیں، کبھی ہاتھ باندھ لیں کبھی سیدھے کھڑے ہوں کبھی ایک ساتھ جھک جائیں۔ کبھی زمین پر ماتھے رکھ دیں۔ کبھی دو زانو بیٹھ جائیں تو ایک عسکری ترتیب اور فوجی نظم و ضبط کی شکل رونما ہوتی ہے۔ غرض اس طرح کے بہت سے فائدے وجود پذیر اور ظہور فرما ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جب مدینہ میں آزاد فضا میسر آئی اور یہ موقع ملا کہ اللہ کا نام کھلم کھلا لیا جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کو لازم[1] قرار دیا۔ یہاں تک کہ حضرات صحابہ کا عام مذاق یہی بن گیا کہ جماعت کے بغیر وہ نماز کو جائز ہی نہیں سمجھتے تھے[2]۔ بیمار آدمی بھی ساتھیوں کے سہارے مسجد میں آتا اور جماعت میں شریک ہوتا تھا اور سستی وہی کرتا تھا۔ جس کے دل میں نفاق ہوتا تھا[3]۔ پھر شہر یا آبادی ہی نہیں بلکہ جہاں بھی تین مسلمان ہوں ان کے لئے یہی حکم ہوا کہ اگر وہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے تو اُن پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے[4]۔ (کہ ان کے مذہبی معاملات درہم برہم ہو جاتے ہیں اُن کا صحیح نظم قائم نہیں ہوتا)

اذان

اسلام یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ مسلمان سب کاروبار چھوڑ کر نماز اور مسجد کے لئے وقف ہو جائیں وہ جس طرح عبادت فرض کرتا ہے۔ ذرائع معیشت کی فراہمی کو بھی فریضہ قرار دیتا ہے اس نے

---

[1] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں لکڑیاں جمع کراؤں۔ پھر نماز پڑھنے کے لئے نماز کی اذان دیدی جائے تو کسی کو کہدوں کہ وہ نماز پڑھائے پھر میں ان کے یہاں جاؤں جو جماعت میں حاضر نہ ہوں اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں (بخاری شریف ص ۸۹) اندازہ فرمایئے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم (جو اہل ایمان کے حق میں ایسے رؤف رحیم ہیں کہ ہر وہ بات ان کو شاق ہوتی ہے جو مسلمانوں کے لئے پریشانی کا سبب بنے، ترک جماعت پر اتنے ناراض ہوں) تو جماعت کتنی ضروری ہوئی۔ [2] عن عدی عن غیر واحد من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہم قالوا من سمع النداء فلم یجب فلا صلوٰۃ لہ (ترمذی شریف ص ۳۰) [3] مسلم شریف ص ۲۳۲ [4] نسائی شریف باب التشدید فی ترک الجماعۃ۔

جس طرح اہل و عیال کا نفقہ مربی پر لازم اور واجب کیا ہے ایسے ہی زکوٰۃ کو اسلام کا ایک رکن قرار دے کر آمدنی بڑھانے اور پس انداز کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ مگر جب ذرائع معیشت کے لئے کاروبار میں مشغولیت ضروری ہے تو نمازوں کی جماعتوں کے لئے کوئی ایسی صورت ہونی چاہیئے کہ معین وقت پر سب جمع ہو جائیں تاکہ اللہ کا فرض بھی ادا ہو اور دنیا کے کام بھی اطمینان سے ہوتے رہیں۔ صحابہ کرام اگرچہ اندازہ لگا کر جماعت کے وقت خود جمع ہو جاتے تھے[1] مگر ظاہر ہے یہ جذبہ اور یہ شوق آئندہ نسلوں میں باقی رہنے والا نہیں تھا۔ چنانچہ جب جماعت کا سلسلہ شروع ہوا تو کچھ دنوں بعد یہ سوال سامنے آیا۔ حضرات صحابہ نے مختلف تجویزیں پیش کیں۔ کسی نے ناقوس[2] کا ذکر کیا۔ کسی نے بُوق[3] کا۔ ایک صاحب نے تجویز پیش کی کہ آگ روشن کر دی جایا کرے۔ ناقوس کا رواج نصاریٰ میں تھا۔ بوق (بگل) کا یہود میں۔ اور آگ روشن کرنے کا مجوس (آتش پرستوں) میں یہ چیزیں علامت بن سکتی تھیں مگر ان میں یادِ خدا۔ اور عبادت کی معنویت نہیں تھی۔ پھر ان سب فرقوں میں عبادتوں میں تحریف اور من مانی تبدیلی کے علاوہ شرک کی آمیزش بھی ہو چکی تھی، یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ عبادت (نماز) جو تنہا خدائے واحد کے لئے مخصوص ہو اس کا اعلان مشرکانہ طرز پر ہو۔ لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تجویز بھی منظور نہیں فرمائی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ بلند آواز سے پکار دیا جایا کرے اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ اس وقت یہ تجویز منظور کر لی گئی۔ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ پکار دیا کریں[4] لیکن یہ آخری یا قطعی فیصلہ نہیں تھا[5]

---

[1] بخاری شریف ص۸۵ [2] لوہے کی لین لٹکا دی جاتی ہے اس کو مونگری سے بجایا جاتا ہے یہی ناقوس ہے۔ لوہے کے بجائے لکڑی کو اسی طرح استعمال کیا کرتے تھے۔ اس کی جگہ گھنٹہ نے لے لی ہے۔ اب گھنٹہ کو بھی ناقوس کہا جاتا ہے (المنجد) [3] بگل یا بگل کی طرح کا باجا۔ [4] بخاری شریف ص۸۵ فتح الباری ص۲۱ ج ۲ [5] علامہ شبلی مرحوم نے اسی کو آخری فیصلہ سمجھا اور خواب کا واقعہ جو آگے آرہا ہے اس کی تردید کر دی صرف اس بنا پر کہ اس کو بخاری نے بیان نہیں کیا۔ ہمیں نہایت ادب سے یہ عرض کرنا ہے کہ علامہ موصوف جیسے بلند پایہ ادیب اور مورخ تھے۔ کاش اسی درجہ کے محدث (باقی برصفحہ آئندہ)

صحابہ کرام جن کے دینی جذبات میں اُمنگ تھی اور یہی امنگ ان کے تمام جذبات پر غالب آچکی تھی ان کی طلب پُوری نہیں ہوئی۔ اعلان نماز کے لئے مناسب طریقہ کی جستجو باقی رہی تو ایک شب میں متعدد صحابہ نے ایک خواب دیکھا۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن زید بن عبدرَبّہ کو یہ توفیق بخشی کہ وہ فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی خواب بیان کی کہ کوئی شخص ناقوس بیچ رہا ہے میں نے اس سے قیمت معلوم کی۔ اس نے کہا کس کام کے لئے خریدتے ہو۔ میں نے کہا کہ جماعت کا اعلان کیا کریں گے۔ اس سبز پوش شخص نے کہا میں تمہیں اس سے بہتر صوت بتاتا ہوں۔ جب نماز کا وقت ہو کوئی ایک شخص اس طرح پکارا کرے[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بھی ہوتے تو یہ جرأت نہ کرتے کہ جس حدیث کو ترمذی، ابوداؤد، دارمی وغیرہ اصحاب سنن نے بیان کیا ہے اس کو اس کمزور اور رکیک علت کی بنا پر رد کر دیتے کہ بخاری نے بیان نہیں کیا۔ بخاری کا بیان کرنا حجت تو ہوتا ہے، نہ بیان کرنا محدثین کے نزدیک حجت نہیں ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی رائے کو پسند کیا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ اذان دیں۔ حالانکہ بخاری میں اذان کا لفظ نہیں ہے۔ بخاری کے الفاظ یہ ہیں۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قم یا بلال فناد بالصلوٰۃ۔ ص۸۵ (ترجمہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلال! کھڑے ہو جاؤ نماز کی آواز لگا دو۔ نماز کی آواز لگانے یا نماز کے لئے ندا کا طریقہ خود بخاری نے بیان کیا ہے کہ الصلوٰۃ جامعۃ کہا جاتا تھا۔ چنانچہ جب ایک مرتبہ سورج گہن ہوا تو الصلوٰۃ جامعۃ پکار کر ہی لوگوں کو نماز کے لئے جمع کیا گیا تھا (بخاری ص۱۴۲) پس یہاں بھی ناد بالصلوٰۃ کے معنی یہی ہیں کہ الصلوٰۃ جامعۃ پکار دو۔ یہ شرف اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاذ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو عطا فرمایا تھا۔ کہ آپ مورخ بھی تھے اور بلند پایہ محدث بھی۔ آپ نے واقعات کی ترتیب اس طرح بیان فرمائی کہ وہ تمام تعارض ختم ہو گیا جس نے علامہ شبلی کو یہاں تک پریشان کر دیا تھا کہ آپ نے صحاح کی حدیث کا انکار کر دیا۔

[1] فتح الباری ص۶۲ ج۲ [2] ابوداؤد و ترمذی، دارمی وغیرہ۔

اللہ اکبر اللہ اکبر[1]		اللہ بہت بڑا ہے اللہ بہت بڑا ہے
اللہ اکبر اللہ اکبر		اللہ سب سے بڑا ہے اللہ بہت بڑا ہے
اشھد ان لا الٰہ الا اللہ	۲ مرتبہ	میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں
اشھد ان محمد رسول اللہ	۲ مرتبہ	میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں
حی علی الصلوٰۃ	۲ مرتبہ	آؤ نماز کے لئے آؤ
حی علی الفلاح	۲ مرتبہ	آؤ فلاح حاصل کرنے کے لئے۔
اللہ اکبر اللہ اکبر	۱ مرتبہ	اللہ بہت بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے۔
لا الٰہ الا اللہ	۱ مرتبہ	نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔

اس شخص نے یہ کلمات بتائے پھر فرمایا کہ تھوڑی دیر بعد جب جماعت شروع ہونے لگے تب بھی یہی کلمات کوئی ایک شخص[2] پکارے اور حیّ علی الفلاح کے بعد دو مرتبہ یہ کلمات بھی کہے "قد قامت الصلوٰۃ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب کو رد یا رحق" فرمایا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بلند آواز تھے۔ ان کو حکم فرمایا کہ اذان پڑھیں اور حضرت عبداللہ بن زید کو فرمایا کہ وہ بتاتے رہیں۔

---

[1] ان کلمات کی ادائیگی خود عبادت ہے کیونکہ اللہ اور رسول کا ذکر اور شہادت حق ہے یا نماز اور فلاح کی طرف بلاوا ہے اچھے کام اور ابدی کامیابی کے لئے بلانا بھی عبادت اور ثواب کا کام ہے۔ معنی اور مفہوم کے لحاظ سے یہ چند کلمات اسلام کے تمام بنیادی عقائد پر مشتمل ہیں سب سے پہلے اللہ کی ذات و صفات۔ پھر توحید۔ پھر مسئلہ رسالت نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت۔ پھر الصلوٰۃ یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت خاص طرز پر اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت کے بعد اطاعت مخصوصہ (الصلوٰۃ) اور الفلاح کا ذکر ہے تو اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ اطاعت و عبادت اسی طرز پر ہو کہ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔ اسی صورت میں فلاح یعنی ابدی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

[2] بہتر ہے کہ مؤذن ہی تکبیر پڑھے (ترمذی شریف)۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اذان کی آواز سنی تو وہ دوڑے آئے۔ یا رسول اللہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے۔ یہی کلمات خواب[1] میں میں نے بھی سنے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[2]

فللہ الحمد فذالك اثبت[3]۔ الحمد للہ۔ اس سے اور زیادہ ثبوت مل گیا۔

---

[1] اذان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت بھی ہے تو کلمات اذان کی تلقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نہیں ہوئی۔ حالانکہ شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ کلمات سن چکے تھے (فتح الباری وغیرہ) بلکہ صحابہ کرام کے رویاء صادقہ کو تلقین کا ذریعہ بنایا گیا اور ان کی زبان سے کہلوایا گیا اشہد ان محمدا رسول اللہ یہ جو قرآن حکیم میں ہے ورفعنا لك ذكرك (سورہ ۹۴ الانشراح) (ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کیا) تو اس سے زیادہ اور اس سے بہتر اس کا مشاہدہ کہاں ہو سکتا تھا۔

خوش تر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

[2] صحابہ کرام کی خوابیں اصولاً مشورہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اذان کی مشروعیت و مسنونیت ان خوابوں سے نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد اور آپ کی تصدیق سے ثابت ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب

[3] ترمذی شریف ص ۲۶ ج ۱۔

دار الہجرت اور حضرات مہاجرین کے لئے دُعا

دُرستیٔ آب وہوا اور حفظانِ صحت کے لئے پیغمبرانہ تدبیر

یثرب کے بجائے مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۙ اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ (سورہ ۱۶ النحل آیت ۴۱ ع ۶)

جن لوگوں پر (ان کے ایمان لانے کی وجہ سے) ظلم ہوا اور ظلم سہنے کے بعد انہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی تو ہم ضرور انہیں دُنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا بدلہ تو کہیں بڑھ کر ہے۔ کاش یہ لوگ علم سے کام لیتے یہ (مہاجرین وہ ہیں) جو ہر طرح کی مصیبتوں میں ثابت قدم رہے اور جو اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ (سورہ ۱۶ النحل آیت ۴۱)

مکہ جو حضرات مہاجرین کا وطن تھا۔ نہایت خشک اور گرم مقام تھا۔ نیچے ریت اور کنکریاں اُوپر گرم پہاڑ جن میں شادابی کا نام نہیں تھا۔ اس کے برخلاف یثرب شاداب باغوں کے بیچ میں ایک کھلی ہوئی آبادی ہر طرف کھیت اور سبزہ اس کی ایک وادی[1] جس کا

---

[1] اس طرح کے میدان جن میں سیلاب آتا تھا۔ علاقہ یثرب میں تین تھے۔ العقیق۔ بطحان۔ قناۃ۔ (معجم البلدان)

نام بطحان تھا گویا گندے پانی کی جھیل تھی۔ جہاں سڑا ہوا پانی ہمیشہ بھرا رہتا تھا جس کی وجہ سے پورے یثرب کی آب و ہوا مرطوب رہتی تھی[1] مکہ جیسے گرم اور خشک مقام کے آدمی یہاں آتے تو بیمار پڑ جاتے تھے اسی وجہ سے یہاں کا بخار حمیٰ یثرب پورے عرب میں مشہور تھا چنانچہ حضرات مہاجرین یہاں پہنچے تو مزاج خراب ہو گئے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نہایت تیز بخار ہوا۔ وہ بحرانی کیفیت میں یہ شعر پڑھتے تھے۔

کُلّ امر مصبح فی اھلہ

والموت ادنی من شراك نعلہ

لوگ اپنے اہل و عیال میں ہوتے ہیں تو صبح صبح ان کو دعا دی جاتی ہے۔ انعم صباحًا[2] اور حال یہ ہے کہ موت جوتی کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ اگرچہ حبشی[3] تھے۔ مگر عمر گذری تھی مکہ کی گلیوں اور اس کی وادیوں میں۔ اُن کو بخار ہوا تو وہ بخار کی گھبراہٹ میں یہ اشعار پڑھتے تھے۔

الا لیت شعری ھل اَبیتنّ لیلۃ	بوادٍ و حَوْلی اِذخر و جلیل
وھل اردن یوما میاہ مجنۃ	وھل یبدون لنا شامۃ و طفیل

---

[1] بقول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اوبأ ارض اللّٰہِ اللہ کی زمین میں سب سے زیادہ وبا والی سرزمین۔ بخاری شریف ص۲۵۳ [2] یہ اہل مکہ کی تہذیب تھی۔ صبح اُٹھتے ہی ایک دوسرے کو کہتے تھے انعم صباحًا۔ آپ کی صبح بہت اچھی۔ شعر کہنے والے کا مقصد بظاہر یہ ہے کہ میں یہاں اپنے اہل و عیال سے دور اس دُعا کے سننے سے محروم ہوں۔ [3] یہ قطعی بات نہیں ہے کہ پیدائش مکہ میں ہوئی تھی اس میں اختلاف ہے (الاستیعاب) حضرت ابوبکر نے ان کو منہ مانگی قیمت پر خرید کر آزاد کر دیا۔ آزاد ہونے کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا حساب کتاب بھی انہیں کے پاس رہتا تھا۔ پھر مؤذن رسول اللہؐ ہونے کی سعادت حصہ میں آئی۔ کان خازنًا لابی بکر و مؤذنًا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (الاستیعاب)

کاش مجھے معلوم ہوجاتا کہ کیا میں کوئی رات وادی (مکہ) میں اس حالت میں گذار سکوں گا کہ میرے گرد (گیاہ) اذخر[1] اور (گیاہ) جلیل ہو اور کیا کسی روز مجنہ[2] کے چشموں پر میرا ورود ہو سکے گا اور کیا کوہ شامہ[3] اور کوہ طفیل مجھے سامنے نظر آئیں گے

پھر اُن کے لئے بد دعا بھی کرتے تھے جن[4] کے ظلم و ستم نے ان کو ہجرت پر مجبور کیا تھا، کہ

اے اللہ ان لوگوں نے ہمیں اپنے وطن سے نکال کر اس وبا والی سرزمین میں پہنچایا۔ اے اللہ ان پر لعنت کر (ان کو اپنی رحمت سے محروم کر دے۔)

صحابہ کرامؓ کی یہ حالت ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی:

اے اللہ ہمیں "مدینہ" بھی ایسا ہی محبوب بنا دے جیسے مکہ محبوب تھا۔ یا مکہ سے بھی زیادہ ہمیں مدینہ کی محبت دے دے۔ اے اللہ مدینہ کے صاع میں مدینہ کے مُد میں ہمارے لئے برکت عطا فرما۔ خداوندا ہمارے لئے اس کی آب و ہوا کو صحت بخش کر دے۔ اور اس کے بخار کو یہاں سے منتقل کر کے جحفہ پہنچا دے[5]۔

---

[1] اذخر ایک گھاس کا نام ہے۔ چھتوں اور چھپروں میں لگائی جاتی ہے (بخاری ص۲۲) [2] ایک پہاڑ کا نام ہے وقیل مجنة بلد علیٰ امیال من مکة وقیل جبل (معجم البلدان) [3] شامہ اور طفیل پاس پاس دو پہاڑ ہیں۔ جو مکہ سے پچیس تیس میل کے فاصلہ پر ہیں۔ (معجم البلدان) [4] شیبہ بن ربیعہ عتبہ بن ربیعہ۔ امیہ بن خلف۔ بخاری شریف ص۲۵۳ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی دعا قبول ہوئی۔ اگلے سال یہ سب غزوۂ بدر میں مارے گئے۔ [5] مکہ معظمہ سے چار منزل تقریباً اسی میل کے فاصلہ پر مدینہ کے راستہ میں ایک سیلاب زدہ مقام تھا۔ پہلے اس کا نام "مہیعہ" تھا اس وقت ایک بڑا شہر تھا۔ پھر اس طرف سیلاب آنے لگے تو یہ تباہ ہو گیا اور اس تباہی اور بربادی کے سبب سے ہی اس کو جحفہ کہا گیا (معجم البلدان) جحف کے معنے چھیل ڈالنا جحفہ، قشرہ، جاء ہم سیل جحاف فاجتحفہم فسمیت الجحفة (قاموس) رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علاقہ کو بخار منتقل کرنے کے لئے نامزد فرمایا۔ یہ خود اس علاقہ کی بربادی کی دلیل ہے (باقی صفحہ آئندہ پر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا قبول ہوئی۔ اس قبولیت کے آثار آج تک نمایاں ہیں۔ کہ مدینہ منورہ کی آب و ہوا نہایت معتدل اور خوشگوار ہے۔ دولت و ثروت مدینہ میں نہیں ہے مگر ہر چیز میں برکت ہے۔ عموماً اہلِ مدینہ اس برکت کو دولت و ثروت سے بہتر سمجھتے ہیں۔

پھر اس دارالہجرت کی جو محبت دلوں میں ڈالی گئی اس کا ادنیٰ نتیجہ یہ ہے کہ اس یثرب کو یثرب کے بجائے اپنے محبوب نبی کی طرف منسوب کرکے مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کہا جانے لگا۔ پھر اسی ایک نام پر بس نہیں ہوئی بلکہ اربابِ ذوق نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق نام رکھے جو سو سے زائد ہو گئے۔ ان میں سے چورانوے نام علامہ سمہودی نے وفاء الوفا باخبار دار المصطفےٰ میں شمار کرائے ہیں (ص۷ تا ص۱۹ ج ۱)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) رحمتِ عالم صلی اللہ وسلم کب گوارا کر سکتے تھے کہ کسی آباد علاقہ کو وبا کے لئے منتخب فرمائیں باقی یہ کہ منتقل کرنے کے بجائے سرے سے اس مرض کو ختم کرنے کی دعا کیوں نہیں فرمائی تو حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مزاجوں کی تبدیلی تقاضا فطرت ہے ایسے ہی بخار بھی فطرت کا تقاضا ہے۔ جو صاحب کمال قدرت کے اسرار و رموز اور قضاء قدر کی حکمتوں اور مصلحتوں کا مزاج شناس ہو وہ تبدیلی فطرت کی دعا نہیں کر سکتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مواخات

مہاجرین اور انصار رضی اللہ عنہم میں بھائی چارہ

(۱)

پچاس کے قریب صحابہ کرام مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ آچکے ہیں باقی آرہے ہیں۔ آنے والوں میں وہ بھی ہیں جو مکہ میں صاحب حیثیت تھے، جائدادوں اور کاروبار کے مالک تھے۔ مگر اب یہ سب قرآن پاک کے الفاظ میں "الفقراء" ہیں۔ کیونکہ نہ صرف جائدادوں پر بلکہ اُن کے مال متاع اور سامان و اسباب پر بھی دوسروں کا قبضہ ہو چکا ہے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے رعب و داب اور دھاک کے آدمی چند ہی تھے جنہوں نے کھلم کھلا ہجرت کی۔ باقی سب وہ تھے جو چھپتے چھپاتے خالی ہاتھ بمشکل تمام مدینہ پہنچے تھے ان کے بدن کے کپڑے بھی سالم نہیں تھے (کسی قدر تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے۔)

(۲)

پوری دنیا میں صرف وہ مٹھی بھر جاں نثار ان پردیسی فقراء اور تہیدستوں کے مددگار تھے جنہوں نے بیعت عقبہ کے موقع پر ان کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ مگر یہ کتنے تھے؟ اُن کے ذرائع کیا تھے؟ صرف تہتر یا پچھتر جب کہ اُن میں دو عورتیں بھی تھیں۔

(۳)

یثرب اول تو کاروباری قصبہ نہیں تھا اور جو کاروبار تھا اس پر یہودیوں کا قبضہ تھا قبیلہ اوس اور خزرج کے لوگ جن سے حضرات انصار کا تعلق تھا وہ کاشتکار تھے۔ کسی کے پاس

لہ سورہ ۵۹ حشر آیت ۸ ۔ لہ جو حضرات بیعت کے موقع پر حاضر نہیں ہو سکے اور مسلمان ہو چکے تھے ان کی تعداد بھی اس سے زیادہ نہ ہو گی۔

اپنی زمین بھی کوئی دوسروں کی زمین میں بٹائی پر کاشت کرتا تھا۔ جن کی زمینیں اپنی تھیں اقتصادی ڈھانچہ اُن کا بھی بگڑا ہوا تھا۔ جس کے پاس جو کچھ پس انداز تھا، وہ "اوس" اور "خزرج" کی آپس کی لڑائی میں ختم ہو چکا تھا جن کا سلسلہ تقریباً ایک سو بیس سال کے بعد تین چار سال پہلے ختم ہوا تھا۔

عموماً بیع سَلَم (بدھنی) کی شکل میں یا سُود پر پیشگی رقم لے لی جاتی تھی اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ پُوری پیداوار اس سَلَم یا سُود کی نذر ہو جاتی تھی۔

ان قبیلوں کے کچھ لوگ ان حالات سے مستثنٰی تھے مگر اُن میں سے چند کے سوا باقی سب صاحبِ جائداد۔ بڑے لوگ اپنے سابق مذہب پر قائم تھے۔

(۴)

اللہ کے گھر (مسجد مبارک) کی تعمیر شروع ہوئی تو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان درماندہ پردیسی مہاجرین کی بود و باش کا مسئلہ بھی تھا کہ اگر ان کے رہنے کا ٹھکانا ہو جائے تو دارالھجرت میں وطن کی کچھ آسائش میسر آ سکے اور پراگندہ حالی ختم ہو۔

ممکن تھا ان کے لئے الگ محلہ آباد کر دیا جاتا معاشرت کا جو فرق تھا اہل مدینہ کاشت کار اور زمیندار تھے اور مہاجرین تاجر پیشہ، شہری زندگی کے عادی۔ اس کا بھی تقاضا یہی ہونا چاہیئے تھا کہ ان کی آبادی الگ ہوتی نئی آبادی کے لئے مالی مشکلات کا حل وہ باہمی تعاون تھا جس نے بلا کسی غیر معمولی خرچ کے مسجد مبارک اور ازواجِ مطہرات کے حجرات کی تعمیر کرا دی تھی لیکن علیحدہ آبادی سے مہاجرین اور انصار میں شیر و شکر جیسی یگانگت نہیں پیدا ہو سکتی تھی اور باہمی انسیت و الفت کی وہ نعمت جو اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو عطا فرمائی تھی (جس کو کلام پاک میں خاص طور پر نمایاں فرمایا گیا تھا)[2] وہ مشاہدہ بن کر سامنے نہیں آ سکتی تھی۔

---

[1] بخاری شریف ص ۲۹ [2] هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ تا عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ سورہ ۸ الانفال آیت ۶۲ و ۶۳۔

جن کو مساوات۔ اشتراک عمل اور ایک دوسرے کے لئے ایثار و اخلاص کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنا تھا۔ علیحدہ آبادی نہ اُن کے لئے مناسب تھی نہ وہ خود یہ علیحدگی برداشت کر سکتے تھے جو اسلامی معاشرہ میں اونچ نیچ کی بنیاد بن جاتی۔

اس کے علاوہ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے جس مساوی سطح کی ضرورت تھی علیحدہ آبادی اس کے لئے خلیج بن جاتی۔

حضرات مہاجرین کم و بیش دس بارہ سال تک برکات نبوت سے فیضیاب ہو کر تربیت یافتہ عالم و فاضل بن چکے تھے۔ حضرات انصار کی مخلصانہ ذہانت اگرچہ ان کے لئے رہنما ہوتی تھی۔ مگر اس ذہانت میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم "رؤف رحیم" کا رنگ بھرنے اور حضرات انصار کو مہاجرین کی سطح پر لانے کے لئے جس تواصی[1] باالحق۔ باہمی احتساب۔ افادہ اور استفادہ۔ تعلیم و تعلّم کی ضرورت تھی، الگ آبادی کی صورت میں وہ پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

(۵)

عرب میں عقد موالات کا طریقہ رائج تھا۔ غیر قبیلہ کا آدمی کسی بھی قبیلہ میں پہنچتا، اور ایک معاہدہ کر کے اس قبیلہ میں داخل ہو جاتا اب اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہوتا۔ معاملات صلح و جنگ میں شریک رہتا اور مرنے کے بعد اس کا ترکہ بھی اسی قبیلہ میں تقسیم کیا جاتا۔ حضرات مہاجرین اور انصار میں یہ عقد ہو سکتا تھا لیکن یہ عقد موالات کچھ روایتیں رکھتا تھا۔ ان میں ایسی روایات بھی تھیں جن کو اسلام برداشت نہیں کر سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو

---

[1] ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے اور اس پر عمل کرنے کی نصیحت کرنا۔

[2] ہمارے زمانہ کا سیاسی گٹھ جوڑ اور پارٹی بندی اس کا نمونہ ہے کہ حق و انصاف کا نام لینا جرم ہوتا ہے۔ جا بیجا۔ جائز و ناجائز پارٹی کی حمایت کی جاتی ہے اور اسی کو تدبر اور دانشمندی سمجھا جاتا ہے۔

بدبودار[1] فرمایا۔ اور قرآن حکیم نے ان کی مخالف اور متضاد بنیادوں پر اسلامی تہذیب اخلاق کی عمارت بلند کی۔ اب یہ پیغمبرانہ تدبر تھا کہ عقد موالات[2] کے بجائے آپ نے عقد مواخات کی بنیاد ڈالی

(۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مکان میں حضرات مہاجرین و انصار (رضی اللہ عنہم اجمعین) کا اجتماع ہوا۔ یہ کل نوے حضرات تھے پینتالیس مہاجرین، پینتالیس انصار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صوابدید کے بموجب ان میں سے ایک ایک انصاری کو ایک ایک مہاجر کا نام بنام بھائی قرار دے دیا۔ یہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ فراست اور مردم شناسی تھی کہ جن کو آپ نے بھائی بنایا فطری طور پر اُن کے مزاج برادرانہ تھے۔ وہ حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ

---

[1] دعوھا فانھا منتنۃ۔ بخاری شریف ص۴۹ [2] زمانہ جاہلیت میں اس تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی کہ حق پر کون ہے اور تقاضاء انصاف کیا ہے۔ صرف یہ معاہدہ (عقد موالات) ہی دلیل ہوتا تھا یعنی چونکہ ہمارا حلیف میدان جنگ میں ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بھی اس کی حمایت میں میدانِ جنگ میں ہوں۔ اسلام نے اس قسم کے معاہدہ ہی کو حرام قرار دیا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے لاحلف فی الاسلام اور مسلمانوں کے لئے قرآن پاک کی خاص ہدایت یہ ہے۔ یا ایھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین بالقسط۔ الآیۃ (ترجمہ) مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے یہ اللہ کے لئے گواہی (سچی گواہی) خواہ خود تمہارے خلاف ہو یا ماں باپ اور قرابت والوں کے خلاف ہو۔ (سورہ ۴ (نساء) آیت ۱۳۲) نیز ارشاد ہے۔ اگر کسی قوم سے کسی بناء پر ناراضگی بغض اور غصہ ہے تو ہرگز ہرگز ایسا نہ ہو کہ یہ بغض تمہیں اُبھارے اس بات پر کہ اُس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے (سورۂ مائدہ رکوع ۲۔ آیت ۸) اور ایک گروہ نے اگر تمہیں خانہ کعبہ میں جانے سے روک دیا ہے جس سے تمہیں غم و غصہ ہے تو اس کا یہ اثر ہرگز نہ ہونا چاہیئے کہ یہ غم و غصہ تمہیں اس بات پر ابھارے کہ تم زیادتی کرنے لگو (تمہارا دستور تو یہ ہونا چاہیئے کہ) نیکی اور پرہیزگاری کے کام میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کے کام میں مدد نہ کرو۔ سورہ ۵ مائدہ آیت ۲۔

ایک دوسرے کے ہمدرد اور مددگار بن گئے اور مزاجوں کی موافقت کے ساتھ جب حضرات مہاجرین سے للّٰہیت اور اعلیٰ اخلاق کا بھی ظہور ہوا تو حضرات انصار کے اخلاص نے عقیدت کی شان اختیار کرلی۔

ام العلاء ایک انصاری خاتون تھیں جن کے گھرانے کے حصہ میں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ آئے تھے وہ اپنے مہمان کی اتنی معتقد ہوگئیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو ام العلاء نے بڑے وثوق سے کہا شہادتی علیک لقد اکرمک اللہ یعنی میں قسم کھاکر کہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یقیناً آپ کو بخش دیا ہے[1]

رشتۂ اخوت اور حضراتِ انصار کا ایثار

وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ

(سورۂ نساء آیت ۳۳)

اور جن سے اقرار باندھا تم نے ان کو پہنچاؤ ان کا حصہ

(شاہ عبدالقادرؒ)

عرب میں عقد موالات کا اثر مرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مولیٰ (جس سے یہ معاملہ ہوتا تھا) وہ چھٹے حصے کا مستحق ہوا کرتا تھا۔ مندرجہ بالا آیت کے بموجب رشتۂ اخوت کا اثر وفات کے بعد ظاہر ہونا چاہیے تھا کہ ایک دوسرے کا وارث ہوتا مگر حضرات انصار نے بیعت عقبہ کے سلسلہ میں جب دعوت دی تھی تو امداد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ آقائے دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم نے جب رشتۂ اخوت قائم فرمایا تو حضرات انصار کی مخلصانہ اور ایثار شیوہ ذہانت نے اس کے معنی یہ

---

[1] آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح وثوق کرلینے اور قسم کھانے کو پسند نہیں فرمایا کیونکہ کسی کو معلوم نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ آپ نے تعلیم دی کہ یہ کہنا چاہیے کہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہوگا (بخاری شریف ص ۱۶۶) مگر حضرت ام العلاء کا یہ وثوق اور یقین اس بناء پر تھا کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے غیر معمولی تقویٰ اور آپ کے اعلیٰ اخلاق نے ان کو گرویدہ اور معتقد بنا دیا تھا۔

سمجھے کہ امداد کا طریقہ برادرانہ ہونا چاہیئے۔

امداد کرنے کے لیئے جائداد تقسیم نہیں کی جاتی مگر برادر زندگی میں برابر کا شریک ہوتا ہے لہذا حضراتِ انصار نے فیصلہ فرمایا کہ مہاجر بھائیوں کو اپنی زندگیوں میں برابر کا شریک بنالیں، چنانچہ دربار رسالت میں درخواست پیش کردی۔

اَقْسِمْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ اِخْوَانِنَا النَّخِيْلَ ۔ [1]

ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان باغات تقسیم فرما دیجیئے۔

منصوبہ یہ تھا کہ بھائیوں کا حصہ بھائیوں کے قبضہ میں دیدیا جائے۔ وہ اس کو اپنی ملک سمجھیں اپنی صوابدید کے بموجب اس میں تصرف کریں اور فائدہ اٹھائیں لیکن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت نے یہ منظور نہیں فرمایا کہ حضراتِ انصار کی جائدادوں سے ان کی ملکیت ختم ہو دوسری طرف دشواری یہ بھی کہ خود حضراتِ انصار کا جو مقصد تھا وہ اس پیشکش سے پورا نہیں ہوتا تھا حضراتِ انصار کا مقصد تو یہ تھا کہ مہاجرین کی مالی مشکلات ختم ہوں لیکن اس طرح تقسیم کے بعد حضرات مہاجرین "صاحب جائداد" ضرور ہوجاتے مگر یہ حضرات تاجر پیشہ کاشت کاری اور زراعت سے ناواقف تھے۔ وہ ان جائدادوں سے پیداوار کرکے وہ امداد حاصل نہیں کرسکتے تھے جس کے لئے حضرات انصار نے یہ ایثار کیا تھا۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضراتِ انصار کو اس دشواری کی طرف توجہ دلائی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ امداد کی صورت یہ ہے کہ زمین اور باغ کے بجائے پیداوار کا حصہ مہاجرین کو دو۔

باغات کی خدمت اور زمین میں کاشت کی ذمہ داری آپ صاحبان لیں اور پیداوار مہاجرین کو دے دیں [2]

---

[1] بخاری شریف ص ۳۱۲ و ص ۵۳۴ [2] البدایۃ والنہایۃ ص ۲۲۹ ج ۳ ص ۲۲۸ ج ۳۔

حضراتِ مہاجرین نے بھی یہی فرمائش کی۔ کام کی ذمہ داری آپ لیں اور پیداوار میں شریک کر لیں۔

حضرات انصار نے جیسے ہی یہ تجویز سُنیں، دفعتًا اُن کے جذبات کی صدا بلند ہوئی سمعنا و اطعنا (ہم نے سُن لیا ہے ہم پوری پوری تعمیل کریں گے) دنیا نے بہت سے انقلاب دیکھے، مگر اس انقلاب کی کوئی مثال چشم عالم کے سامنے نہیں آئی کہ مالک خود اپنی مرضی سے کاشتکار اور اجنبی لوگ پردیس سے آئے ہوئے خود بخود زمیندار بن گئے۔[1]

---

[1] عام طور پر یہی صورت ہوئی اگرچہ بعض حضرات نے یہ بھی کیا کہ زمینیں اور باغ لے لیا اور خود کام کیا۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کو جو درخت دیئے گئے تھے وہ ان پر مالکانہ تصرف کرتی رہیں اور اپنی ملک ہی سمجھتی رہیں حتیٰ کہ جب ان کو واپس کرنے کو کہا گیا تو تیار نہ ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریبًا دس گنی جائداد دے کر ان کو واپس کرنے پر راضی کیا۔ (صفحہ ۲۰۹ ج ۴ البدایہ والنہایہ بحوالہ مسند احمد) علامہ علی بن برہان الدین حلبی کی تحقیق یہ ہے کہ حضراتِ انصار کی پیش کش اگرچہ یہی تھی کہ وہ اپنی نصف جائدادیں دینا چاہتے تھے۔ مگر حضرات مہاجرین میں سے بعض نے تو اس کو اس صورت سے منظور کیا کہ حضراتِ انصار ہی کام کریں گے اور ان کی پیداوار مہاجرین حضرات کو دیتے رہیں گے اور بعض نے ان اراضی کو بطور بٹائی منظور کیا کہ وہ خود کام کریں گے اور نصف حصہ انصار کو دیتے رہیں گے۔ سیرۃ حلبیہ صفحہ ۲۹ ج ۲ مگر اس دوسری صورت میں کوئی خاص ایثار نہیں ہے۔ حالانکہ حضرات انصار کا ایثار اتنا تھا کہ مہاجرین حضرات کو یہ فکر ہو گیا کہ تمام اجر و ثواب یہ سمیٹ لیں گے ہم تہی دامن رہ جائیں گے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

[2] حضرات انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تصور یہی تھا۔ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منظور نہیں فرمایا۔ حضرات مہاجرین کی حیثیت کو عارضی قرار دیا۔ چنانچہ جب حضرات مہاجرین کو جائدادیں مل گئیں۔ تو حضرات انصار کی جائدادیں واپس کر دی گئیں۔

یہ ایثار کیوں تھا؟

قرآن شریف میں ہم بھی پڑھتے ہیں:

اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ (سورہ ۴۰ المومن آیت ۳۹)

یہ دنیا (موجودہ زندگی) صرف چند دن کام چلانا ہے اور برت لینا ہے۔
بیشک آخرت ہی ٹھہراؤ (اور مستقل قیام) کا مقام ہے۔[1]

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (سورہ ۲۹ العنکبوت آیت ۶۴)

بیشک اصل زندگی عالم آخرت ہے۔

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا (سورہ ۷۳ مزمل آیت ۲۰)

اور جو نیک عمل اپنے لئے آگے بھیجدو گے اس کو اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے۔

ہمارا عقیدہ یہی ہے اور بلاشبہ ان آیتوں پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن ہمارے ایمان و عقیدہ کو یقین کا وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو مشاہدہ کی شان رکھتا ہو۔ پھر مشاہدہ بھی غلطی کر جاتا ہے۔ ہماری آنکھیں آفتاب کو گردش کرتا ہوا دیکھتی ہیں۔ ہر صبح و شام کا طلوع و غروب ہمارا مشاہدہ ہے۔ لیکن سائنس کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ مشاہدہ غلط ہے۔ آفتاب گردش نہیں کرتا زمین گھومتی ہے۔ جب مشاہدہ بھی غلط ہو جاتا ہے تو یقین کا کوئی اور درجہ بھی ہو سکتا ہے جو مشاہدہ سے بالا ہو جو سراسر یقین ہی یقین ہو۔ اس میں کسی طرح بھی شک و

---

[1] یہ جو زندگی ہے دنیا کی سو برت لینا ہے اور وہ گھر جو پچھلا ہے وہی ہے ٹھیراؤ کا گھر۔
(حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ)

شبہ یا کسی قسم کے احتمال کی گنجائش نہ ہو جس کو اصطلاحاً عین الیقین[1] کہتے ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یقین کا یہی درجہ[2] حاصل تھا۔ اسی یقین کی بنا پر حضرات انصار اپنی جائدادیں تقسیم کرنے پر خوش تھے کہ ہم نے آخرت کی حقیقی زندگی کے لئے بہت بڑا سرمایہ حاصل کر لیا اور جس کو راہِ خدا میں اپنی ملک سے نکالا۔ اس پر ابدی اور لازوال ملک کی مہر لگ گئی جو کبھی مٹنے والی نہیں ہے۔ دوسری طرف اسی یقین اور عین الیقین نے ان حضرات مہاجرین کے پاک دلوں میں ایک اضطراب پیدا کر دیا جو مفت میں صاحب جائیداد اور زمیندار بن گئے تھے۔ اضطراب اس پر تھا کہ حضرات انصار کے اس ایثار کا ثمرہ یہ ہو گا کہ اجر و ثواب کا ہر ایک درجہ حضرات انصار ہی حاصل کر لیں گے۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین) ہم ان درجات تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

چنانچہ حضرات مہاجرین نے اپنے آقا کی خدمت میں (صلی اللہ علیہ وسلم) عرض کیا یا رسول اللہ جن لوگوں میں ہم آکر اُترے ہیں۔ ہماری چشم بصیرت نے ان جیسے ہمدرد و غمگسار نہیں دیکھے تنگی ہو یا فراخی ان کی ہمدردی میں فرق نہیں آتا۔ اپنی جائدادیں ہمیں دیں۔ پھر کام کی ذمہ داری بھی خود لے لی۔ محنت وہ خود کریں گے اور نفع میں ہمارا حصہ لگائیں گے۔ پس سارا اجر و ثواب وہی سمیٹ لیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات مہاجرین کو اطمینان دلایا کہ:

---

[1] مشاہدہ آتش یقین پیدا کر دیتا ہے کہ آگ ہے اور یہ جلاتی ہے۔ لیکن جو یقین آتش سوزاں میں بھسم ہونے والے کو ہو سکتا ہے وہ صرف مشاہدہ کرنے والے یا تاپنے والے کو نہیں ہو سکتا۔ جلنے اور خاکستر ہونے والے کا یقین ہی عین الیقین ہے۔ [2] یہی عین الیقین صحابہ کرام کی افضلیت کا سبب ہے کیونکہ امت میں یہ درجہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ امت میں کسی کو بھی یہ شرف حاصل نہیں ہے کہ صادق مصدوق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بالمشافہ کوئی ارشاد سنا ہو جس سے یقین کا آفتاب روشن ہوا ہو۔

اگر تم ان کا احسان مانو اور ان کے لئے دل سے دعا کرتے رہو تو تمہارا ثواب
بھی کم نہ ہوگا۔[1]

حضرات انصار کے اسی یقین کا یہ اثر تھا کہ جو ایثار کر چکے تھے اس پر وہ قانع نہیں تھے چنانچہ جائداد کے اس بٹوارہ کے بعد بھی ان کا دستِ کرم کوتاہ نہیں ہوا وہ ان کی طرف بھی بڑھتا رہا جنہیں جائیدادیں نہیں ملی تھیں جو گھر، ہستی اور صاحبِ اہل وعیال نہیں تھے، یہ اصحاب صفہ تھے ان کی خدمت بھی وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔

اصحابِ صفہ کے لئے سوال کرنا حرام تھا۔ فاقہ سے بیہوش ہو کر ان کو گر جانا آسان تھا مگر سوال کرنا محال۔ اُن کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ان کے چہروں سے بھی ان کے فاقہ کا راز فاش نہ ہو حضرات انصار کی مزاج شناسی نے ان قناعت پسندوں کے لئے ایک نئی راہ تجویز کی۔
ان حضرات نے مسجد کے ستونوں میں رسیاں باندھ دیں۔ کھجوروں کے موسم میں وہ کھجور کے خوشے جن

---

[1] ہمارے ایک بزرگ تحریر فرماتے ہیں۔ دعا کا احسان درہم و دینار کے احسان سے کم نہیں ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے یہاں جب کوئی سائل آتا اور دعائیں دیتا جیسا کہ سائلوں کا طریقہ ہے تو ام المومنین بھی اس فقیر کو دعائیں دیتیں اور بعد میں خیرات دیتیں۔ کسی نے کہا۔ اے ام المومنین آپ سائل کو صدقہ بھی دیتی ہیں اور جس طرح وہ آپ کو دعا دیتا ہے آپ بھی دُعا دیتی ہیں، فرمایا۔ میں اگر اس کو دعا نہ دوں اور فقط صدقہ دوں تو اس کا احسان مجھ پر زیادہ رہے گا۔ کیونکہ دعا صدقہ سے کہیں بہتر ہے۔ اس لئے دعا کی مکافات دعا سے کردیتی ہوں تاکہ میرا صدقہ خالص رہے۔ دُعا کے مقابلہ میں نہ ہو۔ کذا فی المفاتیح شرح المصابیح۔ لہٰذا جو شخص دراہم معدودہ دیکر مخلصانہ دُعاؤں کا سودا کرسکتا ہے وہ کبھی نہ چوکے اور اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے دعا ضرور حاصل کرے۔

بجاوے چند دادم جاں خریدم   بحمد اللہ زہے ارزاں خریدم

سیرۃ المصطفیٰ از حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی ص ۳۳۱ ج ۱ [2] البدایہ والنہایہ ص ۲۲۶ ج ۳

میں گدرے کھجور ہوتے تھے درختوں سے کاٹ کرلاتے اور ان رسیوں میں لٹکا دیتے تھے۔ کھجور پک کر گرجاتے یا یہ حضرت توڑ لیتے اور ان سے فاقہ کشی کرتے رہتے تھے۔ بظاہر یہ نفل ہوتا تھا۔ مگر درحقیقت سدرمق کا ذریعہ تھا، فاقہ زدہ کمریں سیدھی ہوسکتی تھیں۔

ایثار واخلاص کی مثالیں

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (سورہ ۵۹ حشر آیت ۹)

اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو۔

اس آیت میں حضرات انصار کی جو خصوصیت بیان فرمائی گئی۔ اس کی مثال[1] حضرت ابوطلحہ کا واقعہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ

ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا کہ یارسول اللہ میں سخت بھوکا ہوں[2]۔ آپ نے گھر والوں سے دریافت کرایا کچھ کھانے کو ہے؟ ہر ایک گھر سے جواب آیا۔ صرف پانی ہے۔ آپ نے حاضرین سے فرمایا۔ کوئی صاحب ان کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں حضرت ابوطلحہ نے عرض کیا میں حاضر ہوں۔ غرض وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ گھر میں جاکر بیوی سے کہا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مہمان کی عزت کرو (ادب و احترام سے مدارات کرو) اہلیہ محترمہ نے کہا صرف بچوں کے سہارے کا کھانا موجود ہے۔ حضرت ابوطلحہ نے فرمایا جو کچھ ہے

---

[1] وفاء الوفاء ص ۲۲۴ ج ۱ [2] ایک اور مثال بھی بیان کی گئی ہے کہ ایک صاحب کو بکری کی سری پیش کی گئی۔ انہوں نے کہا فلاں صاحب اور ان کے بچے زیادہ ضرورت مند ہیں۔ چنانچہ یہ سری ان کے یہاں بھیجی گئی انہوں نے ایک دوسرے صاحب کا نام لے کر اور ان کی ضرورت ظاہر کرکے ان کے یہاں بھجوادی۔ اسی طرح سات آدمیوں میں گھوم کر پہلے شخص کے پاس آئی۔ ہر ایک دوسرے کو اپنے سے مقدم رکھتا رہا۔ (فتح الباری بحوالہ ابن مردویہ) [3] فتح الباری ص ۹۳ ج ۷۔

تیار کرو۔ چراغ روشن کرلو بچوں کو بہلا کر سلادو۔ محترم خاتون نے ایسا ہی کیا۔ کھانا تیار کیا۔ چراغ جلایا۔ جب کھانے بیٹھے تو یہ خاتون اُٹھیں بظاہر اس لئے کہ چراغ کی بتی بڑھادیں (لو تیز کردیں) مگر بڑھانے کے بجائے میاں بیوی کی آپس کی تجویز کے مطابق چراغ بجھا دیا۔ اندھیری میں کھانا شروع کیا۔ میاں بیوی صرف ہاتھ اور مونھ چلاتے رہے گویا کھا رہے ہیں۔ کھایا کچھ نہیں بھوکے پیٹ رات گذاری[3]

یہ تھا ایثار۔ اب اخلاص ملاحظہ فرمایئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرما دیا تھا کہ سیاسی اقتدار میں حضرات انصار کا حصہ نہیں ہوگا۔ ان کے مقابلہ میں دوسروں کو بڑھایا جائے گا۔ مگر ان حضرات کو نہ اپنے لئے اقتدار کی طلب تھی نہ اولاد کے لئے وہ خود بھی عشق مولا میں گم تھے اسی عشق کا متوالا اپنی اولاد کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کو اپنے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی مطلوب تھی اور اس آقا کی خوشنودی کے ذریعہ تمام آقاؤں کے آقا حضرت حق جل مجدہٗ کی رضا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اُن کو اس پر ناز تھا کہ جہاں یہ پیشین گوئی کی جاتی تھی۔

اِنَّکُمْ ستلقون بَعْدِی اثرۃ

تم میرے بعد دیکھو گے کہ دوسروں کو تم پر ترجیح دی جائیگی

ان کو بڑھایا جائے گا تم کو نظر انداز کیا جائے گا۔

وہاں بشارت بھی ساتھ ساتھ دی جاتی تھی۔

فَاصْبِرُوْا حَتّٰی تَلْقَوْنِیْ وَمَوْعِدُکُمُ الْحَوْضُ

صبر کرنا یہاں تک کہ تمہاری میری ملاقات ہو اور ملاقات کا مقام حوض کوثر ہوگا۔ اسی کا وعدہ ہے۔

---

[1] گویا مہمان کے اعزاز میں۔ کیونکہ کسی ضرورت سے ہی چراغ جلایا جاتا تھا۔ ورنہ عام طور پر گھر میں چراغ جلانے کا دستور نہیں تھا۔ بخاری شریف صہ۵۳۵ [2] عام عادت بھی اس لئے دوبارہ چراغ جلانے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

[3] بخاری شریف صہ۵۳۵ صہ۵۳۱ [4] بخاری شریف صہ۵۳۵

اور جب ان حضرات کے ایثار و اخلاص کا یہ عالم ہے تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جس کی ایک نظر نے پوری جماعت میں یہ اخلاص و ایثار پیدا کیا وہ خود اخلاص و ایثار سے تہی دامن ہو (معاذ اللہ) اور کیا محمد رسول اللہ کے ایثار، اخلاص اور آپ کی صداقت و حقانیت کی یہ کھلی ہوئی دلیل نہیں ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

صلوات اللہ علیہ وعلیٰ اصحابہ الکرام واتباعہ اجمعین۔ آمین

اخلاص وللہیت کی اِنتہا

جو آپ کے کام آئے وہ بہتر ہے اس سے جو ہمارے پاس رہے۔

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا۔ سورہ ۵۹ حشر آیت ۹

محبت کرتے ہیں اُن سے جو وطن چھوڑ کر آئے اِن کے پاس اور نہیں پاتے اپنے دلوں میں کوئی رشک اس سے جو دیا جائے مہاجرین کو

۴ھ میں قبیلہ بنی نضیر کے یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو اُن کے شر سے محفوظ رکھا مگر ظاہر ہے ان کے اس منصوبہ سے وہ معاہدہ ختم ہو گیا جو بقاء باہم کے متعلق ۱ھ ہجری میں ہوا تھا۔ (تفصیل آگے آئے گی)۔ لامحالہ ان کو وہ سزا دی گئی جو از روئے معاہدہ لازم تھی۔ یعنی ان کو اس علاقہ سے خارج کر دیا گیا۔ ان کی جائدادیں اسلامی محروسہ میں داخل ہوئیں۔ چونکہ یہ علاقہ جنگ کے بغیر قبضہ میں آیا تھا تو اس کو مجاہدین پر تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ وحیٔ الٰہی[1] نے

---

[1] سورہ ۵۹ الحشر آیت ۶

اس کو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق قرار دیا۔[1]

رسول اللہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سب سے پہلے حضرات صحابہ کی مشکلات تھیں آپ نے حضرات انصار کو جمع فرما کر استصواب فرمایا کہ اس علاقہ کی اراضی انصار اور مہاجرین دونوں کو دی جائیں یا صرف حضرات مہاجرین کو دی جائیں تاکہ وہ حضرات انصار کی جائدادیں واپس کردیں اور اُن کے مکانات خالی کردیں۔؟

ارشادگرامی کا جواب دینے کے لئے قبیلہ اوس اور خزرج کے دونوں سردار سعد بن عبادہ (خزرج) اسعد بن معاذ (اوس) کھڑے ہوئے۔ عرض کیا یا رسول اللہ جو کچھ آپ تقسیم فرمائیں حضرات مہاجرین کو تقسیم فرمادیں۔ ہمیں نہ اپنے مکانات کی ضرورت ہے نہ جائدادوں کی۔ بلکہ ہم بہت خوش ہوں گے اگر ہماری جائدادوں اور ملکیتوں میں سے کچھ اوران مہاجرین کو عنایت فرمادیں جو راہِ خدا میں وطن سے بے وطن ہوئے، گھروں سے اجڑے جائیدادوں سے محروم ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حوصلہ مندانہ جواب سُنا تو مطمئن ہوئے اور دعا دی:

اَللّٰھُمَّ ارْحَمِ الانصار وابناء الانصار اور بعض دوسری روایتوں میں تیسرا لفظ ابناء

---

[1] اس وقت تک مملکت کی ضرورتیں بھی غیر معمولی تھیں کہ ایک مملکت کی بنیاد رکھی جارہی تھی اور حضرات مہاجرین و انصار میں اگرچہ ایسے صاحبِ استطاعت بھی تھے جو ضروریات زندگی فراہم کرسکتے تھے۔ مگر کچھ ایسے تہی دست بھی تھے کہ فاقہ کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا تو اگر یہ جائداد مجاہدین پر مساویانہ تقسیم کردی جاتی تو نہ مملکت کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوسکتی تھیں نہ فاقہ زدہ انصار و مہاجرین کو قابل اعتماد امداد مل سکتی تھی۔ اب قرآن پاک کے الفاظ میں ان جائدادوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تسلط تسلیم کرایا گیا۔ ولٰکن اللہ یسلط رسلہ علی من یشاء (حشر آیت ۶) یعنی تمام جائداد پر آپ کا اختیار تمیزی تسلیم کیا گیا تو آپ نے مساویانہ تقسیم کے بجائے ایسا بندوبست فرمایا کہ افراد کی ضرورتیں بھی پوری ہوئیں اور جماعت کی اقتصادی اور جنگی ضرورتوں کو بھی مدد مل سکی واللہ اعلم [2] اے اللہ رحم فرما انصار پر اور انصار کی اولاد پر۔

ابناء الانصار بھی ہے۔

اب آپ نے اس علاقہ کا ایک حصّہ حضرات مہاجرین کو عنایت فرمایا۔ حضرات انصار میں سے دو صاحب بہت ضرورت مند تھے۔ حضرت ابو دجانہ اور حضرت سہل بن حنیف ان کو کچھ جائداد عطا فرمائی باقی علاقہ اپنے پاس رکھا، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کاشت[1] ہوتی تھی اور اس کی آمدنی میں سے ازواجِ مطہرات کا نفقہ ادا فرماتے تھے۔ باقی تمام آمدنی مسلمانوں کی جماعتی[2] اور انفرادی خصوصًا جہاد کی ضرورتوں میں صرف کر دیتے تھے۔

بہرحال حضرات انصار نے نہ صرف یہ کہ اس جائیداد میں حصّہ لینے سے معذرت کر دی بلکہ اپنی باقی جائیدادوں کے متعلق بھی پیش کش کر دی۔ یہ ہے ایک عملی مثال اس بلندی حوصلہ اور وسعتِ قلب کی جس کو زیب عنوان آیت میں سراہا گیا ہے۔

چند سال بعد بحرین کا علاقہ محروسہ اسلامیہ میں داخل ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ حضراتِ انصار کو کچھ جاگیریں عطا فرما دیں مگر حضراتِ انصار نے ان کے لینے سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ بضد ہو گئے کہ جتنی جاگیریں ہمیں عطا فرمائی ہیں اتنی ہی حضرات مہاجرین کو بھی عنایت فرما دیں اتنی گنجائش نہیں تھی۔ ارشاد ہوا۔

اَمّالا فاصبر وا حتّٰی تلقونی انہ سیصیبکم اثرۃ (بخاری شریف ص۵۳۵)

اگر آپ صاحبان منظور نہیں کرتے تو صبر سے کام لو یہاں تک کہ تم (حوض کوثر) پر مجھ سے ملو گے (یعنی اس ایثار کے جواب میں ایثار نہیں ہوگا) بلکہ تمہیں ترجیحات سے واسطہ پڑے گا کہ دوسروں کو تم پر مقدم رکھا جائے گا۔ تمہارے حقوق کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا۔

---

[1] السیرۃ الحلبیہ ص۲۹۰ ج ۲۔

[2] فیجعلہ مجعل مالِ اللہ۔ بخاری شریف ص۴۰۵ و ص۴۰۶ وغیرہ فی السلاح والکراع عدۃ فی سبیل اللہ (ص۴۲۵ بخاری شریف و قسطلانی)

اسماء گرامی برادران مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم

رجسٹروں کو اس وقت توفیق نہیں ہوئی تھی کہ حضرات صحابہ کے اسماء گرامی اپنے صفحات میں محفوظ کریں اور بھائی بننے والوں کو لکھاوٹ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تاہم راوی حضرات کے سینوں نے جو نام محفوظ رکھے عیون الاثر فتح الباری و سیرۃ ابن ہشام کے حوالہ سے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

حضرات مہاجرین	حضرات انصار	حضرات مہاجرین	حضرات انصار
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ	حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ	عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ
عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ	ابو مرثد رضی اللہ عنہ	عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ
ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ	سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ	عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ	عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ
عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ	سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ	عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ	ابو دجانہ رضی اللہ عنہ
زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	سلامہ بن سلام بن وقش رضی اللہ عنہ	ابوسلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ	سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ
عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ	عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ	ابوالہیثم بن تیہان رضی اللہ عنہ
طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ	کعب بن مالک رضی اللہ عنہ	عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ	عمیر بن الحمام رضی اللہ عنہ
سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ	ابی بن کعب رضی اللہ عنہ	طفیل بن الحارث رضی اللہ عنہ	سفیان نسر خزرجی رضی اللہ عنہ
مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	ابوایوب خالد بن زید انصاری رضی اللہ عنہ	صفوان بن بیضا رضی اللہ عنہ	رافع بن معلی رضی اللہ عنہ
ابوحذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ	عباد بن بشیر رضی اللہ عنہ	مقداد رضی اللہ عنہ	عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ
عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ	حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ	ذوالشمالین رضی اللہ عنہ	یزید بن الحارث رضی اللہ عنہ
ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ	منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ	ارقم رضی اللہ عنہ	طلحہ بن زید رضی اللہ عنہ
سلمان فارسی رضی اللہ عنہ	ابوالدرداء عویمر بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ	زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ	معن بن عدی رضی اللہ عنہ
بلال رضی اللہ عنہ	ابورویحہ عبداللہ بن عبدالرحمن رضی اللہ عنہ	عمرو بن سراقہ رضی اللہ عنہ	سعد بن زید رضی اللہ عنہ

حضرات مہاجرین	حضرات انصار	حضرات مہاجرین	حضرات انصار
عاقل بن بکیر رضی اللہ عنہ	مبشر بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ	عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ	مجذر بن ومار رضی اللہ عنہ
خنیس بن حذافہ رضی اللہ عنہ	منذر بن محمد رضی اللہ عنہ	عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ	حارث بن صمہ رضی اللہ عنہ
سبرہ بن ابی رہم رضی اللہ عنہ	عباد بن الخشخاش رضی اللہ عنہ	مہجع مولی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	مرثد بن عمرو بن جلیہ رضی اللہ عنہم
مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ	زید بن المزین رضی اللہ عنہ		

مواخات قبل ہجرت

تعاون و تناصر اور افادہ و استفادہ کی ضرورت جیسی مدینہ طیبہ میں تھی ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں بھی تھی۔ کیونکہ اس سے بے سہاروں کو سہارا مل جاتا تھا اور بے پناہوں کو پناہ۔ چنانچہ بقول علامہ حافظ ابن عبدالبر۔ مکہ میں بھی رشتۂ اخوت مواخات کے ذریعہ مضبوط کیا گیا تھا یہ برادران مہاجرین ۱۸ تھے۔ ان کے مبارک اسماء گرامی سے اس صفحہ کو آراستہ کیا جا رہا ہے۔

۱۔ سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	حضرت علی کرم اللہ وجہہ
۲۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ
۳۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ
۴۔ حمزہ رضی اللہ عنہ	زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ
۵۔ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ
۶۔ عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ	بلال بن رباح رضی اللہ عنہ
۷۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ
۸۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ	سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ
۹۔ سعید بن زید رضی اللہ عنہ	طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ

ماخوذ از عیون الاثر ص ۱۹۹ ج ۱ حافظ ابن سید الناس

مسجد اور حجرات کی تعمیر اور مواخات پر دوبارہ نظر

اقتصادی تعمیر، بنیادی نظریہ۔ طریقۂ تعمیر اور دورِ حاضر کی اقتصادی تحریکات

محمد رسول اللہ (فداہ روحی) صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات مہاجرین جو مسجد کی اور پھر حجروں (ازواجِ مطہرات کے بیوت) کی تعمیر کر رہے ہیں، اُس شہر کے رہنے والے ہیں جو ملکِ عرب کا مرکزی شہر ہے، جو اپنے تمدن میں دُنیا کے متمدن شہروں سے پیچھے نہیں ہے۔ جس کی آبادی باقاعدہ ہے۔ مختلف محلوں میں بٹی ہوئی۔ بیچ میں سڑکیں، بازار پُر رونق۔ مکانات پختہ۔ ہر طرح کی آرائش سے آراستہ۔ ایک مکان وہ بھی ہے جس کو "دار القواریرؔ" کہا جاتا تھا (شیش محل) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مہاجر رفقاء نے انہیں محلوں میں پرورش پائی تھی، انہیں گلیوں اور کوچوں میں کھیلے تھے انہیں سڑکوں پر دوڑے اور چلے تھے۔ پھر تاجر بن کر انہیں بازاروں میں خرید و فروخت کرتے رہے تھے۔

دار الہجرت (مدینہ طیبہ) میں جب یہ حضرات خود مزدور اور معمار بن کر کچی اینٹوں، چھوٹے بڑے ناہموار پتھروں، کھجور کی ٹہنیوں اور کھجور کے پٹھوں اور پتوں سے مسجد مبارک اور حجروں کی تعمیر کر رہے تھے۔ تو اپنے خاندانی مکانات اور مکہ کے محلات کا نقشہ اُن کے ذہنوں سے محو نہیں ہوا تھا۔

نبوت کے ابتدائی تین سال میں جو تربیت دی گئی تھی اس کا نصاب اور طریقۂ تربیت پہلے گذر چکا ہے۔ یہ تربیت صرف تین سال تک ہی نہیں رہی بلکہ قیام مکہ کی پُوری مدت میں اس کا سلسلہ جاری رہا اور وہ رنگ جو پہلے تین سال میں کھلا تھا وہ پختہ اور زیادہ پختہ ہوتا رہا۔

بلاشبہ یہ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ تمدن کے تمام نقشوں کو چھوڑ کر جفاکش زاہدانہ اور درویشانہ زندگی کا نقشہ جمایا جا رہا ہے۔

مگر قرآن پاک میں حضرت حق جل مجدہٗ کا ارشاد تو یہ ہے:

لہ معجم البلدان

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِیَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔ (سورہ ۷ الاعراف آیت ۳۲)

تو کہہ کس نے منع کیا ہے رونق اللہ کی جو پیدا کی اُس نے اپنے بندوں کے واسطے اور ستھری چیزیں کھانے کی ۔ تو کہہ وہ ہے ایمان والوں کے واسطے دنیا کی زندگی میں نری (مخصوص طور پر) اُن کی ہیں قیامت کے دِن (الاعراف آیت ۳۲)

پھر زینت سے یہ اجتناب کیوں ؟

آپ کو فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ حضرات صحابہ نے اس دور کو تعمیر ملت کا دورِ اوّل قرار دیا تھا۔ چنانچہ اسی سال کو اسلامی سنہ (سنہ ہجری) کا پہلا سال مانا گیا۔ کلام الٰہی نے بھی "مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ"[1] کا لفظ استعمال کر کے صحابہ کرام کے اس تخیل کی تائید فرمائی۔

آج ہر طرف پس ماندہ قوموں کو ترقی دینے کا شور ہے۔ لیکن جب اُن کی ہمدردی کے دعویدار سیاسی رہنما مساوات اور سوشلزم کا نام لیکر کہتے ہیں "معیار زندگی بلند کرو"[2] تو مسجد مبارک اور تعمیر حجرات کا سادہ نقشہ خاموشی سے اشارہ کرتا ہے کہ قوم کی تعمیر ایسے نعرے سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس طرح کے عمل سے ہوتی ہے۔ ہمدردی یہ نہیں کہ آپ اپنی کوٹھی کی سب سے اونچی منزل پر رونق افروز ہو کر خاک نشین غریبوں کو حکم دیدیں کہ ایسی ہی کوٹھی تم بھی بناؤ تاکہ مساوات اور برابری رونما ہو۔ اس کو ہمدردی نہیں کہا جا سکتا یہ ستم ظریفی ہے۔ اس نعرے سے آپ اپنے کردار کو مشتبہ کر دیتے ہیں کہ آپ اس نمائشی نعرے سے غریبوں کو سبز باغ دکھا کر اپنی عیش پرستی کیلئے وجہ جواز

---

[1] لمسجد اُسس علی التقویٰ من اوّل یوم (سورہ توبہ ۱۰۸) [2] یعنی جب معیار زندگی بلند کرنا نصب العین قرار دیا گیا تو جس کا معیار بلند ہو گیا ہے وہ قابل اعتراض نہیں۔ گویا وہ منزل پر پہلے پہنچ گیا ہے۔

نکالتے ہیں۔

ہمدردی یہ ہے کہ آپ قصرِ معلیٰ کی سطح بالا سے نیچے اتریں۔ غریبوں کی ٹوٹی چٹائی پر ان کے برابر بیٹھیں، پھر ان کو ساتھ لیکر آگے بڑھیں۔ یعنی پہلا مرحلہ یہ ہے کہ بلند کرنے کے بجائے آپ معیارِ زندگی کو برابر کریں۔ سیرت مبارکہ کا ایک روشن باب یہ ہے کہ آپؐ نے اقتصادی تعمیر و ترقی کے لئے یہی اسلوب اختیار فرمایا۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) اُم المومنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ ٹٹیوں کا تھا، ٹٹیوں میں سوراخ ہو گئے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ دومۃ الجندل میں تشریف لے گئے تو حضرت اُم سلمہؓ نے اس غیوبت میں حجرے کی دیواریں کچی اینٹوں کی بنوالیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ سے واپس ہوئے تو سب سے پہلے انہیں کے یہاں تشریف لے گئے۔ دریافت کیا یہ تعمیر کیسی ؟ حضرت ام سلمہ نے معذرت کی کہ دیوار اس لئے بنوالی ہے کہ پردہ ہو جائے کسی کی نظر نہ پڑ سکے فرمایا۔ اُم سلمہ۔ مال کا بدترین مصرف یہ تعمیر[۲] ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آپ نے (صلی اللہ علیہ وسلم) عذر قبول فرمایا مگر اس عمل کی تائید اور حمایت نہیں فرمائی جس سے ایک امتیاز پیدا ہو رہا تھا۔

(۲) اسی دور کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک راستے کے کنارے پر ایک مکان دیکھا جو حال میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کا پھاٹک شاندار بنایا گیا تھا اور پھاٹک پر قبہ نما محراب بھی رکھی گئی تھی۔ دریافت فرمایا یہ مکان کس کا ہے۔ ایک انصاری کا نام بتایا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ اگلے روز یہ انصاری دربار رسالت میں حاضر ہوئے تو خلافِ معمول آقائے دو جہان (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رُخ پلٹا ہوا پایا۔ حاضرین مجلس سے اس بے التفاتی کی وجہ معلوم کی، تو

---

[۱] یعنی کرایہ کے لئے مکانات بنوانا بھی ایک قسم کی زمینداری ہے جو پسند نہیں ہے (واللہ اعلم بالصواب)

[۲] طبقات ابن سعد صفحہ ۱۲ (الجزء الاول من القسم الثانی۔

کوئی خاص سبب کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ البتہ کل کے واقعہ کا تذکرہ کیا گیا کہ جب حضرت والا (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے مکان کی طرف سے گذرے تھے تو قبۃ دار پھاٹک کو دیکھ کر دریافت فرمایا تھا کہ یہ پھاٹک کس کا ہے۔ انصاری جاں نثار نے یہ بات سُنی۔ واپس مکان پر پہنچے اور پورے پھاٹک کو منہدم کرا کر زمین کی برابر کر دیا۔[1]

(۳) یمن کا ایک قبیلہ بنو اشعر تھا۔ اس قبیلہ کے جو خاندان مسلمان ہو گئے تھے وہ مدینہ میں رہتے تھے اور فوجی خدمات (جہاد) میں حصہ لیا کرتے تھے۔ ہر ایک خاندان اپنے آمد و خرچ کا خود ذمہ دار تھا۔ لیکن اُن کا یہ بھی دستور تھا کہ اگر کسی کی آمدنی میں کمی ہو جاتی (مثلاً موسم کے ختم پر نئی فصل سے پہلے تنگی ہو جاتی یا سفر میں کسی کا توشہ ختم ہو جاتا) تو ایسا کرتے تھے کہ تمام خاندانوں میں جس کے یہاں جو کچھ غلہ یا توشہ ہوتا وہ سب ایک جگہ اکٹھا کر لیتے تھے، پھر سب کو برابر تقسیم کر دیتے یہ آپس کی ہمدردی اور باہمی اتفاق کی صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی پسند تھی کہ مجمع میں اس کی تعریف فرماتے ہوئے یہاں تک فرماتے۔

هُمْ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْهُمْ وہ میرے ہیں میں اُن کا (بخاری شریف ص۳۳۸)

(۴) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن سے بہت زیادہ تعلق خاطر تھا۔ جب آپ سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں اُن سے رخصت ہوتے اور جب سفر سے واپس ہوتے تو سب سے پہلے ان کے یہاں تشریف لے جاتے۔ ایک مرتبہ آپ سفر سے واپس ہوئے اور حسب معمول ان کے یہاں

---

[1] اخلاص کی انتہا یہ ہے کہ منہدم کر دینے کی اطلاع بھی نہیں دی کچھ دنوں بعد جب دوبارہ اس طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا تو خود آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس پھاٹک کا نام و نشان بھی نہیں تھا تب آپ نے فرمایا اما ان کل بناء وبال علی صاحبہ الا مالا - الا مالا - الا مالا - ہر ایک تعمیر اس کے بانی کے حق میں وبال ہے مگر وہ جو ضروری ہو، بہت ضروری ہو۔ جس کے بغیر چارہ نہ ہو۔

[2] ابوداؤد شریف باب فی البناء ص۳۶۲ ج۲ مجتبائی)

تشریف لے گئے مگر حجرہ (کمرہ) کے اندر نہیں داخل ہوئے، دروازے سے ہی واپس تشریف لے آئے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس مرتبہ نئی بات یہ کی تھی کہ حجرے کے دروازے پر کپڑے کا پردہ آراستہ کر دیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت موجود نہیں تھے۔ واپس ہوئے تو حضرت فاطمہ غمگین بیٹھی تھیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ غمگین اس لئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور خلاف معمول باہر سے ہی واپس ہو گئے تو خدمت مبارک میں حاضر ہو کر کبیدگی کا سبب دریافت کیا ارشاد ہوا۔ "دروازہ پر کپڑے کا پردہ سجا رکھا ہے۔ مجھے ایسے تکلفات سے کیا واسطہ"۔

اب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ناراضگی کا سبب معلوم ہوا تو معافی چاہی اور عرض کیا جو حکم ہو اس کی تعمیل کروں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غریب عیالدار کا نام لیا اور فرمایا کہ یہ کپڑا انکے یہاں پہنچا دو۔[1]

(۵) حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت اسماء بنت یزید وغیرہما کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو سونے کے زیورات سے منع کیا۔ یہاں تک فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے محبوب کو آگ کا کنگن پہنائے وہ اس کو سونے کا کنگن پہنا دے۔[2]

(علماء کا اتفاق ہے کہ یہ ممانعت ابتدا میں تھی اس کے بعد عورتوں کو سونے کے زیورات کی اجازت دی گئی، البتہ یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ہر سال ان کی زکوٰۃ بلا ناغہ پوری پوری ادا ہوتی رہے)

---

[1] ابوداؤد شریف باب فی اتخاذ الستور

[2] ابوداؤد شریف باب ماجاء فی الذہب للنساء۔ صفحہ ۲۳ ج ۲ مجتبائی۔

سلسلہ مواخات اور سیاسی رہنماؤں کے لئے ایک سبق

یُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (آلِ عمران آیت ۱۶۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں قیام فرما ہوئے تو آپ کی حیثیت سیاسی سربراہ (امیر) کی بھی تھی (تفصیل آگے آئے گی) آپ مہاجرین کی آبادکاری کے لئے کوئی قانون بنا سکتے تھے۔ مگر سیرۃ مبارکہ کا سبق یہ ہے کہ قانون بنانا کارگر نہیں، دلوں کو بنانا چاہیئے۔ سیاسی یا اقتصادی انقلاب کے بجائے دلوں کی دنیا میں انقلاب برپا کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بہت مشہور ارشاد ہے[2] جس کا مفہوم یہ ہے:

جسم انسان میں ایک پارچہ گوشت ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہے تو بدن کی پوری عمارت آباد۔ اگر وہ خراب ہے تو بدن کی پوری عمارت ویران یاد رکھو۔ وہ قلب ہے۔

کلام اللہ شریف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ بیان فرمائی تھی۔

تمہارا (اہل ایمان کا) رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق (سخت ناگوار) گذرتا ہے۔ تمہاری بھلائی کا حریص (بہت خواہشمند) ہے۔ وہ مومنوں کے لئے شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے[3]۔ وہ ان کو (اہل ایمان کو) اللہ کی آیتیں سناتا ہے

---

[1] ان کو (اہل ایمان کو) پاک صاف کرتے ہیں (سنوارتے ہیں) اور ان کو کتاب اور حکمت (دانش و بینش) کی تعلیم دیتے ہیں۔ سورہ ۳ آیت ۱۶۳ [2] بخاری شریف وغیرہ صحاح۔

[3] سورہ ۹ توبہ آیت ۱۲۸۔

اور ان کو سنوارتا ہے (ہر طرح کی برائیوں سے انہیں
پاک کرتا ہے)[1]

قانون کے سامنے چار و ناچار گردنیں جھک جاتی ہیں مگر دل نہیں سنورتے۔
یہ نبی رحمت۔ رؤف رحیم کی نظر کیمیا اثر کی برکت تھی کہ حضرات انصار کے دل ایسے سنورے
بخل اور حُبِّ مال کی برائی ختم ہو کر ایثار، فدائیت اور سخاوت کے وہ بے پناہ جذبات ان میں
موجزن ہوئے کہ جیسے ہی رشتۂ اخوت قائم ہوا انہوں نے خود درخواست پیش کر دی۔

اَقْسِمْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ اِخْوَانِنَا النَّخِيلَ۔[2]

ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان باغات تقسیم کر دیجئے۔

حضرات انصار کا اصرار یہ تھا کہ حضرات مہاجرین کو ان جائدادوں کا مالک بنا دیا جائے
لیکن رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم جیسے غریب اور پردیسی مہاجرین کے حق میں مشفق و محسن تھے
اسی طرح آپ کا دامن رحمت انصار پر بھی پھیلا ہوا تھا ان کے حق میں بھی آپ رؤف رحیم تھے۔
آپ نے ملکیت کی تقسیم منظور نہیں فرمائی صرف پیداوار کی تقسیم کا فیصلہ فرمایا۔ (تفصیل پہلے گذر
چکی ہے)

(یہ ہونی چاہیئے شان سیاسی سربراہ اور رہنما۔ قوم کی)

---

[1] سورہ ۳ آل عمران آیت ۱۶۴ [2] بخاری شریف ص ۳۱۲ و ص ۵۳۴

سیرتِ مُبارکہ کے اشارات

اور

تحریکات دورِ حاضر کے نظریات میں بُنیادی فرق

وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ

سیرتِ مبارکہ کے پُر تقدس سلسلہ میں سوشلزم کمیونزم وغیرہ دورِ حاضر کی تحریکات کا ذکر کرنا سوء ادب اور گستاخی ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاء۔ (یعنی کسی حقیقت کی پُوری وضاحت جب ہوتی ہے جب اس کی مقابل اور برعکس چیز کو سامنے رکھا جائے)

نورِ آفتاب کی قدر اُسی وقت ہوتی ہے جب ظلمتِ شب کی مصیبت جھیلی ہو۔ لہٰذا ان تحریکات کے بُنیادی نظریات کا کسی قدر تذکرہ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سیرتِ مُبارکہ کے ان اشارات کی وضاحت ہو سکے جن کا تعلق اقتصادیات سے ہے اور انصاف پسند اہلِ بصیرت ان کی قدر و منزلت معلوم کر سکیں۔ اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ تحریکاتِ حاضرہ کے متوالوں میں ایسے بھی ہیں جو ان تحریکات کا پیوند دامنِ اسلام سے جوڑنا چاہتے ہیں اور اس کو اسلام پر ایک احسان سمجھتے ہیں۔ لہٰذا بنیادی فرق کی وضاحت اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایسے محسنینِ اسلام کے سامنے حقیقت جلوہ گر ہو سکے۔

(۱)

سب سے پہلا فرق یہ ہے کہ ان تحریکات کے بانیوں نے اُس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس کا سمجھنا سب سے پہلے ضروری تھا۔

ان تحریکات کا منشا اگر انسانی سماج کی فلاح و بہبود ہے تو سب سے پہلا فرض یہ ہے

کہ انسان کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ انسان کیا ہے۔ انسانیت کیا ہے۔ تاکہ انسان کی فلاح وبہبود کے معنی اور ترقی کا معیار معین ہو سکے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ تحریکات دور حاضر کی پیداوار ہیں اور اس سے پہلے انسان کے دماغ پر تالے پڑے ہوتے تھے۔ ان تالوں کی کنجیاں بیسویں صدی عیسوی میں انسان کے ہاتھ آئی ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صرف ڈیزائن اور نقشہ بدلا ہے ورنہ ان تحریکات کی بنیادیں بہت قدیم ہیں اور اس طرح کے انقلابات سے دنیا ہمیشہ دوچار ہوتی رہی[1] ہے۔

موجودہ تحریکات اور ان کی ہم جنس سابق تحریکات کی مشترکہ کوتاہی یہ ہے کہ ان کی بنیاد صرف خدا فراموشی پر نہیں ہے بلکہ خود فراموشی بھی ان کی بنیادوں کا کنکریٹ اور اینٹ گارا ہے انسان کیا ہے۔ کیوں پیدا ہوا۔ اس کا مستقبل کیا ہے۔ اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ موت کی حقیقت کیا ہے۔ وہ فنا ہے یا انتقال (یعنی حالت کی تبدیلی اور ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہو جانا۔)

اگر موت انتقال ہے اور انسان موت کے بعد بھی باقی رہنے والی حقیقت ہے تو مابعدالموت کا تعلق موجودہ زندگی سے کیا ہے۔

قول و عمل اگر باقی رہنے والی حقیقتیں ہیں تو کس طرح ؟ اور ان کا کچھ اثر مابعدالموت ہوگا یا نہیں۔ عاقبت اندیش انسان کا فرض ہے کہ میدانِ عمل میں قدم رکھنے سے پہلے ان سوالات کو حل کرلے۔ ان سوالات سے غفلت خود فراموشی ہے جس کا نتیجہ خدا فراموشی ہوتا ہے۔ مَنْ لَمْ یَعْرِفْ نَفْسَہٗ لَمْ یَعْرِفْ رَبَّہٗ۔

---

[1] فارسی زبان اور تاریخ ایران سے دلچسپی رکھنے والے مزدک سے واقف ہیں جس نے تقریباً پانچویں صدی عیسوی میں تحریک چلائی تھی کہ زر۔ زن اور زمین سب کے لئے مشترک ہے۔ زنان را خلاص گردانید و اموال را مباح داشت و ہمہ مردمان را در خواستہ زن شریک ساخت چنانکہ در آتش و آب و علف انباز اند (دبستان مذہب) وملل ونحل ص۲۴۷۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو احقر کی تصنیف اقتصادی تحریکات اور اسلامی تعلیم کے اشارات۔

(۲)

انسان ایک جاندار ہے۔ جو اپنے اندر غور و فکر اور تحقیق و تنقید کی طاقت رکھتا ہے جس کی بنا پر اُس نے خاص طرح کی زندگی اختیار کی جس نے درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے موجودہ تمدن کی صورت اختیار کرلی جس کے بہت سے شعبوں میں سے ایک شعبہ وہ ہے جس کو سائنس اور فلسفہ کہا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ کائنات کی آخری سرحد تک پرواز کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کو کچھ ایسے ضابطوں اور قوانین کی ضرورت ہے جو اس زندگی کو محفوظ رکھ سکیں اور اس کو خوشگوار بنا سکیں۔ چنانچہ وہ یہ ضابطے بناتا ہے اور ان کو رائج کرتا ہے۔

یہ ہیں وہ انکشافات جو تحریکات کے بانی صاحبان کو حقیقت انسان کے متعلق خود بخود یا اس سائنس اور فلسفہ کے ذریعے سے ہو گئے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر چیز کی حقیقت سے واقف ہے لیکن اس کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے اس کا جواب سائنس اور فلسفہ نے بھی نہیں دیا

اس کے برعکس قرآنِ حکیم کے شروع ہی میں چند تمہیدی فقروں کے بعد سب سے پہلے انسان کی وہ خصوصیت بیان کی گئی ہے جو اس کو باقی تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ اس کی وہ حیثیت واضح کی گئی ہے جو اس کو پوری کائنات یعنی عالم مخلوقات میں حاصل ہے

(۳)

صرف اسلام ہی نہیں بلکہ جملہ مذاہب اس پر متفق ہیں کہ

(۱) انسان کا خاتمہ موت پر نہیں ہو جاتا۔ بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ موت کی حقیقت فنا ہو جانا نہیں ہے بلکہ موت ایک تبدیلی اور انتقال ہے یعنی عالم مشاہدہ سے ایک ایسے عالم کی طرف منتقل ہو جانا جو ہمارے مشاہدہ سے بالا ہے۔

(۲) اور یہ کہ انسان کا حقیقی اور دائمی مستقبل وہ ہے جس کا آغاز اس انتقال اور اس تبدیلی کے بعد ہو گا۔ جس کو موت کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر حقیقی مستقبل اور حقیقی زندگی وہ ہے جو موت کی گھاٹی کو پار کرنے کے بعد سامنے

آئے گی تو موجودہ زندگی کا تعلق اس سے کیا ہوگا؟ اس زندگی کا آغاز از سرِ نو ہوگا۔ یعنی نیست سے ہست اور عدم کی جگہ ایک وجود کا آغاز ہوگا یا وہ زندگی موجودہ زندگی کا نتیجہ اور ثمرہ ہوگی۔ گویا آج ہم بوتے ہیں اور مرنے کے بعد اس کو کاٹیں گے یا وہ ایک قدرتی ارتقاء ہوگا۔ یعنی جس طرح انسان کا موجودہ وجود ایک ارتقائی درجہ ہے جو تخلیق کے بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد ظہور پذیر ہوا ہے! ایسے ہی مابعد الموت بھی ایک ارتقائی درجہ ہوگا۔ سائنس نے اس کا جواب نہیں دیا۔ مذہب اس کا جواب دیتا ہے اور قرآن حکیم اسی جواب کو سامنے رکھ کر نہ صرف اقتصادیات وسیاسیات بلکہ انسان کی پوری زندگی کے لئے ضابطۂ حیات مقرر کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ مبارکہ جو قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہے اس کی عکاسی کرتی ہے۔

(۴)

خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اس کو مانے۔ انسان کو ضرورت ہے کہ اپنے آپ کو باہوش ثابت کرنے کے لئے خدا کو مانے اس شخص کو باہوش نہیں کہا جا سکتا جس کا دعویٰ یہ ہو کہ تاج محل خود بخود وجود میں آگیا۔

یہ شخص اگر اسی کور باطنی کے ساتھ تاج محل کی سیر کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ بانی اور معماروں

لہ ڈارون کا نظریہ ہمارے پیشِ نظر نہیں ہے۔ ہمارے پیشِ نظر قرآنی آیات ہیں جن میں یہ ترتیب قائم کی گئی ہے کہ انسان کی سرشت مٹی سے ہوئی۔ پھر ہر انسان کے مراتب تولید میں نطفہ۔ پھر علقہ (خون بستہ) پھر گوشت کا لوتھڑا۔ پھر انسانی شکل۔ پھر نفخِ روح۔ پھر ولادت۔ پھر بچپن، جوانی۔ کہولت۔ پھر بڑھاپا۔ بس جس طرح نفخ روح (جان پڑ جانے کے بعد) بطن مادر میں رہا اور وہاں سے اس عالم میں آیا۔ یہ بھی ایک انتقال ہے۔ اسی طرح موجودہ عالم بطن گیتی ہے۔ جہاں وہ اپنے اوصاف و خصائل اور اپنے کردار وعمل کے ساتھ نشوونما پا رہا ہے اور مرنے کے معنی کہ وہ بطن گیتی سے دوسرے عالم میں منتقل ہوگا اور جس طرح ماں باپ کی خصلتیں اور ان کے امراض عموماً بچہ میں سرایت کر جاتے ہیں انسان کے اعمال و کردار کے اچھے برے اثرات بھی انسان میں اثر کر جائیں گے۔ دوسرے عالم میں ان کے اثرات ظاہر ہوں گے۔

کی قدر نہیں کرے گا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ سنگ تراشی، نقش سازی، ڈیزائن سازی اور انجینئرنگ وغیرہ کے تصورات سے بھی محروم رہے گا۔ اس کے ذہن میں بھی نہیں آئے گا کہ ڈیزائن سازی بھی کوئی خاص فن ہے۔ سنگ خارا اور سنگِ مرمر پر پھول اور بوٹیاں بنانا پھران میں رنگ بھرنا اور ایسے مسالے تیار کرنا کہ صدہا سال کی سیکڑوں برساتیں ان پر کوئی اثر نہ کر سکیں عمارت کے طول و عرض، بلندی وغیرہ کو موزوں رکھنا بھی قابل قدر ہنر ہیں۔

یہ ظالم تاج محل کو خود رُو مان کر ان تمام فنون اور اُن کے ماہرین پر ظلم کرتا ہے۔ ان فنون کے ایجاد کرنے اور ترقی دینے کا کوئی سوال اُس کے سامنے نہیں آتا۔ وہ خود اپنے اوپر بھی ظلم کرتا ہے اور اپنی ظالمانہ فطرت سے ان تمام فنون کو بھی مجروح اور مفلوج کر دیتا ہے ایسے کور باطنوں کو اگر اقتدار کی باگ ڈور دیدی جائے تو کیا تمدن ایک قدم بھی آگے بڑھ سکے گا۔

کائنات کے اس تاج محل میں جو حسن اور خوبیاں ہیں ان کو صحیح طور پر وہی پہچان سکتا ہے جو اس کے پیدا کرنے والے کو پہچانے۔ اسی کو "معرفتِ حق" کہا جاتا ہے۔ معرفتِ حق حقیقت پسندی اور خدا پرستی کی بنیاد ہے۔ اس کو مضبوط کرنے اور ترقی دینے کا نام روحانیت ہے۔

(۵)

انسان کی حیثیت

انسان کی حیثیت اگر یہ ہے کہ وہ ایک جاندار ہے جس کو عقل کی نعمت دے دی گئی ہے۔ تو اس سے اعلیٰ اخلاق، شرافت اور رُوحانیت کا مطالبہ خاص وزن نہیں رکھتا۔ اگر وزن رکھتا ہے تو صرف اتنا جو بتقاضائے عقل ضروری ہو مگر اسلام نے انسان کی حیثیت بہت بلند قرار دی ہے۔ وہ کمالات تخلیق کا بہترین نمونہ[1] اور نظام قدرت کا شاہکار ہے۔ جس کو یہ عزت اور عظمت دی گئی ہے[2] کہ وہ اس پوری کائنات

---

[1] لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (سورہ والتین)

[2] ولقد کرمنا بنی آدم (سورہ ۱۷ بنی اسرائیل آیت ۷۰)

میں خالق کائنات کا خلیفہ[1] ہے۔ کائنات کی بڑی سے بڑی مخلوق حتیٰ کہ چاند سورج اور زمین و آسمان کو بھی خالق و قادر ذوالجلال نے اس کے لئے مسخر[2] کر دیا ہے۔ وہ ہر ایک پہ حکم چلا سکتا ہے جس کو چاہے اپنے کام میں لا سکتا ہے۔

یہ ہے انسان کی حیثیت اسلام کی نظر میں اور خود فراموشی یہ ہے کہ انسان اپنی اس حیثیت سے اور اس حیثیت کے بموجب جو اُس کے فرائض ہیں ان سے غافل ہو۔

فرائض خلافت و نیابت کے منصب جلیل کا جس طرح یہ تقاضا ہے کہ خلیفہ اپنے آقا کا فرمانبردار اور وفادار ہو۔ ایسے ہی اس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے آقا کے کمالات کا مظہر ہو اور ان نقائص سے پاک ہو جو کمالات کی ضد ہیں اور عیب سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے سب سے پہلے فقروں میں خالق کائنات کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

۱۔ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ	بہت رحم کرنے والا۔ بہت مہربان
۲۔ رَبِّ العَالَمِینَ	تمام جہانوں کا پالنے والا
۳۔ مَالِكِ یَومِ الدِّینِ	مالک انصاف کے دن کا۔

۱۔ سب سے پہلے ضروری ہے کہ انسان میں رحم ہو۔ شفقت اور مہربانی ہو

۲۔ اس کی فطرت میں تربیت ہو (یعنی پرورش کرنا۔ سکھانا۔ سدھانا۔ ضرورتمندوں کی ضرورتیں پوری کرنا) سخاوت۔ بخشش اور سیر چشمی جیسی صفات سے وہ آراستہ ہو۔

رب العالمین خود نہیں کھاتا دوسروں کو کھلاتا ہے۔ وہ بھوک پیاس سے بھی بے نیاز ہے لیکن انسان (جو کھانے پینے کا محتاج ہے) اگر بھوکوں کی ضرورت کو اپنی بھوک سے مقدم رکھے تو اس کا کام ایثار اور قربانی ہے۔

---

[1] انی جاعل فی الارض خلیفۃ۔ سورہ ۲ بقرہ آیت ۳۰ [2] سخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم اللیل والنھار سورہ ۱۴ ابراہیم آیت ۳۳ وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعا منہ سورہ ۴۵ جاثیہ آیت ۱۳۔

۳۔ رب العالمین سب سے بڑا منصف ہے اس کے خلیفہ کو بھی عدل وانصاف کا پیکر ہونا چاہیئے۔

۴۔ خالق کائنات رب العالمین عالم غیب السمٰوٰت والارض ہے۔ یعلم مافی البر والبحر[1] اس کی صفت ہے اس کے خلیفہ اور نائب کو بھی ذی علم ہونا چاہیئے وہ عالم غیب السمٰوٰت والارض اور عالم مافی البر والبحر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کا فرض ہے کہ اپنے علم کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے اور دعا کرتا رہے۔ رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا[3]۔

۵۔ رب العالمین صرف خالق ہی نہیں بلکہ اس کی صفت ہے، بدیع السمٰوٰتِ والارض[4]۔ نئی طرح بنانے والا (ایجاد کرنے والا) زمینوں اور آسمانوں کا۔ فکر انسان کو بھی چاہیئے کہ تخلیق وایجاد کی باریکیوں کی تلاش کرنے میں مصروف رہے۔ وہ نیست کو ہست اور معدوم کو موجود تو نہیں کر سکتا۔ یہ تو وہی کر سکتا ہے جس کے ایک حکم کن[5] پر نیست ہست بن جائے اور عدم محض جامہ وجود سے آراستہ ہو جائے۔ البتہ وہ یہ ضرور کر سکتا ہے کہ موجودات کی پوشیدہ صلاحیتوں کا کھوج لگائے اور مخفی طاقتوں کے اسباب وذرائع معلوم کر کے جدید ایجادات کو بروئے کار لائے۔

مختصر یہ کہ یہ اوصاف کمال کا سلسلہ ہے۔ ان کے برعکس اوصاف نقص ہیں۔ رحم، مہربانی اور شفقت کے مقابلہ میں سخت مزاجی، سنگدلی، جبر و قہر۔ سخاوت اور سیر چشمی کے مقابلہ میں بخل تنگدلی اور کنجوسی۔ حاجت روائی اور کارسازی کے مقابلہ میں خود غرضی اور نفع اندوزی، ایثار

---

[1] ان تمام باتوں کا جاننے والا جو پردۂ آسمان یا سینۂ زمین میں چھپی ہوئی ہیں۔ [2] ان تمام باتوں اور ان تمام طاقتوں کو جانتا ہے جو سمندر یا خشکی میں ودیعت ہیں [3] سورہ ۲۰ طٰہٰ آیت ۱۱۴۔ [4] سورہ ۶ الانعام آیت ۱۰۱۔ [5] ہو جا۔ یعنی عالم کون وہست میں آجا۔ عالم وجود میں آجا۔

کے مقابلہ میں، حرص طمع۔ رشوت ستانی اور ذخیرہ اندوزی۔ عدل و انصاف کے مقابلہ میں ظلم علم کے مقابلہ میں جہل و سفاہت۔ تحقیق و تنقید کے مقابلہ میں اندھی تقلید۔

انسان میں قدرت نے دونوں صلاحیتیں رکھی ہیں۔ وہ اوصاف و کمال کو اپنا کر کامل و مکمل بھی بن سکتا ہے اور اوصاف نقص کو اختیار کر کے، ذلیل، کمینہ اور شیطان اخرس بھی بن سکتا ہے

شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اوصافِ نقص سے پاک ہو کر اوصافِ کمال اختیار کرے اسی کو تقدس کہا جاتا ہے۔ اس مطالبہ کو پورا کرنے کی کوشش تزکیہ ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اہم مقصد اور آپ کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دورِ حاضر کی تحریکات کا مقصد یہ ہے کہ ملک کا ہر ایک باشندہ خوشحال ہو زندگی کی ضرورتیں اس کو میسر ہوں باشندگانِ ملک اطمینان کی زندگی گذار سکیں۔ یہ مقصد بہت مبارک ہے لیکن جب تک انسان بری خصلتوں سے پاک نہ ہو۔ کیا یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے

یہ دوسرا فرق ہے جو سیرت مبارکہ کی تعلیمات کو موجودہ تحریکات سے ممتاز کرتا ہے کہ سوشلزم و نیشنلزم وغیرہ کا اصول تزکیہ اور اصلاحِ اخلاق کے مفہوم سے نا آشنا بلکہ اس کے ماحول میں یہ الفاظ قطعاً بے جوڑ اور مضحکہ انگیز ہیں جبکہ سیرتِ مبارکہ کی تعلیمات۔ تزکیہ کو ایسا محور قرار دیتی ہیں کہ ہر ایک نظام اسی کے گرد گھومتا ہے اور اسی کی درگاہ سے سندِ جواز حاصل کرتا ہے۔ کوئی بھی نظام ہو، اگر اس کی بنیاد تزکیہ پر نہیں ہے تو وہ باطل اور فاسد ہے۔ کیونکہ سیرت مبارکہ کی تعلیمات کا مطمع نظر صرف حیوانی زندگی نہیں جو چند روزہ عارضی ہے بلکہ اس کا مطمع نظر وہ حقیقی زندگی ہے جو ابدی اور دائمی ہوگی۔ جس کی خوشگواری تزکیہ پر موقوف ہے۔

(۶)

ٹیکس کی عربی ضریبہ ہے۔ آپ پورے قرآن شریف کا مطالعہ کر لیجئے آپ کو کہیں کوئی ایسا لفظ نہیں ملے گا جو مالی نظام کے سلسلہ میں ٹیکس اور ضریبہ کے مفہوم کو ادا کرتا ہو کیونکہ

لے اِنَّا عرضنا الامانۃ الی قولہ تعالیٰ انہ کان ظلوما جہولاً۔ سورہ ۳۳ الاحزاب آیت ۷۲

ٹیکس کی تہ میں جبر اور قہر ہوتا ہے۔ قانون کے بنانے والے اگرچہ عوام کے نمائندے ہوتے ہیں مگر اُس کے نفاذ کی پشت پر حکومت کی مسلح طاقت ہوتی ہے۔ اس طرح استحصال تو ہو سکتا ہے کہ حکومت کو رقم مل جائے اور اس کے بجٹ کا خسارہ پورا ہو جائے مگر ادا کرنے والوں کے اخلاق کی اصلاح اور دلوں کا تزکیہ نہیں ہو سکتا۔ بخل، طمع، حرص جیسے امراض بدستور رہتے ہیں اور آرڈیننس یا قانون کی بھیانک طاقت ان امراض میں نفرت، غصہ بغض اور عداوت جیسی بیماریوں کا اضافہ کر دیتی ہے۔

جاگیرداری نظام۔ سرمایہ داری۔ زمینداری۔ انتہا یہ کہ فرد کی ملکیت ختم کر دی جائے تو بہت سے محشر تو برپا ہو سکتے ہیں مگر دلوں کی پاکی اور اخلاق کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ بلکہ خاتمہ ملکیت سے عائلی[1] نظام درہم برہم ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ[2] وہ نفرت انگیز آثار کی ہوتا ہے جو دامن عصمت و عفت کے بھی تار پود بکھیر دیتا ہے۔

جس مالی نظام کی قرآن حکیم رہنمائی کرتا ہے اس کا نتیجہ اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ داری جاگیرداری حتیٰ کہ ملکیت بھی ختم ہو جائے[3]۔ مگر یہ خاتمہ اس طرح ہو گا کہ دلوں کی دنیا بھی بدل جائے گی

---

[1] صاحب خانہ کا اثر اور دباؤ نہ رہے تو ظاہر ہے گھر کا نظام درہم برہم اور اثر اور دباؤ صرف اس بنا پر نہیں کہ بیوی کا شوہر یا بچوں کا باپ ہے۔ بلکہ دباؤ اور اثر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ مالک و قابض ہے بے دست و پا صاحب خانہ کا اثر صرف اخلاقی مطالبہ ہوتا ہے اور جب باپ کا دباؤ نہ ہو تو کیا اولاد با اخلاق بن سکتی ہے؟

[2] خانگی نظام ختم ہونے کے بعد جب سرکاری پرورش گاہوں میں بچے پرورش پائیں گے تو ایک طرف قرابت اور رشتہ داری کے جملہ حقوق ختم بلکہ رشتہ داروں کو پہچاننا مشکل بھی ہو گا اور بے کار بھی۔ دوسری جانب جنسی تعلقات کے لئے سلسلہ ازدواج بے معنی ہو جائے گا۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیے احقر کی تصنیف "دورِ حاضر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل" اور "اسلامی تعلیمات و ارشادات" یہ کتاب مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور۔

[3] انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے تو ہر چیز کا اصل مالک اللہ ہے۔ بندہ کی ملکیت صرف نیابت ہے جو مالک حقیقی کی منشاء اور اس کی مصلحت کے تحت اور اس کے احکام کے تابع ہو گی (باقی صفحہ آئندہ پر)

خارجی طاقت یعنی آرڈی نینس یا قانون کی شوراشوری۔ اہل ثروت اور ارباب دولت کو سراسیمہ اور پریشان نہیں کرے گی۔ بلکہ خود اپنے اندرونی جذبات کی سوزش ان کی نظر میں اس دولت کو وبال جان اور اس کے خرچ کرنے کو راحت و اطمینان بنا دے گی۔

مالی نظام کے سلسلہ میں جو الفاظ قرآن حکیم یا سنت نبویہ نے استعمال فرمائے ان پر نظر ڈالئے۔ وہ سب انقلاب انگیز ہیں۔ مگر بجٹ کے خسارہ کو پورا کرنے کے لئے نہیں بلکہ دلوں کی بیماریوں کو دور کرنے کے لئے۔

سب سے پہلا اور سب سے مشہور لفظ زکوٰۃ ہے۔ جس کے مفہوم میں 'تزکیہ' داخل ہے زکوٰۃ کے معنی پاکی ہیں اور تزکیہ کے معنی پاک کر دینا یعنی زکوٰۃ اس لئے فرض ہوتی ہے کہ دلوں کو پاک کردے۔ بخل وہ ناپاکی ہے جو دلوں کو ہی نہیں اس ملکیت کو بھی ناپاک کر دیتی ہے جو اسکے زیر اثر ہو۔ زکوٰۃ دل کو بخل سے پاک کرتی ہے تو ساتھ ساتھ دولت کو بھی پاک کر دیتی ہے۔ دوسرا لفظ صدقہ ہے۔ جو صدق سے ماخوذ ہے۔ یعنی صدقہ اس بات کی عملی دلیل ہے کہ ملی ضرورتوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پھر اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ اپنے بندوں کا محافظ مشکلات کو حل کرنے والا۔ حاجتوں کو پورا کرنے والا (حل المشکلات قاضی الحاجات) پس جب بھی پرورش، حفاظت تعلیم و تربیت وغیرہ کی ضرورتیں پیش آئیں گی، انسان پر بحیثیت نائب و خلیفہ ان ضرورتوں کو پورا کرنا ضروری ہوگا انفرادی ضرورتیں افراد سے پوری ہوں گی۔ زکوٰۃ و صدقات اسی لئے ہیں کہ ضرورت مند افراد کی انفرادی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ لہٰذا ان کی ادائیگی کے لئے حکومت کا توسط ضروری نہیں ہے وہ وہاں بھی لازم ہیں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے۔ صاحب استطاعت کا فرض ہے کہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرے۔ اسی لئے ان میں تملیک بھی ضروری ہے یعنی ضرورت مند کو محض اجازت دے دینا کافی نہیں بلکہ مالک بنانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ البتہ اجتماعی ضرورتیں ہیئت اجتماعیہ یعنی خلافت کے ذریعہ پوری ہوں گی یہ اجتماعی ہیئت، خلافت الٰہیہ کی حیثیت سے افراد پر اقتدار رکھتی ہے اور افراد کی مملوکات پر بھی وہ کسی کی ملک چھین نہیں سکتی، مگر پابندی لگا سکتی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے "دور حاضر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل"

احساس یا غریبوں اور فقیروں کی ہمدردی کا دعویٰ ایک سچی حقیقت ہے محض نمائش اور بناوٹ نہیں
یہ دو مد لازمی ہیں۔ ان کے مصارف بھی معین ہیں۔ یہ ضرورت مند افراد کی امداد کے لئے
مخصوص ہیں۔ ان دو مدوں کے ذریعہ قوم کی غریبی دور ہو سکتی ہے۔ ان کے لئے حکومت کا واسطہ
بھی ضروری نہیں براہ راست صاحب دولت پر فرض ہے کہ اتنی مقدار اپنی ملک سے نکالے اور ضرورتمند
کی ملکیت میں دیدے۔ مملکت یا ملت کی اجتماعی ضرورتوں پر زکوٰۃ و صدقات واجبہ کی رقم صرف نہیں
کی جا سکتی۔ اِن ضرورتوں کیلئے قرآن حکیم نے قرض یا انفاق فی سبیل اللہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (سورۂ مزمل)

(قرض دو اللہ کو اچھی طرح قرض دینا)

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ

(سورہ ۲ بقرہ آیت ۱۹۴)

اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور دست رحم کو بند کر کے۔ یعنی بخل کر کے امت ڈالو اپنے
ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں)

قرض کیجیے اسلامی مملکت کی مخالف حکومتیں اپنی جنگی طاقتیں زیادہ سے زیادہ مضبوط
کر رہی ہیں۔ اسلامی مملکت کی آمدنی کے عام ذرائع دفاعی ضرورتیں نہیں پوری کر سکتے۔ ہنگامی امداد
کی ضرورت ہوتی ہے، حکومتیں ایسی صورتوں میں قومی قرض[1] یا قرضہ جنگ کی اپیل کرتی ہیں۔ مگر

---

[1] بہت ممکن ہے حکومتوں نے قرض کی اصطلاح بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن سے ہی سیکھی ہو۔ لیکن اگر یہ اصطلاح قرآن سے سیکھی
ہے تو محض الفاظ قرآن کے ہیں روح قطعاً غیر قرآنی ہے قرآن صاحب دولت سے اس تعلق کی بنا پر دولت لیتا ہے جو اسکا خدا کے
ساتھ ہے اور حکومتیں سود کا لالچ دیکر قرض لیتی ہیں۔ قرآن والے قرض سے دولت کی محبت کم ہوتی ہے بخل کے مرض میں تخفیف ہوتی ہے
اور سرکاری قرض سے ان امراض میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا ہے اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ قرآنی قرض کا بار صرف صاحب دولت پر پڑتا ہے
کیونکہ وہ یہ سمجھ کر قرض دیتا ہے کہ اسکا اجر دنیا میں کچھ نہیں ملیگا اللہ کے یہاں ملیگا اور سرکاری قرض کا بار غریبوں پر پڑتا ہے کیونکہ سود کی
ادائیگی نئے ٹیکس لگا کر یا ٹیکسوں میں اضافہ کر کے کی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں غریب کی غریبی میں اضافہ ہوتا ہے اور دولتمند اور زیادہ دولتمند ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم یہ قرض اللہ کے لئے طلب کرتا ہے۔ انفاق یعنی خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ یعنی پہلے انسان کا رشتہ اللہ سے جوڑتا ہے، غیر اللہ سے اس کے دل کو پاک کرتا ہے۔ مال دولت اور ہر چیز کے مقابلہ میں اللہ کی محبت بڑھاتا ہے اور ایمان کا معیار یہ قرار دیتا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ سورۂ ۲ بقرہ آیت ۱۶۵

(جو ایمان لائے وہ بہت بڑھے ہوئے ہیں اللہ کی محبت میں)

اسی محبت کے نتیجہ میں وہ اس سے مالی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ہے تزکیۂ قلب

(۷)

تزکیہ کس طرح ہوتا ہے تزکیہ کا آغاز خود اپنے نفس سے ہوتا ہے۔ پہلے خود اپنی اصلاح کرے۔ اپنے نفس کو بخل، طمع، حبِ مال جیسی آلودگیوں سے پاک کرے۔ تب درجہ بدرجہ دوسروں سے اصلاح قبول کر لینے کی توقع کر سکتا ہے۔

اس سلسلہ تحریر کا تعلق جناب رسالت مآب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ سے ہے لہٰذا وہی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جن کا تعلق خود ذاتِ اقدس سے ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) دولت پرستی اور حبِ مال سے قلب کو پاک کرنے کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ نے (صلی اللہ علیہ وسلم) طے فرما لیا کہ جو کچھ آمد ہو وہ شام تک خرچ کر دی جائے، کاشانۂ نبوت میں رات کو کوئی ایک حبہ بھی باقی نہ رہ سکے۔

گردنوں کو پھاند کر گزرنا خلافِ ادب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ ہاں کسی مجبوری کی صورت میں یہ بے ادبی معاف سمجھی جائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک روز خود ایسا کرنا پڑا۔ آپ عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ کو خیال آیا کہ فلاں زوجہ مطہرہ کے یہاں آپ کی کچھ چاندی رکھی ہوئی ہے۔ جیسے ہی آپ نے سلام پھیرا، بڑی پھرتی سے آپ کھڑے ہوئے اور ان زوجہ مطہرہ کے یہاں تشریف لے گئے۔ فوراً ہی واپس تشریف لے آئے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لوگ حیران ہیں۔ کیا ماجرا ہے! خلافِ معمول اس طرح تیزی سے کیوں تشریف لے گئے

ابھی کوئی دریافت نہیں کرنے پایا تھا کہ آپ نے خود ہی فرما دیا۔ مجھے نماز پڑھتے ہوئے[1] یاد آیا کہ کچھ چاندی رکھی ہوئی ہے۔ مجھے گوارا نہیں کہ شام کا وقت ہو اور چاندی میرے پاس رہے ایک روایت میں یہ ہے کہ چاندی میرے گھر میں رات گذارے لہٰذا میں کہہ آیا ہوں کہ اس کو تقسیم کر دیں۔[2][3]

یہ احساسِ لطیف کی نزاکت ہے کہ عصر کا وقت ہے شام ہونے اور رات آنے میں کافی دیر[4] ہے مگر یہ دیر بھی دیر نہیں معلوم ہوئی۔ گویا دولت کی آلودگی سے جس قدر جلد ممکن ہو دامن پاک ہو جائے۔

یہ تھوڑی سی چاندی کا معاملہ تھا۔ ممکن ہے دو تین تولہ ہی ہو مگر دولت کے بڑے سے بڑے انبار کے متعلق بھی آپ کا جذبہ یہی تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے رات کی چاندنی میں آپ تشریف لے جا رہے تھے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ سامنے اُحد پہاڑ تھا۔ آپ نے فرمایا۔ اگر احد پہاڑ کی برابر سونا میرے پاس ہو تو میری خوشی یہ ہوگی کہ تین راتیں نہ گذرنے پائیں کہ وہ سب راہِ خدا میں خرچ ہو جائے۔ ایک دینار بھی میرے پاس باقی نہ رہے بجز اس دینار کے جو کسی مطالبہ کو ادا کرنے کے لئے محفوظ رکھنا پڑے۔[5]

---

[1] نماز میں کسی بات کا یاد آ جانا غیر اختیاری ہے اور یہ بھی فطری بات ہے کہ انسان کا ذہن اور دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے لہٰذا فطری اور غیر اختیاری پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ البتہ نماز سے غافل ہو کر خیال میں مصروف اور مشغول نہ ہو جانا چاہیئے۔ اس خیال کو ہٹا کر نماز ہی کی طرف دھیان لگانا چاہیئے۔ سنتِ مبارکہ کی تعلیم یہی ہے واللہ اعلم بالصواب۔ [2] ضرورت مند اور مستحق لوگوں کی کمی نہیں تھی [3] بخاری شریف صـ۱۶۳ صـ۱۱

[4] مسلک احناف کے بموجب گرمیوں میں تقریباً دو گھنٹے اور حضرات شوافع کے مسلک کے بموجب دوسرے مثل ہی میں عصر کی نماز پڑھی گئی تھی تو ابھی تقریباً ایک تہائی دن باقی تھا۔ مگر الفاظ حدیث اکرھت ان یمسی او یبیت عندنا (بخاری شریف صـ۱۶۳) سے وہی متبادر ہے جس سے مسلک احناف کی تائید ہوتی ہے (واللہ اعلم بالصواب)

[5] بخاری شریف صـ۹۵۴ و صـ۳۲۱ وغیرہ۔

زندگی بھر درہم و دینار کو یہ سعادت میسّر نہ ہوئی کہ کاشانۂ نبوت میں رات گذار سکے، بعد وفات کے لیے ارشاد ہوا۔

لا تقتسم ورثتی دینارًا ولا درهمًا. ما ترکت بعد نفقة نسائی ومؤنة عاملی فهو صدقة۔[1]

(یعنی) یہ تو ہوگا ہی نہیں کہ میرے وارث دینار یا درہم تقسیم کر سکیں (البتہ کچھ جائیدادیں میری تحویل میں ہیں۔ تو) ازواج کے نفقہ اور کارندے کے حق المحنت کے علاوہ جو کچھ میرا ترکہ ہو وہ صدقہ ہے۔

استعمال کی بندش تزکیہ کا مطلب صرف یہی نہیں رہا کہ اکتناز نہ ہو، یعنی حاصل شدہ درہم و دینار کو شب باشی کا موقع نہ ملے (شام سے پہلے ہی خرچ کر دیا جائے) بلکہ تزکیہ کا دوسرا رخ یہ تھا کہ آمدنی صرف وہ ہو جو ہر طرح مقدس، طیب اور پاک ہو۔ پھر اس پاک میں بھی یہ پابندی کہ زکوٰۃ یا صدقہ نہ ہو۔ یہ پابندی نہ صرف اپنے لئے بلکہ

(الف) نسلاً بعد نسل اپنی تمام اولاد کے لئے۔

(ب) تمام خاندان کے لئے جو آلِ ہاشم کہلاتا تھا (انتہا یہ کہ)

(ج) اپنے خاندان کے تمام آزاد کردہ غلاموں کے لئے[2]

پھر لطف یہ کہ (۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام تر ترکہ صدقہ۔ آپ کے وارثوں کو یہ حق نہیں کہ اس کو تقسیم کر سکیں (۲) مگر صدقہ یا زکوٰۃ کی یہ مجال نہیں کہ وہ آلِ ہاشم کا دامن

---

[1] بخاری شریف ص۴۳۹ [2] جن کو موالی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ عربوں کا حوصلہ یہ تھا کہ وہ اپنے موالی کو بھی اپنے خاندان کا فرد سمجھا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موالی کو یہی حیثیت دی ہے ارشاد ہے ان الصدقة لا تحل لنا وان موالی القوم من انفسهم۔ ترمذی شریف ص۸۳ ج۱ ابوداؤد شریف ص۲۳۱ ج۱ وهکذا فی النسائی ص۳۶۶ ج۱۔

چھوٗ سکے۔

(۲) پوری امت کے لئے یہ ضابطہ کہ

توئخذ من اغنیاء ھم وترد علی فقراء ھم

یعنی جس قوم یا گروہ کے دولت مندوں سے زکوٰۃ لی جائے وہ اسی گروہ یا قوم کے ضرورتمندوں کو دیدی جائے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کے لئے اس میں یہ ترمیم کہ اس ضابطہ کا جزو اول تو واجب العمل۔ کہ اگر دولت مند ہوں تو عام مسلمانوں کی طرح اُن سے بھی زکوٰۃ و صدقہ لیا جائے لیکن دوسرا جزو (کہ ان کے ضرورت مندوں کو دیا جائے) حرام یعنی آل ہاشم کے دولتمند یہ نہیں کر سکتے کہ عام دستور کے بموجب وہ اپنی زکوٰۃ کی رقم یا صدقہ فطر اپنے کسی ہاشمی رشتہ دار یا اُس کے آزاد غلام کو دے دیں یہ رقم لامحالہ کسی غیر ہاشمی مسلمان کو ہی دینی ہوگی۔

صدقہ کے کھجور آتے ہوتے پڑے تھے۔ جگر گوشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ بچے تھے۔ انہوں نے ایک کھجور منہ میں رکھ لیا۔ جیسے ہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر پڑی لختِ جگر کو تنبیہہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا۔

کخ کخ۔ اما شعرت انالا نا کلُ الصدقہ

اخ تھو۔ اخ تھو۔ تمہیں اتنی تیز نہیں۔ ہم صدقہ نہیں کھایا کرتے۔

رازدرون پردہ گذران کی کیفیت ان تمام پابندیوں اور احتیاطوں کے بعد اندرون نشیمن کیا حالت رہا کرتی تھی۔ ذرا جھانک کر دیکھو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ جب بھی میں کھانا کھانے بیٹھتی ہوں طبیعت ایسی بھرآتی ہے کہ اگر چاہوں تو خوب رو سکتی ہوں مجھے وہ حالت یاد آجاتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں رہی۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ خدا کی قسم کبھی بھی ایسا

لہ پیدائش نصف رمضان ۳ھ (تاریخ الخلفاء) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تقریباً ساڑھے چھ سال عمر تھی لہ بخاری شریف ص؟؟ و فتح الباری ص؟؟ فتوے بھی ہے اگرچہ یہ بھی بتانا ہے کہ سید کی زکوٰۃ سید لے سکتا ہے۔

نہیں ہوا کہ دونوں وقت آپ روٹی اور گوشت سے شکم سیر ہوئے ہوں[1]۔

میدہ آپ نے عمر بھر نہیں دیکھا کبھی آپ کے لئے چپاتی نہیں پکائی گئی۔ جَو کا آٹا بھی بے چھنا پکتا تھا، یہی خوراک تھی۔ اس پر بھی دو دو ماہ گذر جاتے تھے کہ چولھے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ دو کالی چیزیں یعنی کھجور اور پانی غذا ہوا کرتی تھی البتہ انصاری پڑوسی دودھ بھیج دیا کرتے تھے[2]۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص) فرماتے ہیں گھر کے آدمی نو[3] تھے دن رات کے خرچ کیلئے ان سب کے واسطے صرف ایک صاع[4] ہوتا تھا اور ایسا بھی ہوا کہ آپ نے یہودی کے یہاں ذرہ رہن رکھ کر جو منگوائے اور ایسا بھی ہوا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جَو کی روٹی اور باسی چربی لے گیا[5]۔ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔

بچھانے کا گدا چمڑے کا تھا۔ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی[6]۔ اکثر کھرے چارپائی پر آرام فرماتے تھے۔ چٹائی کے پٹھے جسم مبارک میں گڑجایا کرتے تھے[7]۔

وفات ہوئی تو ذرہ ایک یہودی کے یہاں تیس[8] صاع جَو کے عوض میں رہن تھی[9]۔

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک موٹا کمبل پیوند لگا ہوا۔ اور ایک موٹے کپڑے کی لنگی نکال کر ہمیں دکھائی اور فرمایا ان دو کپڑوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوح قبض ہوئی[10]۔

وفات کے بعد ترکہ یہ تھا۔ (ضروری) اسلحہ۔ ایک خچر قطعہ آراضی جس کو صدقہ کر دیا تھا[11]۔

---

[1] ترمذی شریف صفحہ ۵ ج ۲ [2] بخاری شریف صفحہ ۹۵۶ [3] ازواج مطہرات نوسویں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم [4] ایک صاع کا وزن دوسو ستر تولہ (تین سیر چھ چھٹانک (تقریباً ۲ کیلو چھ سو گرام) [5] بخاری شریف صفحہ ۲۷۱ [6] بخاری شریف صفحہ ۹۵۶ [7] بخاری شریف صفحہ ۳۳۵ [8] تیس صاع تقریباً ڈھائی من [9] بخاری شریف صفحہ ۴۰۹ وشمائل ترمذی شریف۔

[10] بخاری شریف صفحہ ۴۶۵ ترمذی شریف صفحہ ۲۰۶ ج ۱

[11] شمائل ترمذی شریف صفحہ ۲۹۔

ایک معمہ ..... سنہ ۷ھ میں خیبر فتح ہوا۔ اس کے بعد ازواج مطہرات کے نفقے مقرر کر دیئے گئے۔ ہر ایک خاتون کا سالانہ نفقہ۔ اسی وسق کھجور اور بیس[2] وسق جو۔ ایک[1] وسق کا وزن پانچ من ڈھائی سیر۔ اس حساب سے اسی وسق کھجور چار سو پانچ من اور بیس[2] وسق جو ایک سو ایک من دس سیر۔ کھجور اور جو کا جو بھی نرخ مانا جائے۔ جب ایک شخص کی خوراک کے لئے مہینہ میں ایک من اور سال بھر میں بارہ من جو یا کھجور بہت کافی ہوتے ہیں تو یہ کئی سو من کی مقدار فاضل ہی تھی۔ اس کے ذریعہ زندگی بہت خوش حال بن سکتی تھی۔ پھر یہ تنگی کیوں تھی۔

جواب کوئی حساب داں اس معمہ کو حل نہیں کر سکتا۔ قرآن حکیم نے اس کا جواب دیا ہے جب صحابہ کرام کی شان یہ بیان فرمائی۔

یوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ (سورہ حشر ۵۹)

(ضرورتمندوں کو) اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں باوجودیکہ خود ان کو شدید ضرورت ہوتی ہے۔

اور اللہ کے پاک بندوں کی یہ شان بیان فرمائی:

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝

اور کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر (جب کھانا خود اُن کو بھی محبوب ہوتا ہے اور وہ خود بھی ضرورت مند ہوتے ہیں) مسکین کو۔ یتیم کو اور قیدی کو

ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر عوام کی اقتصادی حالت معلوم ہو جائے تو معمہ حل ہو جائے گا۔

عوام کی حالت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو آپ کا مع اہل وعیال یومیہ وظیفہ

---

[1] بخاری شریف ص ۳۱۳ [2] ایک وسق ساٹھ صاع کا اور ایک صاع ۳ سیر چھ چھٹانک (۲۷۰ تولہ)

نصف بکریؒ مقرر کیا گیا تھا. کیونکہ متوسط درجہ کے مہاجر کی یومیہ آمدنی کا اوسط یہی تھا. یہ آمدنی فی کس نہیں بلکہ فی گھر تھی.

اور جب متوسط درجہ کے مہاجرین کی یہ آمدنی تھی تو غریبوں کی آمدنی کا اوسط تو فی گھر اس سے بھی کم ہوگا. جس کا لازمی تقاضا عمومی افلاس تھا. پس عمومی افلاس اور عوام کی خستہ حالی اس معمہ کا حل ہے. اس کی وضاحت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ سے ہوتی ہے.

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں جب از سر نو وظائف مقرر کئے تو ہر ایک زوجہ مطہرہ کا سالانہ وظیفہ دس ہزار درہم مقرر کیا. اُم المومنین حضرت زینب بنت جحش (رضی اللہ عنہا) کے یہاں یہ رقم پہلی مرتبہ پہنچی تو فرمایا اللہ تعالیٰ امیرالمومنین پر رحم فرمائے. یہ

لہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ کو بکری خریدنے کے لئے بھیجا تو آپ نے ایک دینار اُن کو دیا تھا. یہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کی کمال ہوشیاری تھی کہ آپ نے ایک دینار کی دو بکریاں خرید لیں. (بظاہر آپ کسی گلہ میں یا کسی کے مکان پر پہنچ گئے. پھر بازار میں لاکر ایک بکری ایک دینار میں فروخت کردی. دوسری بکری اور ایک دینار آقا دو جہان (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پیش کر دیا. آپؐ نے ان کو دعا دی (بخاری شریف ص۵۱۴). بہرحال اگرچہ حضرت عروہ نے ایک دینار میں دو بکریاں خرید لی تھیں. مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ایک دینار اسی لئے دیا تھا کہ عام طور پر قیمت ایک دینار کے قریب ہوتی تھی پھر بازار میں ایک بکری کو ایک دینار میں فروخت کر دیا اور خریدار کا ایک بکری کو بلا تکلف ایک دینار میں خرید لینا بھی یہی بتاتا ہے کہ بازار میں عام قیمت تقریباً ایک دینار ہی ہوتی تھی اس صورت میں نصف بکری کا وظیفہ مقرر کرنے کا مفہوم یہ ہوا کہ نصف دینار یومیہ حضرت ابوبکر کے گھر کے خرچ کے لئے مقرر کیا گیا. دینار کی قیمت عام طور پر دس درہم ہوتی تھی (فتح القدیر باب الجزیہ) اس کے بعد نصف بکری یومیہ کے بجائے دو ہزار درہم اور جب آپ نے عیالداری کی ضرورتیں پیش کر کے اضافہ کی فرمائش کی تو ڈھائی ہزار درہم (تقریباً سات درہم یومیہ) (تاریخ الخلفاء ص۵۵)
ایک درہم ساڑھے تین ماشہ کا مانا جائے تو دو تولہ چھ ماشہ چاندی یومیہ. حضرت صدیق اور ان کے اہل و عیال کے لئے مقرر کئے گئے. ۲ہ تاریخ الخلفاء ص۵۵ مجتبائی بحوالہ طبقات ابن سعد.

رقم میرے پاس بھیجی حالانکہ میری سہیلیوں میں ایسی ہیں جو مجھ سے زیادہ باہمت ہیں وہ زیادہ مستعدی سے اس رقم کو تقسیم کرسکتی تھی۔

جب پیش کرنے والوں نے کہا محترمہ۔ یہ تقسیم کرنے کے لئے نہیں ہیں یہ تو آپکے جیب خرچ کے لئے ہیں تو فرمایا اچھا۔ یہاں ڈال دو۔ ان کو رکھواکران پہ کپڑا ڈلوادیا اور اپنی خادمہ سے فرمایا۔ کپڑے کے نیچے ہاتھ ڈال کر فلاں خاندان کے لئے رقم نکالو۔ فلاں خاندان کے لئے نکالو۔ اسی طرح خاندان شمار کراتی رہیں اوران کے لئے رقومات علیحدہ کراتی رہیں۔ خادمہ نے کہا، سیدہ میں بھی تو حاضر ہوں۔ کچھ میرے لئے بھی' فرمایا۔ جو کچھ کپڑے کے نیچے رہ گیا ہے وہ تمہارا ہے۔

خادمہ نے کپڑا اٹھایا تو صرف پچاسی درہم باقی تھے۔ وہ اس کو عطا فرما دیئے۔[1]

یہ تھا اسلامی سوشلزم۔ اگراس کو سوشلزم کہا جاسکتا ہے جو تقسیم دولت کا قانون نہیں ہوتا بلکہ دلوں میں دولت سے نفرت اور غریبوں کی ہمدردی کا وہ جذبہ بھر دیتا ہے کہ ان کو اطمینان جب ہی ہوتا ہے۔ جب پوری دولت تقسیم ہو جائے اور امیر، غریب کی سطح پر آجائے اسی کو تزکیہ کہا جاتا ہے کہ بخل، حُبِّ مال اور حرص و طمع کے جراثیم سے وہ پارۂ گوشت پاک و صاف ہو جائے جس کو دل کہا جاتا ہے۔

نتیجہ۔ یہ بحث بظاہر بے محل ہے۔ مگر جب شروع ہو گئی تو اب یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ یہ اقتصادی نظام جس کی بنا مساوات پر رکھی گئی تھی جس کیلئے دولت مند غریب کی سطح پر آتے تھے وہ کتنی جلد کامیاب ہوا اور کیسا کامیاب ہوا۔

(۱) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وظیفہ یومیہ نصف بکری معین کیا گیا۔ یعنی پانچ درہم یومیہ۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دو سالہ دورِ خلافت میں درجِ رجسٹر مسلمانوں کے وظائف مقرر کیے تو اسی نسبت سے یعنی فی کس پانچ درہم یومیہ۔[2]

---

[1] کتاب الخراج للامام ابی یوسف ؒ ص ۴۵ [2] کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۶۴۲ ص ۲۶۳

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فضائل۔ خدمات اور مناصب کا لحاظ کرتے ہوئے وظائف مقرر فرمائے جو بارہ ہزار درہم سالانہ[1] تک تھے۔ جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق تھا تو یہ ضابطہ مقرر کر دیا کہ جیسے ہی بچہ پیدا ہو اس کا وظیفہ جاری کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ یمن کا علاقہ زرخیز تھا تو وہاں یہ حالت ہو گئی کہ ایسے ضرورت مند نہ رہے جن کو زکوٰۃ دی جا سکے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یمن کے والی (گورنر) تھے انہوں نے جو زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں وصول کیں ان کا ایک تہائی مرکزی بیت المال (مدینہ) میں بھیجا۔ مگر بجائے مبارکباد کے حضرت فاروق اعظمؓ کی جانب سے تنبیہہ نامہ پہنچا:

> آپ کو یمن اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ وہاں سے چندہ یا جزیہ وصول کر کے یہاں بھیجیں آپ کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہاں کے اہل استطاعت سے زکوٰۃ و صدقات وصول کریں اور اسی علاقہ کے ضرورت مندوں پر تقسیم کر دیں۔ پھر آپ نے یہ رقم کیسے بھیجی۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا:

> سب کو دے دیا گیا جب یہاں کوئی لینے والا نہ رہا تو یہ فاضل رقم بھیج دی۔

اگلے سال حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے نصف اور تیسرے سال زکوٰۃ کی پوری رقم مرکزی بیت المال میں بھیج دی۔ اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مرتبہ بھی اتنی سختی سے لکھا تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا دو لفظی جواب یہ تھا۔

---

[1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارہ ہزار درہم سالانہ باقی تمام ازواج کے دس دس ہزار۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تمام مہاجرین کے جو غزوہ بدر میں شریک تھے۔ پانچ پانچ ہزار۔ حضرت انصار جو بدر میں شریک تھے ان کے چار چار ہزار۔ (کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۵۴۹ صـ ۲۲۴۔

مَا جِدتُ اَحَدًا یاخذ منی شیئًا

کوئی نہیں ملا جو مجھ سے کچھ لے لے [1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور شروع ہوا تو مدینہ کی یہ حالت ہو گئی کہ لوگ زکوٰۃ کی رقم لیئے پھرتے تھے اور کوئی شخص ایسا نہیں ملتا تھا جو اسے قبول کر لے۔

سنہ ۷ھ میں خیبر فتح ہوا تھا۔ اس وقت سے اسلامی مملکت اس قابل ہوئی تھی کہ کسی درجہ پر مالی نظام قائم ہو سکا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت سنہ ۲۳ھ سے شروع ہوا اس سولہ سال کے عرصہ میں پوری مملکت کی یہ حالت ہو گئی کہ غریبی کا نام و نشان نہیں رہا۔ ساتھ [2]

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۱۹۱۱ صفحہ ۵۹۶ [2] اس نظام کی بنیادیں اتنی مضبوط تھیں کہ شدید خانہ جنگی کے باوجود خوش حالی کا دور دورہ رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت یعنی خلافت راشدہ کے تیس سال ختم ہونے کے بعد اگرچہ وصول اور خرچ کے بارہ میں وہ احتیاط باقی نہیں رہی تھی مگر جو اقتصادی ساکھ قائم ہو چکی تھی وہ قائم رہی۔ جس کی ایک مثال یہ بھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تقریباً ساٹھ سال بعد جب حضرت عمر بن عبدالعزیز (المتوفی رجب سنہ ۱۰۱ھ) نے نظامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیا تو آپ نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن (گورنر عراق) کو حکم بھیجا کہ وظائف مقررہ ادا کر دیں۔ گورنر صاحب نے تعمیل حکم کے بعد رپورٹ بھیجی کہ تمام وظائف ادا کئے جا چکے ہیں۔ تب بھی کافی رقم باقی ہے۔ دربارِ خلافت سے حکم صادر ہوا۔ آپ کے صوبہ میں جتنے مقروض ہیں اُن کا جائزہ لو اور ان سب کے قرض ادا کر دو جو فضول خرچی کی بناء پر مقروض نہ ہوئے ہوں۔ گورنر صاحب نے تعمیل کے بعد رپورٹ بھیجی کہ سب مقروضوں کے قرض ادا کئے جا چکے ہیں تب بھی رقم باقی ہے۔ حکم صادر ہوا جن نوجوانوں کے نکاح نہیں ہوئے ان کے نکاح کرا دیجئے اور مہر اس رقم سے ادا کر دیجئے گورنر صاحب نے اس حکم کی تعمیل کے بعد بھی یہی رپورٹ بھیجی کہ رقم باقی ہے۔ حکم صادر ہوا جو غیر مسلم کاشت کار جزیہ ادا کرتے ہیں ان کا جائزہ لیجئے۔ ان کو تقاوی کی ضرورت ہو تو ان کی تقاوی دے دیجئے کہ وہ آسانی اور سہولت کے ساتھ زمین بو سکیں۔ کتاب الاموال لابی عبید ص۲۵۱ حدیث ۶۲۱۔

ساتھ تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا تو وہی مدینہ جس میں قبہ دار پھاٹک ناپسند فرمایا گیا تھا اب اس کی تعمیرات محدود علاقہ سے آگے بڑھ کر کوہِ سلع تک پہنچ گئیں۔ جو احد کے قریب مدینہ سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر ہے۔

تیسرا کام

قریش واہل یثرب کا معاہدہ

(۱)

یثرب ومضافات یثرب (مدینہ) اُس عرب کا ایک علاقہ تھا جہاں نہ کوئی حکومت و سلطنت تھی نہ فوج اور پولیس۔ پورا عرب آزاد و خودسر قبائل کا ایک وسیع جنگل تھا۔ وہاں صرف معاہدات کا ایک نظام تھا۔ وہی قبائل کو جوڑتا تھا اور وہی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ دو قبیلوں میں اگر جنگ ہوگئی تو وہ ان قبیلوں تک ہی نہیں رہتی تھی بلکہ ان کے حلیف اور معاہد قبیلے میدان میں اُتر آتے تھے۔ اس طرح دو قبیلوں کی لڑائی دو تنظیموں (دو قبائلی گروپوں) کی لڑائی بن جاتی تھی۔

یثرب کے دو قبیلے اوس وخزرج کے افراد مسلمان ہوئے تھے ان کے بھی معاہدات تھے۔ یثرب کے قریب (بنو قریظہ۔ بنونضیر وغیرہ) یہود کے جو قبائل آباد تھے ان معاہدات میں شریک تھے۔ بنو قریظہ، قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔

ان معاہدات میں جس طرح دفاع کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ حملہ آور کا مقابلہ آپس کی متحدہ طاقت سے کریں گے اسی طرح یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر حلیف قبیلہ کا کوئی شخص کسی کو قتل کرے تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی۔

پنچایتی قسم کے کچھ قاعدے اصول متعارفہ کے طور پر رائج تھے جو عام طور پر تسلیم کئے جاتے تھے۔

ان کے بموجب قتل کی بعض صورتوں میں "قصاص" ہوتا تھا یعنی جان کے بدلے جان۔ بعض صورتوں میں جان کے بدلے میں جان نہیں بلکہ دِیَت لازم ہوتی تھی دیت کے سو اونٹ مقرر تھے دِیت اور بعض صورتوں میں "خون بہا" صرف قاتل یا قاتل کے اہل خانہ سے وصول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ قاتل کی سوسائٹی سے وصول کیا جاتا تھا۔ جس کو عاقلہ کہتے تھے۔ اس کی حدود ہوتی تھیں اس میں (سوسائٹی میں) قاتل کے قبیلے کے آدمی بھی ہوتے تھے۔ حلیف قبیلوں کو بھی اس میں شریک ہونا پڑتا تھا اور معاہدات میں یہ طے ہوتا تھا کہ اگر دیت لازم ہو تو کس قبیلہ کو کتنا دیت میں حصہ لینا ہوگا۔ ان شرائط کو جو قصاص۔ خون بہا اور دِیت کے متعلق ہوا کرتی تھیں ان کو "معاقل" کہا جاتا تھا۔

(۲)

قریشی حضرات جو ہجرت کرکے مدینہ آئے تھے ایک نیا عنصر تھے۔ اگرچہ حضرات انصار نے ان کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اور اس طرح مکی اور مدنی مسلمانوں کا ایک گروپ بن سکتا تھا، جو ایک نئی سیاسی اور مذہبی پارٹی کی حیثیت میں رونما ہوتا، مگر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صورت اختیار نہیں فرمائی۔

یہ گروپ ایک وزن رکھتا تھا اور اگر صرف سیاسی انقلاب مقصود ہوتا تو یہ گروپ کارآمد ہوسکتا تھا لیکن جس کا نصب العین دعوت الی اللہ تھا وہ اس جتھہ بندی کو پسند نہیں کرسکتا تھا۔

حضرات انصار یعنی قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے جو افراد مسلمان ہوئے تھے، انکے پورے قبیلے اور کنبے (بلکہ) مسلمان نہیں ہوئے تھے اور بہت سے وہ تھے کہ اُن کے گھر کے بھی سب آدمی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ سابق مذہب پر قائم تھے۔ اس طرح کی جتھہ بندی آپس میں تصادم اور مقابلہ کی شکل پیدا کردیتی جس کا نتیجہ فساد فی الارض اور قطع ارحام ہوتا جو اسلام میں بدترین جرم ہے۔

جتھہ بندی اور علیحدگی کے برخلاف رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاق واتحاد اور میل ملاپ کا راستہ اختیار کیا۔ آپ نے اس علاقہ کے تمام باشندوں میں خیر سگالی اور تعاون و امدادِ باہمی

کی رُوح پیدا کرنی چاہی۔ مواخات جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے اس کی پہلی کڑی تھی جس سے آپ نے مہاجرین اور انصار میں نہ صرف تعاون اور خیر سگالی کا رشتہ قائم کیا، بلکہ انصار اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنا دیا۔

یثرب میں ایک فرقہ مشرکین کا تھا جو قریش مکہ کا ہم مذہب تھا اور قریش مکہ اس کو آسانی سے اپنا آلۂ کار بنا سکتے تھے۔ دوسرا فرقہ یثرب کے قرب وجوار میں یہود کا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات مہاجرین کا رابطہ ان سے بھی قائم کر دینا چاہا۔

(۳)

مدینہ میں تشریف لانے کے بعد آپ نے جو کام سب سے پہلے کئے اُن میں تیسرا کام یہ تھا کہ آپ نے مہاجرین اور اُن تمام فرقوں میں بقاء باہم۔ تعاون اور خیر خواہی اور خیر اندیشی کا رشتہ قائم کرنے کے لئے ایک تحریر مرتب فرمائی اس کو عہد نامہ بھی کہہ سکتے ہیں اور ایک وفاق کا دستور اساسی بھی۔ قریش مکہ کی تمام کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے جس کامیابی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات مہاجرین مکہ سے نکل کر مدینہ تشریف لائے تھے اور یہاں ایک مرکز کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اس نے جس طرح قریش کو چراغ پاکر دیا تھا حتیٰ کہ انہوں نے فوراً ہی اس مرکز کو ختم کرنے کی سازش شروع کر دی تھی اس کا بھی تقاضا تھا کہ حضرات مہاجرین اور باشندگان یثرب ؒ مضافاتِ یثرب کے درمیان تعاون، تحفظ اور بقاء باہم کا عہد و پیمان ہو۔ اس عہد نامہ سے یہ تقاضا بھی پورا ہو رہا تھا۔

(۴)

اس عہد نامہ کا ایک فریق حضرات قریش میں جو ایمان و اسلام سے مشرف ہوئے اور ہجرت

ؒ چنانچہ اپنے ہم مشرب یعنی مشرکین مدینہ کو خط لکھا کہ مسلمانوں کو نکال دو یا اُن سے جنگ کرو، ورنہ ہم مدینہ پہنچیں گے اور تمہارے جوانوں کو قتل کریں گے عورتوں کی آبرو خراب کریں گے (ابوداؤد شریف باب خبر النضیر) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں جلد اوّل (قریش کی طرف سے یثرب میں مخالف محاذ)

کر کے مدینہ میں قیام پذیر ہوئے جن کو عہد نامہ میں المومنین والمسلمین من قریش سے تعبیر کیا گیا ہے
دوسرا فریق اہلِ یثرب ہیں (کسی مذہبی فرقہ کی بنا پر نہیں بلکہ باشندۂ یثرب کی حیثیت سے) ان میں
حضرات انصار کے علاوہ وہ بھی شامل ہیں جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اپنے کفر و شرک پر قائم
تھے۔ ان میں عبداللہ بن ابی بن سلول جیسے رؤسا بھی تھے جو کھلم کھلا[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اور اسلام کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

یہود بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع وغیرہ اہلِ یثرب نہیں ہیں۔ یہ قبائل یثرب سے باہر مضافات
یثرب میں آباد تھے۔ اہلِ یثرب (اوس اور خزرج) سے اُن کے معاہدات تھے۔ ان معاہدات کو
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر انداز نہیں فرمایا بلکہ ان کو مستحکم اور مضبوط کیا ہے۔ چنانچہ انہیں معاہدات
کے واسطہ سے ان کو اس عہد نامہ میں شامل فرمایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی فریق نہیں ہیں۔ آپ ایک سرپرست ہیں اور اس معاہدہ کے بانی
کی حیثیت سے آپ کو مرکزی شخصیت تسلیم کیا گیا ہے اور یہ طے کیا گیا ہے کہ باہمی نزاعات میں
آپ کی ذاتِ پاک مرجع ہوگی اور آپ کا فیصلہ آخری ہوگا۔

آپ کی یہ مرکزی حیثیت کسی مادی طاقت کی بنیاد پر نہیں ہے۔ انصار و مہاجرین کی مٹھی بھر
جماعت جو آپ کے ساتھ تھی یہ طاقت نہیں رکھتی تھی کہ مشرکین یثرب اور قبائل یہود کو اس پر مجبور کرتی
کہ وہ آپ کو مرکز اور مرجع تسلیم کریں۔ یہ آپ کی پُر تقدس شخصیت کا اعجاز تھا کہ مخالفین کے قلوب
بھی اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ آپ سے صرف سچائی، انصاف اور ہمدردی و خیر خواہی کی توقع
کی جا سکتی ہے۔ آپ جیسا شخص کاذب و ظالم نہیں ہو سکتا۔ آپ کی اسی مقبولیت نے جو چند روز
میں حاصل ہو گئی تھی آپ کو مرجع اور مرکز بنایا اور آپ کی اسی مقبولیت نے اُن کا بھی وزن بڑھا دیا[2]

---

[1] ملاحظہ ہو بخاری شریف ص۶۵۶ و ص۹۱۶ و ص۹۲۴ وغیرہ حدیث اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ جس میں تذکرہ ہے کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجمع کو خطاب فرمانا چاہا تو عبداللہ ابن اُبی بن سلول نے توہین آمیز انداز سے مخالفت کی۔

[2] جو تمام جہانوں کے لئے رحمت بن کر آیا وہ تو سب کا تھا۔ وہ کسی ایک کا کیسے ہو سکتا تھا۔

جو آپ کے جاں نثار تھے۔ پھر اس معاہدہ کے ایک ایک لفظ پر نظر ڈالئے کوئی بات بھی ایسی نہیں جس کا انکار کیا جا سکے سچائی، تقویٰ اور نیک کردار کی تاکید بار بار کی گئی ہے جس سے انکار کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سرپرستانہ حیثیت کے علاوہ (جو نزاع کے وقت مرجع بنے گی) اور کوئی اختیار آپ نے اپنے لئے منظور نہیں کرایا۔

دنیا کی تاریخ نے اس عہدنامہ کو یہ اہمیت دی ہے کہ اس کو اقدم دستور مسجل فی العالم۔ (دنیا میں بنیادی حقوق کی سب سے پہلی باقاعدہ دستاویز) بھی کہا گیا۔ لہٰذا ہم اس کو بجنسہٖ نقل کرتے ہیں۔ اُردو داں حضرات کی آسانی کے لئے ہر ایک فقرہ کے سامنے اس کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ فقروں کے شروع میں نمبر عہدنامہ میں نہیں ہیں۔ یہ مترجم کا اضافہ ہے تاکہ منشا اور مفہوم پوری طرح واضح ہو جائے۔ اس عہدنامہ کی حیثیت ابن ہشام نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

قال ابن اسحاق وکتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتابًا بین المہاجرین والانصار وادع فیہ یہود وعاہدہم و اقرہم علی دینہم واموالہم علیہم وشرط واشترط لہم

(ترجمہ) فن مغازی کے امام علامہ ابن اسحاق نے بیان فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کتاب (تحریر) لکھی۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان اس تحریر میں یہود سے بھی مصالحت کی صورت اختیار کی ان سے معاہدہ کیا اور ان کو اپنے دین پر قائم رکھا اور جو جائدادیں ان کی تھیں ان پر قائم رکھا کچھ شرطیں ان پر لگائیں اور کچھ شرطیں ان کے لئے تسلیم کیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
(۱) ھذا کتاب من محمد النبی رسول اللہ بین المؤمنین والمسلمین من قریش واھل یثرب ومن تبعہم	(۱) یہ تحریر ہے محمد اللہ کے نبی کی طرف سے جو اللہ کے رسول ہیں قریش کے مومنین و مسلمین اور اہل یثرب کے درمیان اور جو اُن کے تابع ہیں اور اُن سے الحاق کئے ہوتے ہیں۔ اور کوشش و جدوجہد

لہ نحوی قاعدہ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ جو اہل یثرب کے تابع اور اُن کے ساتھ ہیں (باقی بر صفحہ آئندہ)

فلحق بھم وجاھد معھم	میں اُن کے ساتھ ہیں[1]
(۲) اَنَّھُم اُمَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ دُوْنَ النَّاس	(۲) یہ کہ یہ سب (اپنے ماسوا) تمام انسانوں کے مقابلہ میں ایک اُمّت[2] ہوں گے۔
(۳) المھاجرون من قریش علی ربعتھم[3] یتعاقلون بینھم وھم نفدون عانیھم بالمعروف والقسط بین المسلمین	(۳) قریش کے وہ افراد جو ہجرت کرکے آئے ہیں۔ وہ اپنے حال پر بدستور رہیں گے (اُن کی آزادی اور اُن کے حقوق بدستور رہیں گے) قصاص وخون بہا اور دیت کے متعلق جو جو اُن کا دستور ہے اور جو اُن کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے ان کا کوئی شخص قید ہوگا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے (کوئی حلیف اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا) یہ تمام باتیں اس طرح ہونگی کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے گا۔
(۴) وبنو عوف علی ربعتھم	(۴) بنو عوف کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اسی عہد نامہ کے دوسرے حصہ میں یہود کا ذکر ہے اس میں یہود بنی النجار، یہود بنی الحارث وغیرہ کے الفاظ ہیں جن سے اسی کی تائید ہوتی ہے یعنی بنی النجار کے ساتھ جو یہود تھے نہیں یہود بنی النجار کہا گیا ہے باقی دوسری صورت کہ یہ معنے لیے جائیں کہ جو یہود مسلمانوں کے تابع ہیں وہ نحوی لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہے، اور عہد نامہ کے سیاق اور پرداخت کے بھی مخالف ہے، علاوہ ازیں جو یہود مسلمانوں کے ساتھ ہوں ان کو علیحدہ ایک فقرہ (۱۱) میں بیان کیا گیا ہے۔

[1] اس کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جہاد میں ان کے ساتھ رہے ہیں (مگر اب تک کوئی جہاد نہیں ہوا تھا اور جو لڑائیاں زمانۂ جاہلیت میں ہوتی تھیں وہ جہاد نہیں تھیں۔ خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر مبارک میں تو ان کے لئے جہاد کا لفظ آنا بہت ہی مستبعد اور خلافِ عقل ہے۔ واللّٰہ اعلم

[2] گروہ۔ قوم۔ جماعت۔ یعنی اگر مذہبی آزادی حاصل رہے تو مسلمان دوسری قوم یا گروہ کے ساتھ مل کر اُمّۃ واحدہ ہو سکتے ہیں۔ [3] رَبِعَتِہِم۔ کَعِبَتِہ ای حالۃ حسنۃ او امرھم الذی کانوا علیہ (قاموس)۔

یتعاقلون معاقلھم الاولیٰ وکل طائفۃٍ تفدی عانیھا بالمعروف والقسط بین المؤمنین	قصاص۔ خون بہا اور دیت کے متعلق جوان کا دستور ہے اور جوان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے۔ ان کا کوئی شخص قید ہو گا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے۔ یہ تمام باتیں اس طرح ہونگی کہ مسلمانوں کے ساتھ عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے گا۔

پھر اسی طرح قبائل بنوالحارث، بنوساعدہ۔ بنوجشم، بنوالنجار، بنوعمرو بن عوف۔ بنونبیت بنوالاوس کے نام لئے گئے ہیں اور ہر ایک قبیلہ کے نام کے ساتھ یہ صراحت کر دی گئی ہے جو مہاجرین اور بنوعوف کے لئے کی گئی ہے کہ اُن کی آزادی اور ان کے حقوق بدستور رہیں گے۔ قصاص خون بہا اور دیت کے متعلق جوان کا دستور ہے اور جوان کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے۔ اُن کا کوئی شخص قید ہو جائے گا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے۔ یہ تمام باتیں اس طرح ہوں گی کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے گا۔

(۵) ان المومنین لایترکون مفرجاً[1] ان یعطوہ بالمعروف فی فداء اوعقل	(۵) یہ کہ مسلمان کسی ایسے شخص کو جو قرض میں دبا ہوا کثیرالعیال ہو اس بات سے نہیں چھوڑیں گے (محروم نہیں کریں گے) کہ اس کو اچھی طرح عطیہ دیں۔ فدیہ یا دیت کے سلسلہ میں۔[2]
(۶) وان لایحالف مومن مولی	(۶) اور یہ کہ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہو گا کہ وہ کسی مسلمان کو نظرانداز کر کے اس کے حلیف سے معاہدہ

[1] المفرج المثقل من الدین الکثیر والعیال (ابن ہشام ص ۲۰۲ ج ۱)

[2] یعنی اگر کوئی مقروض اور کثیرالعیال مسلمان ہو اور اس پر کسی سلسلہ میں فدیہ یا دیت لازم ہو جائے تو مسلمانوں کو حق ہو گا کہ وہ اچھی طرح اس کی امداد کریں اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو عام مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس امداد کا حق ہو گا اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں ہو گا (واللہ اعلم)

مومن دونہ	کرلے (جو مسلمان پہلے سے حلیف ہے اس کو بھی اس معاہدہ اور عہدوپیمان میں شریک رکھنا ہوگا)
(۷) وان المومنین المتقین ایدیھم علی کل من بغی منھم اوابتغٰی[1] دسیعۃ ظلم ۔ اواثم او عدوان او فساد بین المومنین وان ایدیھم علیہ جمیعًا ولوکان ولد احدھم	(۷) اور یہ کہ اہل تقویٰ مومنین سب کی طاقت متحد رہے گی اس شخص کے مقابلہ میں جو ان سے بغاوت کرے (اُن پر ظلم وزیادتی کرے) یا ظالمانہ طریقہ پر اُن سے وصول کرنا چاہے یا مسلمانوں کے آپس میں گناہ ظلم یا فساد پھیلانا چاہے۔ ایسے شخص کے مقابلہ میں ان کی طاقت متحد رہے گی۔ خواہ (وہ ظالم) کسی کا اپنا لڑکا ہی ہو۔
(۸) ولا یقتل مومن مومنا فی کافر ولا ینصر کافر علی مومن۔	(۸) یہ کہ کوئی مومن کسی مومن کو کسی کافر کی حمایت[2] میں قتل نہیں کرے گا۔ نہ کسی کافر کی کسی مومن کے مقابلہ میں مدد کی جائے گی۔

---

[1] ای ابتغٰی منھم ان یدفعوا الیہ علی وجہ ظلمھم ای کونھم مظلومین (مجمع البحار)

[2] حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ مکہ کے مشہور رئیس، دشمن اسلام امیہ بن خلف سے کاروباری سلسلہ میں معاہد ہو گئے ہوئے تھے۔ غزوۂ بدر میں حضرات انصار نے امیہ بن خلف کا تعاقب کیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس کو بچانا چاہا اس میں خود ان کے بھی تلوار لگ گئی اور زخمی ہو گئے۔ مگر مجاہدین انصار نے امیہ کو قتل کر ہی دیا بخاری شریف صفحہ ۳ اب اگر امیہ کے حامی ان انصار سے قتل امیہ کا بدلہ لینا چاہتے (جیسا کہ قاعدہ تھا بلکہ ضروری سمجھا جاتا تھا) اور اس سلسلہ میں معاہدہ کی بنا پر یا کسی اور تعلق کی بنا پر حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ سے مدد چاہتے تو معاہدہ کی اس دفعہ کے بموجب حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کیلئے جائز نہ تھا کہ وہ حامیان امیہ بن خلف کی امداد کرتے۔ اس دفعہ کے معنی یہ بھی لئے گئے ہیں کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو کسی کافر کے مقابلہ میں قتل کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ مگر اس مفہوم کے لئے لفظ "بکافر" ہونا چاہیئے تھا۔ یہاں "فی کافر" ہے (باقی برصفحہ آئندہ)

(۹) وان ذمۃ اللہ واحدۃ یجیر علیھم ادناھم

۹۔ یہ کہ اللہ کی ذمہ داری (پناہ) ایک ہے (یعنی اللہ کے نام پر جو ذمہ داری لی جائیگی اس کا احترام تمام مسلمانوں پر لازم ہوگا) پناہ دے سکتا ہے مسلمانوں کی ذمہ داری پر سب سے معمولی درجہ کا مسلمان بھی۔[۱]

(۱۰) وان المومنین بعضھم مولی بعض دون الناس

(۱۰) اور یہ کہ ہر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا ولی ہوگا معاہدہ صلح و جنگ میں شریک ہوگا یہ ولایت غیر مسلم کو حاصل نہیں ہوگی۔

(۱۱) وانہ من تبعنا من یھود فان لہ النصر والاسوۃ غیر مظلومین ولامتناصر علیھم

(۱۱) اور یہ کہ جو یہودی ہمارے ساتھ ہوں گے ان کی مدد کی جائے گی ان کے ساتھ ہمدردی کی جائے گی وہ مظلوم نہیں ہوں گے۔ نہ ان کے ساتھ انتقامی کاروائی کی جائے گی۔[۲]

(۱۲) وان سلم المؤمنین واحدۃ لا یسالم مومن دون مومن فی قتال فی سبیل اللہ الا علی سواء

(۱۲) اور یہ کہ مسلمانوں کی صلح ایک ہے کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے بغیر قتال فی سبیل اللہ (راہ خدا میں جنگ) کے سلسلہ میں صلح نہیں کر سکتا مگر اس صورت میں کہ مساوات ہو اور آپس میں پوری طرح انصاف ہو جب کسی معمولی مسلمان کے عہد و پیمان کو بھی یہ اہمیت ہے کہ وہ سب مسلمانوں کا عہد و پیمان مانا جاتا ہے تو مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ صلح یا عہد و پیمان ایسی صورت سے کرے جس میں حقوق کی مساوات اور سر بسر عدل و انصاف ہو۔ اگر اس میں کوتاہی کی ہے تو صرف

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: "فی کافر" کی صورت میں معنی وہی ہو سکتے ہیں جو ترجمہ میں لکھے گئے۔ علاوہ ازیں میدان جنگ یا دار الحرب میں تو بیشک یہی ہے۔ مگر دار الاسلام میں یہ حکم نہیں ہے ہاں اگر مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہی ہے کہ مسلمان کو ذمی کافر کے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

[۱] یعنی اگر معمولی درجہ کا مسلمان جو ذمہ دارانہ حیثیت نہیں رکھتا۔ نہ افسر ہے نہ عہدہ دار عام مسلمانوں میں سے ایک ہے وہ بھی کسی غیر مسلم کو پناہ دیدے یا اس سے کوئی معاہدہ کرے تو تمام مسلمانوں پر اس کی پابندی ضروری ہوگی۔

[۲] یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے برخلاف ان کے مخالفین کی مدد نہیں کی جائے گی۔

وعدل بینھم — اپنے حق میں نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے حق میں کو تاہی تھے واللہ اعلم)

(۱۳) وان کل غازیۃ غزت معنا یعقب بعضھا بعضا[۲] — (۱۳) اور یہ کہ مجاہدین (غازیوں) کی جو جماعت ہمارے ساتھ (ہمارے نظام کے ماتحت) غزوہ کرے گی اس کا غزوہ نمبروار ہوگا۔ ایک ہی جماعت (فوج) مسلسل نہیں جائے گی بلکہ اگر ایک مرتبہ جا چکی ہے تو اب دوسری جماعت جائے گی۔ اس کے بعد اپنے نمبر پر یہ جا سکے گی۔

۱۴۔ وان المؤمنین یبیئ بعضھم بعضا بما نال دماءھم فی سبیل اللہ — (۱۴) اور یہ کہ مسلمان ایک دوسرے کے برابر ہوگا اس (امتحان کی بنا پر جو پیش آیا ہوگا اُن کے خونوں کو اللہ کی راہ میں یعنی جانی قربانی معیار ہے فرق مراتب اسی معیار پر ہوگا۔ جن کی قربانیاں مساوی ہیں ان کا درجہ بھی مساوی ہوگا۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ قبائل میں جو فرق مراتب[۳] پہلے تھا اب[۱] قابل تسلیم نہیں ہوگا جب تک قربانیاں بھی اس درجہ کی نہ ہوں۔

---

[۱] اس کے باوجود افسر اعلیٰ کو مسترد کرنے کا حق نہیں ہے وہ مسترد اس وقت کر سکتا ہے۔ جب ایسا عہد و پیمان ہو جس میں سراسر معصیت ہے۔ کسی حرام کو جائز یا حلال کو حرام قرار دے دیا گیا ہو۔ تفصیلات کتب فقہ میں ہیں۔ [۲] ای یکون الغزوۃ بینھم نوبا فاذا خرجت طائفۃ ثم عادت لم تکلف ان تعید ثانیۃ حتی یعقبھا اخری غیرھا (مجمع البحار تحت کلمۃ عقب) [۳] چنانچہ پہلے قبائل بنی تمیم۔ بنی اسد۔ بنی عامر افضل مانے جاتے تھے اور ان کے مقابلہ میں قبائل جھینہ مزینہ۔ مسلم اور غفار کا درجہ کم تھا۔ مگر چونکہ یہ قبائل پہلے ہی اسلام سے مشرف ہوتے اور حضرات انصار و مہاجرین کے ساتھ خدمات انجام دیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ نے ان کی فضیلت بیان فرمائی ارشاد ہوا قریش و الانصار وجھینہ ومزینہ واسلم وغفار واشجع میرے مددگار ہیں اور اللہ اور رسول انکے مددگار ہیں۔ اللہ اور رسول کے علاوہ ان قبائل کا اور کوئی مددگار نہیں ہے بخاری شریف باب ذکر اسلم وغفار ومزینہ وجھینہ واشجع ص ۴۹۹۔

(۱۵) وانّ المومنین المتقین علی احسن ھدی و اقومہ۔	(۱۵) اور یہ مومن متقی بہت بہتر طور و طریق اور نہایت مضبوط اصول پر قائم رہیں گے (اہل ایمان اور اہل تقویٰ کا فرض ہوگا کہ اُن کے اطوار بہتر اور ان کے اصول و اخلاق مضبوط ہوں)
(۱۶) وانہ لایجیر مشرک مالا لقریش ولا نفسا ولا یحول دونہ علی مومن	(۱۶) اور یہ کہ کوئی مشرک قریش کے کسی مال کی ذمہ داری نہیں لے گا نہ کسی قریشی کی جان کی ضمانت کریگا (پناہ دیگا) نہ کسی قریشی کی حمایت میں کسی مسلمان کے آڑے آئے گا۔
(۱۷) وانہ من اعتبط مومنا قتلا عن بینۃ فانہ قود بہ الا ان یرضی ولی المقتول بالعقل وان المومنین علیہ کافۃ ولا یحل لھم الا قیام علیہ	(۱۷) جو شخص کسی بے قصور مسلمان کو قتل کر دیگا جس کا بینہ (باقاعدہ شہادت) موجود ہو تو اس کے قصاص میں ماخوذ ہو گا (جان کے بدلہ جان دینا ہو گا) البتہ اگر مقتول کے وارث خون بہا پر راضی ہو جائیں تو خون بہا دینا ہو گا اور تمام مسلمانوں کو جماعتی حیثیت میں اس اصول کو نافذ کرنا ہو گا جب تک اس پر عمل نہ ہو جائے کسی اور کام میں مشغول ہو جانا مسلمانوں کیلئے درست نہ ہو گا۔
(۱۸) انہ لا یحل لمومن اقر بما فی ھذہ الصحیفۃ وآمن باللہ والیوم الآخر ان ینصر محدثاً[۱] او یؤویہ وانہ	(۱۸) اور یہ کہ جائز نہیں ہو گا کسی صاحب ایمان کیلئے جو اس دستاویز کے مضمون کا اقرار کرے اور جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے کہ کسی فتنہ پرداز کی مدد کرے یا کسی فتنہ اٹھانے والے کو پناہ دے (اپنے یہاں ٹھہرائے) اور جو اس کی مدد کرے گا اور اس کو پناہ دے گا (ٹھیرنے کا موقع دیگا)

۱؎ محدثا۔ دال پر زیر جنایت کرنے والا (مجمع البحار) یہ کوئی فتنہ اٹھانے والا۔ سازش کرنے والا بھی ہو سکتا ہے اور بدعتی یعنی کسی بدعت کا ایجاد کرنے والا بھی ہو سکتا ہے اور اگر دال پر زبر ہو۔ تو مراد فتنہ یا بدعت ہو گی اور یہ مطلب ہو گا کہ کسی صاحب ایمان کے لئے جائز نہیں ہو سکتا کہ کسی فتنہ کو پسند کرے اور اس کو بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دے۔ وایواءہ الرضا عنہ والصبر علیہ واقرار فاعلہ (مجمع البحار)

من نصرہ او اواہ علیہ لعنۃ اللہ وغضبہ یوم القیمۃ لا یوخذ منہ صرف ولا عدل

اس پر اللہ کی لعنت۔ خدا کا غضب۔ قیامت کے روز نہ اس کی توبہ قبول ہو نہ فدیہ (کفارہ)[1]

(۱۹) وانکم مہما اختلفتم فیہ من شیءٍ فان مردہ الی اللہ والی محمد

(۱۹) اور یہ کہ جب بھی اس عہدنامہ کی کسی بات میں اختلاف کرو تو مرجع اللہ ہوگا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) (اس کا فیصلہ ذات اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ ہوگا جو اس عہدنامہ کے بانی اور معاہدہ کرنے والوں کے سرپرست ہیں اور آپ سے ہی فیصلہ کی اپیل ہوگی)۔

(۲۰) وان الیہود ینفقون مع المومنین ماداموا محاربین

(۲۰) جب تک کسی جنگ کا سلسلہ رہے تو مصارف جنگ مسلمانوں کے ساتھ یہود کو بھی برداشت کرنے ہوں گے۔

(۲۱) وان یہود بنی عوف امۃ مع المومنین للیہود دینہم وللمسلمین دینہم۔ موالیہم و انفسہم الا من ظلم او اثم فانہ لا یوتغ الا نفسہ و اھل بیتہ۔

(۲۱) اور یہ کہ بنی عوف کے یہودی اور مسلمان ایک امت ہونگے۔ یہود کیلئے ان کا دین ہوگا اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین (اپنے اپنے مذہبوں میں آزاد رہتے ہوئے تیسرے کے مقابلہ میں ایک متحدہ طاقت ہونگے) اور جو ان کے موالی ہیں (آزاد کردہ غلام یا ان کے حلیف) اور وہ خود۔ ان سب کے لئے یہی ہے (کہ وہ اپنے دین پر) مگر وہ شخص جو ظلم کرے۔ کیونکہ ایسا شخص خود اپنے آپ کو اور اپنے اہل بیت (متعلقین) ہی کو برباد کرے گا (اس بربادی کی ذمہ داری خود اس پر ہوگی)

(۲۲) وان الیہود بنی النجار

(۲۲) یہود بنی نجار کے لئے بھی وہی شرطیں اور وہی حقوق ہیں

---

[1] یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ نہ اس کی نفل عبادت قبول ہو نہ فرض (مجمع البحار)

مثل مالیھود بنی عوف — جو یہود بنی عوف کے بیان کئے گئے۔

(۲۳) اس کے بعد یہود بنی الحارث۔ یہود بنی ساعدہ۔ یہود بنی جشم۔ یہود بنی الاوس۔ یہود بنی ثعلبہ کا نام لیا گیا ہے اور ہر ایک کے متعلق یہ الفاظ دہرائے گئے ہیں۔ مثل مالیھود بنی عوف۔ ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنی عوف کے حقوق ہیں۔

آخر میں یہ ہے۔

الا من ظلم او اثم	مگر وہ شخص جو ظلم کرے یا کوئی جرم کرے کیونکہ ایسا شخص خود اپنے
فانہ لا یوتغ الا	آپ کو اور اپنے اہل بیت (متعلقین) کو برباد کر دیگا (اس بربادی
نفسہ واھل بیتہ	کی ذمہ داری خود اس پر ہوگی)

(۲۴) پھر یہ چند تشریحی اور توضیحی دفعات ہیں:

(الف) وان جفنۃ بطن من ثعلبۃ	(الف) یہ کہ جفنہ ثعلبہ کا بطن (ضمنی قبیلہ) ہے
(ب) وان لبنی الشطیبۃ مثل	(ب) یہ کہ بنی شطبہ کے وہی حقوق ہیں جو یہود بنی عوف کے (تسلیم
مالیھود بنی عوف و	کئے گئے) اور یہ کہ ہر نیکی اور بھلائی نصب العین اور حصول کار
ان البر دون الاثم	ہوگا گناہ اور جرم نہیں۔
(ج) وان موالی ثعلبۃ	(ج) قبیلہ ثعلبہ کے موالی (حلیف آزاد کردہ غلام) کی حیثیت
کانفسھم	خود بنی ثعلبہ جیسی ہوگی۔
(د) وان بطانۃ[1]	(د) یہود کے اہل و عیال ان کے خواص اور ماتحت خاندانوں
یھود کانفسھم	اور افراد کی حیثیت خود یہود جیسی ہوگی (ان کے وہی حقوق
	ہوں گے جو یہود کے ہیں)
(ہ) وانہ لا یخرج منھم احد	(ہ) اور یہ کہ جو جس کے ماتحت یا جس کے ساتھ ہے وہ اس سے
الا باذن محمد	علیحدہ نہیں ہوگا مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت سے

[1] بطانۃ الرجل اھلہ وخاصتہ وصاحبہ (قاموس)

(۲۵) وانہ لا ینحجز علی ثار جرح۔

(۲۵) اور یہ کہ نہیں بندش لگائے گا کوئی زخم کے قصاص (زخم کے بدلے میں زخم) پر۔[1]

(۲۶) وانہ من فتك فبنفسہ واھل بیتہ الا من ظلم وان اللہ علی ابر ھذا

(۲۶) جو کسی کو بے خبری میں دھوکے سے مار دے اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے اور اس کے اہل بیت پر مگر وہ شخص جس نے ظلم کیا ہو اور ہم اللہ کو حاضر ناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ خوبی اور پوری ذمہ داری کے ساتھ ان شرائط پر عمل کریں گے۔

(۲۷) وان علی الیھود نفقتھم وعلی المسلمین نفقتھم

(۲۷) اور یہ کہ یہود اپنے مصارف کے ذمہ دار ہوں گے اور مسلمان اپنے مصارف کے (جو اس عہد نامے کی شرطوں کو پورا کرتے ہیں، کرنے پڑیں گے)

(۲۸) وان بینھم النصر علی من حارب اھل ھٰذہ الصحیفۃ۔

(۲۸) اور یہ کہ جو فریق اس معاہدہ میں شریک ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے ان کے مقابلہ میں جو ان معاہدہ کرنے والوں سے جنگ کریں گے۔

(۲۹) وان بینھم النصح والنصیحۃ والبر دون الاثم۔

(۲۹) اور یہ کہ اس معاہدہ کے تمام فریق آپس میں ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں گے ایک دوسرے کو اچھی باتوں کی ہدایت کریں گے، نیک کردار رہیں گے جرم اور گناہ نہیں کریں گے۔

وانہ لا یاثم امرؤ بحلیفہ

اور یہ کہ کوئی شخص اپنے حلیف کے ساتھ مجرمانہ فعل نہیں کریگا

وان النصر للمظلوم۔

اور یہ کہ مظلوم مستحقِ مدد ہوگا۔

(۳۰) وان الیھود ینفقون مع المؤمنین ما داموا محاربین

(۳۰) اور یہ کہ جب تک کوئی جنگ ہو گی تو مسلمانوں کے ساتھ یہود بھی حربیہ جنگ برداشت کریں گے۔

(۳۱) وان یثرب حرام جوفھا

(۳۱) اور یہ کہ وہ پورا علاقہ جو حدود یثرب میں ہے ان سب کے لئے

---

[1] جب کہ توریت کا حکم تھا کہ زخم کے بدلہ میں ویسا ہی جیسا زخم۔ اس اصول کو ختم نہیں کیا جائے گا۔

لا هل هذه الصحيفة

واجب الاحترام (محفوظ علاقہ) ہوگا۔ جو اس عہد نامہ میں شریک ہیں۔

(۴۲) وان الجار كالنفس غير مضار ولا اثم

(۴۲) اور یہ کہ پڑوسی کو خود اپنی جان کی برابر سمجھا جائیگا نہ اس کو نقصان پہنچایا جائیگا نہ اس کے ساتھ کوئی مجرمانہ فعل کیا جائے گا۔

(۴۳) وانه لا تجار حرمة الا باذن اهلها

(۴۳) اور یہ کہ نہیں حفاظت اور پناہ میں لیا جائے گا کسی خاتون کو مگر اس کے اہل (ذمہ دار) کی اجازت سے[1]۔

(۴۴) وانه ما كان بين اهل هذه الصحيفة من حدث او اشتجار يخاف فساده فان مرده الى الله والى محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم وان الله على اتقى ما فى هذه الصحيفة وابره

(۴۴) اور یہ کہ اس عہد نامہ کے فریقوں کے درمیان جو کوئی نئی بات پیش آئے یا کوئی نزاع ہو جس سے فساد کا خطرہ ہو تو اس میں اللہ اور محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کیا جائے گا اور یہ کہ ہم سب اللہ کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ جو کچھ اس عہد نامہ میں ہے اس کی پوری پابندی کریں اور اس کو نیکی اور بھلائی کے ساتھ پورا کریں گے۔

(۴۵) وانه لا تجار قريش ولا من نصرها۔

(۴۵) اور یہ کہ نہ قریش کو پناہ دی جائے گی نہ اس کو جو قریش کی مدد کرے۔

(۴۶) وان بينهم النصر على من دهم[2] يثرب

(۴۶) اور یہ کہ اس عہد نامہ کے تمام شریک ایک دوسرے کی مدد کریں گے اس کے مقابلہ میں جو یثرب پر چڑھ آئے (حملہ کرے)

(۴۷) وانه اذا دعوا الى صلح يصالحونه ويلبسونه فانهم يصالحونه ويلبسونه وانهم اذا دعوا الى مثل ذالك فانه

(۴۷) اور یہ کہ اس عہد نامہ کے جملہ فریق جب (مسلمانوں کی طرف سے) ان کو کسی کے ساتھ صلح کرنے کی دعوت دی جائے گی وہ صلح کریں گے اور صلح پر عمل کریں گے اور یہ کہ جب مسلمانوں کو اسی جیسی صلح کی دعوت

---

[1] مکہ کے مشرکین قریش اس معاہدہ میں داخل نہ تھے۔ لہٰذا جب صلح حدیبیہ کے بعد ان کی عورتیں مسلمان ہو کر مدینہ منورہ پہنچیں تو ان کو پناہ میں لے لیا گیا۔ [2] دهمك غشيك (القاموس)

لهم على المؤمنين الا من محارب في الدين۔

دی جائے تو وہ بھی صلح کریں گے مسلمانوں پر یہ انکا حق ہوگا مگر یہ کہ کسی سے دین کے بارے میں جنگ ہو رہی ہو (مذہبی جنگ ہو)۔

(۳۸) على كل اناس حصتهم من جانبهم الذي قبلهم

(۳۸) اور یہ کہ ہر فریق پر اس حصہ کی ذمہ داری ہے جو اس کی جانب میں ہے۔

(۳۹) وان يهود الاوس مواليهم وانفسهم على مثل ما لاهل هذه الصحيفة مع البر المحض من اهل هذه الصحيفة وان البر دون الاثم لا يكسب كاسب الا على نفسه وان الله على اصدق ما في هذه الصحيفة وابره۔

(۳۹) اور یہ کہ قبیلہ اوس کے یہودان کے موالی (حلیف یا آزاد کردہ غلام) ان کو وہی حقوق ہوں گے جو اس عہد نامہ کے تمام فریقوں کو ہوں گے، پوری نیک کرداری اور مخلصانہ بھلائی کے ساتھ نیک کرداری ہی ہمارا اصل اصول ہوگا۔ مجرمانہ فعل سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، ہر ایک عمل کرنے والا اپنے عمل کا ذمہ دار ہوگا اس کے فعل کو کسی دوسرے پر نہیں ڈالا جا سکے گا) اور اللہ تعالیٰ کو ہم حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ جو کچھ اس دستاویز میں لکھا گیا ہے اس پر پوری سچائی سے اور نیک کرداری کے ساتھ عمل کریں گے۔

(۴۰) وانه لا يحول هذا الكتاب دون ظالم واثم وانه من خرج امن ومن قعد امن بالمدينة الا من ظلم واثم وان الله جار لمن بر واتقى ومحمد رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

(۴۰) اور یہ کہ یہ تحریر کسی ظالم اور مجرم کے لئے آڑ نہیں بنے گی۔ جو مدینہ سے باہر ہو وہ بھی امن میں اور جو اندر رہے وہ بھی امن میں رہے گا۔ مگر یہ کہ وہ ظلم کرے یا مجرمانہ حرکت کرے، اللہ تعالیٰ اس کا محافظ ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے محافظ ہیں۔ جو نیک کردار رہ کر پوری پابندی کے ساتھ اس پر عمل کرے۔

تحویل قبلہ انقلاب عظیم

سب سے افضل امت۔ سب سے افضل قبلہ

جھنڈا قوم بناتی ہے۔ کسی قوم کی قومیت جھنڈے سے نہیں بنتی! البتہ جھنڈا نشان قومیت بن جاتا ہے۔ جھنڈے کے رنگ یا وضع قطع کا کوئی فطری تعلق قوم کی فطرت سے نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ روایات کا لحاظ وضع اور رنگ کے انتخاب کے وقت رکھا جاتا ہے۔ پھر وہ جھنڈا خود بیکر روایت اور نشانِ عظمت بن جاتا ہے۔ اس کی سربلندی یا سرنگونی قسمتِ قوم کا فیصلہ سمجھی جانے لگتی ہے۔

تقریباً یہی شان عبادت اور عبادت کرنے کے رُخ "قبلہ" کی ہے۔ عبادت یعنی بندگی نیازمندی عاجزی اور فروتنی کا تعلق، اندرونی احساس اور قلب وضمیر سے ہے۔ نہ پورب[1] سے ہے نہ پچھم سے نیکی[2] اور بھلائی شرافت۔ حسنِ اخلاق اور خوبی کردار کا نام ہے۔ نیکی یہ نہیں ہے کہ مشرق کی طرف منہ کرلیں یا مغرب کی طرف مگر ہر ایک عبادت گذار حتیٰ کہ وہ بھی جو مانتا ہے کہ جس کی وہ عبادت کر

---

[1] ارشاد خداوندی ہے۔ للہ المشرق والمغرب الآیۃ۔ اللہ ہی کا ہے پورب اور اللہ ہی کا پچھم جس طرف بھی رُخ کرلو۔ وہاں اللہ ہے۔ آیت ۱۱۴ سورہ ۲ بقرہ۔

[2] لیس البران تولوا (الآیۃ) یعنی نیکی (اور بھلائی) یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے پھیرلو۔ پورب کی طرف یا پچھم کی طرف ہاں۔ نیکی اور بھلائی اور حسن کردار اس کا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔ فرشتوں پر۔ کتب (وحی الٰہی) پر اور نبیوں پر (پھر اس ایمان کے تقاضے کو پورا کیا کہ جب کہ مال کی ضرورت تھی کہ وہ تندرست تھا (دنیاوی زندگی کا میدان اس کے سامنے تھا، اس نے اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر) دیا۔ مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو مسکینوں کو اور مسافر کو اور سائلین کو اور گردنوں کے (چھڑانے) میں اور برپا کیا نماز کو (پوری شان کے ساتھ نماز با جماعت ادا کی) زکوٰۃ ادا کی اور وہ جو پورا کریں عہد جب عہد کرلیں اور جو صبر کرنے والے ہیں سختی اور شدت میں اور خوف وہراس کے وقت (آیت ۱۷۷ سورہ ۲ بقرہ)

رہا ہے وہ کسی ایک رُخ یا کسی ایک جگہ میں نہیں ہے، وہ لامکان ولازمان ہے۔ ہر جگہ ہے اور ہر طرف ہے) عبادت کے لیئے ایک رُخ مقرر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ جس طرح عمل کی پابندی کے لیئے وقت کا مقرر کرنا ضروری ہے ایسے ہی دل کے جماؤ اور توجہ کے ٹھہراؤ کے لیئے بھی رُخ کا مقرر کرنا ضروری ہے اور افراد قوم میں یکجہتی بھی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب سب کی عبادت ایک ہی طرح ایک ہی رُخ پر ہو۔[1]

مکہ کے مشرک اگرچہ سرنیاز بتوں کے سامنے خم کرتے تھے۔ مگر ان کے تحت الشعور میں یہ تھا کہ اُن کا قبلہ "کعبہ" ہے جس کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام نے رکھی تھی، جس کی تجدید حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور ان کے فرزند رشید حضرت اسماعیل علیہ السّلام نے کی۔ جو ہمارے مذہبی پیشوا بھی ہیں اور خاندانی مورث اعلیٰ بھی۔

اہل شرک اور بُت پرستوں کے بالمقابل اہل کتاب (یہودی اور نصرانی) تھے جن کا قبلہ بیت المقدس یا بیت اللحم تھا۔ سیّدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کے لیئے اٹھے تو اگرچہ کعبہ کو آپ نے نظر انداز نہیں فرمایا۔ مگر آپ نے قبلہ اس کو بنایا جو تقریباً ڈھائی ہزار سال سے انبیاء علیہم السلام کا قبلہ چلا آرہا تھا، حرم کعبہ میں آپ نماز پڑھتے تو کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر رُخ شمال کی طرف کرتے تھے۔ یعنی وہ قبلہ بھی آپ کے سامنے رہتا تھا جو آل اسماعیل علیہ السّلام کا قبلہ تھا اور وہ قبلہ بھی سامنے ہوتا جو بنی اسرائیل کا قبلہ تھا۔ لیکن جب آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو یہاں یہ اجتماع قبلتین ممکن نہیں تھا، کیونکہ مکہ یہاں سے جنوب میں تھا اور بیت المقدس شمال میں۔ لامحالہ آپ نے انبیاء علیہم السّلام کے ڈھائی ہزار سالہ قبلہ ہی کو اختیار فرمایا۔ چنانچہ مسجد کی تعمیر کی تو اسی دیوار کو دیوار قبلہ قرار دیا جو بیت المقدس کی جانب تھی (شمالی دیوار)

لیکن سوال یہ تھا کہ اس دین کے لیئے جو حق و باطل کے لیئے فرقان عظیم ہے خالص اور نکھری ہوئی توحید جس کی بنیاد ہے۔ جس کی تعلیم میں یہ قوت ہے کہ کبھی اس کے منسوخ کرنے کی

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی رحمۃ اللہ عرف تفسیر کبیر۔

ضرورت پیش نہیں آسکتی جو ابدالآباد تک باقی رہنے والا کامل و مکمل دین ہے اس کا قبلہ بھی بیت المقدس رہے جو اہل شرک کا قبلہ تو بیشک نہیں ہے، مگر جو اس سے وابستہ ہیں وہ خود اتحاد اور یک جہتی سے محروم دو ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہودی اور عیسائی (ہر ایک ٹکڑی دوسرے کی تردید کر رہی ہے اور جہاں تک اخلاق و کردار کا تعلق ہے تو اخلاق و کردار میں اہل شرک کے ہم دوش ہیں، بلکہ کچھ آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ قتل انبیاء کے دھبے بھی ان کے دامن پر نمایاں ہیں۔

اور اگر قبلہ بدلا جاتا ہے تو قبلہ کا مسئلہ صرف ایک رخ کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک مرکز کا مسئلہ بھی ہے۔ حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السّلام کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور تک۔ حق پرستی۔ توحید۔ دعوت الی اللہ۔ ہدایت وارشاد یعنی مذہبی اور روحانی رہنمائی کا فریضہ بنو اسرائیل کے سپرد رہا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بیشمار انعامات اُن پر ہوتے رہے بنو اسرائیل کا دینی مرکز بیت المقدس تھا۔ اب سوال یہ بھی تھا کہ دعوت وارشاد کی مرکزیت۔ جس کو اصطلاحاً امامت اور خلافت الٰہیہ کہا جاتا ہے۔ کیا اسی قوم کے سپرد رہے گی یا اس میں تبدیلی ہوگی۔ اگر تبدیلی ہوگی تو کیوں۔ اور تبدیلی کے بعد جس قوم کو یہ امامت سپرد ہوگی تو کیا اس کا قبلہ بھی یہی رہے گا یا اس کو بھی بدلا جائے گا اور اگر بدلا جائے گا تو کیوں؟

ان سوالات کے جوابات عقل و قیاس یا جذبات کی منطق سے نہیں دیئے جا سکتے تھے۔ کیونکہ کسی فرد یا قوم کو امامتِ نوعِ انسان کا درجہ خدا ہی کی طرف سے سپرد ہوتا ہے اور یہ کہ خدا پرست پرستش کے وقت اپنا رُخ کس طرف کریں یہ بھی وہی بتا سکتا ہے جس کی خوشنودی کے لئے پرستش کی جاتی ہے لیکن ایک سربراہ کو انقلاب کے موقع پر جب مختلف سوالات (اور خصوصاً جب ایسے سوالات درپیش ہوں جن کا تعلق خود انقلاب اور مقصد انقلاب سے ہو) جو تردد اور تشویش ہو سکتی ہے اس سے کہیں زیادہ تردد اس ہادیٔ اعظم کو درپیش تھا جو اس لئے دنیا میں آیا تھا کہ طالبانِ حق کو ہدایت وارشاد کی آخری منزل طے کرائے اور ان کے لئے ایسا راستہ معین کر دے کہ زمانہ کی کوئی بھی گردش اس میں کجی یا ناہمواری پیدا نہ کر سکے۔ اسی لئے وہ بار بار اس سمت کی طرف نظر اٹھاتا

جس سمت سے عقدہ کشائی کی توقع تھی۔ ہادیٔ برحق کے تردد کا عکس اُن پر بھی پڑ رہا تھا جو اس کے ساتھ اس لئے وابستہ ہوئے تھے کہ ذہنی تشویش و تردد کو اطمینان سے بدلیں اور وہ نور حاصل کریں جو نہ صرف دنیا کی تاریکیوں میں بلکہ ظلماتِ محشر میں بھی اُن کے لئے شمع راہ ہو۔

اشارے چند سال پہلے محمد رسول اللہ علیہ وسلم کو وہ شرف اعظم حاصل ہو چکا تھا جو نہ صرف نوع انسان بلکہ حق یہ ہے کہ پوری کائنات میں نہ آج تک کسی کو میسر آیا تھا نہ آئندہ آنے والا تھا۔ یعنی آپ شبِ معراج میں اس بلند ترین مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں تک نہ کسی نبیِ مرسل کی رسائی ہوئی تھی نہ کسی مَلکِ مُقرب کی۔ جبرئیل امین علیہ السلام اس سے بہت نیچے درماندہ رہ کر یہ معذرت کر چکے تھے۔

اگر یک سر موئے بالا پرم   فروغ تجلّی بسوزد پرم

اس عروج و سیر میں آپ نے بیت معمور ملاحظہ فرمایا تھا جس کے گرد ہر روز ستر ہزار فرشتے مصروف طواف ہوتے ہیں[۱]۔ وہیں بانی ملت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی کہ آپ بیت معمور سے تکیہ لگائے بیٹھے ہیں[۲]۔ اسی سیاحتِ قدسی میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں پھر عرش معلیٰ کی اسی سیاحت سے واپسی میں یہ ہوا تھا کہ جب بیت المقدس میں نزول اجلال ہوا تو تمام انبیاء اور مرسلین صف آراستہ ہوتے اور امامت کے لئے اسی سید الثقلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آگے بڑھایا گیا۔

پنج وقتہ نمازوں کا قبلہ یہ بیت المقدس ہو۔ جہاں مسجد اقصٰی ہے جو ایک گذرگاہ ہے عرش بریں

---

[۱] صحابہ کرام کے تردد اور انتظار و اشتیاق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تبدیلی قبلہ کی خبر جس کو پہنچی اور جس حالت میں پہنچی فوراً عمل شروع کر دیا۔ جو صحابہ نماز پڑھ رہے تھے انہوں نے نماز میں خبر سُنی تو فوراً نماز ہی میں اپنا رُخ بلکہ امام سمیت پوری جماعت کا رُخ شمال سے جنوب کو یعنی بیت المقدس کی جانب سے قبلہ کی سمت کو کر لیا (بخاری شریف وغیرہ) [۲] جن کا دوبارہ کبھی نمبر نہیں آتا بخاری و مسلم حدیث معراج [۳] مسلم شریف [۴] البدایہ والنہایہ صفحہ ۱۱۳ ج ۳ -

پر جانے والے کا۔ یا وہ کعبہ ہو جو نقطہ محاذات ہے۔ اس بیت معمور کا جس کا طواف ملائک کے جھمگٹ ہر وقت کرتے رہتے ہیں جو تجلیہ گاہ ہے۔ ابراہیم خلیل اللہ کا (علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام)

اس طرح کے مشاہدات اشارہ کر رہے تھے کہ امام الانبیاء اور اس کی امت خیر الامم کا قبلہ خانہ کعبہ ہونا چاہیئے۔ مگر جہاں نص صریح اور قطعی فیصلہ کی ضرورت ہو وہاں اشاروں کو کافی نہیں سمجھا جا سکتا۔ البتہ یہ اشارے قطعی فیصلہ اور امر واضح کی توقع ضرور دلا سکتے تھے اور یہ توقع اشتیاق اور یہ اشتیاق اضطراب بن سکتا تھا۔ اگر انتظار طویل ہوتا۔

یہی اشتیاق و انتظار تھا جس کی وجہ سے آپ بار بار اس سمت کو نظر اٹھاتے تھے۔ جہاں سے مراد پوری ہونے کی توقع تھی۔ بالآخر انتظار ختم ہوا جب ہجرت سے سوا سال بعد فرمانِ خداوندی نازل ہوا۔

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا۔ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ (حکم الٰہی کے شوق وطلب میں) تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اُٹھ رہا ہے تو یقین کرو ہم عنقریب تمہارا رُخ ایک ایسے قبلہ کی طرف پھیر دینے والے ہیں جو تم چاہتے ہو اور اب کہ اس معاملہ کے ظہور کا وقت آگیا ہے، تو چاہیئے کہ تم اپنا رُخ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو (نماز کے وقت) اسی طرف رُخ پھیر لو۔ (آیت ۱۴۴)

وجوہات رب المشرقین والمغربین۔ خالق السمٰوت والارض۔ رب العرش الکریم کے کسی حکم کے متعلق وجہ دریافت کرنا بے ادبی ہے لا یُسئل عما یفعل (وہ جو کچھ کرتا ہے

لہ طبری و مسند اسحاق۔ فتح الباری ص۲۲۵ ج۲

اس پر اس سے باز پرس نہیں کی جا سکتی) اور جبکہ مشرق و مغرب اسی کا ہے اور ہر جگہ اور ہر سمت میں اس کا جلوہ یکساں ہے تو بلاشبہ اس کو اختیار ہے کہ قبلہ کے لئے جو سمت چاہے مقرر کردے چون وچرا کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ حکم جس کے پانچ لکھے ہیں فَوَلِّ وجهك شطر المسجد الحرام۔ ایک انقلاب انگیز فیصلہ بھی ہے جو تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ کی پوری شان اپنے اندر رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ امامتِ عظمیٰ اور خلافتِ الٰہیہ کا منصب جس پر تقریباً ڈھائی ہزار سال سے بنو اسرائیل فائز تھے اب وہ اُن سے چھن کر بنو اسمٰعیل کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ وہی احکم الحاکمین جس کی بارگاہِ عظمت تک کسی باز پرس کی رسائی نہیں ہو سکتی اپنی شان یہ بیان فرماتا ہے کہ "ذرہ برابر بھی ظلم اس سے صادر نہیں ہوتا"[1]

ناممکن اور محال ہے کہ جو رب ہے پالنے پوسنے والا ہے۔ وہ اپنے ہی پیدا کئے ہوئے بندوں پر کوئی ظلم کرے[2]۔

بلاشبہ اس کی شان یہ ہے کہ تعزّ من تشاء وتذلّ من تشاء (جس کو تو چاہے عزت دے اور جس کو تو چاہے ذلت دے) مگر اس مطلق العنان قدرت کے باوجود اس نے قوموں اور اُمتوں کی ذلت و عظمت کے لئے یہ ضابطے مقرر کر دیئے ہیں۔

(الف) جس قوم کو جو نعمت وہ عطا فرما دیتا ہے وہ اس میں انقلاب اور تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ کرے (آیت ۵۳ سورہ ۸ الانفال) (اور اپنی عظمت آفرین خصوصیات کو ختم نہ کردے) عروج کے بعد زوال اس ضابطہ کے بموجب ہوتا ہے اور ترقی کے لئے ضابطہ یہ ہے۔

(ب) جو حالت کسی قوم کی ہوتی ہے وہ قادر ذوالجلال اس میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہ کرے۔ (آیت ۱۰ سورہ ۱۳ رعد)

بہر حال رب ذوالجلال نے اپنی شان اور اپنے ہی منظور فرمودہ ضابطہ کا یہ احترام فرمایا کہ اس

---

[1] آیت ۴۰ سورہ ۴ النساء [2] وما ربك بظلام للعبيد آیت ۴۶ سورہ ۴۱ حم سجدہ

انقلاب آفرین حکم کی وجوہات بیان فرمائیں اور اس تفصیل سے بیان فرمائیں کہ شاید کسی اور حکم کی وجوہات اس تفصیل سے بیان نہیں فرمائیں۔

آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کیجئے۔ سب سے پہلے آپ سورۂ فاتحہ پڑھیں گے جو نرالے رنگ کی حمد وثنا ہے۔ جس میں بندوں کو نہایت جامع دعا کی تلقین بھی ہے اور عبرت آموز سبق بھی پھر وہ سورت شروع ہوتی ہے جو قرآن پاک کی سب سے بڑی سورت ہے۔

اس میں مقصدِ قرآنِ حکیم کی وضاحت کے بعد ان تین جماعتوں کا ذکر اور ان کے کردار کا بیان ہے جو کسی بھی تحریک کے برپا ہونے پر ظہور پذیر ہو جاتی ہیں۔ یعنی (۱) ماننے والے (۲) کھلے ہوئے مخالف اور منکر (۳) وہ اغراض پرست بزدل جن کے دلوں میں انکار بھرا ہوتا ہے اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ وہ موافق اور فرماں بردار ہیں۔ اس کے بعد عبادت رب کی ہدایت ہے اور اس رسول کا ذکر ہے جو طریقہ عبادت کی تعلیم دے رہا ہے جس کی تصدیق کے لئے وہ معجزہ پیش کیا گیا ہے جس کا نام قرآن ہے۔ پھر نوع انسان کی حیثیت بیان فرمائی گئی ہے کہ اس کو زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت عطا ہوئی اس کی شان ملائک سے بھی بلند ہے۔ اب خلافت اور امامت کا ذکر شروع ہوا تو بنو اسرائیل کو یاد دلایا گیا ہے کہ یہ نعمت عظمیٰ ان کو عطا ہوئی تھی۔

یہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۴۰[1] ہے یہاں سے سورہ بقرہ کا پانچواں رکوع شروع ہوتا ہے اس آیت سے لیکر آیت ۱۲۳ تک جو پندرھویں رکوع کے شروع میں ہے بنو اسرائیل ہی کا تذکرہ ہے۔ ان آیات میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کے انعامات شمار کرائے گئے ہیں جو بنو اسرائیل کو وقتاً فوقتاً عطا ہوتے رہے۔ دوسری جانب اس کا تذکرہ ہے کہ باری تعالیٰ کے ان انعامات کو بنو اسرائیل نے کس طرح (معاذ اللہ) پامال کیا۔ اور کس طرح ان کی دھجیاں بکھیریں۔ ان تمام جرائم کی تفصیل تو بہت طویل ہے یہاں صرف ان جرائم کے عنوان پیش کئے جا رہے ہیں جو اپنے اندر خاص

---

[1] یعنی تراسی ۸۳ آیتوں میں جو دس رکوع میں پھیلی ہوئی ہیں۔

اہمیت رکھتے ہیں جو ان ترا سی آیتوں میں شمار کرائے گئے ہیں۔

(۱) اللہ سے جو عہد کیا تھا۔ اس کو توڑ ڈالا۔ اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا (آیت ۱۰۰، ۱۰۱)

(۲) حیلہ بازی اور ٹال مٹول۔ (آیت ۶۵، ۶۶)

(۳) قبولِ حق سے گریز اور اس پر فخر۔ (آیت ۸۷ تا ۹۳)

(۴) سنگ دلی۔ (آیت ۷۴ و ۸۸)

(۵) کج بحثی۔ (آیت ۶۸ و ۶۹)

(۶) نسلی حسد۔ (آیت ۸۹ و ۹۰ و ۱۰۹)

(۷) پوری ڈھٹائی سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کرنا۔ (آیت ۸۴ و ۸۵)

(۸) داعیانِ حق سے عناد (آیت ۸۷) اُن کا مذاق بنانا (آیت ۱۰۴)

(۹) احکام خداوندی کو فروخت کرنا (آیت ۴۱ و ۹۰)

(۱۰) عقائد میں تحریف۔ (آیت ۸۰ و ۱۱۱)

(۱۱) احکام خداوندی میں تحریف۔ (آیت ۷۵)

(۱۲) موت سے گریز، دنیاوی زندگی کی شدتِ حرص (آیت ۹۶)

(۱۳) گوسالہ پرستی۔ (آیت ۹۲)

(۱۴) خدا کے بیٹا ماننا۔ (آیت ۱۱۶)

لہ اطاعتِ الٰہی اور ایمان بالانبیا کا عہد۔ توریت میں بھی اس عہد کا ذکر آچکا ہے۔ مثلاً تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے۔ اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کے شرعون اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا۔ فقرہ ۱۸ باب ۲۶ (استثنار)

لہ تم نے زندہ خدا رب الافواج کی باتوں کو بگاڑ ڈالا ہے۔ یرمیا۔ باب ۲۳ فقرہ ۳۶۔

لہ جو اپنی زبان استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ فرماتا ہے۔ یرمیا باب ۲۳ فقرہ ۲۱، ۳۲

لہ یہود اور نصاریٰ دونوں ہی نے خدا کا بیٹا مان لیا تھا۔ یہود نے حضرت عزیر کو اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔

(۱۵) انبیاء علیہم السّلام کو قتل کر ڈالنا۔ (آیت ۶۱ و ۹۱)

(۱۶) جادو اور کہانت (آیت ۱۰۲ ، ۱۰۳)

(۱۷) گروہ بندی اور گروہ بندی کے ساتھ جنّت کی ٹھیکہ داری کہ یہود کہتے تھے کہ جب تک انسان یہودی گروہ بندی میں داخل نہ ہو نجات نہیں پا سکتا اور عیسائی کہتے تھے کہ جب تک عیسائی گروہ بندی میں داخل نہ ہو جنت میں نہیں جا سکتا۔ (آیت ۱۱۱)

قرآن پاک کی محولہ بالا آیتوں میں ان جرائم کو شمار کرایا گیا ہے۔ پھر ان کی مثالیں اور شواہد پیش کئے گئے ہیں۔

اب ایک قدرتی سوال ہے کہ جس قوم کا یہ کردار ہو چکا ہے کیا وہ اس کی اہل ہے۔ کہ منصبِ امامت کی حامل رہے اور اس کے قبلہ کو نوعِ انسان اور دینِ کامل کا قبلہ قرار دیا جائے اور اس میں تبدیلی نہ کی جائے۔

کلام اللہ کی نظر میں تبدیلی صرف مناسب ہی نہیں ہے بلکہ اتنی ضروری ہے کہ اس پر اعتراض وہی کر سکتے ہیں جو فہم و بصیرت سے محروم اور مضحکہ انگیز نادانی (سفاہت) میں مبتلا ہوں چنانچہ تبدیلی قبلہ کے حکم کی تمہید اس طرح فرمائی گئی ہے۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا۔ (آیت ۱۴۲)

جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہیں وہ کہیں گے کس بات نے اُن (مسلمانوں) کو ہٹا دیا اُس قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے۔

حضرت ابراہیمؑ سے وعدہ ابراہیمؑ کا وعدہ اور بنو اسرائیل کی محرومی کا سبب

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت اور ان کی عظمت بنو اسرائیل میں بھی مسلّم تھی اور بنو اسمٰعیل میں بھی۔ دونوں[1] ان کو اپنا مورث اعلیٰ مانتے تھے۔ قرآن حکیم یہود کے جرائم

[1] برہمن جس برہما کی تعظیم کرتے ہیں کیا عجب ہے وہ ابرہم یا ابراہام ہی ہو۔ عربوں نے اگر ابراہام کا ابراہیم کر لیا ہے تو اتنی تبدیلی کا حق تو بھارت کے آریوں کو بھی ہونا چاہیئے کہ وہ ابرہم کا برہم اور برہما کر لیں جیسے آرین کو آریہ کر لیا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

شمار کرانے کے بعد خاتمہ کلام پر پھر یاد دلاتا ہے کہ

"اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمتیں جو میں نے تم کو بخشیں اور میں نے تم کو دنیا جہان والوں پر فضیلت دی۔ (آیت ۱۲۲)

اس یاددہانی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا اسم گرامی لیکر وہ بشارت یاد دلاتا ہے جو حضرت حق جلّ مجدہٗ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو دی گئی تھی۔

اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (آیت ۲۳ سورہ ۲ بقرہ)

میں تمہیں انسانوں کے لیے امام بنانے والا ہوں۔

پھر یاد دلاتا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السّلام نے یہ دریافت کیا کہ کیا یہ شرف میری اولاد کو بھی میسر آئے گا۔ تو بتا دیا گیا تھا۔

لاینال عھدی الظالمین (آیت ۱۲۴) (نہیں پہنچتا میرا اقرار نافرمانوں کو)

(یعنی جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں ان کا میرے اس عہد میں کوئی حصہ نہیں ہے)

اس صغریٰ اور کبریٰ کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنو اسرائیل خود اس بشارت کے بموجب جو حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو دیگئی تھی اس کے مستحق ہیں کہ ان کو منصب امامت سے معزول کر دیا جائے کیونکہ وہ ظالم ہیں اور ظالم بھی ایسے کہ ان جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں جن کو گذشتہ ۸۲ آیتوں میں بیان کیا گیا ہے

اب مستحق شرف کون

قرآن حکیم یاد دلاتا ہے کہ ایک "بیت" خانہ وہ ہے جس کو شروع ہی سے "مثابۃً للناس وامناً" بنایا گیا ہے (تمام انسانوں کا مرجع اور مرکز۔ امن و حریت کا مقام)

اس بیت سے متعلق ہدایت کردی گئی تھی وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى (آیت ۱۲۵) ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بنالو۔

اس بیت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا تھا اور حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند ارجمند اسمٰعیل کو حکم دیا تھا۔

طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (آیت ۱۲۵)

تم دونوں میرے گھر کو پاک صاف رکھو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے

پھر قرآن حمید یاد دلاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل (علیہما السّلام) جب اس بیت کی بنیادیں (جو حضرت آدم علیہ السّلام کے زمانہ کی تھیں) بلند کر رہے تھے تو اُن کے دلوں کی گہرائیوں سے ان کی زبانوں پر یہ دعا بھی جاری تھی۔

اے پروردگار ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو۔ بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور (مصالح عالم) کا جاننے والا ہے۔ اے پروردگار (اپنے فضل و کرم سے) ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم (تیرے احکام کے فرمانبردار) بن جائیں اور ہماری نسل سے بھی ایسی امت پیدا کر جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو۔ خداوندا ہمیں ہماری عبادت کے طور طریق بتا دے اور ہماری کوتاہیوں سے درگذر فرما اور اپنی عنایت سے نواز، بلاشبہ تیری ذات ہے جس کے درگذر کرنے کی کوئی انتہا نہیں جو رحم کرنے والی ہے۔ (آیت ۱۲۷-۱۲۸)

اسی سلسلہ میں ان کی دعا یہ بھی تھی۔

اے ہمارے رب (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول پیدا ہو جو انہیں میں سے ہو۔ وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے۔ کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور اپنی پیغمبرانہ تربیت سے ان کے دلوں کو مانجھ دے۔ (آیت ۱۲۹)

اس کے بعد کلام الٰہی تنبیہ کرتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کا مسلک تھا

(۱) توحید خالص۔ خدائے واحد کی پرستش جس میں کسی طرح کے شرک کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ (آیت ۱۳۲)

(۲) سپردگی اور فرمانبرداری۔ یعنی اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دینا اور اس کے احکام کی پوری طرح تعمیل کرنا۔ (آیت ۱۳۱)

یہی توحید خالص اور تسلیم و رضا تھی۔ جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو "امام الناس" بنایا اور یہی نعمت بنو اسرائیل کو عطا ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان کو عالمین (دنیا جہان) پر فضیلت بخشی گئی تھی۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اسی مسلک کی وصیت اپنی اولاد کو کی تھی، ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد میں جس قدر نبی آئے سب نے اسی مسلک کو مضبوطی سے اختیار کیا۔ یہ تمہاری دھڑے بندی جس کا نام یہودیت اور نصرانیت ہے ان سب انبیاء (علیہم السلام) کا دامن اس سے پاک رہا۔ (آیت ۱۴۰) تمہاری اسی دھڑے بندی کا نتیجہ ہے کہ کسی نبی کو مانتے ہو۔ کسی کو نہیں مانا یہاں تک کہ قتل بھی کر دیا۔ اسی دھڑے بندی نے تم کو منصب امامت سے محروم کیا۔ درجہ افضلیت سے نیچے گرا کر ذلت و مسکنت کے گڑھے میں ڈالا غضب الٰہی کو تمہاری گردنوں کا طوق بنا دیا۔

آج سب سے افضل وہ ہے جو اس دھڑے بندی سے بالا و برتر ہو کر مسلک ابراہیمی کو مضبوطی سے سنبھالے۔ خدائے واحد کا پرستار حقیقی بن کر اپنے آپ کو خدا کے حوالہ کر دے۔

آج یہ شرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو حاصل ہے لہٰذا وہی افضل الناس اور امتِ وسط ہے اور اسی افضلیت کی بنا پر یہ فیصلہ بھی کیا جا رہا ہے کہ اس کا قبلہ وہ ہو گا جس کی حرمت و عظمت عہدِ قدیم سے چلی آ رہی ہے جس کے معمار ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام تھے۔

ترجمہ: پس منظر پر آپ نظر ڈال چکے۔ اب ان آیتوں کا مضمون مطالعہ فرمائیے جن میں تحویل قبلہ کا حکم ہے۔ جس کا یہ پس منظر تھا۔

جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہیں وہ کہیں گے مسلمان جس قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ کیا بات ہوئی کہ ان کا رُخ اس سے پھر گیا۔ اے نبی! تم کہو پورب ہو یا پچھم سب اللہ ہی کے لئے ہے (وہ کسی خاص مقام یا جہت میں محدود نہیں

وہ جس کسی کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلا دیتا ہے۔

اور (اے مسلمانو! جس طرح یہ بات ہوئی کہ بیت المقدس کی جگہ خانہ کعبہ قبلہ قرار پایا) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے تمہیں امۃ وسط (نیک ترین۔ عادل اور معتدل) اُمت بنا دیا۔ تاکہ تم گواہ رہو لوگوں پر (یعنی ایک بہتر نمونہ اور معیار کہ نوع انسان کی ہر اُمت کو اسی سانچے میں ڈھلنا اور اسی معیار پر اُترنا چاہیئے) اور رسول گواہ رہیں تم پر (وہ تمہارے لئے نمونہ اور معیار ہیں کہ اُمتِ اسلامیہ کو اس معیار پر پورا ہونا اور اس سانچہ میں ڈھلنا چاہیئے) اور ہم نے تمہیں اس قبلہ پر جس کی طرف تم رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے اسی لئے رکھا تھا کہ (وقت پر) معلوم ہو جائے کہ کون لوگ واقعی (اللہ کے) رسول کی پیروی کرتے ہیں اور کون الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں۔ یہ حکم بہت گراں (اور سخت آزمائش کا حکم ہے) مگر ان لوگوں کو نہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے راہ دکھا دی ہے (اور وہ اطاعتِ رسول کے ذوقِ سلیم سے بہرہ ور ہیں) اللہ ایسا نہیں کہ ضائع ہو جانے دے تمہارے ایمان کو (کہ جو نمازیں بتقاضا۔ ایمان باللہ وایمان بالرسول۔ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھیں ان کو بیکار قرار دے) بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا شفیق ہے (خصوصاً ان پر جنہوں نے اللہ اور رسول کے حکم کی تعمیل میں کوئی کام کیا۔ اور تبدیلی قبلہ کے متعلق اس کا یہ حکم بھی سراسر شفقت ہی ہے) (اے پیغمبر! ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکم الٰہی کے شوق وطلب میں تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھ اٹھ جاتا ہے۔ تو یقین کرو ہم آپ کا رُخ اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس کو آپ چاہتے ہیں (اچھا) اب کر لیجیئے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف اور تم لوگ (آپ اور آپ کے ساتھی) جہاں بھی ہو اپنے چہرے پھیر لیا کرو اسی طرف۔ اور جن لوگوں

لے یعنی سپردگی اور حکم خدا کی تعمیل کے لئے سرتاسر اطاعت بن جانا جو ملتِ ابراہیم کی خصوصیت ہے کس میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ کس میں نہیں پائی جاتی (واللہ اعلم)

کو کتاب مل چکی ہے (یہود اور نصاریٰ) وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ معاملہ ان کے پروردگار کی طرف سے ایک امر حق ہے (کیونکہ ان کے مقدس نوشتوں میں اس کی پیشین گوئی موجود ہے۔ اور اللہ بے خبر نہیں ہے۔ ان کی کارروائیوں سے۔

اور اگر تم اہل کتاب کے سامنے (دنیا جہان کی) ساری دلیلیں بھی پیش کر دو جب بھی وہ تمہارے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں نہ یہ ہو سکتا ہے کہ (علم و بصیرت کی پوری روشنی حاصل ہونے کے بعد تم ان کے قبلہ کی پیروی کرنے لگو اور نہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے ہیں (یہود کا قبلہ ہیکل بیت المقدس ہے! در نصاریٰ کسی عمارت یا مکان کو نہیں بلکہ سمت مشرق کو قبلہ بنائے ہوئے ہیں۔

(ابن جریر وغیرہ)

(اور دیکھو) اگر تم نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی باوجودیکہ تمہیں اس بارے میں علم حاصل ہو چکا ہے (قبلہ کے متعلق وحی نازل ہو چکی ہے) تو تم بھی ان میں آجاؤ گے جو نافرمانی کر کے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور جن لوگوں کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ آپ[1] کو ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو جانتے پہچانتے ہیں۔ لیکن اس پہ ایک گروہ ان میں ایسا ہے جو جان بوجھ کر سچائی کو چھپاتا ہے (تحویل قبلہ کا یہ معاملہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک امر حق ہے۔ پس ہرگز ہرگز ایسا نہ ہو کہ تم شک کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ۱۲

نکاح السیّدہ فاطمۃ الزّہرا۔ (رضی اللہ عنہا)

ارشادِ خداوندی ہے: وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ تا وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (آیت ۳۲ سورہ ۲۴ النور)

نکاح کر دو ان کا جو تم میں بے نکاح ہوں اور اپنے غلاموں اور باندیوں کا
بھی جو اس قابل ہوں۔ اگر وہ مفلس ہوں گے تو خدا تعالیٰ ان کو اپنے
فضل سے غنی کر دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے خوب جاننے والا

(آیت ۳۲ سورہ ۲۴ النور)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص طور سے ہدایت فرمائی۔
علی! تین کام ہیں ان میں تاخیر ہرگز نہ کرنا۔ نماز جب اس کا
وقت ہو جائے۔ جنازہ جب آ جائے، بے نکاح جب اس
کا کفو مل جائے[1]

ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے "غنا" چاہتے ہیں۔ پھر نکاح مگر فرمان خداوندی نے نکاح
کو مقدم رکھا اور غنا کا خود وعدہ فرمایا۔

اس کی ایک عجیب و غریب مثال حضرت علی اور سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہما کا نکاح ہے
حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے والد خواجہ ابوطالب کی وفات کے وقت اگرچہ جوان تھے۔ تقریباً بیس
سال کی عمر تھی۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بچپن ہی سے اپنی تربیت میں لے لیا
تھا اور خواجہ ابوطالب کو ان کی طرف سے بے فکر کر دیا تھا۔
ابوطالب دولت مند نہیں تھے کہ ان کے وارث ان کے ترکہ سے دولت مند ہو جاتے

---

[1] ترمذی شریف باب ما جاء فی الوقت الاول من الفضل صہ ۲۴۔

اس کے علاوہ ہجرت کرنے والے بزرگ وہ تھے کہ دولت مند[1] بھی فقیر ہو گئے تھے۔ لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی جو تھا وہ توکل کا سرمایہ تھا اور بس۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر پندرہ سال کے قریب ہوئی تو رشتے آنے شروع ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی مشورہ دیا گیا کہ وہ بھی خواستگاری پیش کر دیں۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو احساس تھا کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی آپ نے مشورہ دینے والوں سے بھی کہا۔ مگر تہیدستی اور غربت کا عذر کسی نے بھی قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ مشورہ دینے والوں نے یہی کہا کہ بارگاہِ رسالت میں اس کی ضرورت نہیں کہ تمہارے پاس دولت ہو۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے مشفق مربی ہیں۔ تمہارا گوشہ خاطر معلوم ہو جائے گا تو وہ خود منظور فرمالیں گے

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ مجھ پر مشورہ دینے والوں نے اتنا اصرار کیا کہ بالآخر مجھے تعمیل کرنی پڑی۔ میں نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ خدمتِ مبارک میں حاضر ہوا مگر ایک طرف میری شرم وحیا، دوسری طرف ذاتِ اقدس کا رعب و جلال۔ حاضر ہونے کو حاضر ہو گیا مگر زبان بند۔ طبیعت محجوب۔ خاموش بیٹھ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مربیانہ شفقت ہی کارفرما ہوئی۔ خود دریافت فرمایا۔ کیسے آئے ہو۔ کچھ کام ہے۔ اس کے جواب میں بھی میں خاموش ہی تھا پھر خود ہی فرمایا۔ فاطمہ سے رشتہ کے لئے آئے ہو۔

میں نے عرض کیا ــــ "نعم"

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں بھی مواخات (بھائی چارہ) قائم فرمایا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے ساتھ شامل کیا اور اخ قرار دیا۔ مدینہ منورہ میں جو مہاجرین اور انصار کرام میں مواخات رشتہ اخوت قائم فرمایا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی نہیں آتا۔ گویا آپ کی وہی مواخات قائم رہی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ معظمہ میں قائم ہو گئی تھی۔ مقصد یہ کہ سلسلہ مواخات سے جو سہولت حضرات مہاجرین کو مل گئی تھی کہ رہنے اور کاشت وغیرہ کا انتظام ہو گیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ سہولت بھی نہیں ملی تھی۔

فرمایا۔ پھر کیا دو گے۔

میں نے عرض کیا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔

ارشاد ہوا۔ میں نے تمہیں زرہ دی تھی وہ کیا ہوئی[1]

جیسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ سمجھ میں آیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زرہ بیچنے کی نیت کر لی۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ۴۰۰ درہم میں بیچ کر پوری رقم اپنے مربی و سرپرست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دی اس میں سے تقریباً ایک تہائی خوشبو پر خرچ ہوئی باقی دوسری ضرورتوں پر۔

آپ نے احباب کو طلب فرمایا۔ اور نکاح پڑھ دیا۔

مکان کا انتظام دلھن کو لانے کے لئے مکان کی ضرورت ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ دلھن کو وہیں اتارا۔ پھر مستقل قیام کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا گیا کہ حضرت حارثہ بن نعمان کے مکان خالی پڑے ہیں۔ ان سے ایک مکان لے لو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خودداری نے مکان کی فرمائش کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ کسی طرح حضرت حارث رضی اللہ عنہ کو معلوم ہو گیا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ سارے مکان آپ کے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو پسند فرمائیں وہ اس مکان کی خوش بختی ہے۔ میں اسی مکان کو جس کو آپ لیں گے زیادہ محبوب اور مبارک سمجھوں گا، بمقابلہ اس کے جو آپ کے کام میں نہیں آئے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صدقت بارك الله (آپ نے سچ فرمایا اللہ آپ کو برکت دے) حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے اور حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کو اپنے مکان میں لا کر اتارا۔

---

[1] مشورہ دینے۔ پھر حاضری اور گفتگو کی۔ یہ تمام تفصیل البدایۃ والنہایۃ سے ماخوذ ہے۔ صفحہ ۳۴۶ ج ۳

اللہ تعالیٰ اپنے پاکباز مقرّبین کو کس طرح محفوظ رکھتا ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنی دلہن (فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو رخصت کرانے کا ارادہ کیا تو میں نے بنی قینقاع کے ایک سنہار کی شرکت سے ایک کام کرنا چاہا۔ خیال یہ تھا کہ نفع ہو گا تو ولیمہ کر سکوں گا۔

صورت یہ تھی کہ غزوۂ بدر کے مالِ غنیمت سے مجھے ایک ناقہ ملی اور ایک اونٹنی مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عنایت فرمائی تھی جب میرے پاس دو اونٹ ہو گئے تو میں نے قبیلہ بنی قینقاع کے ایک سنہار سے یہ طے کیا کہ ہم دونوں ان اونٹوں پر جنگل سے اذخر لے آیا کریں گے اور اس کو بازار میں بیچ دیا کریں گے۔ یہ معاملہ نفع ہی کا تھا اس میں نقصان کا سوال ہی نہیں تھا لیکن خدا کو منظور نہیں تھا کہ امام الاولیاء بے فکری سے ولیمہ کریں۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ حضرت علی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جنہوں نے غزوۂ اُحد میں شہید ہو کر سید الشہداء کا خطاب (لسانِ نبوت سے حاصل کیا) وہ جیسے بہادر تھے ایسے ہی منچلے بھی تھے۔ قیام گاہ پر کچھ احباب اکٹھے تھے۔ شراب کا دَور چل رہا تھا۔ کسی نے کہا شراب کے ساتھ اونٹنیوں کے کوہان کے کباب بھی ہونے چاہئیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں اونٹنیاں سامنے کھڑی تھیں۔ حضرت حمزہ فوراً اُٹھے، اور دونوں اونٹنیوں کے کوہان نکال لئے اور کوکھیں چاک کر کے گردے وغیرہ نکال لئے احباب کی فرمائش پوری کر دی[2] مگر ولیمہ کے متعلق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا سارا منصوبہ ختم ہو گیا۔ اسی لئے کہتے ہیں۔ "نزدیکاں را بیش بود حیرانی"

نکاح سے کچھ عرصہ بعد رخصتی

ایک روایت ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح پہلے ہو چکا تھا اور رخصتی نو ماہ بعد ہوئی تھی۔[3] بخاری شریف کی

---

[1] بخاری شریف ص۲۸۰ [2] بخاری شریف ص۳۲۰ و ص۵۷۱ (وغیرہ)

[3] الاستیعاب والبدایۃ والنہایۃ ص۳۴۶ ج ۳۔

مذکورہ بالا روایت سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

جہیز تاجدار دو عالم شاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر سیدۃ نساء اھل الجنۃ فاطمہ زھراء رضی اللہ عنہا کو جو جہیز دیا اسکی فہرست[1] یہ ہے،

لحاف ایک

چمڑے کا گدا جس میں کھجور درخت کی چھال بھری ہوئی تھی۔ ایک

چکیاں۔ ۲ مشکیزہ ایک۔ مٹی کے گھڑے۔ دو

صلوات اللہ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین

---

[1] الاصابہ والترغیب والترہیب۔ باب الترغیب فی الاذکار بعد الصلوات۔

مقاصد بعثت۔ فرائض نبوت

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بیت اللہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے تو دل کی تمناؤں کے ترجمان دعائیہ کلمات یہ تھے جو زبان مبارک پر جاری تھے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ سورہ ۲ البقرہ آیت ۱۲۹

اے ہمارے رب۔ اٹھا ان میں سے ایک رسول انہیں میں کا۔ پڑھے ان پر تیری آیتیں اور سکھا دے ان کو کتاب اور پکی باتیں اور ان کو سنوارے۔ (شاہ عبدالقادرؒ)

قبولیت دعا

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ سورہ ۶۲ الجمعہ آیت ۲

وہی ہے جس نے اٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول انہیں میں کا پڑھتا ان پاس اس کی آئیں اور ان کو سنوارتا اور سکھاتا کتاب اور عقلمندی۔ شاہ عبدالقادرؒ

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (سورہ ۳ آل عمران آیت ۱۶۴)

اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا اُن میں رسول انہیں میں کا۔
پڑھتا ہے اُن پر آیتیں اس کی اور سنوارتا ہے ان کو اور سکھاتا
ہے ان کو کتاب اور کام کی بات (شاہ عبدالقادرؒ)
و مے آموزد آن را۔ کتاب و علم (شاہ ولی اللہؒ)

دعاء اور قبولیتِ دعا کے الفاظ پر دوبارہ نظر ڈال لیجئے۔ حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ کے مقاصد یہ تھے
تلاوتِ آیات اللہ ۔ تعلیم کتاب اللہ ۔ تعلیم الحکمہ ۔ تزکیہ

تشریح

تلاوتِ آیات اللہ یتلوعلیہم کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ پڑھتا ہے اُن پر آیتیں۔ لیکن پڑھنے ہی کے لئے لفظ قرأت بھی آیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ پڑھو تو قرأت کا لفظ ہی لایا گیا۔ اقرا باسم ربك الذی خلق۔ مگر یہاں دعا میں بھی یتلو ہے اور قبولیتِ دُعا میں بھی "یتلو" ہی ارشاد ہوا ہے۔ یعنی تلاوت کرتا ہے تو گیا قرأت اور تلاوت میں کچھ فرق ہے واقعہ یہی ہے۔ تلاوت اور قرأت میں فرق ہے۔ تلاوت کے معنٰی[1] صرف پڑھنے کے نہیں ہیں۔ بلکہ تلاوت میں عمل بھی ملحوظ ہوتا ہے۔ پھر عمل بھی ایسا کہ تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی تلاوت میں صرف قول نہیں ہوتا بلکہ "قول[2] مع سعی پیہم" یعنی جس طرح آپ آیتیں سنائیں گے ساتھ ساتھ عمل

---

[1] یہ مقصد نہیں ہے کہ تلاوت قرأت اور پڑھنے کے معنی میں نہیں آتا۔ قرآن شریف میں بہت جگہ محض پڑھنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ واتل علیہم نبا ابنی ادم بالحق۔ نتلو علیك من نبا موسٰی وفرعون بالحق وغیرہ۔ مگر جب ماخذ کا لحاظ کیا جائے تو صرف قرأت کے معنٰے نہیں ہوتے بلکہ کچھ اضافہ بھی ہوتا ہے تفصیل دوسرے حاشیہ میں ملاحظہ فرمایئے۔ [2] تلاوت کا ماخذ "تلو" ہے جس کے معنی ہیں اتباع کرنا پیچھے چلنا۔ اس طرح کہ آپ میں اور جس کے پیچھے چل رہے ہیں اس کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ ہو۔ تلاہ ۔ تبعہ (باقی برصفحہ آئندہ)

اور عمل کے تسلسل کا بھی مشاہدہ کرا دیں گے۔ یعنی جس طرح یہ ایک معجزہ ہے کہ "ایک اُمی محض" جس نے عمر عزیز کے چالیس دور اس طرح گذارے کہ پڑھنے پڑھانے سے نا آشنا تھا اس کو "اقرا" کا حکم ہو رہا ہے اور وہ قرأت کر رہا ہے اسی طرح اس معجزہ کے ساتھ یہ ایک عجیب و غریب مشاہدہ بھی ہے کہ پڑھ کر سنانے والا جو کچھ پڑھتا ہے وہ خود اس کی عملی تصویر بن جاتا ہے یعنی پڑھنے کے ساتھ ایسا کردار بھی پیش کرتا ہے کہ آپ اس کے عمل سے بھی اس کو پڑھ سکتے ہیں۔

ایک مثال ملاحظہ فرمایئے:

ارشادِ ربانی ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ۔ تا مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ۔ سورہ۔ اسرا آیت

شاہ صاحبان کے الفاظ میں اردو اور فارسی ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

کھڑی رکھ نماز۔ سورج کے[1] ڈھلنے سے۔ رات کی اندھیری تک اور قرآن پڑھنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) متابعہ لیس بینہم مالیس منہا۔ وذلک۔ یکون تارۃً بالجسم وتارۃ بالاقتداء فی الحکم ومصدرہ تلوٌّ وتلو۔ وتارۃ بالقراءۃ اوتدبر المعنی ومصدرہ تلاوۃ والقمر اذا تلاھا اراد بہ ھٰھنا الاتباع علی سبیل الاقتداء والمرتبۃ وذالک انہ یقال ان القمر ھو یقتبس النور من الشمس۔ وھولہا بمنزلۃ الخلیفۃ (ثم قال) والتلاوۃ تختص باتباع کتب اللہ المنزلۃ تارۃ بالقرأۃ وتارۃ بالارتسام لما فیہا من امر ونھی وترغیب وترھیب او ما یتوھم فیہ ذلک وھو اخص من القراءۃ فکل تلاوۃ قراءۃ ولیس کل قراءۃ تلاوۃ لا یقال تلوت رقعتک وانما یقال فی القرآن فی شیئ اذا قرأتہ وجب علیک اتباعہ (المفردات فی غریب القرآن)

[1] یعنی کواکب پرستوں کے طریقہ کے برخلاف کواکب پرست طلوع آفتاب کے وقت آفتاب کی پوجا کرتے ہیں تو خدا پرستوں کی عبادت طلوع آفتاب سے پہلے ہوتی ہے یا زوال آفتاب کے بعد۔ واللہ اعلم بالصواب

فجر کا۔ بیشک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو۔ اور کچھ رات جاگتا رہ
اس میں۔ یہ بڑھتی ہے تجھ کو۔ شاید کھڑا کرے تجھ کو تیرا رب تعریف
کے مقام میں۔ (شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ)

برپا دار نماز را۔ وقت زوالِ آفتاب۔ تا ہجوم تاریکیِ شب
دلازم گیر قرآن خواندن فجر را۔ ہر آئینہ قرآن خواندن فجر را حاضر میشوند
فرشتگان۔ و در بعض شب بیدار باش بقرآن شب خیزی زیادہ شد
برائے تو۔ نزدیک است کہ ایستادہ کند ترا پروردگار تو بمقام پسندیدہ

(شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ)

وحی الٰہی کے کلمات کو شمار کیجیے جو ان آیتوں میں ہیں کل تیس [۳۰] لفظ ہیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور کردار پر نظر ڈالیے تو دفتر بے پایاں ہے۔ پانچ فرض۔ اُن کے اجزاء ترکیبی۔ قیام۔ رکوع۔ سجدہ وغیرہ۔ ان کے اوقات۔ پڑھنے کا انفرادی اور جماعتی طریقہ پھر ہر ایک کے ساتھ سنتیں۔ نفلیں۔ اُن کے آداب اور طریقے جو احادیث کے سیکڑوں صفحات میں پھیلے ہوتے ہیں، یہ سب تلاوت کے معنی واضح کر رہے ہیں۔

فریضہ نماز عام مسلمانوں کیلئے

چار وقت کی وہ نمازیں جن کا سلسلہ آفتاب ڈھلنے کے وقت سے شروع ہو کر اندھیری رات گئے تک رہتا ہے اور پانچویں وقت کی نماز (صبح کی نماز) جس میں قرآن شریف پڑھنے کی خاص تاکید ہے (کیونکہ یہ "مشہود" ہوتا ہے۔ یعنی اس وقت دن اور رات کے کارگذار فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ یہ پانچ نمازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح تمام مسلمانوں پر فرض ہیں۔

---

[۱] یعنی دن اور رات کے کارپرداز فرشتے اس وقت جمع ہوتے ہیں وہ قرأت سنتے ہیں کیونکہ وہ خود قرأت نہیں کر سکتے اُن کا وظیفہ تسبیح وتحمید ہوتا ہے (واللہ اعلم) [۲] وہ تعریف کا مقام ہے شفاعت کا جب کوئی نہ بول سکے گا تب حضرت عرض کر کر خلق کو چھڑا دیں گے تکلیف سے (موضح القرآن)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت یہ ہے کہ ان پانچ نمازوں کے علاوہ آپ کے لئے ایک اور حکم بھی ہے فتہجّد بہ نافلۃً لّک" جس کے معنے حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے یہ کئے ہیں۔ کچھ رات جاگتا رہ اس میں (نماز پڑھنے میں) یہ بڑھتی ہے تجھ کو۔ یعنی یہ خاص طور پر آپ کے حق میں اضافہ ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔ شب خیزی زیادہ شد برائے تو۔ گویا نماز تہجد بھی آپ پر فرض ہے۔ یہ فرض اُمّت پر[1] نہیں۔ اُمّت کے حق میں صرف سُنّت ہے۔ نہ پڑھیں تو کوئی گناہ نہیں۔ مگر آپ کے حق میں فرض[2] ہے۔

---

[1] امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ نے وتر کو واجب قرار دیا ہے۔ یہ بھی تہجد ہی کا حصہ ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صرف وتروں کے متعلق ہے کہ ان اللہ امدّکم بصلوٰۃ ھی خیر لکم من حمر النعم الوتر جعلہ اللہ بین صلوٰۃ العشاء الی ان یطلع الفجر (ترمذی شریف وابوداؤد) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک نماز کا ایک اور اضافہ کردیا ہے۔ یہ نماز ایسی ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت (حمر النعم) سے بھی بہتر ہے یہ نماز وتر ہے۔ جس کا وقت اللہ تعالیٰ نے نماز عشاء اور فجر کے درمیان مقرر کیا ہے۔

[2] اس کی مزید تشریح یہ ہے کہ نبوت کے دور اول میں جو حکم ہوا تھا قم اللّیل الّا قلیلا (سورہ مزمل رباستثناء تھوڑی سی شب کے تمام رات قیام کرو) وہ منسوخ نہیں ہوا کیونکہ اس کی جو علت یا حکمت بیان کی گئی تھی وہ آخر تک باقی رہی۔ حکمت یا علت یہ تھی کہ اس سے نفس پامال ہوتا ہے۔ قول اور فعل میں موافقت ہوتی ہے اور دعا اور ذکر بہت ہی ٹھیک طرح ادا ہوتے ہیں ان ناشئۃ اللّیل ھی اشد وطأً واقوم قیلًا (بیشک رات کے وقت اٹھنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور دعا ہو یا قرأت ہر بات خوب ٹھیک نکلتی ہے) یہ آپ کی حیاتِ مقدس کا وہ جوہری جزو تھا جو ہمیشہ قائم رہنا چاہیئے تھا۔ چنانچہ قائم رہا تو اس کو پیدا کرنے والا عمل یعنی قیام لیل وہ بھی لازم رہا۔ پھر ارشاد ربانی فتہجد بہ نے اس کو اور پختہ کردیا۔ کیونکہ جب اسی آیت میں بشارت دی گئی کہ آپ کو مقام محمود پر مبعوث کیا جائیگا (عسی ان یبعثک ربّک مقامًا محمودًا) اور یہ ظاہر کیا گیا کہ تہجد اس کا ذریعہ ہوگا۔ تو ایک علت اور حکمت کا (باقی صفحہ آئندہ پر)

اس خصوصیت کی علت اور حکمت بھی بیان کر دی گئی کہ آپ کو مقام محمود کا منصب عالی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور اضافہ ہو گیا اور مطلب یہ ہوا کہ آپ کی یہ خصوصیات ہیں کہ ہمیشہ نفس پامال (بتعبیر دیگر مطیع اور فرمانبردار) قول اور فعل میں مطابقت۔ ذکر اور دعا کی نہایت صحیح طرح سے ادائیگی اور مقام محمود پر آپ مبعوث فرمائے جائیں گے۔ یہ تمام خصوصیات قیام لیل پر مرتب ہوں گی۔ لہذا قیام لیل یعنی تہجد مخصوص طور پر آپ پر فرض رہیگا۔

البتہ یہ تخفیف ضرور ہوئی کہ پہلے حکم تھا کہ کم وبیش نصف شب قیام کرو۔ بعد میں یہ سہولت کر دی گئی کہ (قرأت۔ سہولت کے مطابق کرو) (فاقرؤا ما تیسر منہ۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تہجد اور وتر میں فرق کرتے ہیں۔ وہ تہجد کو عام مسلمانوں کے لئے سنت قرار دیتے ہیں اور صرف وتر کی تین رکعت کو واجب قرار دیتے ہیں۔ امام صاحب کا استدلال احادیث سے بھی ہے جو پہلے حاشیہ میں بیان کی گئیں اور استاد محترم حضرت علامہ انور شاہ رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت امام صاحب کی دلیل قرآن پاک کی یہ آیتیں بھی ہیں۔ جن میں قیام لیل کا حکم ہے (قم اللیل الا قلیلا) یہ حکم جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رہا۔ امت کے لئے بھی رہا منسوخ نہیں ہوا (چنانچہ لفظ جمع کے ساتھ ارشاد ہوا۔ فاقرؤا۔ تم پڑھو جس قدر میسر ہو۔ البتہ آپ کے لئے یہ تخفیف کی گئی کہ قرأت بقدر سہولت ہو اور امت کو مزید سہولت یہ دی گئی کہ آخر شب کو بیدار ہونے کا یقین نہ ہو تو شروع شب میں وتر کی تین رکعتیں پڑھ لیں جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ خطرہ ہو کہ آخر شب میں نہیں اٹھ سکیں گے تو اول شب میں وتر پڑھ لیں (مسلم شریف ص ۲۵۸ ج ۱) بایں ہمہ یہ نظر انداز نہ ہونا چاہیئے کہ حضرات علماء کا ایک قول یہ بھی ہے کہ تہجد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نفل کا درجہ ہی رکھتا تھا۔ آپ پر فرض نہیں تھا۔ مگر یہ صرف علمی نکتہ سنجی ہے، ورنہ عمل کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح پابند رہے۔ جیسے فرائض کے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

لہ مقام محمود۔ یحمدہ اھل الجمع کلھم۔ یعنی میدان حشر میں جمع ہونے والی ساری مخلوق آپ کی تعریف کرے گی (بخاری شریف) یہ اس لئے کہ آپ پوری مخلوق کے لئے شفاعت (باقی صفحہ آئندہ پر)

عطا کرتا ہے عَسٰی اَن یَبعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحمُودًا (سورہ ۱۷ بنی اسرائیل آیت ۹) (قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہیں ایسے مقام پر پہنچائے جو عالمگیر اور دائمی ستائش کا مقام ہو۔ جس کی ہر طرح تعریف کی جائے۔)

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

یہ ایک عام اصول ہے۔ یہاں یہی ظاہر کرنا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا جس طرح یہ مقام عالی ہے کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" اسی طرح آپ کے فرائض میں بھی اضافہ[1] ہے اور ایسا اضافہ کہ عام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کریں گے اور آپ کی سفارش قبول ہوگی۔ احادیث میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ میدانِ حشر میں پوری مخلوق جمع ہوگی اور منتظر ہوگی کہ اس کا حساب ہو اور ان کے حق میں فیصلہ ہو۔ ایک دراز مدت اس انتظار میں گذر جائے گی۔ اہل ایمان کو اس کی درازی اتنی محسوس نہیں ہوگی مگر اہلِ کفر کے لئے یہ درازی خود مصیبت بن جائے گی تو اب کسی ایسے مقرب بارگاہ کی تلاش ہوگی جو حضرت حق جل مجدہ سے سفارش کرے کہ حساب کر کے ان کا معاملہ طے کر دیا جائے۔ مخلوق حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ اور دیگر اکابر انبیاء (علیہم السلام) کے پاس دوڑے گی کہ وہ شفاعت کریں گے مگر تمام انبیاء (علیہم السلام) معذرت کر دیں گے اور حضرت خاتم الانبیاء علیہم السلام کا نام لیں گے۔ تب مخلوق رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرے گی۔ آپ بارگاہِ الٰہی میں حمد و ثناء کرتے ہوئے سجدہ کریں گے اور پوری مخلوق کے لئے سفارش کریں گے تو حساب شروع ہوگا (بخاری و ترمذی شریف وغیرہما) اب ساری مخلوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سفارش سے بہرہ اندوز ہوگی۔ اس کو شفاعتِ کبریٰ کہا جاتا ہے۔

[1] مگر یہ اضافہ عجیب قسم کا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ تو معصوم و مغفور ہیں پھر یہ ریاضت کیوں کہ پائے مبارک پر ورم آ جاتا ہے تو آپ نے جواب دیا۔ افلا اکون عبدًا شکورًا کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں۔ بخاری شریف ص۱۶۲۔ یعنی عام اہلِ ایمان کے لئے فرضیت اس لئے ہے کہ گناہوں کا کفارہ ہو اور آپ کے لئے فرضیت بر بنائے شکر ہے۔ اسی لئے نفلیں جو شکر ادا کرنے کے لئے ہوتی ہیں وہ آپ کے حق میں فرض ہیں (واللہ اعلم بالصواب)

انسانوں کو یہ حوصلہ نہیں ہے کہ اس اضافہ کو برداشت کر سکیں۔ یہ حوصلہ بھی ربِّ محمدؐ نے صرف محمدؐ ہی کو عطا فرمایا تھا، جس نے اس اضافہ کو برداشت[1] کیا (صلوات اللہ علیہ دائماً ابداً)

سلسلۂ عبادات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات نماز کے سلسلہ میں صرف یہی نہیں کہ تہجد آپ پر فرض تھا۔ بلکہ تہجد کے علاوہ بھی اور نوافل آپ کے حق میں فرض کا درجہ[2] رکھتی تھیں۔

---

[1] برداشت کرنے کی صورت ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نیت باندھنے میں آپ نے تین دفعہ اللہ اکبر فرمایا۔ پھر فرمایا۔ ذو الملکوت والجبروت والکبریاء والعظمۃ (مالک ملک۔ اقتدار اعلیٰ کا مالک۔ بڑائی اور عظمت والا) پھر قرأت شروع کی تو پوری سورۂ بقرہ نہایت اطمینان سے پڑھی پھر اسی کے مناسب بہت طویل رکوع کیا۔ پھر اتنا ہی طویل قیام کیا۔ پھر اتنا ہی طویل سجدہ کیا۔ سجدہ کے بعد بڑے اطمینان سے دیر تک بیٹھے رہے۔ پھر دوسرا سجدہ کر کے کھڑے ہوتے تو سورۂ آل عمران پوری پڑھی تیسری رکعت میں سورۂ نساء مکمل چوتھی رکعت میں سورۂ مائدہ یا سورۂ الانعام پوری پڑھی صحابی کے بعد کے راوی شعبہ کو شک ہے کہ کونسی سورت کا نام لیا تھا (ابو داؤد: باب مایقول فی الرکوع) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا بھی کرتے تھے کہ تین دفعہ میں تہجد پڑھا کرتے تھے۔ یعنی ایک مرتبہ اُٹھے۔ وضو کیا مسواک کی نفلیں پڑھیں پھر آرام فرمایا۔ تھوڑی دیر تک سوتے رہے پھر اُٹھے اس طرح تین دفعہ سوتے پھر اُٹھے اور نوافل پڑھتے تھے (مسلم شریف) ظاہر ہے بار بار اُٹھنا کتنا شاق ہوتا ہے۔ پھر تلاوت کی صورت حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہ نے یہ بیان فرمائی کہ ایک ایک حرف الگ الگ کھینچ کر (بخاری شریف، ابو داؤد، ترمذی وغیرہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آخر میں آپ تہجد کی نماز بیٹھ کر ادا فرماتے تھے مگر صورت یہ ہوتی تھی کہ پہلے بیٹھ کر پڑھتے رہتے جب تیس چالیس آیتیں رہ جاتیں تو کھڑے ہو کر پڑھتے۔ پھر رکوع کیا کرتے تھے۔ بخاری شریف ص۱۳۵ و ص۱۵۱ وغیرہ۔

[2] مثلاً ظہر کی سنتیں اگر وقت پر نہ پڑھی جائیں تو ان کی قضا نہیں ہے (باقی برصفحہ آئندہ)

روزہ نماز کے علاوہ روزے کے بارے میں خصوصیت یہ تھی کہ چند روز کا مسلسل روزہ کہ بیچ میں افطار قطعاً نہ ہو اُمت کو اس کی اجازت نہیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔

ایک مرتبہ صحابہ کرام نے اصرار کر کے اجازت[1] حاصل کی اور مسلسل روزہ رکھنا شروع کیا مگر صرف دو روز بعد ہی اندازہ ہو گیا۔

نہ ہر جائے[2] مرکب تواں تاختن   کہ جاہا سپر باید انداختن

حضرات علماء نے روزے کے تین درجے قرار دیئے ہیں (۱) عوام کا روزہ یعنی فقہی قاعدوں کے مطابق کھانے پینے وغیرہ سے رکنا۔ اور مکروہات و محرمات یعنی غیبت۔ جھوٹ نجاست حسد۔ مکر و فریب وغیرہ سے اجتناب و احتیاط۔

(۲) خواص کا روزہ۔ یعنی صرف مکروہات و محرمات سے اجتناب نہیں بلکہ ایسی جائز چیزوں سے بھی احتیاط برتی جائے جو یادِ خدا سے غافل کر دیں۔ مثلاً شعر شاعری یا شکار وغیرہ۔

(۳) اخص الخواص کا روزہ۔ اللہ کے سوا ہر چیز سے یکسوئی اور برطرفی اور صرف ذات حق جل مجدہٗ میں محویت اور اس کی ذات و صفات میں ایسی مشغولیت کہ وہی جملہ توجہات کا محور رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روزے کی یہی شان ہوتی تھی اور یہ شان نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی تھی جب آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) لیکن ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظہر کی سنتیں رہ گئیں تو آپ نے نماز عصر کے بعد ان کو پڑھا۔ بخاری شریف صفحہ ۱۶۴ و صفحہ ۱۶۵۔ پھر ان کو معمول بنا لیا۔ بخاری شریف صفحہ ۸۳ حالانکہ نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک اور نماز صبح کے بعد سے طلوع آفتاب تک نوافل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے۔ بخاری شریف صفحہ ۸۲ مگر چونکہ آپ کے حق میں نوافل فرض کا درجہ رکھتی تھیں۔ لہٰذا آپ نے عصر کے بعد یہ نفلیں پڑھیں (واللہ اعلم بالصواب) [1] بخاری شریف صفحہ ۲۶۳ باب التنکیل لمن اکثر الوصال۔ [2] ہر جگہ گھوڑے نہیں دوڑاتے جا سکتے۔ بہت سی جگہیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہاں سپر ڈال دینا چاہیئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

الخلق عیال اللّٰہ فاحب الخلق الی اللّٰہ من احسن الی عیالہ۔

(ترجمہ) مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ پس خلق خدا میں اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کے عیال پر احسان کرے۔[1]

عجیب و غریب بات یہ ہوتی تھی کہ جس طرح توجہ الی اللہ اور ذات حق میں انہماک بڑھتا تھا اتنا ہی اُس کی مخلوق کے حق میں رحم و کرم اور جود و سخا کا درجہ بڑھتا تھا یعنی پروردگار کی محبت اس کی پروردہ مخلوق پر لطف و احسان کی صورت میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شہادت ملاحظہ فرمایئے؛

کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اجود الناس۔ وکان اجود ما یکون فی رمضان حین یلقاہ جبرئیل وکان یلقاہ فی کل لیلۃ من رمضان فیدارسہ القرآن فلرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اجود بالخیر من الریح المرسلۃ[2]

(یعنی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سخی تھے اور آپ کی بے پناہ سخاوت کا زیادہ ظہور رمضان میں ہوتا تھا۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ سے ملاقات کیا کرتے تھے اور حضرت جبرئیل کی ملاقات رمضان شریف کی ہر ایک رات میں ہوتی تھی وہ آپ سے قرآن شریف کا دور کیا کرتے تھے۔ پس واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت اور بخشش جو سال بھر نسیم صبح رہتی تھی اس زمانہ میں وہ آندھی سے زیادہ تیز ہو جاتی تھی جس کے جھونکے کسی رکاوٹ کے پابند نہیں ہوتے ہر طرف پہنچتے ہیں اور ہر ایک کو متاثر کرتے ہیں۔

زکوٰۃ اُمت کے لئے ایک نصاب معین کیا گیا کہ اس سے کم پر زکوٰۃ ہی واجب نہیں ہوتی اور جب واجب ہو جاتی ہے تو صرف چالیسواں حصہ دینا ہوتا ہے۔ باقی سب مال حلال

---

[1] مشکوٰۃ شریف از شعب الایمان للبیہقی باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔

[2] بخاری شریف صـ۳ و صـ۲۵۵ وغیرہ۔

ومباح. بلکہ پاکیزہ اور طیب. مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور العمل پہلے گذر چکا ہے کہ آپ نے طے فرمالیا تھا کہ کاشانۂ نبوت سونے چاندی سے پاک رہے گا۔ دینار تو دینار درہم کی بھی مجال نہیں تھی کہ وہ دولت کدہ پاک میں رات گذار سکے۔[1]

جہاد کے سلسلہ میں عام مسلمانوں کے لئے زحف عن القتال (یعنی جنگ کے وقت میدانِ جنگ سے بھاگ جانا) حرام ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ بھی کہ ابھی دو لشکر سے بھی نہیں نکلے صرف ہتھیار سجائے ہیں۔ اس وقت ہر ایک مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ اسلحہ اُتارے اور موقع ہو تو ارادۂ جنگ بھی ملتوی کر دے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہتھیار سجانے کے بعد جائز نہیں سمجھتے تھے[1] کہ اسلحہ اُتار دیں جب تک فیصلہ کن جنگ نہ کرلیں۔

غرض یہ کردار تھا جس کو پیش کرتے ہوئے آپ آیات اللہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے جو قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے وہ آپ کے عمل سے آیات اللہ کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

خلاصۂ کلام تلاوت آیات اللہ کی تشریح کو ہم تبرکاً شہیدِ وفا عبداللہ[2] بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے اشعار پر ختم کرتے ہیں۔

۱- وفینا رسول اللہ یتلو کتابہ	اذا انشق معروف من الفجر ساطع
۲- ارانا الھُدی بعد العمی فقلوبنا بہ	موقنات ان ما قال واقع
۳- یبیت یجافی جنبہٗ عن فراشہ	اذا استثقلت بالمشرکین المضاجع

بخاری شریف ص۱۵۵

ترجمہ (۱) ہمارے بیچ میں اللہ کے رسول ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کتاب اللہ کی تلاوت اس وقت کرتے ہیں جب کہ وہ معروف اور جانی پہچانی شئی جو روشن ہوتی ہے۔ جس کو فجر کہتے ہیں شق ہوتی ہے۔ (پو پھٹتی ہے)

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ص۱۳ ج۲ [2] وہ جاں نثار اور فداکار جو غزوہ موتہ میں شہید ہوئے۔

[3] اس سلسلہ میں مفصل بحث پہلے گذر چکی ہے کہ کس طرح سب کچھ خرچ کرکے فاقہ اختیار کیا جاتا تھا (محمد میاں)

(۲) اس اللہ کے رسول نے ہمیں نابینائی (گمراہی) کے بعد ہدایت کا راستہ دکھایا پس ہمارے قلوب اس کا یقین رکھتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ ہو کر رہے گا۔

(۳) یہ اللہ کے رسول اس طرح رات گذارتے ہیں کہ آپ کا پہلو بستر سے الگ رہتا ہے (خاص اس وقت جبکہ مشرکین (بستر پر دراز ہوتے ہیں اور بستر ان کے جسموں سے) بوجھل ہوتے ہیں۔

تعلیم الکتاب

یعلمھم الکتاب ہزاروں فتاویٰ اور فیصلے جن سے ملت اسلامیہ کے اہل علم حضرات فقہاء استدلال کرتے ہیں اور غیر مسلم فضلاء کے لئے شمع بصیرت ہیں وہ انہیں غیر متمدن اور پس ماندہ کاشت کاروں یا چرواہوں کے ارشاد فرمودہ ہیں جن کی پس ماندگی کا شاہِ ایران مذاق اڑایا کرتا تھا اور خود مکہ کے سردار اُن کو حقیر سمجھتے تھے یہاں تک کہ ابوجہل کو جانکنی کے وقت صدمہ تھا تو یہ تھا کہ اس کو مدینہ کے کسانوں نے مارا۔ یا اُن کے ارشادات و فرمودات ہیں جو مکہ کے معمولی دوکاندار تھے اور تحقیق کی جائے تو ان میں کچھ وہ بھی تھے جو رہزنی کیا کرتے تھے اور کچھ وہ تھے کہ بقول علامہ حالی

تعیش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی غرض ہر طرح اُن کی حالت بُری تھی

ان حضرات نے نہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی نہ کسی دار العلوم یا دار الافتاء سے استفادہ کیا تھا۔ ان کی تعلیم گاہ و تربیت گاہ اُسی ہادیٔ اعظمؐ کی خس پوش مسجد تھی جس کو رب العرش نے تعلیم کتاب کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔

پھر ان میں سے ۲۳ سالہ دورِ نبوت کے رفقاء تو چند ہی تھے جن کی تعداد چالیس بھی نہیں تھی۔ مدینہ طیبہ کا دس سالہ دور بھی سب کو نصیب نہیں ہوا۔ بہت سے[1] وہ تھے جنکو

---

[1] جیسے ابوہریرہ۔ ابوموسیٰ اشعری۔ خالد بن ولید۔ عمرو بن العاصؓ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہم۔

دو تین سال اور بعض وہ تھے جن کو چند ماہ ہی میسر آئے مگر اخذ و استنباط کی وہ غیر معمولی بصیرت نصیب ہو گئی کہ یونیورسٹیوں اور دارالعلوموں کے تعلیم یافتہ فضلاء ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے بصیرت کے ساتھ جو وسعتِ ذہن میسر آئی وہ بھی پیغمبرانہ تربیت کی برکت تھی۔ یعنی جس طرح وہ خود اخذ و استنباط سے کام لیتے تھے وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اسی طرح اخذ و استنباط کا حق دوسرے کو بھی ہے وہ جس طرح اپنی رائے کا احترام کرتے تھے۔ دوسرے کے فیصلہ کا بھی اسی طرح احترام کرتے تھے۔

چنانچہ جن اجتہادی مسائل میں آج اختلاف ہے۔ حضرات صحابہ کے دور میں بھی یہ اختلاف تھا اسی لئے ہر ایک فریق کے پاس جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہے کسی صحابی کا قول۔ یا فیصلہ بھی وہ اپنے خزینۂ یادداشت میں محفوظ رکھتا ہے مگر باہمی تصادم سے یہ حضرات محفوظ تھے اور سبق آموز بات یہ ہے کہ نہ باہمی رشک و حسد تھا۔ نہ شوقِ تعلّی نہ جذبۂ برتری۔ تحقیق مسئلہ کے وقت کھلے طور پر تنقید اور جرح۔ مگر وقتِ نماز آگیا تو جماعت میں سب شریک۔ بسا اوقات امام وہی بنا جو نشانۂ اختلاف تھا۔[1]

مثال ہم فقہ پڑھتے ہیں۔ پڑھاتے ہیں۔ رات دن کے معاملات میں مسائل فقہ پر عمل کرتے ہیں لیکن اگر ایسا اتفاق ہو جائے کہ امام مثلاً صبح کی نماز میں آیت سجدہ پڑھ لے پھر سجدہ کرے تو تقریباً ہر ایک مقتدی وقفِ انتشار ہو جاتا ہے۔ کوئی سجدہ میں پہنچ جاتا ہے کوئی رکوع میں امام کا انتظار کرتا ہے۔ لیکن تحویل قبلہ کی آیت نازل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کے بجائے خانۂ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ مسجد بنی عبدالاشہل اور اسی طرح مسجد قبا میں جماعتیں ہو رہی تھیں اسی حالت میں خبر دینے والے نے خبر دی تو فوراً پوری پوری صفوں کا رخ شمال کی جانب سے جنوب کی طرف پھر گیا۔ مردوں کی جگہ عورتوں کی صف پہنچ گئی۔ مگر یہ سب تبدیلی نہایت خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ اس طرح ہو گئی[2]

---

[1] جیسے جریر بن عبداللہ بجلی۔ [2] تفسیر مظہری ص ۱۴۴ ج ۱

گویا ان کو پہلے سے اس کی مشق کرائی جا چکی تھی۔ حالانکہ مشق تو کیا مشق کا کبھی تصور بھی نہیں کیا گیا تھا۔

نمازِ صبح کے وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ قرأت کر رہے تھے کہ ایک بدبخت نے خنجر مارا۔ فاروق اعظمؓ نے گرتے گرتے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر مصلے پر کھڑا کیا۔ حملہ آور کو صفِ اوّل کے لوگوں نے پکڑنے کی کوشش کی۔ ۱۳ آدمی زخمی ہوئے تب اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر یہ انتشار جو کچھ بھی ہوا صرف صفِ اوّل میں امام سے متصل بعد کی صف والوں کو اتنا پتہ چلا کہ نماز پڑھانے والے فاروق اعظم نہیں ہیں کوئی اور شخص نماز پڑھا رہا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بہت اختصار سے نماز پڑھ کر سلام پھیر دیا۔ تب لوگوں کو صورتِ حال کا علم ہوا[1]۔

یہ تھا تعلیم الکتاب کا ایک رُخ اور حضرات صحابہ پر اس کا اثر۔ دوسری صورت ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) قرآن حکیم میں تغییر خلق اللہ۔ یعنی اللہ کی بنائی ہوئی صورت میں تبدیلی پیدا کرنے کو شیطانی فعل فرمایا گیا ہے[2]۔ مگر تغییر خلق اللہ کا لفظ عام ہے۔ جس طرح مردوں کا خصی کرنا تغییر خلق اللہ ہے اور حرام ہے ختنہ کرنا بھی تغییر خلق اللہ ہے۔ علیٰ ہذا بدن کے کسی حصّہ کے بال منڈوانا یا کٹوانا۔ یا اکھاڑنا۔ ناخون تراشنا یا گدھوانا۔ یا عورتوں کے سر کے بال مصنوعی طور پر بڑھانا۔ یا چہرے کے بال نوچنا۔ دانتوں میں مصنوعی طور پر کشادگی پیدا کرنا ان باتوں میں خدا کی بنائی ہوئی صورت میں تبدیلی ہوتی ہے۔ پس جس کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم الکتاب کے لئے مبعوث فرمایا تھا، اس نے ان تمام کی تفصیل فرمائی۔ بعض تغیرات کو مستثنیٰ فرمایا۔ مثلاً ارشاد فرمایا۔

الفطرۃ خمسٌ ۔ الختان والاستحداد ۔ قص الشارب وتقلیم الاظفار

---

[1] بخاری شریف صـ ۵۲۳ [2] سورہ ـ ۴ نساء آیت ۱۱۹

ونتف الابط ۔ [1]

یعنی یہ پانچ چیزیں اگرچہ ان میں تغییر خلق اللہ ہے مگر یہ تغییر بتقاضاء فطرت ہے یہ تغییر حرام نہیں ہے۔ بلکہ فطرت ہے ختنہ کرانا۔ موئے زیر ناف کو صاف کرنا۔ مونچھیں کٹوانا۔ ناخون کتروانا۔ بغل کے بال اکھیڑنا۔

اس کے مقابل دوسرا ارشاد یہ ہوا

خالفوا المشرکین۔ وَ فِروا اللحی واعفُوا الشّوارب۔ [2]

مشرکین کے خلاف یہ طریقہ اختیار کرو کہ داڑھیں بڑھاؤ اور مونچھوں کو خوب باریک کترواؤ

عورتوں کے متعلق ارشاد ہوا

لعن اللہ الواشمات والمتوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغیرات خلق اللہ۔ [3]

ترجمہ: ان عورتوں پر خدا کی لعنت جو گودتی ہیں جو گدواتی ہیں جو بال نوچتی ہیں۔ جو خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے دانتوں میں کشادگی کراتی ہیں جو خدا کی بنائی ہوئی صورت کو بدلتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ تغییر خلق اللہ کی تفسیر و تشریح کہ بعض کو جائز اور مستحسن قرار دیا اور بعض کو ممنوع اور حرام یہ فریضۂ نبوت تھا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا۔

(۲) ارشادِ ربانی ہے۔ اَحَلَّ اللہ البیع وحرّم الربوا۔ سورہ ۲ آیت ۲۷۲

اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت (تبادلہ) کو حلال قرار دیا اور ربوا (ایسی زیادتی جو بدل سے زیادہ ہو) کو حرام قرار دیا۔

اب قرض کی صورت میں اگر پانچ روپیہ کے بجائے چھ روپیہ وصول کئے جاتے ہیں تو ظاہر ہے یہ ایک روپیہ بدل سے زائد ہے۔ ربوا یعنی سود ہے۔ لیکن اگر ایک تولہ چاندی کو دو تولہ

[1] بخاری شریف ص۸۷۵ [2] بخاری شریف ص۸۷۵ [3] بخاری شریف ص۸۷۹

چاندی۔ یا ایک سیر گیہوں کو دو سیر گیہوں کے بدلہ میں فروخت کیا جائے۔ تو کیا یہ بیع جائز ہوگی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی حرام فرمایا۔ اور نہ صرف چاندی اور گیہوں بلکہ اس طرح[1]
کی اور چیزوں کے متعلق بھی نہایت سختی کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اگر ہم جنس سے تبادلہ ہے
مثلاً سونے کی بیع سونے کی کسی چیز سے ہو رہی ہے تو اس میں بھی مساوات اور نقد ہونا ضروری
ہے۔ نہ کم و بیش جائز ہے نہ اُدھار۔

ان دو مثالوں میں سے ایک کا تعلق خرید و فروخت سے ہے دوسرے کا تعلق آرائش
بدن سے۔ ان کے علاوہ ہزاروں مسائل ہیں جن کا تعلق عبادات۔ معاملات۔ معاشرت۔ اقتصاد
امور خانہ داری۔ آداب مجلس یا ملکی سیاست یا بین الاقوامی تعلقات سے ہے۔ قرآن حکیم
نے ان کے متعلق اصول کی تعلیم دی ہے اور کہیں صرف اشارہ کر دیا ہے۔ ارشادات

---

[1] حدیث میں ایسی چھ چیزیں شمار کی گئی ہیں جن کا تبادلہ اگر ہم جنس سے ہو تو زیادتی اور ادھار حرام ہے۔
تبادلہ برابر سرابر اور ہاتھ در ہاتھ ہونا چاہیئے۔ چاندی[1]۔ سونا[2]۔ گیہوں[3]۔ جو[4]۔ کھجور[5]۔ اور نمک[6]۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ نے اس سے یہ اصول اخذ کیا کہ ایسی تمام چیزیں جو وزن کرکے یا صاع یا رطل جیسے
پیمانہ سے ناپ کر بیچی جائیں اگر ان کا تبادلہ ہم جنس سے کیا جائے تو ان میں مساوات اور ہاتھ در ہاتھ ہونا ضروری
ہے لہٰذا چاول۔ جوار۔ مکی وغیرہ کا تبادلہ اگر ہم جنس سے کیا جائے مثلاً چاول کی بیع چاول سے کی جائے
تو مساوات اور ہاتھ در ہاتھ ہونا ضروری ہے نہ اضافہ جائز ہے نہ ادھار کیونکہ یہاں جنس کا بھی اتحاد
ہے اور قدر بھی متحد ہے کہ دونوں وزنی ہیں وزن کرکے بیچی جاتی ہیں۔ واللہ اعلم

[2] پانچ سیر گیہوں کی قیمت ایک روپیہ بھی لگا سکتے ہیں اور ایک ہزار روپیہ بھی۔ یہ بائع اور مشتری کی باہمی
رضامندی پر ہے کہ وہ پانچ سیر گیہوں کو ایک روپیہ کی برابر قرار دیں یا ایک ہزار کی برابر۔ لیکن ہم جنس میں یعنی گیہوں
کی بیع گیہوں سے ہو تو وہاں پانچ سیر گندم کو دس سیر گندم کے برابر قرار دینا غلط ہوگا۔ البتہ جو جنس ایسی ہے
کہ وہ کیل یا وزن کرکے نہیں بیچی جاتی۔ گزوں سے ناپ کر یا مثلاً شمار کرکے بیچی جاتی ہے۔ جیسے کپڑا۔ وہاں امام
ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق یہ جائز ہے کہ ایک گز کپڑے کو ایک ہزار گز کپڑے کے عوض میں بیچا جائے۔ مگر نقد۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کتب حدیث کے ہزاروں صفحات میں محفوظ ہیں، ان کی توضیح اور تشریح کرتے ہیں۔ پھر حضرات ائمہ مجتہدین نے ان سے اصول اخذ کر کے پیش آنے والے معاملات کو ان اصول کے معیار پر جانچ کر احکام مرتب کیے جو کتب فقہ میں منضبط ہیں۔

ارشادات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق حضرت حق جل مجدہٗ نے فرما دی کہ ارشاد ہوا۔ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى - اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى - سورہ ۵۳ النجم آیت ۳ و ۴

اپنی چاہ اور اپنے نفس کی خواہش پر آپ کچھ نہیں کہتے آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے جو آپ پر نازل کی جاتی ہے۔

نیز حضرت حق جل مجدہٗ کا ارشاد ہے۔

ما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا سورہ ۵۹ حشر آیت ۷

جو کچھ تمہارے سامنے پیش کریں رسول اس کو لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم اعلیٰ بنا کر بھیجا تو آپ نے دریافت فرمایا۔

کوئی مقدمہ آپ کے سامنے آئے گا تو آپ کس طرح فیصلہ کریں گے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ کتاب اللہ کے مطابق اور اگر کتاب اللہ میں اس معاملہ کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہوگی تو رسول اللہ کی سنت کے بموجب اور اگر سنت رسول اللہ یعنی آپ کے جو ارشادات یا واقعات میرے علم میں ہیں ان میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہوگی تو اپنے اجتہاد سے کام لوں گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سینہ پر دست مبارک رکھ کر فرمایا۔ الحمد للہ وفق رسولَ رسول اللہ لما یرضی بہ رسول اللہ (الحمد للہ۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کے رسول (فرستادہ) کو اس کی توفیق فرمائی جس کو

اللہ کا رسول پسند کرتا ہے)

اس ارشاد گرامی نے حضرات مجتہدین کے اجتہاد کی تصویب اور تائید فرما دی۔

تعلیم الحکمہ

یعلمھم الکتاب والحکمۃ سکھاتے ہیں ان کو (علماء امت کو) کتاب اور حکمت[1] یعنی کتاب اللہ کی تعلیم کے ساتھ آپ ایسے اصول کی تعلیم بھی دیتے ہیں جن پر قانونی عدل اور دستور و آئین کی حسین اور شاندار عمارت سر بفلک کی جا سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات ملاحظہ فرمایئے۔ وہ ایسے ہی اصول کا مجموعہ ہیں یہاں خطبات کے علاوہ چند حدیثوں کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ارشاد ہوا[2] — حلال بھی واضح ہے۔ حرام بھی واضح ہے۔ لیکن دونوں کے درمیان کچھ ایسے امور ہیں جن میں کچھ مشابہت حلال کی ہے کچھ مشابہت حرام کی پس جس نے ایسے مشتبہ امور سے

---

[1] قرآن حکیم میں یہ الفاظ تین جگہ آتے ہیں۔ سورہ بقرہ۔ سورہ آل عمران اور سورہ جمعہ۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حکمت کا ترجمہ سورہ بقرہ اور آل عمران میں علم کیا ہے اور سورہ جمعہ میں دانش۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے (علی الترتیب) تین ترجمے کئے ہیں۔ پکی باتیں۔ کام کی بات۔ عقلمندی۔ مگر ظاہر ہے۔ یہ سب ترجمے تشریح طلب ہیں۔ احقر نے اپنے الفاظ میں ان کی تشریح کر دی ہے۔ جہاں تک حضرات مفسرین کا تعلق ہے تو ان کے ارشادات یہ ہیں مایکمل نفوسہم من المعارف والاحکام وقیل ھی السنۃ وقیل ھی القضاء وقیل الفقہ ص ۱۳۱ تفسیر مظہری ج ۱۔ الحکمۃ العلوم الحقۃ المستحکمۃ التی یستفیدھا الحکیم من الحکیم بلا توسط کتاب ولا بیان تفسیر مظہری ص ۱۲۶/۲۲۴ الحکمۃ الشرعیۃ المحکمۃ المطابقۃ لشرائع الانبیاء فی الاصول المشھود علیھا بالکتب السماویۃ بالقبول۔ ایضاً تفسیر مظہری ص ۲۷/۹ اصابۃ الحق بالعلم والعقل قضیۃ صادقۃ (المفردات فی غریب القرآن)۔

[2] بخاری شریف ص ۱۳۔

تقویٰ اختیار کیا اور احتیاط برتی۔ اس نے اپنے دین کو بھی اعتراض سے بری کر لیا اور اپنی آبرو بھی بچالی اور جو ان مشتبہ امور میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو اپنے مویشی سرکار کی محفوظ چراگاہ کے پاس چرا رہا ہے قریب ہے کہ وہ مویشی کو اس چراگاہ میں اتار دے۔

یاد رکھو ہر ایک سرکار کی چراگاہ ہوتی ہے۔ یاد رکھو (احکم الحاکمین) اللہ تعالیٰ کی چراگاہ حرام امور ہیں۔ یاد رکھو بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے وہ ٹھیک رہتا ہے تو بدن ٹھیک رہتا ہے۔ وہ بگڑ جائے تو بدن بگڑ جاتا ہے۔ یاد رکھو یہ گوشت کا ٹکڑا وہ ہے جس کو "دِل" کہا جاتا ہے۔

اس ارشاد گرامی نے بہت سے اصول کی تعلیم دے دی۔ مثلاً یہ کہ[1] ایسے تمام امور جن کے جواز اور عدم جواز میں کلام ہو۔ تقویٰ یہ ہے کہ ان کو نہ کیا جائے۔ اصطلاح فقہ میں ایسے امور کو مکروہ کہا جاتا ہے۔ جو درجہ بدرجہ تنزیہی، تحریمی۔ پھر تحریمی قریب بحرام ہوتا ہے۔

یا مثلاً یہ کہ عقائد و خیالات کی اصلاح سب سے مقدم ہے۔ عقائد خراب ہوتے ہیں تو دل کے جذبات بھی خراب ہوتے ہیں جو عمل کو خراب کر دیتے ہیں۔

(۲) اسی حدیث میں یہ[2] اضافہ بھی ہے۔

بس جو شخص مشتبہ کام کو چھوڑ دے وہ غیر مشتبہ حرام کو بدرجہ اولیٰ چھوڑ دے گا اور مجرمانہ جرأت کر کے مشتبہ کام کرنے لگے تو وہ عنقریب حرام میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔

(۳) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ ہم بھی مجلس مبارک میں حاضر تھے۔ ارشاد ہوا۔

اپنے بعد مجھے تمہارے متعلق جس بات کا خطرہ ہے وہ دنیا کی وہ رونق و زینت ہے جو پوری زیبائش کے ساتھ تمہارے سامنے آئے گی۔

---

[1] اس اصول کو سامنے رکھ کر فاتحہ۔ سوئم۔ چہارم۔ چہلم۔ برسی۔ شب برات۔ بی بی فاطمہ کی صحنک و محفل میلاد قیام وغیرہ پر نظر ڈالئے۔ [2] بخاری شریف ص۲۰۵ [3] بخاری شریف ص۱۹۰۔

ایک شخص نے عرض کیا۔ یارسول اللہ۔ کیا خیر بھی شر کو لا سکتا ہے (یعنی جب یہ رونق و زینت حلال اور جائز راستہ سے آئے گی تو پھر اس سے خطرہ کیوں ہے) راوی بیان کرتے ہیں کہ اس سوال پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص توجہ فرمائی۔ آپ خاموش ہو گئے اور دیر تک خاموش رہے۔ ہمیں خیال ہوا کہ شاید وحی نازل ہو رہی ہے۔ اس کے بعد آپ نے پسینہ پونچھا اور دریافت فرمایا سائل کہاں ہے۔ گویا اس سوال کو آپ نے معقول قرار دیا۔ پھر فرمایا۔ بیشک خیر شر کو نہیں لاتا (بشرطیکہ خیر کے تقاضوں کو پورا کرتے رہو۔ یعنی دولت کی بناء پر جو حقوق ہوتے ہیں ان کو ادا کرتے رہو) پھر آپ نے مثال دیتے ہوئے فرمایا۔ دیکھو۔ موسم بہار میں جو سبزہ پیدا ہوتا ہے اگر جانور اس کو کھائے چلا جائے تو وہ سبزہ (جو نہایت عمدہ ہے اور سراسر خیر ہے) جانور کو مار ڈالتا ہے یا نیم جان کر دیتا ہے۔ ہاں وہ جانور جو سبزہ کو کھا کر ساتھ ساتھ ہضم بھی کرتا رہے اور سبزہ سے شکم سیر ہونے کے تقاضے کو پورا کرتا رہے۔ مثلاً یہ کہ یہی مویشی جب سبزہ سے شکم سیر ہو جائے اور اس کی کوکھیں تن جائیں تو گھومے پھرے۔ دھوپ میں بیٹھے۔ پھر فضلہ خارج کرے (اس کے بعد کھائے تو مفید ہو گا) پھر ارشاد ہوا۔ دیکھو یہ مال ہرا بھرا اور شیریں ہے۔ پس وہ اُس مسلمان کا بہت اچھا دوست ہے جو مسکینوں۔ یتیموں۔ مسافروں اور ضرورت مندوں کو فراموش نہ کرے ان کو بھی آسودہ کرتا رہے اور دیکھو جو شخص بلا استحقاق کے مال لیتا ہے (مثلاً سوال کر کے) تو اس کی مثال ایسی ہے کھاتا رہتا ہے پیٹ نہیں بھرتا۔

تزکیہ

یُزَکِّیْھِمْ	اُن کو مانجھتا ہے	(مولانا ابوالکلام آزاد)
	اُن کو سنوارتا ہے	(حضرت شاہ عبدالقادرؒ)

ظاہر ہے دوسرا ترجمہ زیادہ حاوی[1] جامع اور واقعہ اور حقیقت حال کے زیادہ مطابق ہے

[1] لغت سے بھی قریب تر یہی ترجمہ ہے یعنی سنوارنا ہے۔ کیونکہ لفظ زکوٰۃ کے معنی صرف (باقی صفحہ آئندہ پر)

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان کو صرف مانجھا ہی نہیں بلکہ اُن کو آراستہ بھی کیا ہے ان کو حسین اور جمیل بھی بنا دیا ہے یعنی مانجھنے کے بعد سنوارا[1] بھی ہے۔ جس طرح یہ عمل بہت مشکل ہے کیونکہ یہ ایک کیمیا ہے اور کیمیا بھی وہ جو کانسی یا پیتل کو نہیں بلکہ زیر پا گرد و خس و خاشاک کو سونا بناتا ہے اسی طرح اس کی وسعت بھی اتنی زیادہ ہے کہ ہزاروں صفحات کے دامن بھی اسکو نہیں سمیٹ سکتے۔ کیونکہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جس کو سنوارنے کی ضرورت نہ ہو اور جو حسین و جمیل بننے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

فرد میں بھی خرابی ہوتی ہے، جماعت میں بھی۔ ظاہر میں بھی۔ باطن میں بھی۔ مرد میں بھی اور عورت میں بھی۔ پھر اندرون خانہ۔ بیرون خانہ۔ حلقہ درس و تلقین۔ محفل طرب و نشاط۔ بزم شعر و سخن۔ انجمن خورد و نوش۔ بازار۔ تجارتی کاروبار۔ بارگاہ عدل و انصاف یا ایوان سیاست اجتماعی مطالبات اور اُن سے متعلق خواص کے نظریات، عوام کے جذبات، طرح طرح کی تحریکات سیاسی چالیں، شاطرانہ حرکتیں میدانِ جنگ۔ جشن فتح یا صلح کانفرنس وغیرہ۔ قدرتی بات ہے کہ ان میں خرابیاں بھی ہوتی ہیں اور خوبیاں بھی۔ خرابیوں کو دور کرکے خوبیاں پیدا کرنا۔ خرابیوں کے عوامل اور محرکات کو پہچان کر دلوں کو اُن سے پاک کرنا اور ان کے برخلاف خدا پرستی۔ صداقت ہمدردی۔ اخلاص اور ان کے جذبات کو دلوں کے نہاں خانوں میں جلوہ گر کرنا۔ ان سب کا نام تزکیہ ہے۔

ان تمام وسعتوں کے ساتھ "تزکیہ" کو فرائض نبوت میں شمار کرایا گیا۔ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ) پاک کرنا نہیں ہیں بلکہ خوشگوار اور تر و تازہ بنانے کے ہیں۔ زکی الرجل صلح وتنعم فہو زکی (قاموس) والزکوٰۃ لغۃ الطہارۃ۔ والنماء۔ والبرکۃ المدح (مجمع البحار) الزکوٰۃ النمو الحاصل من برکۃ اللہ تعالیٰ (الی ان قال) وبزکاء النفس وطہارتہا یصیر الانسان بحیث یستحق فی الدنیا الاوصاف المحمودۃ وفی الآخرۃ الاجر المثوبۃ (المفردات فی غریب القرآن)

[1] مثلاً صرف مرض بخل رفع نہیں کیا بلکہ سیر چشمی، وسعت نظر اور جذبات ہمدردی خلق خدا سے ان کو آراستہ بھی کیا۔

(محمد میاں)

خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فریضہ کو حسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا مگر کس طرح انجام دیا اور آئندہ کے لئے کیا گیا۔ ہدایتیں فرمائیں ان کی تفصیلات کے لئے آپ حدیث۔ تفسیر، فقہ، سیر و مغازی تہذیب اخلاق۔ تصوف و احسان کی کتابیں ملاحظہ فرمائیں۔ اس مختصر مجموعہ میں اُن کا مختصر بیان بھی ممکن نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان تمام فرائض میں جو پہلے بیان کئے گئے (تلاوت آیات اللہ، تعلیم الکتاب، تعلیم الحکمۃ، تزکیہ) تزکیہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گویا نصب العین تزکیہ ہی ہے اور تمام امور اس کے مقدمات اور ابتدائی مراحل ہیں۔

تزکیہ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ نہ صرف عبادات و اخلاق اور احسان و سلوک کی بنیاد تزکیہ پر ہے بلکہ اسلام نے معاشرت۔ معیشت۔ سیاسی نظام اور اس کے لئے مالی نظام انتہا یہ کہ جنگ اور صلح کی بنیاد بھی تزکیہ پر ہی رکھی ہے۔ مقاتلہ و مبارزہ۔ دشمن کو تباہ کرنا۔ اس کے ملک کو برباد کرنا "جہاد فی سبیل اللہ" اسی وقت ہوگا جب کہ لڑنے والے وہ ہوں جو اپنا تزکیہ کر چکے ہوں۔ تزکیہ کے بغیر یہ قتل و قتال فساد فی الارض ہے۔ یہی تزکیہ ہے جو زندگی کے ہر ایک شعبہ میں کارفرما ہے۔ مثلاً

۱۔ معاشرت اور سماجی زندگی میں سب سے پہلی چیز نکاح اور ازدواج ہے وحی الٰہی کی ہدایت ہے:

قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۔ (سورہ ۲۴ نور آیت ۳۰)

کہہ دیجئے مسلمانوں سے نیچی رکھیں اپنی نگاہیں اور حفاظت کرتے رہیں اپنی شرم گاہوں کی۔ یہ اُن کے لئے زیادہ تزکیہ (صفائی اور پاکی) کی بات ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔

ع ملاحظہ فرمائیے آیت ۱۶۴ سورہ آل عمران و آیت ۲ سورہ جمعہ جو قبولیت دعا کے سلسلہ میں ص۲۶ پر گذری اور اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ حضرات صحابہ کو کتاب اللہ نے الراشدون کی سند عطا فرمادی اور انہیں رشد و ھدیٰ کا معیار قرار دیا اولئک ھم الراشدون فضلاً من اللہ ونعمۃ۔ (سورہ حجرات)

اسی تزکیہ کو سامنے رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء[1]۔

نوجوانو! جو ازدواجی زندگی کی ضروریات پورا کرنے کی استطاعت اور گنجائش رکھے وہ ازدواجی زندگی اختیار کرے۔ کیونکہ اس سے نگاہ پوری طرح نیچی ہوتی ہے اور فرج کی پوری حفاظت ہوتی ہے اور جس میں یہ گنجائش نہ ہو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ روزے رکھے جو شہوانی رجحانات کو مفلوج اور مضمحل کر دیتے ہیں۔

ایک دوسرے کے مکان میں جانے کے لئے وحی الٰہی نے استیذان کو ضروری قرار دیا کہ پہلے اجازت حاصل کرو۔ استیذان کے ساتھ سلام بھی کرو۔ پھر ارشاد ہوا۔

وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا ھو ازکی لکم واللہ بما تعملون علیم۔ سورہ ۲۴ نور آیت ۲۸۔

اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس ہو جاؤ تو واپس ہو جایا کرو۔ یہی تمہارے لئے صفائی اور ستھرائی (تزکیہ) کی بات ہے اور جو تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے[3]۔

۲۔ معیشت اور کاروبار کے سلسلہ میں تجارت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن تاجر

---

[1] بخاری شریف ص۵۸۔ [2] اسلام تجرد کو پسند نہیں کرتا۔ تجرد رہبانیت ہے اور سادھو پنا ہے۔ جو نصب العین نہیں بن سکتا۔ کیونکہ زندگی کی دلچسپیوں کو ختم کر دیا جائے تو ترقیات کی طرف بڑھنے والے قدم بوجھل ہو جائیں دنیا اپنی رونق کو کھو بیٹھے اور معاشرۂ انسانی کی چہل پہل ختم ہو جائے۔ اسلام ارتقاء اور تعمیر کا حامی ہے وہ کسی گوشہ میں بھی تخریب کو پسند نہیں کرتا صرف اس تخریب کو جائز قرار دیتا ہے جو تعمیر کے لئے ہو۔ [3] شروع سے پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے۔ اے ایمان والو۔ مت جایا کرو۔ گھروں میں اپنے گھروں کے سوا جب تک اُن سے اجازت نہ لے لو اور (اجازت لینے سے پہلے رباقی آئندہ صفحہ پر)

کے لئے ضروری ہے الصدوق الامین (پوری طرح سچا معاملہ کرنے والا امانت دار) ہو [1]
خیانت اور غلط بیانی وغیرہ سے تزکیہ کر چکا ہو۔

ہر طرح کے کاروبار کے سلسلہ میں ارشاد ہوا۔ اللہ تعالیٰ طیب (پاک صاف ستھرا) ہے
وہ پاکی اور ستھرائی کو پسند کرتا ہے اور پاک اور ستھری چیز ہی قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی
ان باتوں کا حکم فرمایا جن کا حکم انبیاء علیہم السلام کو فرمایا تھا۔ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا
یا ایّھا الرّسل کلوا من الطیّبات واعملوا صالحا (اے گروہ پیغمبران۔ پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور
نیک عمل کرو) (اسی طرح مسلمانوں کو خطاب فرمایا) یا ایّھا الّذین اٰمنوا کلوا من طیبات ما
رزقناکم (اے ایمان والو۔ کھاؤ وہ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں) اس کے بعد آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا ذکر کیا جو لمبا سفر کرتا ہے۔ پراگندہ سر۔ گرد سے اٹا ہوا اپنے ہاتھ
آسمان کی طرف پھیلا کر دعا کرتا ہے۔ یارب۔ یارب اور حالت یہ ہے کہ اس کی خوراک حرام
اس کا پانی حرام (ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہوا) اس کا لباس حرام۔ حرام غذا سے اس کا نشوو
نما ہوا۔ ایسے شخص کی دعا کیا قبول ہو سکتی ہے؟ ترمذی شریف تفسیر سورۃ البقرہ ص ۱۲۳ ج ۲
حرص، طمع، خود غرضی۔ بخل۔ نفع اندوزی۔ ناپاک خصلتیں ہیں جن سے تزکیہ ضروری ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کر لو۔ (مثلاً یہ کہو السّلام علیکم) کیا میں حاضر ہو
سکتا ہوں) یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا پورا خیال رکھو گے۔ پھر اگر ان گھروں میں تم کو کوئی
آدمی معلوم نہ ہو۔ تب بھی ان گھروں میں نہ جاؤ۔ جب تک تم کو اجازت نہ دی جائے۔ اور اگر تم سے
کہا جائے کہ واپس ہو جاؤ۔ تو واپس ہو جاؤ۔ یہی تمہارے لئے صفائی ستھرائی کی بات ہے۔

[1] ایسے تاجر کا حشر انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء امت کے ساتھ ہوگا (ترمذی وابن ماجہ
وغیرہ) اس کے برخلاف جو تاجر خیانت کرے (اچھا نمونہ دکھا کر برا مال دے یا ملاوٹ کرے۔ وغیرہ) اس
کے متعلق ارشاد ہوا کہ اس کو مسلمان کہنا درست نہیں (من غش فلیس منا ترمذی شریف ص ۱۵۶ چور بازاری
کرنے والا ملعون ہے۔ المحتکر ملعون (ابن ماجہ وغیرہ)

یہی خصلتیں ربوا اور سود کی علت پیدا کرتی ہیں۔ لہٰذا نہ صرف سود حرام ہے بلکہ ہر ایسا کاروبار اور ہر ایسا معاملہ حرام۔ جس میں سُود کا شبہ ہو۔

سیاسی نظام میں چوٹی کا فرد یعنی سربراہ وہ ہونا چاہیئے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ یعنی تزکیۂ نفس میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (سورہ حجرات)

اللہ کے یہاں سب سے زیادہ مستحق احترام وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس اور پرہیز گار ہو۔

حکومت کیا ہے

اسلام نے نماز اور روزہ کی طرح۔ حفاظت جان ومال عصمت اور آبرو کی حفاظت۔ تعلیم و تربیت۔ امر بالمعروف۔ نہی عن المنکر۔ یعنی اچھی باتیں بتانا ان پر عمل کرانا۔ بُری باتوں سے خود رکنا اور دوسروں کو روکنا۔ عدل و انصاف غریبوں کی پرورش۔ کمزوروں کی مدد مظلوموں کی فریاد رسی۔ بیماروں کی تیمار داری ملک اور قوم کی حفاظت وغیرہ کو بھی افراد کے فرائض قرار دیا ہے۔ یعنی ہر ایک مسلمان کا خود اپنا فرض ہے کہ اپنی پوری طاقت استطاعت ان فرائض کو انجام دینے میں صرف کرے ورنہ وہ عنداللہ جواب دہ ہوگا لیکن جب تک باہمی تعاون نہ ہو بہت[1] سے فرائض ایسے ہیں جو انجام نہیں پا سکتے۔ اسی باہمی تعاون کے وسیع نظام کا نام نظام[2] حکومت ہے اس کے سربراہ کو خلیفۃ المسلمین کہا جاتا

---

[1] مثلاً عدل و انصاف اور مظلوموں کی فریاد رسی کے لئے پنچایتوں یا عدالتوں کا قیام۔ غریبوں اور کمزوروں کے وظائف۔ تعلیم و تربیت کے لئے تعلیمی اور اصلاحی ادارے۔ بیماروں کی تیمار داری کے لئے ہسپتال اور شفاخانے ملک و قوم کی حفاظت کے لئے قوتِ دفاع یعنی فوج اور سامان جنگ وغیرہ

[2] مقصد یہ ہے کہ تمام فرائض جو حکومت کے فرائض قرار دیتے جاتے ہیں اسلام نے ان کو اہل ایمان کے شخصی اور ذاتی فرائض قرار دیا ہے۔ اسلامی تعلیم کے بموجب اگر ان فرائض کا احساس ہوگا تو اس کا مبارک نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کوئی ہیئت جابرہ اور جیرہ دست طاقت نہیں ہوگی جو قانون کے ذریعہ اپنی جیرہ دستی کا مظاہرہ کرے بلکہ نظام حکومت ذریعہ تعاون اور امداد باہمی کا ایک رابطہ ہوگا جس میں ہر ایک فریق (باقی آئندہ صفحہ پر)

ہے یعنی تمام مسلمانوں کا نائب اور ان کا قائم مقام۔

مالی نظام

سیرۃ مبارکہ کا دامن اس جبر و قہر سے پاک ہے جو ٹیکسوں کے وصول کرنے کے لئے عمل میں لایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظامِ حکومت کی مالی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے جو مالیہ وصول کیا جائے اسلام نے اس کی بنیاد بھی تزکیہ پر رکھی ہے۔

خود غرضی۔ حرص و طمع۔ حُبِّ مال اور بخل وہ ناپاک خصلتیں ہیں جن سے نفسِ مومن کا پاک ہونا ضروری ہے۔ یہ نفس کی خباثت ہے کہ دولت و ثروت کی محبت قومی اور ملی ضرورتوں سے اس کی آنکھ بند کر دے۔

جس طرح نماز روزہ فرض ہے ایسے ہی جہاد بھی فرض ہے جو مال سے بھی ہوتا ہے اور جان سے بھی جو اسلام اور ایمان کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کی بیداری یہ ہے کہ مسلسل جہاد کرتا رہے۔ صاحبِ مال جہاد بالمال بھی کرے گا۔ یہ جہاد درحقیقت خود اپنے نفس سے ہوگا۔ وہ نفس جو بارگاہِ بخل[1] اور دربارِ حرص و طمع میں ہر وقت حاضر رہتا ہے اس کو مجبور کرنا ہوگا کہ وہ اس ظلمت کدہ سے نکلے۔ خود غرضی کی غلاظت سے اپنا دامن پاک کرے[2]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: دوسرے کا مدد گار احسان مند اور دعا گو ہوگا قوم اپنے سربراہ اور اس کے کارپردازوں کی شکر گزار اور احسان مند اس لئے ہوگی کہ اُن کے ذریعہ اس کے ذاتی فرائض حسن و خوبی سے انجام پا رہے ہیں۔ سربراہ اور اس کے عمال قوم کے شکر گزار اس لئے ہوں گے کہ قوم کے تعاون نے اُن کی ذمہ داری کی مشکلات کو آسان کر دیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جو اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ترجمہ یہ ہے۔ تمہارے بہترین سربراہ وہ ہیں کہ تم اُن سے محبت کرو وہ تم سے محبت رکھیں۔ تم ان کو دعائیں دو وہ تم کو دعائیں دیں اور بدترین سربراہ وہ ہوں گے کہ تم ان سے بغض رکھو وہ تم سے بغض رکھیں تم اُن پر لعنت بھیجو وہ تم پر لعنت بھیجیں (مسلم شریف ص ۱۲۹ ج ۲)

[1] ان اللہ اشترٰی من المؤمنین انفسہم واموالہم الآیۃ سورہ توبہ

[2] وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ سورہ ۴ نساء آیت ۱۲۸

[3] وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ سورہ ۵۹ آیت ۹۔

ہنگامی اور غیر معمولی ضرورتوں کے لئے جو امداد حاصل کی جائے قرآن حکیم نے اس کو انفاق فی سبیل اللہ یا قرض کا عنوان دیا ہے۔ لیکن ایک مقررہ چندہ جو صاحب نصاب پر سال بہ سال فرض ہوتا ہے اس کا نام زکوٰۃ ہے کیونکہ اس کا مقصد تزکیہ ہے۔ یعنی نفس مومن کو بخل کی آلودگی سے پاک کرنا۔ اس تمہید کے بعد ارشاد ربانی کے مضمرات پر گہری نظر ڈالئے۔

ارشاد ربانی ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ سورہ ۹ توبہ آیت ۱۰۳

(ترجمہ) (اے رسول) اُن لوگوں کے مال سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کر (یہ اس لئے کہ) تم اُن کو (بخل اور حب مال کی پلیدی سے) پاک کرو اور اُن کا تزکیہ کرو۔ (اُن کو سدھاؤ اور اُن کی تربیت کرو کہ ہمدردی خلق خدا۔ سیر چشمی داد و دہش اور امداد باہمی وغیرہ کے وہ عادی ہو جائیں اور یہ باتیں ان کی طبیعت ثانیہ بن جائیں) اور ان کو دعا دو۔ بیشک آپ کی دُعا ان کے دلوں کے لئے راحت و سکون ہے۔

حُبِّ مال سے صحابۂ کرام کے مُبارک قلوب کس درجہ پاک ہوئے۔ حضرات مہاجرین اور حضرات انصار کی قربانیاں اس کی مثال پیش کرتی ہیں۔ حضرات مہاجرین کے پاس جو کچھ تھا وہ انہوں نے مکہ میں خرچ کیا اور اس حالت میں مدینہ پہنچے کہ قرآن حکیم نے اُن کے لئے لفظ فقراء[1] استعمال کیا۔

حضرات انصار کی قربانیاں آپ اسی کتاب میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ تمام جائدادیں نصف نصف تقسیم کر چکے۔ پھر بھی اُن کی آرزو رہتی تھی کہ راہ خدا میں زیادہ سے زیادہ خرچ کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کی جائدادوں سے اُن کے نقصانات کی کچھ تلافی کرنی چاہی تو

---

[1] سورۂ حشر للفقراء المهاجرين الذين اُخرجوا من ديارهم واموالهم۔

تو اس کو لینے سے معذرت کر دی کہ پہلے مہاجرین کو آپ عنایت فرمائیں تب یہ جائیدادیں لیں گے ورنہ ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

حُبِّ جان سے تزکیہ کا اندازہ کرنے کے لئے اس بے پناہ شوقِ شہادت پر نظر ڈالئے جو ان حضرات کے مبارک دلوں اور سینوں میں بھر دیا گیا تھا۔

فزت ورب الکعبہ (میں کامیاب ہو گیا ہوں خدا کی قسم) کسی مجاہد نے دشمن کے قتل کرنے پر نہیں کہا تھا۔ حرام بن ملحان کے جب دھوکہ سے نیزہ مارا گیا اور خون کا فوارہ ابل پڑا تو اس خونِ شہادت سے وضو کرتے ہوئے آپ نے نعرہ لگایا تھا۔[۱]

فزت ورب الکعبہ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا

(میں اپنی مراد کو پہنچ گیا)۔ یہ پرتو تھا اُس آرزوئے شہادت کا جس کے لئے سید الانبیاءؐ کا قلب مبارک بیتاب ہو کرتا تھا آپ فرمایا کرتے تھے میری تمنا ہے کہ راہِ خدا میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔[۲]

حضرت عبداللہ بن حُبشی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا سب سے افضل جہاد کونسا ہے ارشاد ہوا من اھریق دمہ وعقر جوادہ[۳] جس کا گھوڑا بھی مارا گیا اور خود اس کا خون بھی بہا دیا گیا۔

تزکیہ کا عجیب و غریب طریقہ

مرض کے علاج کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ کسی مقوی خمیرہ سے بدن کی اصل طاقت کو بڑھا دیا جائے تو قوتِ غریزہ مرض کو دور کر دے گی۔ شراب جو عرب کی گھٹی میں پڑی تھی اس کے انسداد کیلئے یہی طریقہ اختیار کیا گیا وحی الٰہی ناطق ہوئی۔

---

[۱] قال بالدم ھکذا فنضحہ علی وجہہ ورأسہ ثم قال فزت ورب الکعبہ بخاری شریف ص۵۸۵ اشارہ کر کے بتایا کہ خون کو اس طرح چلو میں لیا اور اس کو چہرے پر ڈالا سر پر چھڑکا اور کہا فزت ورب الکعبہ

[۲] بخاری شریف ص۳۹۲ [۳] ابو داؤد شریف باب بعد باب فی فضل التطوع فی البیت ص۲۱۱ و ص۲۱۲ (مجتبائی)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ۔ (سورہ نساء۔ آیت ۴۳۔)

مسلمانو! ایسا نہ کرو کہ تم نشہ کی حالت میں ہو اور نماز پڑھنی شروع کر دو (نشہ کی حالت میں تو نماز کے پاس بھی نہ جاؤ) نماز کے لئے ضروری ہے کہ تم ایسی حالت میں ہو کہ جو کچھ زبان سے کہو ٹھیک طور پر اسے سمجھتے ہو۔

یہ ارشادِ ربانی خمیرہ مقوی تھا۔ نماز اور اپنے خالق کی بارگاہ میں سر نیاز خم کرنے کی عادت ہو چکی تھی۔ شوقِ نماز نے شوقِ نشہ کو کافور کر دیا۔ شراب سے وحشت ہونے لگی۔ محفل میں دَور اب بھی چلتا تھا۔ مگر دلوں کا سرور ختم ہو چکا تھا۔ اچانک حرمتِ شراب کا اعلان ہو گیا تو نہ شراب باقی رہی نہ محفلِ شراب۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح حضرت ابی بن کعب حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہم) جیسے اکابر کی مجلس تھی۔ شراب کا دور چل رہا تھا ساقی میں خود تھا۔ میں عمر میں بھی سب سے کم تھا۔ منادی کی آواز کانوں میں پڑی۔ مجھ سے کہا گیا باہر نکل کر دیکھو۔ آواز کیسی ہے۔ میں نے آواز سنی اور آ کر کہا۔ اعلان ہو رہا ہے الا ان الخمر قد حرمت (آگاہ ہو جاؤ۔ شراب حرام کر دی گئی ہے)

میزبانِ محفل صاحبِ خانہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے فوراً فرمایا "جاؤ مٹکے اُنڈھا دو" میں نے تعمیل کی۔ اب پورے مدینہ کی حالت یہ تھی کہ شراب گلیوں میں بہہ رہی تھی۔ جیسے ہی اعلان کانوں میں پڑا مٹکے اوندھے کر دیئے گئے کسی نے اس تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ اعلان کون کر رہا ہے۔ کس بنا پر کر رہا ہے۔[۲]

تزکیہ کا عجیب و غریب نمونہ جیتا و بال جان ایک مؤمن کامل سے زنا سرزد ہو گیا۔ دوسرے موقع پر یہی حرکت ایک مومنہ سے بھی سرزد ہو گئی۔ تلافی کا ایک راستہ

---

[۱] بخاری شریف صفحہ ۶۶۳ و صفحہ ۸۳۸ [۲] مسلم شریف صفحہ ۶۰ ج ۲۔

یہ بھی تھا کہ پورے اخلاص کے ساتھ توبہ کر لیتے۔ ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں تھی جب کہ ارشادِ ربانی کا سہارا موجود تھا۔

اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتی	یاعبادی الذین اسرفوا علی
کی اپنے اوپر (گناہ کئے) ناامید	انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ
مت ہو اللہ کی رحمت سے۔ اللہ تعالیٰ	ان اللہ یغفر الذنوب جمیعًا۔
سب گناہ بخش دیتا ہے۔	سورہ ۳۹ الزمر آیت ۵۳

مگر آئینہ کو مانجھنے سے بہتر یہی ہے کہ آئینہ ہی کو توڑ دیا جائے۔ وہ آئینہ ہی کیا جس پر دھبہ پڑ گیا۔ غور فرمائیے اس سے زیادہ تزکیہ کیا ہو سکتا ہے کہ خود اپنی جان وبال ہونے لگے یہ صاحب ان کا نام ماعز تھا۔ ابن مالک۔ خدمتِ مبارک میں حاضر ہوئے۔ فریاد کر رہے تھے

یارسول اللہ طھرنی	یارسول اللہ مجھے پاک کر دیجئے
ارشاد ہوا ویحک ارجع فاستغفر اللہ	بندۂ خدا۔ جاؤ۔ استغفار کرو
وتب الیہ۔	توبہ کر لو۔

یہ ارشاد سن کر کچھ چلے۔ مگر دلِ مضطر کا اضطراب ختم نہیں ہوا۔ پھر لوٹ کر آئے فریاد کرتے ہوئے آتے۔

یارسول اللہ طھرنی۔	یارسول اللہ مجھے پاک کر دیجئے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر واپس کر دیا۔ تین مرتبہ اسی طرح ان کو واپس کیا مگر ان کے اضطراب نے ہر مرتبہ انہیں لوٹنے پر مجبور کیا تب چوتھی مرتبہ فرمایا۔ کس ناپاکی سے پاک کر دوں۔ عرض کیا یارسول اللہ میں نے زنا کیا ہے[1]۔ پھر آپ نے باقاعدہ چار مرتبہ اقرار کیا

---

[1] آپ نے یہ بھی فرمایا۔ تمہیں جنون تو نہیں ہو گیا ہے۔ تمہیں شراب کا نشہ تو نہیں ہے۔ حضرت ماعز نے انکار کیا اور اپنے اعتراف پر قائم اور پاک کرنے کے لئے اصرار کرتے رہے۔ حضرت ماعز پھر بھی مرد تھے۔ ان سے زیادہ حیرت انگیز اور سبق آموز واقعہ قبیلہ غامد کی ایک خاتون کا ہے اس نے اکر اسی طرح (باقی صفحہ آئندہ پر)

اس کے بعد رجم کا حکم صادر کیا گیا۔ چنانچہ ان کو سنگسار کر دیا گیا۔ مگر یہ جو پاک ہونے کے لئے مضطرب تھے اب ان کی پاکی ملاحظہ فرمائیے۔ انھیں ماعز کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی کہ ایسی توبہ ہے کہ اگر پوری اُمت پر بانٹ دی جائے تو سب کے لئے کافی ہو جائے۔
تزکیہ ۔ جو بعثتِ مبارکہ کا اہم مقصد تھا۔ اس کو کس طرح عمل کے پیرایہ میں جلوہ گر فرمایا اس کی وضاحت کے لئے یہ چند مثالیں کافی ہیں ان سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ یہ مقصد کس درجہ ہمہ گیر ہے اس کتاب میں یا کسی ایک کتاب میں اس کے تمام شعبے بیان نہیں کئے جا سکتے۔ لہذا یہ کوشش لاحاصل ہے۔ البتہ اتنی تفصیل بیان کر دینی ضروری ہے۔ جس سے شب و روز کی زندگی میں تزکیہ کا نقشہ اور تزکیہ والے کی ایک تصویر سامنے آ جائے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اعتراف کیا اور یہی اصرار کیا۔ طہرنی۔ مجھے پاک کر دیجئے۔ یہ حاملہ تھی۔ آپ نے فرمایا۔ پہلے ولادت سے فارغ ہو لو۔ جب بچہ ہو گیا تو پھر آئی اور اصرار کیا۔ طہرنی۔ مجھے پاک کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا۔ ابھی بچے کو دودھ پلاؤ۔ دودھ چھوٹنے کے بعد پھر آئی۔ بچہ گود میں اور اس کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا۔ اور یہی اصرار کہ مجھے پاک کر دیجئے۔ فرمایا بچے کا ذمہ دار کون ہو گا۔ ایک انصاری نے بچے کا ذمہ لیا تب اس کو رجم کیا گیا۔ (مسلم شریف ص۶۸ ج۲) حیرت انگیز اور قابل قدر یہ ہے کہ یہ معاملہ خود اس کے اقرار پر تھا، شہادتوں سے اس کا ثبوت نہیں ہوا تھا تو جس مرحلہ پر بھی اعتراف کرنے والا مجرم اپنے جرم کا انکار کر دے اس پر حد نہیں جاری ہو گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوال کر کے کہ تمہیں جنون تو نہیں ہو گیا۔ تم نے نشہ تو نہیں پی رکھا۔ بار بار موقع دیا کہ وہ کسی طرح اپنے جرم کا انکار کر دے۔ اس خاتون کو ولادت پر دودھ پلانے تک کی مہلت دے کر انکار کر دینے کا موقع دیا۔ مگر حیرت ہوتی ہے ان کا ایمان اور اپنے ناپاک ہو جانے کا یقین اتنا مضبوط تھا کہ کسی صورت سے بھی اس میں جنبش نہیں ہوتی اور جس طرح پہلے اعتراف کے وقت اپنی زندگی کو وبالِ جان سمجھ رہے تھے۔ آخر تک وہ ان کو وبال ہی معلوم ہوتی رہی مگر اس ایمان علم کا یہ نتیجہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کی توبہ کی تعریف کی تھی اس خاتون کے متعلق بھی فرمایا کہ ایسی توبہ کی ہے کہ بڑے سے بڑا ظالم بھی ایسی توبہ کرے تو بخشا جائے لے مسلم شریف ص۶۸ ج۲۔

رات دن میں جو کام انسان عادۃً کرتا ہے۔ اور سونے جاگنے. کھانے پینے۔ اٹھنے بیٹھنے میں جو حالات سامنے آتے رہتے ہیں۔ اور گذارتے رہتے ہیں۔ اُن کے آداب کیا ہیں جن کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی۔ اور بندہ اور اس کے خالق کے تعلق کو کس طرح نمایاں فرمایا۔

آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمایئے اور یہ بھی خیال فرمایئے۔ کہ یہ محض زبانی تعلیمات نہیں ہیں۔ بلکہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال اور معمولات ہیں جن سے یہ تعلیمات اخذ کی گئی ہے۔

شب و روز کے حالات و معمولات کا تزکیہ (سنوار)

اسلامی تہذیب کے بنیادی اصول آداب اور دعائیں عمل اور تعلیم

پاک زندگی کیسی ہوتی ہے۔

بنیادی اصول ارشاد ربانی ہے۔

۱۔ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ سورہ ۲ بقرہ آیت ۱۵۲

بس تم یاد رکھو مجھ کو۔ میں یاد رکھوں تم کو اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو۔ (شاہ عبدالقادرؒ)

۲۔ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ سورہ ۱۴ ابراہیم آیت

اگر حق مانو گے۔ تو اور دوں گا۔ اور ناشکری کرو گے تو میری مار سخت ہے (شاہ صاحبؒ)

۳۔ اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (سورہ ۳۳ احزاب آیت ۴۱ و ۴۲)

یاد کرو اللہ کو بہت سی یاد۔ اور پاکی بولو اس کی صبح و شام (ایضاً)

۴۔ فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ (سورہ ۴ نساء آیت ۱۰۳)

جب نماز ادا کر چکو تو یاد کرو اللہ کو کھڑے بیٹھے۔ اور پڑے۔

۵۔ وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ (سورہ ۷ الاعراف آیت ۲۰۵)

اور یاد کرو اپنے رب کو دل میں عاجزی کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اور زبان سے بھی آہستہ آہستہ بغیر پکارے اور ایسا نہ کرنا کہ غافلوں میں سے ہو جاؤ۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (سورہ ۴۷ محمد آیت ۱۲)

اور وہ جو کافر ہیں عیش کرتے ہیں اور اس طرح کھاتے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں اور جہنم ان لوگوں کا ٹھکانا ہے۔

۷۔ وَاِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۔ سورہ ۱۷ اسراء آیت ۱۵

اور جب کسی بستی کی تباہی آتی ہوتی ہے تو اس کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں (نبی کے ذریعہ اُن پہ احکام شریعت نازل کرتے ہیں) پھر وہ بجائے اس کے کہ تعمیل کریں نافرمانی میں سرگرم ہوجاتے ہیں (فسق و فجور کرنے لگتے ہیں) بس اُن پر عذاب کی بات (بربادی کا قدرتی قانون) ثابت ہوجاتی ہے اور پاداش عمل میں) ان کو برباد و ہلاک کر ڈالتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سبق الْمُفَرِّدُوْنَ۔ سبقت لے گئے المفردون[1]

صحابہ کرام ـــــــ یا رسول اللہ المفردون کون۔

ارشاد ہوا الذّاکرونَ اللہَ کثیرًا والذّاکرات وہ مرد اور عورتیں جو کثرت سے اللہ کا ذکر کرتی ہیں[2]

آیاتِ بالا اور حدیث ان اصولوں کی تعلیم دے رہی ہیں۔ جن پر اسلام کی کامل و مکمل تہذیب کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور تعلیم سے رکھی ہے۔

مثبت ـــــــ ذکر اللہ۔ شکر۔ تسبیح۔ تکبیر۔ عاجزی۔ خوفِ خدا[3]۔

---

[1] مسلم شریف صفحہ ۳۴۱ ج ۲ [2] لغت کے لحاظ سے معنیٰ ہیں۔ الگ ہوجانے والے یکسو ہوجانے والے۔

[3] یہ جشن۔ جلوس۔ باجے اور گانے جو دوسری تہذیبوں کے لوازم ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان کے مذہب کی تعلیمات بھی ہیں۔ اسلامی تہذیب کے مزاج کے خلاف اور اسلامی تعلیمات کے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ اسی لئے ان کو حرام قرار دیا گیا۔ انتہا یہ کہ حالاتِ جنگ میں جہاں شوکت و حشمت کا اظہار ضروری سمجھا جاتا ہے۔ بطرد دنیا۔ کی وہاں بھی اجازت نہیں ہے۔ غزوۂ بدر کے موقع پہ کفار قریش بڑی شان (باقی صفحہ آئندہ پر)

منفی ـــــــ جو ناشکری سے پاک ہو۔ اَنعام یعنی مویشی (ڈھوروں اور ڈنگروں) کی مشابہت (جس کو احادیث میں شیطانی عمل کہا گیا ہے۔ اس میں نہ ہو اور اس میں تعیش (عیش پرستانہ اور شاہانہ انداز) نہ ہو۔ یعنی اس میں سادگی ہو۔ سنجیدگی ہو اور کفایت شعاری ہو۔

ان اصولوں کو سامنے رکھیے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور آپ کی تعلیمات ملاحظہ فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بخشے۔

دلیلِ صداقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل سامنے آئے تو یہ بھی غور فرمایئے کہ کیا ایسا شخص (معاذ اللہ) جھوٹا ہو سکتا ہے؟ اور یہ بھی خیال فرمایئے کہ تعلیم سے زیادہ عمل ہے جو تلاوت آیات اللہ کی تشریح کرتا ہے۔

ذکر اللہ حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کی اس درخواست کے جواب میں (کہ کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جس کا میں پابند رہوں) ارشاد ہوا۔

لَا یزال لسانك رطبا من ذکر الله[1]

تمہاری زبان ہر وقت یادِ خدا میں تر رہنی چاہیے

علماء نے اس کی تشریح یہ بھی فرمائی ہے کہ جس وقت اور جس حالت کے لئے جو دعا احادیث میں وارد ہوئی ہے وہ اس موقع پر پڑھی جائے۔ مگر یہ ذکر اللہ کا ہلکا درجہ ہے۔ آیاتِ بالا میں ہدایت ہے کہ ذکر کثرت سے کرو۔ کھڑے۔ بیٹھے اور لیٹنے کی حالت میں بھی اللہ کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے ساتھ اپنی طاقت پر گھمنڈ کرتے ہوئے مکہ سے روانہ ہوتے تھے۔ حضرت حق جل مجدہ نے مسلمانوں کو اس سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرا و رئاء الناس (سورۃ الانفال آیت ۴۷) (ترجمہ) اور ان جیسے نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کی نظر میں نمائش کرتے ہوئے نکلے۔

[1] مشکوٰۃ شریف۔ مسند امام احمد بن حنبل۔

ذکر کرتے رہو۔ (آیت نمبر۴)

ذکر ہلکی آواز سے ہو اور دل سے بھی ہو[1]، غفلت[2] کسی وقت نہ ہو (آیت نمبر۵)

ان آیات کا تقاضا صرف ان دعاؤں کے پڑھ لینے سے پورا نہیں ہوتا۔ جو مختلف حالات کے متعلق احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔ جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ کیونکہ آیات کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی یاد زیادہ سے زیادہ اور ہر حالت میں ہو۔

سید الانبیاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہاں بھی نرالی ہے۔ وہ تمام اوراد و وظائف جو حضرات علماء کرام اور مختلف سلسلوں کے مشائخ طریقت کی تعلیمات میں رائج ہیں ان سب کا مصدر و ماخذ وہ سینۂ مبارک ہے جو گنجینۂ اسرار و معارف تھا۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

صرف استغفار کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم گن لیا کرتے تھے کہ ایک ہی مجلس میں آپ کی زبان مبارک سے سو مرتبہ یہ کلمات صادر ہو جایا کرتے تھے۔

ربّ اغفر لی وتب علیّ انک انت التواب الرحیم۔

اے میرے رب میری مغفرت فرما۔ اور مجھ پہ نظر عنایت فرما۔

بلاشبہ تو بہت توبہ قبول کرنے والا بہت رحمت والا ہے۔

یہ زبان مبارک کا ذکر تھا اور قلب مبارک کی شان یہ تھی کہ وہ حالت خواب میں بھی بیدار رہتا تھا۔ اور حضرت حق کی طرف اتنا متوجہ کہ آپ کی رویا (خواب) بھی وحی[3] ہوتی تھی۔ گہرے مراقبہ میں قلب زیادہ سے زیادہ متوجہ رہتا ہے اور اعضا بے حس و حرکت۔ تقریباً یہی شان ہوتی تھی جب چشم نیم باز محو خواب ہوتی تھی ان عینی تنامان ولا ینام قلبی[4]۔

---

[1] حضرات مشائخ طریقت رحمہم اللہ ذکر کی مختلف صورتیں بتاتے ہیں۔ ذکر بالجہر۔ ذکر خفی۔ ذکر اخفی وغیرہ۔ پاس انفاس، مراقبہ وغیرہ ان کا ماخذ اسی طرح کی آیتیں ہیں۔ [2] قلب میں ذکر اللہ جاری اور مراقبہ قائم رہے [3] بخاری شریف ص۲۵ [4] بخاری شریف ص۱۵۲۔

شب و روز کے حالات و معمولات اور اُن کے آداب و دعائیں

جو حالات و معمولات ذیل میں بیان کئے جا رہے ہیں اُن کے متعلق بہت سی دُعائیں روایات میں وارد ہیں۔ حضرات محدثین نے اُن کو ضخیم جلدوں میں جمع کیا ہے۔ ہم یہاں مختصر آداب اور صرف ایک ایک دُعا پیش کر رہے ہیں۔ نمونہ اور مثال مقصود ہے۔ استیعاب کا نہ مقام ہے نہ مقصود۔ اللہ تعالیٰ ان نمونوں پر ہی عمل کی توفیق بخشے۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔

معمولات شب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے ایک تہائی رات تک نماز عشاء پڑھ لی جائے۔ اس کے بعد آرام کیا جائے قصہ کہانی اور باتوں کے لئے مجلس جمانا درست نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عشا سے پہلے سو جانے اور نماز عشا کے بعد باتیں کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ البتہ سفر یا علمی یا ملی ضرورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ارشاد ہوا جب آپ سونے کا ارادہ کریں تو وضو کیجئے۔ جیسے نماز کیلئے وضو کی جاتی ہے جب لیٹنے کا ارادہ کریں تو پہلے بستر کو جھاڑ لیں۔ لیٹنے لگیں تو یہ دُعا پڑھیں۔

باسمك ربی وضعت جنبی وبك	تیرے ہی نام پر اے میرے پروردگار میں
ارفعه ان امسكت نفسی	نے اپنی کروٹ (بستر پر) رکھی ہے اور تیرا ہی
فارحمها وان ارسلتها	نام لیکر اس کو اٹھاؤں گا اگر تو میری جان کو
فاحفظها بما تحفظ به	(روک لے اسی حالت میں انتقال ہو جائے)
عبادك الصالحين۔	تو اس پر رحم فرما اور اگر میری جان کو چھوڑ دے

لہ حدیث ابی ہریرہ ترمذی شریف باب کراہۃ النوم قبل العشاء والسمر بعدہا۔ لہ ترمذی شریف۔ باب ما جاء فی الرخصۃ فی السمر بعد العشاء۔ لہ بخاری شریف صفحہ ۹۳۴۔ لہ ایضاً لہ ایضاً۔ عہ احقر کا رسالہ "دعائیں" ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں تمام دعائیں جمع کر دی ہیں۔ ترجمہ بھی ساتھ ہے اور دعاؤں پر زیر زبر پیش لگا دیئے ہیں۔

(زندگی میں بیدار ہو جاؤں) تو اسکی اسی
طرح حفاظت فرما جس طرح تو اپنے
نیک بندوں کی حفاظت کیا کرتا ہے۔

پھر آپ دہنی کروٹ پر لیٹیں۔ داہنا ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ لیں اور یہ دعا پڑھیں[1]

اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ وَجْھِیَ اِلَیْكَ وَ	اے اللہ میں نے اپنی ذات تجھے سونپ دی اپنا
فَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَیْكَ وَ اَلْجَاْتُ	معاملہ تیرے سپرد کر دیا اپنی کمر تیری پناہ میں دیدی
ظَھْرِیْ اِلَیْكَ رَھْبَةً وَّ رَغْبَةً	تیرے جلال سے ڈرتے ہوئے اور تیری رحمت اور
اِلَیْكَ	تیرے لطف و کرم کی طرف رغبت کرتے ہوئے۔
لَا مَلْجَاءَ وَلَا مَنْجَاَ مِنْكَ اِلَّا	نہیں کوئی پناہ اور نہ تجھ سے نجات پانے کی
اِلَیْكَ۔	جگہ مگر تیری ہی طرف (تیرا ہی دامن)
اٰمَنْتُ بِکِتَابِكَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَ	میں ایمان لایا تیری کتاب پر جو تو نے نازل
بِنَبِیِّكَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ۔	کی اور ایمان لایا میں تیرے نبی پر جس کو تو نے بھیجا

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ جب سونے کو لیٹو تو اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ الحمد للہ ۳۳ مرتبہ اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ پڑھ لیا کرو[2] (اور سبحان اللہ بھی ۳۳ مرتبہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قل ہو اللہ اور معوذتین بھی تین تین مرتبہ پڑھا کرتے تھے ہر مرتبہ دونوں دست مبارک پر دم کرتے۔ دونوں ہاتھ بدن کے سامنے کے حصے پر پھیر لیتے تھے[3]

بیداری کے وقت یہ دعا۔

الحمد للہ الذی احیانا بعد	تمام تعریفیں اس خدا کے لئے جس نے ہمیں زندہ
ما اماتنا والیہ النشور	کیا اس کے بعد کہ ہمیں مار دیا تھا (سلا دیا تھا) اور
	اللہ ہی کی طرف ہے مرنے کے بعد زندہ ہو کر جانا۔

---

[1] ایضاً بخاری شریف صـ۹۳۲ [2] بخاری شریف صـ۹۳۵ [3] ایضاً بخاری شریف صـ۹۳۵ و صـ۷۵۰۔

نیز یہ دعا۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ وَرَبَّ الْاَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰى وَمُنْزِلَ التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْفُرْقَانِ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْءٍ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهٖ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ اِقْضِ عَنَّا الدَّيْنَ وَاَغْنِنَا مِنَ الْفَقْرِ

اے اللہ اے آسمانوں کے پروردگار زمین کے پیدا کرنے والے اور عرش عظیم کے مالک اے ہمارے پروردگار اور ہر چیز کے مالک اور پروردگار دانے کو پھاڑنے والے گٹھلی کو چیرنے والے (جس سے پودا نمودار ہو) توراۃ انجیل اور قرآن کو نازل کرنے والے میں تیری پناہ لیتا ہوں ہر اس چیز کے شر سے جس کی تو پیشانی کے بال پکڑے ہوئے ہے جو تیرے قبضہ قدرت میں ہے۔ اے اللہ تو ہی ہے اول پس تجھ سے پہلے کوئی نہیں اور تو ہی آخر پس کوئی نہیں جو تیرے بعد ہو۔ اور تو ہی ہے ظاہر پس تیرے اوپر کوئی نہیں اور تو ہی ہے باطن پس تیرے ورے (تجھ سے زیادہ نزدیک) کوئی نہیں ادا کر دے ہمارے ذمہ سے قرض اور بے نیاز کر دے ہم کو فقر سے۔

تہجد کے وقت جو دعائیں پڑھا کرتے تھے ان میں ایک یہ بھی تھی۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَيِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ مَلِكُ السَّمٰوٰتِ

اے اللہ تیرے ہی لئے ہے سب تعریف تو ہی ہے قائم رکھنے والا آسمانوں اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان میں ہیں اور تیرے ہی لئے ہے تمام تعریف تو ہی ہے نور (رونق) آسمانوں کی زمین کی اور ان تمام چیزوں کی جو ان میں ہیں۔

---

۱ مسلم شریف ص۲۳۱ ۲ بخاری شریف ص۹۳۴

وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ
الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ
الْحَقُّ وَ لِقَاءُكَ حَقٌّ
وَ قَوْلُكَ حَقٌّ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ
وَالنَّارُ حَقٌّ وَالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ
وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ حَقٌّ
اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَ بِكَ
اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْكَ
اَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ وَاِلَيْكَ
حَاكَمْتُ فَاغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ
وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ
وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ
بِهٖ مِنِّيْ لَآ اِلٰهَ اَنْتَ اَنْتَ
الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا
اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ - وَلَا اِلٰـــهَ
غَيْرُكَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ
اِلَّا بِاللّٰهِ -

اور تیرے ہی لئے ہے حمد۔ تو ہی بادشاہ آسمانوں
کا زمین کا اور ان سب کا جو ان میں ہیں اور
تیرے لئے ہی ہے تعریف تو ہی ہے حق تیرا
وعدہ حق تیرے سامنے حاضر ہونا حق تیرا قول
حق جنت حق دوزخ حق، تمام انبیاء حق
محمد حق، قیامت حق۔ اے اللہ میں تیرا
مطیع ہوں، تجھ پر ایمان لایا، تجھ پر ہی
بھروسہ رکھتا ہوں، تیری ہی طرف رجوع
ہوتا ہوں اور تیرے ہی لئے مخاصمت
کرتا ہوں اور تجھ ہی کو اپنا منصف بناتا
ہوں پس بخش دے ان (گناہوں) کو جو
میں نے آگے کئے اور جو پیچھے کئے اور جو
چھپا کر کئے اور جو علانیہ کئے اور وہ تمام گناہ
جن کو میں نہیں جانتا تو اُن کو مجھ سے بہت
زیادہ جانتا ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں
ہے۔ تو ہی ہے آگے لانے والا اور تو ہی ہے
پیچھے رکھنے والا۔ صرف تو ہی معبود ہے۔

تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور نہیں کوئی
خود فکر کی طاقت (تدبیر) نہ کوئی عمل کی قوت تیرے بغیر

نماز تہجد اور دُعاء

ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ تھیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

کو اپنے بچپن ہی میں شوق ہوا کہ دیکھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کس طرح پڑھتے ہیں چنانچہ رات کو خالہ میمونہ کے یہاں پہنچ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب رات کا ایک حصہ گذر گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوتے۔ قضاء حاجت کے بعد آپ مشکیزہ پر تشریف لے گئے جو لٹکا ہوا تھا۔ بڑے اطمینان سے پوری طرح وضو کیا اچھی طرح مسواک فرمائی اسی اثناء میں آپ نے سورۃ آل عمران کا آخری رکوع پورا پڑھا۔ پھر آپ نے اطمینان سے نماز شروع کی میں نے آپ کے بائیں جانب کھڑے ہو کر نیت باندھ لی آپ نے دست مبارک میرے کان پر رکھا اور مجھ کو دائیں جانب کر لیا۔[۱]

تہجد کے بعد آپ نے جو دعا مانگی اس میں یہ بھی تھا[۲]

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَ	اے اللہ میرے دل میں نور بھر دے
فِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَفِیْ سَمْعِیْ	میری سماعت میں نور بھر دے
نُوْرًا وَعَنْ یَمِیْنِیْ نُوْرًا وَعَنْ	میرے دائیں نور کر دے میرے بائیں
یَسَارِیْ نُوْرًا وَفَوْقِیْ نُوْرًا وَتَحْتِیْ	نور کر دے میرے اوپر نور کر دے میرے
نُوْرًا وَاَمَامِیْ نُوْرًا وَخَلْفِیْ نُوْرًا	نیچے نور کر دے میرے آگے نور کر دے میرے
وَاجْعَلْ لِیْ نُوْرًا۔	پیچھے نور کر دے اور میرے لئے نور مقرر کر دے

تہجد میں قرأت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں عموماً گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔ پہلے چار رکعت۔ مت پوچھو وہ کس قدر طویل اور کس قدر پُر لطف ہوتی تھیں۔ پھر چار رکعت۔ مت پوچھو کہ وہ کس قدر طویل اور کس قدر پُر کیف ہوتی تھیں۔ پھر تین رکعت پڑھا کرتے تھے۔[۳]

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ نے چار رکعتوں میں چار سورتیں ختم کیں۔ سورہ بقرہ۔ سورہ آل عمران۔ سورہ نساء اور سورہ مائدہ یا سورہ الانعام (گویا ایک چوتھائی قرآن شریف پڑھ لیا۔[۴]

---

۱ بخاری شریف صـ۲۲ وصـ۲۵ وصـ۳۰ ۲ بخاری شریف صـ۹۳۵ ۳ بخاری شریف صـ۱۵۴ ۴ ابوداؤد وباب القول فی الرکوع

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب بڑھاپے کی وجہ سے ضعف غالب ہو گیا تو آپ قرأت بیٹھ کر کیا کرتے تھے اور جب تیس چالیس آیتیں رہ جاتیں تو کھڑے ہو کر پڑھا کرتے تھے[1] تاریکیٔ شب انہیں انوار سے منور رہتی تھی۔ یہاں تک کہ سپیدۂ صبح طلوع ہوتا اور مؤذن اذان پڑھتا اس وقت آپ فجر کی دو رکعت پڑھتے اور تھوڑی دیر داہنی کروٹ پر لیٹ کر آرام فرما لیتے[2] اور کبھی ایسا ہوتا صبح صادق سے کچھ پہلے نوافل سے فراغت پاکر کچھ دیر آرام فرماتے یہاں تک کہ مؤذن کی اذان پر اٹھ جاتے اور وضو فرما کر نماز صبح کے لئے تشریف لے جاتے[3]

وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ہ (سورۃ الذاریات)

اوقاتِ سحر (آخر شب) میں وہ استغفار کیا کرتے ہیں۔

وقت صبح لطف کی بات یہ ہے کہ رات بھر کے مجاہدہ اور ریاضت کے بعد بھی احساس یہی ہے کہ حق عبودیت ادا نہیں ہوا لہٰذا صبح ہو رہی ہے تو یہ استغفار پڑھا جا رہا ہے جس کو اہل علم سید الاستغفار کہتے ہیں۔

سید الاستغفار	
اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِىْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ۔ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ وَعَلَىَّ وَاَبُوْءُ لَكَ بِذَنْبِىْ فَاغْفِرْ لِىْ اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ۔	اے اللہ تو ہی ہے میرا رب تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو نے ہی مجھ کو پیدا کیا میں تیرا بندہ ہوں میں تیرے عہد پر اور تیرے وعدے پر قائم ہوں، جہاں تک میں طاقت رکھتا ہوں میں اقرار کرتا ہوں تیری نعمت کا جو مجھ پر ہے اور اقرار کرتا ہوں اپنے گناہ کا جو تیرے حق میں میں نے کیا بس میرے گناہ بخش دے بیشک تیرے سوا کوئی گناہ نہیں بخش سکتا جو گناہ میں کر چکا ہوں ان کے شر سے بچنے کیلئے تیری پناہ لیتا ہوں[4]

---

[1] بخاری شریف ص۱۵۴ [2] ایضاً ص۱۵۵ [3] ایضاً ص۱۵۴ [4] بخاری شریف ص۹۳۳۔

صبح شام | دن یا رات کا آغاز ہوتا تو زبان مبارک پر جو دُعائیں جاری ہوتیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

اَمْسَیْنَا وَ اَمْسَی الْمُلْکُ لِلّٰہِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ۔	ہماری شام ہوگئی اللہ کے تمام ملک کی شام ہوگئی۔ سب تعریف اللہ کے لیے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ یکتا اور تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اسی کا ملک ہے اسی کے لیے حمد ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔
اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مِنْ خَیْرِ ھٰذِہِ اللَّیْلَۃِ وَخَیْرِ مَا فِیْھَا وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّھَا وَشَرِّ مَا فِیْھَا اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْکَسَلِ وَالْھَرَمِ وَ سُوْءِ الْکِبَرِ وَفِتْنَۃِ الدُّنْیَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ۔	میں تجھ سے التجا کرتا ہوں اس رات کی بھلائی کی جو اس رات میں اور میں تیری پناہ لیتا ہوں اس رات کی خرابی سے اور ان تمام چیزوں کی خرابی اور شرارت سے جو اس رات کے اندر ہیں اور تیری پناہ لیتا ہوں کسل سے بیکار کر دینے والے بڑھاپے اور بڑھاپے کے بُرے دور سے اور تیری پناہ لیتا ہوں دنیا کے فتنہ سے اور عذاب قبر سے۔

اوقاتِ شب کی تقسیم

معمولاتِ شب کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پوری رات کا نظام الاوقات بھی پیش کر دیا جائے۔ سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے والد ماجد سیّدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان

۱؎ مسلم شریف۔ ۲؎ شمائل ترمذی شریف باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

فرمایا ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

ایک حصہ۔ خاص اپنی ذات کے لئے

ایک حصہ۔ اللہ تعالیٰ کے لئے

ایک حصہ۔ اپنے اہل کے لئے

(یہ تین حصے ہوتے تھے مگر مساوی نہیں)۔

جو حصہ اپنے آرام کے لئے مخصوص فرماتے تھے اس کو بھی تقسیم کر دیتے تھے اس میں سے ایک حصہ عامۃ الناس کو عطا فرماتے تھے۔ مگر براہِ راست نہیں۔ بلکہ خواص کے ذریعہ۔

اس مجلس میں خاص خاص حضرات حاضر ہوتے تھے اور خصوصیت کا معیار ہوتا تھا عوام کی زیادہ سے زیادہ خیر خواہی اور ہمدردی۔

پس جو شخص عوام کی ہمدردی۔ خیر خواہی اور عوام کا بوجھ برداشت کرنے میں بڑھا ہوا تھا وہ آپ کی بارگاہ کا مقرب خصوصی ہوتا تھا۔ پھر ان خواص میں مدارِ ترجیح ہوتا تھا علم و عمل۔

اس معیار پر درجات مقرر کرنا اور ہر ایک کو اسکے درجہ کے مطابق وقت دینا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر موقوف ہوتا تھا۔ یہ حضرات آتے کوئی ایک کام لے کر۔ کوئی دو کام۔ کوئی اس سے زائد۔ آپ ان میں مشغول رہتے۔ ان کی طرف حسب حیثیت و حسب ضرورت توجہ فرماتے تھے اور ان حضرات کو عوام میں مشغول فرما دیتے۔ یعنی آپ خود اُن کے معاملات میں بھی اُن کو ہدایت دیتے اور ان کی رہنمائی فرماتے اور ان کے ذریعہ عوام کے حالات اور انکے رجحانات معلوم فرماتے۔ پھر ان باتوں کی تلقین فرماتے جو اُن کے لئے بھی مفید ہوتیں اور عوام کے لئے بھی۔ آپ کی خاص ہدایت ہوتی کہ ان باتوں کو ان تک پہنچا دیں جو یہاں نہیں حاضر ہو سکتے۔

اس کے علاوہ ان کو خاص تاکید ہوتی کہ عوام کی ضرورتیں جو خود وہ نہیں پہنچا سکتے۔ یہ حضرات ان کو دربار رسالت میں پیش کریں۔

ارشاد ہوتا کہ۔

من ابلغ سلطاناً حاجۃ من لا یستطیع ابلاغھا ثبت اللّٰہ قدمیہ یوم القیامۃ۔

جو شخص اس پسماندہ کی ضرورت صاحب اقتدار تک پہنچائے جس کو وہ خود نہیں پہنچا سکتا تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے روز ثابت قدم رکھے گا۔

یہ حضرات اس بارگاہ میں طالب بن کر حاضر ہوتے تھے اور رہنما بن کر یہاں سے باہر آتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اوقاتِ شب کی تقسیم اس طرح ہوتی۔ ثلثِ اوّل کے ختم تک نماز عشاء اور اس سے پہلے نماز مغرب۔ نوافل۔ پھر اگر مہمان ہوتے تو ان کا کھانا وغیرہ۔ ثلث سوم جس کو احادیث میں ثلث اللیل الآخر فرمایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لیے۔ درمیان کا ثلث اُمت کے لئے بذریعہ خواص نیز اہل کیلئے اور آرام فرمانے کیلئے۔

اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (سورہ مزمل)

بیشک تم کو دن میں بہت کام رہتا ہے

دن کے اوقات، معمولات، مشاغل اور دعائیں

دن کے اوقات اور مشاغل کو سوانح حیات کہا جاتا ہے۔ یہ تمام کتاب سوانح حیات کی کرن ہے یہاں ان چند معمولات کے آداب لکھے جاتے ہیں جن پر ہر شخص کو لامحالہ عمل کرنا پڑتا ہے۔

مکان سے نکلتے وقت:

۱- بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ	اللہ کے نام پر اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے
لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ	اس سے بہتر کوئی طاقت ہے نہ قوت۔
۲- بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ	اللہ کے نام پر اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ مِنْ	اے اللہ ہم پناہ لیتے ہیں تیری اس سے کہ ہمارے قدم
اَنْ نَزِلَّ اَوْ نَضِلَّ اَوْ نَظْلِمَ	ڈگمگا جائیں یا ہم گمراہ ہو جائیں یا ہم ظلم کریں یا ہم
اَوْ نُظْلَمَ اَوْ نَجْھَلَ	مظلوم ہوں (ہم پر ظلم کیا جائے) یا ہم جہالت کریں (لڑیں
اَوْ یُجْھَلَ عَلَیْنَا۔	جھگڑیں) یا ہم پر جہالت کی جائے (ہم سے لڑا جھگڑا جائے)۔

مکان میں داخل ہوتے وقت پہلے یہ دُعا پڑھیئے۔ پھر اہل خانہ کو سلام کیجیئے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ خَیْرَ	اے اللہ میں التجا کرتا ہوں تجھ سے اچھے داخلہ
الْمَوْلِجِ وَخَیْرَ الْمَخْرَجِ	کی اور اچھے خارجہ کی۔
بِسْمِ اللّٰہِ وَلَجْنَا وَعَلَی اللّٰہِ	اللہ کے نام پر ہم داخل ہوتے ہیں اور اللہ پر
رَبِّنَا تَوَکَّلْنَا۔	جو ہمارا رب ہے ہم بھروسہ کرتے ہیں۔

بازار میں داخل ہوں:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا	خدا وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کوئی معبود نہیں
شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَ	اُسی کا ہے ملک اُسی کی ہے حمد وہی زندگی بخشتا
لَہُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ	ہے وہی موت دیتا ہے اور وہ خود زندہ ہے اس
وَھُوَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ بِیَدِہِ	کو موت نہیں اسی کے قبضہ میں ہے خیر اور بھلائی
الْخَیْرُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ	اور وہ ہر چیز پہ قادر ہے۔

مجلس سے اُٹھتے وقت:

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ	اے اللہ میں تیری پاکی کا اقرار کرتے ہوئے تیری حمد کرتا
اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ	ہوں میں شہادت دیتا ہوں کہ تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں
اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ	میں تیری مغفرت چاہتا ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں (توبہ کرتا ہوں)

---

[1] صحاح بحوالہ مشکوٰۃ ۔ [2] ابوداؤد ابن ماجہ از مشکوٰۃ [3] ترمذی شریف ۔ ابن ماجہ مشکوٰۃ شریف
[4] ترمذی شریف ۔

کوئی پریشانی پیش آئے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْعَظِیْمُ الْحَلِیْمُ۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ
لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ

کسی پریشان حال معذور یا مجبور پر نظر پڑ جائے تو

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَافَانِیْ	حمد اس اللہ کی جس نے مجھے عافیت بخشی اس سے
مِمَّا ابْتَلَاکَ بِہٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی	جس میں تجھ کو مبتلا کیا اور مجھے ان میں سے بہت سوں پر
کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا۔	فضیلت بخشی جنکو پیدا کیا (بہت سی مخلوق پر فضیلت بخشی)

یہ چند حالات اور ان کے متعلق دعائیں اور آداب بیان کئے گئے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے حالات ہیں۔ مثلاً کھانا۔ پینا۔ انسانی حوائج پوری کرنا۔ جنسی تعلق کو عمل میں لانا۔ یا مثلاً چھینکنا۔ جمائی لینا۔ نیا لباس پہننا۔ نیا پھل دیکھنا۔ چاند دیکھنا۔ بارش برسنا۔ بادل گرجنا۔ آندھی۔ طوفان۔ چاند گہن۔ سورج گہن۔ بیماری۔ علاج۔ بیماری کے مختلف حالات۔ یا مثلاً دشمن کا دباؤ۔ مقدمہ وغیرہ۔ یا مثلاً سفر کرنا۔ سفر کے لئے روانہ ہونا۔ کہیں پڑاؤ ڈالنا۔ کسی کا مہمان بننا۔ کسی مقام پر قیام کے لئے اُترنا۔ روانہ ہونا۔ یا مثلاً تقریبات میں شرکت وغیرہ وغیرہ ان سب کے آداب ہیں۔ احادیث مبارکہ میں دعائیں وارد ہوئی ہیں بقول حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اُمت محمدیہ کو اس کے آقا نامدار (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہر بات بتائی ہے حتیٰ کہ قضاء حاجت کا طریقہ بھی بتایا ہے[1] اور یہی معنے ہیں "تزکیہ کامل" کے، کہ زندگی کے ہر ایک گوشہ اور ہر ایک جزو کو آپ نے سنوارا ہے۔ "فداہ روحی وابی واُمی" صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ان سب کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مشاغل شب کے سلسلہ میں سونے اور جاگنے کے کچھ آداب اور دعائیں بیان کی گئیں اب دن کے کاموں میں ملاقات کے آداب بیان کئے جا رہے ہیں۔ پھر مجلس مبارک کے آداب اور خصوصیات پر اس بیان کو ختم کیا جا رہا ہے۔

---

[1] ترمذی و ابن ماجہ۔

آداب ملاقات

آپ کسی کے یہاں جائیں :

۱۔ پہلے اجازت حاصل کیجیے۔ مکان پر پہنچ گئے ہیں تو سلام بھی کیجیے اور یہ کہیے۔ السّلام علیکم، کیا حاضر ہو سکتا ہوں۔ اگر اجازت مل جائے تو اندر جائیے اور اگر صاحب مکان معذرت کر دے تو واپس ہو جائیے بُرا نہ مانیے[۱]

۲۔ اگر اندر سے جواب نہ آئے تو دوسری مرتبہ پھر تیسری مرتبہ اسی طرح سلام کیجیے۔ پھر آپ سمجھ لیجیے کہ اس وقت ملاقات کا موقع نہیں ہے۔ کوئی عذر ہے۔ لہٰذا واپس ہو جائیے اور بُرا ہرگز نہ مانیے[۲]

۳۔ اجازت لینے کے وقت آپ آڑ میں کھڑے ہوں۔ ایسی جگہ نہ کھڑے ہوں کہ سامنا ہو البتہ اگر صاحب مکان جن سے اجازت لینی ہے سامنے ہوں تو آپ سلام کریں اور اندر حاضر ہونے کی اجازت لے لیں[۳]

۴۔ اندر جھانکنا معیوب ہے۔ ارشاد ہوا۔ اذا دخل البصر فلا اذن[۴] جب نظر اندر پہنچ گئی تو اب اجازت لینے کا کیا مطلب ؟

۵۔ خود اپنے مکان میں بھی سلام کر کے اور پکار کر جائیے۔ گھر میں پہنچ کر گھر کے آدمیوں کو سلام کیجیے[۵]

۶۔ سلام۔ دعا ہے، گرم جوشی سے دعا کرو اور بڑھا کر کہو۔ یعنی یہ کہو۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

۷۔ اگر اندر سے پوچھا جائے کون۔ تو آپ نام بتائیں۔ یہ نہ کہیں "میں" اندر والا

---

[۱] آیت ۲۷ سورہ ۲۴ نور [۲] ترمذی شریف و ابوداؤد شریف [۳] ابوداؤد شریف [۴] ابوداؤد شریف [۵] سورہ ۲۴ نور آیت ۶۱ [۶] تحیۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ۔ سورہ نور آیت ۶۱۔

کیا جانتے میں "کون" [1]

۸۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی کو ہدایت فرمائی۔ ناغہ کر کے ملنے جایا کرو۔ اس سے محبت بڑھے گی [2]

۹۔ آپ نے رات کو کسی کے یہاں پہنچ جانے سے ممانعت فرمادی یہاں تک کہ بلا اطلاع اپنے گھر میں پہنچنے کی بھی اجازت نہیں دی [3]

۱۰۔ اندر داخل ہو کر سب سے بڑھیا جگہ نہ بیٹھئے [4] جہاں جگہ ملے بیٹھ جائیے۔ یہ صاحب مکان کا کام ہے کہ وہ آپ کو کہاں بٹھائے۔

کوئی آپ کے یہاں آئے حضرت زید بن حارثہ حاضر خدمت ہوئے تو سید الانبیاء کرتا اتارے ہوئے تھے۔ چادر کا ایک کنارہ مونڈھے پر تھا۔ خبر پاتے ہی شوق ملاقات میں کھڑے ہو گئے ان کو گلے لگایا۔ سر کو بوسہ دیا۔

حضرت ام ہانی خدمت مبارک میں حاضر ہوئیں۔ آپ نے فرمایا مرحبا ام ہانی "ام ہانی مرحبا" [5]

بنی قریظہ کے معاملہ میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو سرپنچ بنایا گیا تھا وہ فیصلہ سنانے کے لئے مسجد میں آتے تو آپ نے حاضرین سے فرمایا۔

قوموا الی سیدکم۔ تمہارے سردار آ رہے ہیں کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرو [6]

غزوۂ حنین کے بعد ایک وفد کے ساتھ آپ کی رضاعی بہن شیما آئیں تو فرط مسرت سے آپ نے مرحبا فرمایا۔ اپنی چادر بچھا دی اور اپنے پاس ان کو چادر پر بٹھایا۔ [8]

مختصر یہ کہ آنے والے کے متعلق تعلیم یہ ہے کہ

ان کی آمد پر خوشی ظاہر کی جائے۔ کھڑے ہو کر استقبال کیا جائے۔ مصافحہ کے لئے

---

[1] ابوداؤد شریف [2] صحاح [3] ترمذی شریف [4] ترمذی شریف وغیرہ [5] ترمذی شریف ص ۹۹ ج ۲ [6] ترمذی شریف ص ۹۹ ج ۲ [7] بخاری شریف ص ۹۲۳ [8] الاصابہ۔ ذکر شیما۔

ہاتھ بڑھائیے۔ کچھ عرصہ بعد ملاقات ہوئی ہے تو معانقہ بھی کیجیے۔ پھر تعظیم سے بٹھائیے۔ بڑے کی بڑائی اپنی جگہ۔ جب وہ آپ کے یہاں آیا ہے تو اخلاق سے پیش آنا آپ کا فرض ہے ارشاد گرامی ہے کہ بدترین شخص وہ ہے کہ لوگ اس سے اس لئے ملنا پسند نہ کریں کہ وہ بدخو اور ترش مزاج ہے۔[۲]

واپس ہو جب کوئی رخصت ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محبت اور مہربانی سے اس کا ہاتھ اپنے دست مبارک میں لیتے اور جب تک وہ اپنا ہاتھ نہ ہٹاتا۔ آپ اس کا ہاتھ لئے رہتے اور یہ دعا فرماتے۔

استودع اللہ دینکم و — اللہ کے سپرد کرتا ہوں تمہارا دین۔ تمہارا

ایمانکم وخواتیم اعمالکم۔[۳] — ایمان اور خاتمہ اعمال۔

سلام و جواب سلام ارشاد ربانی ہے۔

اِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا
إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا۔ سورہ نساء

جب تم کو دعا دی جائے کوئی دعا (مثلاً سلام کیا جائے)
تو تم بھی دعا دو اس سے بہتر یا وہی کہو الٹ کر بے شک
اللہ ہے ہر چیز کا حساب کرنے والا۔

سلام کا بہتر جواب یہ ہے کہ رحمۃ اللہ و برکاتہ و مغفرتہ بڑھا دو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی ہے کہ ان میں سے ہر لفظ پر دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ جیسے جیسے الفاظ بڑھتے رہیں گے ثواب بڑھتا رہے گا۔[۴]

---

[۱] بخاری شریف صفحہ ۹۲ [۲] بخاری شریف صفحہ ۹۰۵ [۳] ترمذی شریف صفحہ ۱۸۲ ج ۲

[۴] ابوداؤد شریف صفحہ ۳۵۹ ج ۲

دربارِ نبوی

یعنی بزمِ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات اور آداب

ماخوذ از شمائل ترمذی شریف

(۱) رحمۃ للعالمین محبوبِ ربّ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک علم وحیا، صبر، امانت سکون واطمینان کی مجلس ہوتی تھی۔

(۲) حاضر و غائب اہلِ مجلس سے ایسا تعلق خاطر رہتا کہ ہر شخص رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا باپ سمجھتا، ہر موقع پر ہر ایک کی خبرگیری ہوتی۔ ساتھیوں میں سے کوئی نظر نہ آتا تو اس کی خیریت معلوم کی جاتی۔ اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی مزاج پُرسی کے لئے اس کے یہاں تشریف لے جاتے۔ اگر کوئی سفر میں جاتا تو اس کے لئے دعا فرماتے رہتے۔ اگر معلوم ہوتا کوئی رنجیدہ ہے تو اس کی دلداری فرماتے۔ اگر کسی سے کوئی خطا ہو جاتی تو اس کا عذر قبول فرماتے آپس کے معاملات کی تحقیق ہوتی۔ پھر اُن کی اصلاح فرمائی جاتی۔ حضورؐ کے دربار میں امیر و غریب۔ کمزور و قوی سب برابر تھے۔ سب ساتھی اس طرح رہتے جیسے ایک باپ کی اولاد۔

(۳) مجلسِ مبارک میں جہاں بھی کوئی ہوتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشفقانہ انداز سے وہ یہی سمجھتا کہ اس دربار میں سب سے زیادہ خصوصیت اسی خوش نصیب کو حاصل ہے۔

(۴) ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملنا۔ تبسم اور تازہ روئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی پیاری عادت تھی جو اپنی نظیر آپ تھی اور کہیں اس کی نظیر ممکن نہ تھی۔

(۵) جب تک ملنے والا خود نہ اٹھتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ اٹھتے مگر یہ مجبوری جس کی معذرت فرما لیتے۔

(۶) ذاتِ رسالت مآب (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی طرف سے آنے والوں کی عزت کی

جاتی، سلام میں پہل کی جاتی بیٹھنے کو جگہ دی جاتی کبھی خود سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ سے کھسک کر اپنے پاس بٹھا لیتے۔ پوری احتیاط برتی جاتی کہ ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے کسی کا دل میلا ہو۔

(۷) قبیلہ یا خاندان کا جو بڑا ہوتا اس کی بڑائی مانی جاتی، اس سے بڑائی ہی کا برتاؤ کیا جاتا پھر اپنی طرف سے بھی اسی کو اس قبیلہ یا خاندان کا بڑا بنا دیا جاتا۔ یعنی جس طرح دربار رسالت میں باریاب ہونے والوں کا دین محفوظ ہوتا۔ عاقبت درست ہوتی اسی طرح ان کی دنیا بھی درست اور دنیاوی عزت بھی محفوظ ہو جاتی۔ (صلی اللہ علیہ الف الف صلوٰتٍ دائمات)

(۸) خاتم الانبیاء سید الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ تھا کہ آپ تشریف لائیں تو لوگ تعظیماً اٹھیں۔ یا آپ تشریف فرما ہوں اور لوگ کھڑے رہیں۔ البتہ بزم رسالت کی نمایاں شان یہ ہوتی کہ ہر ایک کی دلداری ہوتی۔ ہر ایک کو مانوس کیا جاتا۔ بڑوں کی تعظیم کی جاتی، چھوٹوں پر مہربانی ہوتی مجلس مبارک میں افضل وہی مانا جاتا جس کی خیر خواہی عام ہوتی جو تقوےٰ طہارت میں اگر سب سے آگے ہوتا تو دوسری طرف خدمت خلق۔ مخلوق خدا کی ہمدردی اور خیر اندیشی۔ بندگانِ خدا کے لئے تکلیف برداشت کرنے اور مصیبت جھیلنے میں بھی سب سے پیش پیش ہوتا۔ کمزوروں کی امداد مظلوموں کی فریاد رسی۔ غم زدوں کی غم خواری بے کسوں کی دستگیری میں سب سے بڑھا ہوا ہوتا یعنی جس طرح ہمارے آقا رحمۃ للعالمین تھے ایسے ہی وہ بھی خلقِ خدا کے لئے رحمت ہوتا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ساری اُمت میں سب سے افضل ہیں اور ان کی خصوصی صفت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے۔ ارحم اُمتی۔ یعنی میری تمام اُمت میں سب سے زیادہ رحم والا (اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

(۹) طرز نشست میں مساوات کا یہ عالم ہوتا کہ اجنبی شخص کو پوچھنا پڑتا کہ شاہ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں۔ اس کسر نفسی کے باوجود یہ معجزہ تھا کہ جیسے ہی کوئی شخص حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتا مرعوب ہو جاتا اور اس پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ مگر جیسے ہی بات چیت ہوتی

زبان مبارک سے اس طرح پھول جھڑتے اور ایسے موتی برستے کہ اس کی ہیبت محبت سے بدل جاتی اور وہ آپ کا شیدائی ہو جاتا تھا۔ ایک عجیب انداز تھا کہ لوگوں سے ملے جلے بھی رہتے اور ہر ایک سے بلند و بالا بھی۔ گویا ذاتِ مبارک سہل ممتنع تھی۔

(۱۰) مجلسِ مبارک میں کبھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ لوگوں کے لئے جگہ چھوڑ دیا کرتے۔ اٹھنے بیٹھنے میں کوئی امتیاز نہ ہوتا۔ آپ کہیں جاتے جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے۔ صدر مقام کی کبھی خواہش نہ کرتے۔ یہی آپ کی ہدایت بھی تھی کہ مجلس میں صدر مقام کی خواہش نہ کرو۔ جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ۔ خاص موقعوں پر ملاقات کے لئے عمدہ لباس زیبِ تن فرماتے بال وغیرہ بھی درست فرما لیتے تھے۔

(۱۱) مجلسِ مبارک میں اہلِ ضرورت ہی کا تذکرہ ہوتا۔ اہلِ مجلس کو ہدایت تھی کہ جو لوگ کسی بھی وجہ سے اپنی ضرورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچا سکیں مجلس کے ساتھی وہ باتیں پہنچائیں اور اللہ سے ثوابِ عظیم حاصل کریں۔

(۱۲) مجلسِ مبارک میں وقت کی پوری قدر کی جاتی۔ کام کی باتیں جن میں مخلوق کا فائدہ اور خالق سے ثواب کی توقع ہو، خوشی سے سنی جاتیں انھیں میں دلچسپی لی جاتی۔ آنے والے دین کے طالب بن کر آتے اور رشد و ہدایت کی شمع بن کر جاتے، ان کو ہدایت ہوتی کہ جو کچھ انہوں نے حاصل کیا ہے اس کو عوام تک پہنچائیں۔

(۱۳) بات چیت ہوتی تو کسی کی بات کاٹی نہ جاتی۔ جس نے بات شروع کی پہلے اس کی بات پوری ہو لیتی تب کسی دوسرے کو بولنے کا حق ہوتا۔ جب کوئی بولتا سب خاموشی سے اس کی پوری بات سنتے۔ اگر خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کچھ ارشاد فرماتے تو گویا حاضرین پر سکتہ چھا جاتا۔ فرطِ شوق اور غایتِ احترام میں ایسے ہو جاتے جیسے قالب بے جان!

(۱۴) لوگوں کے حالات اور عوام کے رجحانات کی پوری معلومات رکھی جاتی۔ کوئی اچھا رجحان پایا جاتا تو اس کو تقویت دی جاتی۔ کسی بری بات کا پتہ چلتا تو اس کی روک تھام کی جاتی اچھی

باتوں کی خوبیاں اور جو بُری باتیں ہوتیں اُن کی خرابیاں سمجھا کر ذہن نشین کرائی جاتیں۔

(۱۵) ہر بات اور ہر عمل میں اعتدال سے کام لیا جاتا، ہر کام کے لئے مناسب انتظام ہوتا۔ جو باتیں چھپانے کی ہوتیں وہ امانت سمجھی جاتیں۔ اہلِ ضرورت اور مسافروں کی پوری خبرگیری کی جاتی۔

(۱۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوش طبعی بھی فرما لیتے تھے۔ مگر کوئی جھوٹی بات کبھی زبانِ مبارک پر نہ آتی۔ حاضرینِ مجلس آپس میں ہنستے بولتے۔ پہلے زمانہ کی باتیں کیا کرتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش بیٹھے سنتے رہتے وہ کسی بات پر ہنستے تو آپ بھی مسکرا دیتے۔

(۱۷) اُٹھنا، بیٹھنا۔ غرض تمام باتیں اللہ کے ذکر کے ساتھ ہوتیں۔

(۱۸) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تین باتوں سے ہمیشہ محفوظ رہی۔ جھگڑا۔ تکبر۔ بیکار باتیں اور سید الکونین نے تین باتوں سے ہمیشہ ہر ایک کو محفوظ رکھا۔ مذمت۔ عیب جوئی۔ پوشیدہ باتوں کا اظہار۔

یارب صلّ وسلم دائمًا ابدًا   علیٰ حبیبک خیر الخلق کلھم

آئینہ قرآن میں تصویر تزکیہ

مقاصدِ بعثت کامیاب۔ حضرت حق جل مجدہٗ کی تصدیق

(۱) وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا۔ سورہ ۴۸ الفتح آیت ۲۶

اور جما دیا ان کو تقویٰ کی بات پر اور وہ اُس کے زیادہ مستحق ہیں اور اس کے اہل ہیں اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

(۲) وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَ زَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْیَانَ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ۔ (الحجرات ع ۱)

لیکن اللہ تعالیٰ نے محبت بھر دی تم میں ایمان کی اور سجا دیا، اس کو تمہارے دلوں میں اور نفرت بھر دی تمہارے اندر کفر سے فسق سے اور عصیان (خدا کی نافرمانی) سے۔ یہی ہیں وہ جو راشد ہیں (راہ راست پر ہیں) اللہ تعالیٰ کے فضل اور انعام سے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔

سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہما الصلوٰۃ والسلام کے دعائیہ کلمات کی تلاوت کیجیے۔ خصوصاً یہ کلمات

وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ

اور ہماری نسل میں سے ایسی امت پیدا کر دے جو تیرے حکموں کی فرماں بردار ہو۔ (آیت ۱۲۸ سورہ ۲ بقرہ)

پھر مقاصد بعثت پر نظر ڈالیے اور موازنہ کیجیے کہ مذکورہ بالا آیات کس طرح کامیابی

مقاصد کی شہادت دے رہی ہیں۔ رحمۃ للعالمین۔ خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اُمت کے سامنے کتاب اللہ کی تلاوت کی جس کو کتاب حکمت کی تعلیم دی جس کا تزکیہ کیا آیاتِ مندرجہ بالا کی شہادت یہ ہے کہ بلا کسی استثناء کے وہ سب اس تعلیم کے صرف عالم ہی نہیں بلکہ عامل بھی اتنے بڑے ہو گئے کہ

(۱) وہ کلمۃ التقویٰ پر ثابت قدم ہیں۔

(۲) اتفاقیہ نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ اس کے اہل ہیں کیونکہ

(۳) ایمان کی محبت اُن کے دلوں میں بھر دی گئی ہے۔

(۴) اس محبت کا نتیجہ یہ ہے کہ

(الف) اُن کے قلوب زیورِ ایمان سے آراستہ ہو گئے ہیں۔

(ب) ایمان۔ اسلام اور تقویٰ کی مخالف خصلتیں کفر، فسق اور عصیان سے اُن کے دل متنفر ہو گئے ہیں اور اب حسب ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شان یہ ہے اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اھتدیتم (مشکوٰۃ شریف بروایت رزین) میرے اصحاب تاروں کی طرح ہیں جس کے راستے پر چلو گے ہدایت پا لو گے۔ اور اسی بنا پر[1] حضرت حق جل مجدہ کا اعلان یہ ہے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ (سورہ ۵۸ مجادلہ آیت ۲۲) اللہ اُن سے راضی اور وہ خدا سے راضی ہو گئے۔

---

[1] حدیث اگرچہ سند کے لحاظ سے قوی نہیں مانی جاتی مگر اس کا مضمون وہ ہے کہ قرآن پاک کی آیتیں اس کی تائید اور تصدیق کر رہی ہیں۔ لہٰذا حدیث اپنے مفہوم کے لحاظ سے قوی ہے۔

حج البیت

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا۔ سورۂ آل عمران آیت

اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس بیت کی جو کوئی پاوے اس تک راہ (شاہ صاحبؒ)

رب اکبر کے بیت الحرام کی بنیادیں بلند کرتے ہوئے حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے اُمتِ مسلمہ اور اس کے لیے رسُول کی وہ دعا، کی تھی جس کی ضیا پاشی کا تذکرہ پہلے صفحات میں گذرا۔ اسی وقت حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے حضرت حق جل مجدہٗ کے اس حکم کی تعمیل بھی کی تھی۔

اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ (سورۂ الحج آیت ۲۷)

لوگوں میں حج کا اعلان پکار دے۔

یہ رسُول موعود محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مورثِ اعلیٰ کی ملت "ملتِ ابراہیم" کا احیاء کرتے ہوئے بحکم خدا خانہ کعبہ کو قبلہ بنا چکے تھے۔ لیکن اعلانِ حج کا جو تقاضا تھا۔

یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (آیت سورۂ حج)

آئیں گے تیرے پاس پاپیادہ اور دُبلے پتلے اونٹوں پر جو دُور دراز راستوں سے آئیں گے

یہ تقاضا پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اور کیسے پورا ہوتا جب کہ خانہ کعبہ پر قریش کا قبضہ تھا۔ اور انہوں نے اس مرکزِ توحید کو کفر و شرک کا تیرتھ بنا رکھا تھا۔

لیکن ملتِ ابراہیمی کے فداکاروں میں جو جذبہ تحویلِ قبلہ کے لئے تھا وہی جذبہ اور ممکن ہے اس سے زیادہ جذبہ اور شوق اس کا ہو کہ اعلانِ ابراہیمی کے تقاضے کو پورا کریں۔ اس جذب و اضطراب کو بڑا سکون وارث ابراہیم خلیل اللہ محبوب رب العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خواب سے ہوا کہ:

"سر منڈاتے ہوئے یا بال کترواتے ہوتے مسجد حرام میں داخل ہوئے ہیں"

اسی دَور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا ارادہ فرمایا لیکن جب چودہ سو مومنین

صالحین کے پورے قافلہ اور اُن کے آقا، اور قائد کو (صلی اللہ علیہ وسلم) مقام حدیبیہ پر روک دیا گیا۔ پھر صلح ہوئی تو نہایت دبی ہوئی شرطوں پر جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس وقت نہ عمرہ کریں نہ مکے میں داخل ہوں۔ اس وقت حدیبیہ ہی سے واپس ہو جائیں آئندہ سال آ سکتے ہیں۔ مگر خاص خاص پابندیوں کے ساتھ کہ اسلحہ کم سے کم ہوں اور وہ بھی نیاموں میں بند ہوں۔ صرف تین دن قیام کریں (وغیرہ وغیرہ) تو ایک مایوسی لازمی تھی۔ لیکن وحی الٰہی نے جس طرح اس دبی ہوئی صلح کو فتح مبین فرمایا، مایوس دلوں کو یہ بشارت دے کر تازگی بخشی کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ کے رسولؐ کا خواب پورا ہو گا۔

"تم مسجد حرام میں انشاء اللہ ضرور جاؤ گے امن و امان کے ساتھ کہ تم میں کوئی سر منڈائے ہو گا، کوئی بال کترا تا ہوا کسی طرح کا اندیشہ نہ ہو گا۔" (سورہ ۴۸ الفتح آیت ۲۷)

وحی الٰہی سراسر صداقت ہوتی ہے۔ ایک سال بعد اُن سب نے عمرہ کیا جن کو بشارت دی گئی تھی۔ پھر جب ۸ھ میں مکہ معظمہ فتح ہو چکا تو ۹ھ میں خواب کی تعبیر اس شان سے جلوہ گر ہوئی جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

حج اسلام اور اعلانِ برأت ۹ھ

رمضان شریف ۸ھ میں مکہ فتح ہوا۔ مگر چونکہ فوراً ہی حنین و اوطاس کے معرکے پیش آ گئے پھر طائف کے محاصرہ میں تقریباً ایک مہینہ لگ گیا۔ اس لیے اس سال حج کا انتظام پہلے ہی ہاتھوں میں رہا۔ صرف حج کے ارکان مسلمانوں نے حضرت عتاب بن اُسید (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ ادا کیے جو مکہ معظمہ کے امیر (گورنر) مقرر کیے گئے تھے۔

اب مکہ فتح ہوئے ایک سال ہو چکا ہے، نہ صرف مکہ کے باشندے بلکہ قریب قریب عرب کے تمام ہی قبیلے مسلمان ہو چکے ہیں۔

پہلے عرب[1] کفار و مشرکین کا تھا۔ اب عرب مسلمانوں کا بن چکا ہے۔ لہٰذا اس سال حج کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا جا رہا ہے۔ مگر[2] آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس اس سال بھی تشریف نہیں لے جا سکے۔ لہٰذا حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو قائم مقام بنایا گیا اور تین سو صحابہ کے ساتھ حج ادا کرنے کے لئے روانہ فرما دیا گیا۔ بعد میں حسبِ ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ[3] بھی خصوصی اعلان کے لئے پہنچ گئے۔

---

[1] عرب کے باشندے چونکہ قریش کے زیرِ اثر تھے اس لئے اسلام لانے میں بھی قریش کے رویہ پر ان کی نظر تھی صلح حدیبیہ نے ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی۔ مسلمانوں کو تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ لہٰذا اسلام قبائل میں پھیلنے لگا اور جب مکہ فتح ہو چکا اور قریش حلقہ بگوشِ اسلام بن گئے تو اب تمام رکاوٹیں ختم ہو گئیں۔ اب ہر قبیلہ اسلام کی طرف لپکنے لگا اور وہ اسلام جو گذشتہ ۲۱ سال میں چیونٹی کی چال چلا تھا۔ اب وہ ایک سیلاب بن گیا جس کی لہریں عرب کے کناروں کو چھونے لگیں۔

[2] اس لئے کہ خانۂ کعبہ اگرچہ نشاناتِ شرک سے پاک ہو چکا تھا مگر سلسلۂ حج اس طرح پاک نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ مشرکین بھی آتے تھے اور ان کی مشرکانہ رسوم اور وحشیانہ حرکتیں (مثلاً برہنہ حج کرنا) باقی تھیں حج میں اس سال ان کی ممانعت کا اعلان کر کے مناسکِ حج کو پاک کرنا تھا اور اس لئے بھی آپ تشریف نہیں لے گئے کہ "نسی" یعنی لوند کی وجہ سے جو مہینوں کی ترتیب بگڑی ہوئی تھی وہ درست نہیں ہوئی تھی۔ یہ ترتیب اگلے سال درست ہوئی جس سال آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج فرمایا اسی موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا تھا ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوٰتِ والارض (بخاری شریف ص۶۹) زمانہ کی جو ترتیب اس روز تھی جس روز اللہ تعالےٰ نے آسمان اور زمین پیدا کئے تھے اسی ترتیب پر لوٹ آیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[3] اس موقع پر بھی پوری اہمیت کے ساتھ یہ اعلان کرنا تھا کہ جو کفار و مشرکین عہد نامہ کی خلاف ورزی کر چکے ہیں ان کا معاہدہ مسلمانوں کی طرف سے بھی منسوخ کیا جاتا ہے اور آئندہ اس کی ذمہ داری سے برأت کی جاتی ہے اس قسم کے اہم اعلان کے لئے عربوں کے قاعدہ کے مطابق ضروری تھا کہ خود صاحب معاملہ (باقی بر صفحہ آئندہ)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی تعلیم کے مطابق حج کرایا۔ حج کے زمانہ میں وہ خداوندی اعلان[1] بار بار سنایا جس کی ہدایت سورہ برأت کے شروع میں کی گئی ہے کہ :

۱۔ وہ لوگ جو معاہدے کے پابند رہے ہیں ان کے معاہدے اپنی مدت تک باقی رہیں گے۔

۲۔ جن لوگوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی یا اب تک کوئی معاہدہ ہی نہیں کیا تھا ان کو چار[2] ماہ کی مہلت اور دی جاتی ہے۔ پھر ان کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ[3] کا اعلان ہے۔

۳۔ آئندہ کوئی مشرک اللہ کے گھر میں داخل نہ ہو سکے گا۔

۴۔ کوئی شخص ننگے بدن طواف نہیں کریگا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اعلان کرے یا کوئی اس کا صلبی عزیز اعلان کرے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل تھا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے۔ لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تاکہ مشرکین کو حیلہ بہانہ کا موقع نہ رہے۔

[1] ۱۰ ذی الحجہ جس کو یوم النحر کہا جاتا ہے۔ اس روز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منیٰ کے عام اجتماع میں اعلان کیا کہ آئندہ کوئی مشرک خانہ کعبہ میں نہیں داخل ہو سکے گا۔ نہ کوئی شخص برہنہ بدن طواف کر سکے گا۔ (بخاری شریف) پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سورۂ برأت کی ابتدائی آیتیں پڑھیں جن میں مذکورہ بالا امور کا اعلان ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات نے اس اعلان کی اس طرح زور زور سے تشہیر کی کہ ان کے گلے پڑ گئے (سیرۃ ابن ہشام) [2] مکہ معظمہ گذشتہ سال ۲۰ رمضان کو فتح ہو چکا ہے۔ جب کو آج ۱۰ ذی الحجہ ۹ھ کو پندرہ مہینے گذر چکے ہیں۔ اب تک مشرکوں اور کافروں سے کچھ نہیں کہا گیا اور آج بھی چار ماہ کی مزید مہلت دی جا رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور سیر چشمی کیا ہو سکتی ہے؟ پھر بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ [3] اس اعلان کے بموجب کسی قبیلے سے بھی جنگ کی نوبت نہیں آئی کیونکہ اس سے پہلے ہی وہ سب لوگ مسلمان ہو چکے تھے جن پر اس دفعہ کا اطلاق ہو سکتا تھا۔

حج فرض۔ حج وداع

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْشَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ ۔ (سورہ ۴۸ الفتح آیت ۲۷)۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا ہے جو مطابق واقع کے ہے کہ تم لوگ مسجد حرام میں انشاء اللہ ضرور جاؤ گے امن وامان کے ساتھ کہ تم میں کوئی سر منڈاتا ہوگا۔ کوئی بال کتراتا ہوگا۔ کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا۔[1]

خدا کے سارے احکام پہنچا دیئے گئے۔ ان پر عمل کا عادی بھی بنا دیا گیا لیکن ایک فرض باقی رہ گیا۔ یعنی حج بیت اللہ۔ اس پر عمل کرانا باقی ہے۔

سنہ ۱۰ھ ذی قعدہ کا مہینہ آیا۔ عرب میں حج کا اعلان کرا دیا گیا، اہل ایمان مرد عورتیں اور بچے سب طرف سے آنے لگے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا موکبِ ہمایونی ۲۶ ذیقعدہ سنہ ۱۰ھ کو مدینہ طیبہ سے روانہ ہوا۔ شمع رسالت کے گرداگرد ہزاروں پروانوں کا ہجوم ہے۔ راستہ میں بے شمار پروانوں کے جھرمٹ آتے جاتے ہیں اور لَبَّیْکَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْکَ کہتے ہوئے پروانوں میں ملتے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی تعداد سوا لاکھ کے قریب پہنچ گئی ہے۔

۴ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ کو یہ نورانی قافلہ جو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت لشکر رحمت ہے۔ بلد حرام (مکہ معظمہ) میں داخل ہوا۔ قواعد حج کے مطابق ۸ ذی الحجہ کو

---

[1] یہ واقعہ سنہ ۷ھ میں ہو چکا تھا جب عہد نامہ حدیبیہ کے بموجب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کے لئے تشریف لے گئے اور اطمینان سے عمرہ کیا پھر حلق و قصر کیا اس سے پہلے خیبر فتح ہو چکا تھا چونکہ یہ تمام وعدے حج فرض پر بھی صادق ہو رہے ہیں اس مناسبت سے یہ آیت یہاں پیش کر دی گئی۔

مکہ معظمہ سے روانہ ہوکر شب کو منیٰ میں قیام کرتے ہوئے ۹ ذی الحجہ کو مقام عرفات میں نزول فرما ہوا پھر اسی شام کو عرفات سے روانہ ہوکر عشار کے قریب مزدلفہ پہنچا۔ شب کو یہاں قیام فرماکر صبح سویرے یہ نورانی میلہ مزدلفہ سے منیٰ منتقل ہوا۔ جہاں دو روز قیام پذیر رہا۔ ان ایام میں ان کے امام نے (جو سیاسی نظام کے لحاظ سے بھی امام اعظم ہے اور نہ صرف امام المومنین بلکہ امام الانبیاء و سید المرسلین ہے (صلوات اللہ و سلامہ علیہ و علیہم اجمعین تقریر فرمائی اس کے متفرق اجزاء جو بخاری شریف۔ مسند احمد۔ مسند بزار اور طبرانی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا مفہوم اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں پیش کیا جارہا ہے۔ مطالعہ فرمائیے اور سبق لیجیے۔

ناقہ کی پشت جو اس وقت تاجدار دو جہاں سید الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کا گویا منبر تھا۔ اسی ذی حیات منبر سے آپؐ نے اُمت کو خطاب فرمایا:

خطبہ حجۃ الوداع

(ترجمہ)

پہلے تین دفعہ تکبیر فرمائی اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ پھر ارشاد ہوا:

خدا۔ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اپنے بندے کو کامیاب کیا تن تنہا تمام ٹولیوں کو پسپا کر دیا۔ وہی تعریف کا مستحق ہے ہم اسی کی تعریف کرتے ہیں۔ اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ اسی سے مغفرت مانگتے[1]

---

[1] یہ ہے مقام نبوت تئیس ۲۳ سالہ جدو جہد کا نام نہیں۔ اپنی جفاکشی اور محنت کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اپنی ہستی کچھ نہیں۔ جو کچھ ہے اللہ کا فضل و کرم ہے۔ اس کی امداد و اعانت ہے۔ اپنی کوتاہیاں سامنے ہیں۔ جن کی مغفرت طلب کی جارہی ہے۔ اپنے کسی کمال کا تصور اور خیال بھی نہیں۔ پورا خطبہ پڑھ لو کہیں اپنی معمولی سی تعریف بلکہ تعریف کا کوئی شائبہ بھی نہیں ملے گا۔ جبکہ سیاسی رہنما ایسے موقع پر اپنی خدمات بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور اپنی ہوشمندی اور سلیقہ مندی کے قصیدے خود اپنی زبان سے پڑھتے ہیں۔

ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ اس اکیلے معبود کے سوا کوئی معبود نہیں۔ محمدؐ اس کا بندہ اور پیغمبر ہے۔ (بخاری شریف وغیرہ)

لوگو! میں تمہیں خوفِ خدا کی وصیت کرتا ہوں۔ دیکھو چار چیزیں ہیں: خدا کے سوا کسی کو شریک نہ بناؤ۔ کسی کی ناحق جان نہ لو۔ زنا نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔

اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں۔

دیکھو سنو!

اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ پنج وقتہ نمازیں ادا کرو۔ رمضان کے روزے رکھو۔ زکوٰۃ ادا کرو۔ جن کو تم اپنے معاملات کا ذمہ دار بناؤ، ان کی بات مانو۔ اپنے رب کی جنت میں خوشی خوشی داخل ہو جاؤ۔

دیکھو۔ جو کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔ یاد رکھو۔ ممکن ہے آئندہ مجھے نہ دیکھ سکو!

لوگو! بتاؤ۔ یہ کونسا دن ہے۔ کونسا مہینہ ہے۔ کس مقام پر تم اس وقت ہو۔

(پھر ارشاد ہوا) یہ وہی دن ہے جس کی تم ہمیشہ سے تعظیم کرتے چلے آئے ہو، جس میں ایک دوسرے کے خون کو حرام سمجھتے آتے ہو، یہ وہی ذی الحجہ ہے جس میں آپس کا قتل و خون سب سے بڑا جرم سمجھتے رہے ہو۔ یہ وہی شہر ہے جس کی حرمت و عظمت کا سکہ تمہارے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے جس میں ہر ایک کی جان محفوظ مانی جاتی ہے۔

دیکھو! ایک دوسرے کی جان۔ مال۔ آبرو۔ ایسی ہی حرام ہے۔ جیسے یہ مبارک دن۔ اس مبارک مہینہ میں۔ اس مقدس شہر میں۔

اے لوگو! میری بات سنو اور زندگی پاؤ۔

خبردار ظلم نہ کرنا۔ خبردار ظلم نہ کرنا۔ خبردار ظلم نہ کرنا۔ کسی بھی شخص کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لینا روا نہیں۔ جس کے پاس کسی کی امانت ہے وہ احتیاط سے اس کو ادا کر دے۔ (مسند احمد)

پھر ارشاد ہوا:

مسلمانو! خبردار۔ خبردار۔ میرے بعد گمراہ اور کافر مت ہو جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردن مارتے پھرو۔ میری سنو۔ اور خوب سمجھ لو۔ یاد رکھو مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اور سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ دیکھو ظلم مت کرو۔ کسی کی آبرو مت گراؤ۔

عورتوں کے حقوق: اے لوگو! اپنی عورتوں پر تمہارا حق ہے اور ان کا تم پر۔ تمہارا حق عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہاری ناموس اور آبرو کی حفاظت کریں۔ کوئی بدکاری عمل میں نہ لائیں۔ عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ تم خوش دلی سے ان کو کھانا کپڑا دو۔ عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر کچھ خرچ نہ کرے۔

دیکھو۔ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ وہ اللہ کی بندیاں ہیں۔ خدا نے تم کو ان پر بڑائی دی ہے۔ عورتوں کے معاملہ میں خوفِ خدا سے کام لو۔

گذشتہ دور کے مظالم فراموش: دیکھو! خون (یعنی قتل کرنے اور قصاص لینے کے اور) پانی کے چشموں (اور اموال) کے جو تنازعات چلے آ رہے تھے۔ آج وہ سب میرے قدموں کے نیچے (پامال ہو چکے) ان کو فراموش کرو اور سب سے پہلے جس خون کا مطالبہ معاف کیا جاتا ہے وہ (میرے چچازاد بھائی) ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا خون ہے۔ یہ شیرخوار تھا۔ قبیلہ بنی حارث میں پرورش پا رہا تھا۔ قبیلہ ہذیل کے لوگوں نے اس کو زمانہ شیرخواری ہی میں قتل کر دیا تھا (اس کا خون میں معاف کرتا ہوں)۔

اور دیکھو۔ زمانۂ جاہلیت کے تمام سود معاف۔ میں سب سے پہلے وہ سُود معاف کرتا ہوں جو میرے چچا عباس کے لوگوں کے اُوپر تھے۔ اگر چاہو تو اصل قرض لے سکتے ہو۔ نہ تم پر کوئی ظلم۔ نہ تمہارا کسی پر ظلم۔ (مسند احمد)

لوند ختم : اور دیکھو زمانہ اسی ہیئت پر لوٹ آیا ہے۔ جو اس کی ہیئت ابتدائے آفرینش میں تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھرًا فی کتاب اللہ یوم خلق السمٰوات والارض منها اربعة حرم ذالک الدین (تا ختم آیت سورۃ توبہ)

مسلمانو! خبردار۔ خبردار۔ میرے بعد کفر کی باتوں پر نہ آجانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارتے پھرو (بخاری شریف)

دیکھو۔ شیطان مایوس ہو چکا ہے کہ نماز پڑھنے والے اس کی پوجا نہیں کر سکتے۔ ہاں وہ تمہارے اندر جھگڑے کھڑے کرنے میں لگ گیا ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر تمہیں بھڑکاتا رہے گا۔ دیکھو احتیاط سے کام لیتے رہنا۔ (مسند احمد)

مُساواتِ انسانی : ارشاد ہوا :۔

اے لوگو! تمہارا رب ایک۔ تمہارا باپ ایک۔ نہ عرب کو عجم پر فضیلت نہ عجم کو عرب پر فضیلت۔ نہ کالے کو گورے پر عظمت۔ نہ گورے کو کالے پر بڑائی۔ سب بچے سب ایک باپ "آدم" کی اُولاد ہیں۔ اور آدم کی آفرینش مٹی سے ہوئی تھی۔ کسی کو جو فضیلت میسر آسکتی ہے۔ وہ تقویٰ (خدا ترسی اور پرہیزگاری) کی بنا پر۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ یا ایھا الناس انا خلقناکم (الآیۃ سورہ حجرات ع ۲۔ ترمذی و مسند احمد وغیرہ)

اے جماعت قریش! ایسا نہ ہو کہ قیامت کو تم لدے ہوئے آؤ کہ دنیا تمہاری گردنوں پر سوار ہو اور دوسرے لوگ آخرت لے کر آئیں۔

دیکھو! میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔

مسلم اور مومن کون ہے: دیکھو میں تمہیں بتاتا ہوں مسلم اور مومن کون ہے مسلمان وہ ہے کہ سب مسلمان اُس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے کہ کسی بھی انسان کو اس کی طرف سے نہ اپنی جان کا خطرہ ہو نہ مال کا۔

اور میں بتاؤں۔ مہاجر و مجاہد کون ہے۔ مہاجر وہ ہے جو تمام برائیوں کو چھوڑ دے اور مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت کرنے میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔

اور دیکھو۔ ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان پر ہر چیز حرام ہے اس کی جان حرام۔ اس کا مال حرام۔ اس کی آبرو حرام۔

دیکھو۔ غیبت کر کے مردہ بھائی کا گوشت مت کھاؤ۔ (طبرانی و بزار)۔

اے لوگو! سنو۔ جہاد فی سبیل اللہ میں ایک شام ایک صبح چلنا بھی دنیا اور دنیا کی تمام دولتوں سے بڑھ کر ہے۔

دیکھو۔ میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں جس کے ہوتے ہوئے تم کبھی گمراہ نہ ہو گے بشرطیکہ اس کو مضبوطی سے سنبھالے رہو۔ وہ کیا ہے؟ "اللہ کی کتاب"۔۔۔!

اے لوگو۔ بتاؤ۔ میں نے خدا کے احکام پہنچا دیئے۔ جب تم سے میری بابت سوال ہوگا تو کیا کہو گے ؟

سب نے جواب دیا ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام پوری طرح پہنچا دیا۔ امانت ادا کر دی۔ نصیحت میں کوتاہی نہیں کی۔"

اس پر آپ نے فرمایا۔ خدایا گواہ رہ۔ خدایا گواہ رہ۔ خدایا گواہ رہ

پھر صحابہؓ کو مخاطب کر فرمایا :

"جو یہاں ہیں وہ سب باتیں دوسروں تک پہنچا دیں۔ جو یہاں نہیں ہیں۔"

تکمیلِ دین کی بشارت

فرائضِ نبوت ادا کر دیئے گئے۔ مقاصدِ بعثت کامیاب ہوگئے۔ اللہ کے دین کی عمارت جس کی تعمیر حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام نے شروع کی تھی۔ اس کا آخری ردّہ رکھا جا چکا۔ عمارت ہر لحاظ مکمل ہوگئی۔ تو عرشِ رحمٰن سے اس کی سند صادر ہوئی :

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (سورۃ ۵ آیت ۳)

(ترجمہ) آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی۔ اور تمہارے لئے پسند کر لیا۔ دینِ اسلام۔

مکہ معظمہ سے واپسی فرائض و واجبات سے فراغت ہوگئی تو ۱۴ ذی الحجہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پاک باز رفقا مکہ سے واپس ہوئے۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ اجمعین

اعلام رخصت

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ۔ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا

جب آپہنچے خدا کی مدد اور فتح۔ اور آپ لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق درجوق داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں تو اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیجئے اور اس سے مغفرت کی درخواست کیجئے وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس سورت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا اعلامیہ قرار دیا۔ کیونکہ مقاصد بعثت پوری طرح مکمل ہو چکے۔

(الف) تطہیر کعبہ، آخری مقصد تھا۔ مکہ معظمہ فتح ہوا تو سب سے پہلے اس فرض کو انجام دیا گیا کہ خدا واحد کے بیت کو جو سینکڑوں معبودان باطل کا بیت بنا دیا گیا تھا پھر سے بیت اللہ بنا دیا گیا۔ کھلی آنکھوں جاء الحق[1] وزھق الباطل کا مشاہدہ کرا دیا گیا۔

(ب) سلسلہ دعوت جس کا دامن صلح حدیبیہ کے بعد سے وسیع ہونا شروع ہوا تھا یہاں تک کہ فتح کے بعد سارا عرب اس کا میدان بن گیا اور اقتدار قریش جو آخری کا دٹ تھا اس کی دھجیاں

---

[1] حق آیا باطل جاتا رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں ایک چھڑی تھی خانہ کعبہ کے گرد اگرد بڑے بڑے بت تھے یہ آیت پڑھتے ہوئے آپ چھڑی کی نوک بت پر مارتے تھے اور وہ بت زمین پر ڈھیر ہو جاتا تھا۔

بکھری ہوئی خود قبائل نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو وفود قبائل کی فوجیں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے لگیں۔ دین کا پودا جو تئیس برس پہلے لگایا تھا تن آور درخت بن گیا۔

(ج) یہ مقاصد پورے ہو گئے تو وہ روحِ قدسی جو انہیں مقاصد کے لئے خاکدانِ ارضی میں نزول فرما تھی اور بے چین تھی کہ رفیق اعلیٰ کی رفاقت میسر آتے۔ اب وقت آگیا کہ یہ بے چینی ختم ہو اور رفاقت دائمی میسر ہو۔

(د) تسبیح و تحمید۔ اس رفاقت کا رابطہ ہے۔ حکم ہوا کہ اسی رابطہ میں مشغول ہو جاؤ۔

یہی ہے مفہوم سورت (واللہ اعلم)

(ختم شد جلد اوّل)

علالت۔ دورانِ علالت میں حدیث قرطاس۔ وصیتیں۔ خطابات و نیابت، امامت، غسل تجہیز، تکفین۔ تدفین۔ نماز جنازہ۔ مسئلہ جانشینی۔ خبرِ رحلت سے صحابہ کے تاثرات۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تسکین۔ وراثت انبیاء علیہم السلام۔ اس کے علاوہ سفرِ حج کی تفصیل غدیر خم کی تقریر نیز وفود کی آمد۔ آمدِ وفود پر خطابات و مکالمے۔ قصۂ فدک۔ افسانۂ افک۔ مسئلہ متعہ۔ ازواجِ مطہرات و ان کا تعارف۔ واقعہ ایلاء۔ حلیہ۔ متبنیٰ سے نکاح۔ غلامی اور آزادی جیسے مسائل جلد ثانی میں ملاحظہ فرمائیں جس میں غزوات و سرایا کی تفصیل کے بعد ان مسائل پر بھی بحث ہو گی (انشاء اللہ)۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

شب چہار شنبہ ۲۱ شوال ۱۳۸۹ھ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء

محمد میاں عفی عنہ و غفرلہ والوالدیہ

مختصر تعارف حضرت مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ

از مولانا سید حامد میاں مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

والد ماجد حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب، نور اللہ مرقدہٗ کی پیدائش ۱۲ رجب ۱۳۲۱ھ ۴ اکتوبر ۱۹۰۳ء ہے۔ جائے پیدائش دیوبند کا محلہ "سرائے پیرزادگان" ہے تاریخی نام "مظفر میاں" ہے، (عمر مبارک ۷۴ سال ہوئی)۔

خاندان اور نسب

سادات دیوبند کے خاندانوں میں یہی خاندان سب سے قدیم ہے۔ گیارہویں صدی کے اوائل میں جد امجد سید ابراہیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبند قیام فرما ہوئے تھے، یہ جہانگیر کا دور تھا۔ ان کی وفات ۱۰۳۴ھ میں ہوئی اور محلہ "سرائے پیرزادگان" میں ہی مدفون ہوئے۔

اس خاندان کے حالات "تاریخ دیوبند" میں بھی دیئے گئے ہیں، نیز دیوبند سے ایک رسالہ "تذکرہ سادات رضویہ" کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں شجرۂ نسب بھی ہے۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے درمیان چالیس واسطے ہوتے ہیں۔ اس طرح:

مولانا سید محمد میاں ابن سید منظور محمد ابن سید یوسف علی ابن سید محمد علی ابن سید ظہور ولی ابن سید محمد فردوس ابن شاہ شبلی ابن بندگی محمد اسمٰعیل ابن سید محمد ابراہیم ابن سید سعد اللہ ابن سید محمود قلندر ابن سید احمد ابن سید فرید ابن سید وجیہ الدین ابن سید علاء الدین ابن سید احمد کبیر ابن سید شہاب الدین ابن سید حسین علی ابن سید عبد الباسط ابن سید ابو العباس ابن سید اسحاق عندلیب الملکی ابن سید قاری حسین علی الہادی

ابن سید لطف اللہ ابن سید تاج الدین احمد ابن سید حسین ابن سید علاء الدین ابن سید
ابو طالب ابن سید ناصر الدین احمد ابن سید نظام الدین حسین ابن سید موسیٰ ابن سید
محمد الاعرج ابن سید ابی عبداللہ احمد ابن سید موسیٰ المبرقع ابن الامام محمد تقی ابن الامام موسیٰ
علی رضا ابن الامام موسیٰ کاظم ابن الامام جعفر الصادق ابن الامام محمد باقر ابن الامام
زین العابدین ابن الامام ابی عبداللہ الحسین ابن سیدنا علی و سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا
رضی اللہ عنہم بنت سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

اس شجرہ میں سید حسین علی بن عبدالباسط حمص شام سے ترکِ وطن کرکے اُوش
چلے گئے۔ وہاں سے دہلی آئے پھر حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا سے مرید ہوئے۔
کسب فیض کیا اور حضرت بابا فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ دیگر مشائخ سے کسب فیض
کیا ان کے ساتھی رہے پھر سندھ کے قدیم شہر بھکر[1] میں اقامت گزین رہے اور وہیں
بعہد سلطان جلال الدین خلجی وفات پائی۔ ان کا سال وفات ۶۹۵ھ ہے (حضرت بابا
کا سالِ وصال ۶۹۰ھ) پھر انکی اہلیہ اپنے دو خورد سالہ بچوں شہاب الدین وغیرہ کو لے کر حمص واپس
چلی گئیں۔ اُوش فرغانہ کے علاقہ میں واقع ہے یہی ظہیر الدین بابر کا بھی وطن تھا اور حضرت خواجہ
قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی۔ تذکرہ سادات رضویہ دیوبند، ص ۳ و ۴۔

[1] معلوم ہوا ہے کہ سکھر کے قریب بھکر موجود ہے۔ مگر اب وہ ایک گمنام بستی ہے۔

تعلیم | دادا جان سید منظور محمدؒ محکمہ انہار میں ملازم تھے۔ قیام دیہات میں رہتا تھا۔ اس
لئے آپ نے قرآن پاک کی تعلیم اور ابتدائی فارسی باہر ہی پڑھی، پھر دادا جان (سید منظور محمد
رحمۃ اللہ علیہ) نے متعلقین کو دیوبند ہی بھیج دیا تاکہ تسلسل کے ساتھ تعلیم حاصل ہو سکے
سنہ ۱۹۱۶ء کے قریب دارالعلوم دیوبند میں درجات فارسی میں آپ داخل ہوئے۔
فارسی کی تکمیل کے بعد درجات عربی میں داخل ہوئے۔ ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء میں فراغت
ہوئی دورۂ حدیث علامہ عصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہٗ
سے پڑھا۔ ازہر شاہ صاحب قیصر مدظلہم نے دارالعلوم کے اداریہ میں لکھا ہے کہ

"آپ کو محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ (م ۱۳۵۲ھ) سے شرف تلمذ تھا۔ بلکہ ممتاز تلامذہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ علمی ذوق و شوق استاذ محترم سے ورثہ میں ملا تھا۔"

تدریسی خدمات

مارچ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس زیر صدارت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ہوا تھا۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب صدر المدرسین دار العلوم دیوبند اور دار العلوم دیوبند کے جملہ اکابر اس میں شامل ہوئے، واپسی پر مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد کے ارکان نے صدر المدرسین دار العلوم دیوبند حضرت علامہ کشمیریؒ سے ایسے مدرس کی فرمائش کی جو عربی تقریر و تحریر کی مشق اور خصوصاً فن ادب کی اونچی کتابیں پڑھا سکے۔ حضرت موصوف دیوبند واپس ہوئے تو شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے مشورہ سے اس کے لئے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو منتخب کیا گیا۔ وہاں آپ نے تقریباً ساڑھے تین سال قیام فرمایا۔ اول اول کچھ مشکلات پیش آئیں۔ پھر نہ صرف مدرسہ کے حضرات بلکہ شہر کے بھی بہت سے حضرات مانوس ہو گئے۔ صوبہ بہار کے دوسرے اضلاع کے علماء اور بزرگوں سے بھی تعارف ہو گیا۔ لیکن آپ خود اس مدرسہ سے خاطر برداشتہ رہے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ اس مدرسہ کو سرکاری ایڈ ملتی تھی اور بہار یونیورسٹی کے درجات فاضل وغیرہ کی تیاری بھی یہاں کرائی جاتی تھی، یہ دونوں باتیں دار العلوم دیوبند کے اصول کے خلاف تھیں۔ آپ کے اکابر جو دار العلوم کے بااثر اور بارسوخ حضرات تھے۔ انہوں نے اگرچہ وقتی طور پر آپ کا وہاں انتخاب فرما دیا تھا۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ کچھ عرصہ اگر وہاں اور قیام رہتا تو شمس الہدیٰ پٹنہ میں پروفیسر ہو سکتے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ پروفیسر ہونے کے بعد پرنسپل بھی ہو جاتے۔ کیونکہ وہاں تعلقات کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا اور وہاں کی پرنسپل شپ کے لئے کسی ڈگری کی ضرورت نہ تھی۔ اس زمانہ میں مولانا محمد سہول صاحب پرنسپل تھے جو صرف دار العلوم دیوبند کے

فاضل تھے اور دیوبند وغیرہ میں باثر استاد رہ چکے تھے۔ ان کے پاس کوئی ڈگری تو کیا ہوتی وہ بظاہر انگریزی کے حروف سے بھی واقف نہ تھے۔ لیکن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی ایسے مدرسہ کے خواہاں تھے جو دارالعلوم دیوبند کی طرح سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک ہو۔

حسن اتفاق کہ جامعہ قاسمیہؒ مدرسہ شاہی مراد آباد میں ایک ایسے استاد کی ضرورت ہوئی جو درجاتِ علیا کی تعلیم دے سکے۔ اور دیوبند کے اکابر خصوصاً حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے آپ کو تجویز فرمایا اور سفارش فرمائی۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے اس سفارش کی تائید فرمادی اور والد صاحب کو تحریر فرمایا کہ "اب ایسے مدرسہ میں بھیجا جارہا ہے جو علم کا مرکز ہے"۔

ایک مرتبہ کچھ واقعات ذکر فرمارہے تھے۔ ان میں ارشاد فرمایا کہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہما دونوں ہی میرے شفیق اُستاد تھے اور دونوں ہی سے ان کی کتابیں اور فنون یکساں محنت سے پڑھتے تھے (زمانۂ تعلیم میں حصولِ علم میں غایت درجہ انہماک ؒ اور یادی بیرت اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی تھی) لیکن فراغت کے بعد حضرت حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کی رائے یہ

لہ جامعہ قاسمیہ مراد آباد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کا قائم کردہ ہے۔ اس کا نام حضرتؒ نے مدرسۃ الغربا رکھا تھا جس کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ آپ کی اپیل پر جس نے سب سے پہلے چندہ دیا تھا وہ کوئی نیک بخت مسافر تھا۔ پھر حضرت کی نسبت سے اس کا نام جامعہ قاسمیہ ہوگیا۔ اور چونکہ یہ مدرسہ شاہی مسجد میں تھا اس لئے اسے شاہی مدرسہ بھی کہا جاتا ہے اور مدرسہ میں جو نام کندہ کرایا گیا ہے یہ ہے۔ "مدرسۃ الغربا جامعہ قاسمیہ واقع شاہی مسجد"۔ یہ مدرسہ ۱۲۹۶ھ ماہ صفر (۱۸۷۹ء) سے جاری ہوا۔ سب سے پہلے مدرس مولانا سید احمد حسن صاحب امروہوی تھے جو مولانا رحمت اللہ صاحب کے شاگرد رشید تھے ان کی تنخواہ ۲۵ روپے ماہانہ مقرر کی گئی تھی (ازروداد ۱۲۹۶ھ) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ نے

الق ۔ ارشا ۔ انگلا صفحہ

کہ دارالعلوم دیوبند ہی میں پڑھانا چاہیئے۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں
بالکل مجبور ہوا کہ مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو ترجیح دوں (غالباً
حضرت العلامہ مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رجحان پر) اس لئے آپ ٹینہ
صوبہ بہار پڑھانے کے لئے تشریف لے گئے۔ لیکن فرماتے تھے کہ "ایک استاد
کی صرف ایک بات کو ترجیح دینے کا یہ اثر ہے کہ ان سے پڑھی ہوئی کتابیں ہی ہر
جگہ پڑھانے میں آتی ہیں اور دوسرے استاد مکرم سے پڑھی ہوئی کتابیں کم آتی ہیں
حالانکہ میں نے سب کتابیں یکساں محنت سے پڑھی ہیں۔"
اگرچہ وہ یہ سبق دینا چاہ رہے تھے کہ استاد کی خوشنودی کا کتنا بڑا اثر ہوتا ہے
اور ذراسی بھی کبیدگی خاطر کا کیا اثر ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں
نے حصولِ علم کے لئے کتنی محنت اور جاں فشانی کی تھی کہ اساتذہ کے اتنے عزیز

(حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) ۱۳۰۰ھ میں مدرسہ کا سالانہ امتحان لیا تو تعلیمی حالت سے خوش ہو کر فرمایا
"اگر چند سال ایسی صورت رہی تو یہ مدرسہ تمام مدارس عربیہ میں مثل مدرسہ دیوبند نہایت نام آور اور مشہور
ہوگا۔" (از روداد مدرسہ ۱۳۰۰ھ) اس مدرسہ سے بہت بڑے بڑے حضرات فارغ التحصیل ہوئے۔
حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ ابن حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ مفتی اعظم ہند
حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، ریاض الدین صاحب افضل گڑھی صدر مفتی دارالعلوم دیوبند۔ مولانا
عبدالغفور صاحب غزنوی قاضی القضاۃ غزنی محمود طرزی وزیر اعظم افغانستان۔ اپنے مفتی حضرت مفتی محمود
صاحب اور دیگر بہت بڑے بڑے اکابر اسی مدرسہ کے فارغ شدہ ہیں۔ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ
کے ایک خلیفہ حضرت مولانا صدیق صاحبؒ مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ بظاہر حضرت نانوتویؒ کے
مراد آباد سے تعلق کا یہی قوی سبب تھا اسی لئے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ مولانا صدیق صاحبؒ کے زمانہ
سے لیکر ان کے پڑپوتوں کے زمانہ تک ہمیشہ ان کے اسی مکان میں محلہ "بغیہ" میں قیام فرماتے رہے۔
حالانکہ مکان نہایت خستہ ہو چکا تھا۔ اور ٹھہرنے کے لئے عمدہ سے عمدہ انتظام ہو سکتا تھا۔

ہوگئے تھے کہ ان کیلئے ہر ایک اپنی رائے اور خواہش رکھتا تھا! ورشاید اسی لئے حق تعالیٰ نے مرادآباد میں ترمذی شریف، بیضاوی، جلالین، ہدایہ آخرین، ادب کی تمام کتابیں پڑھانے کا موقع بخشا۔ اگرچہ منطق میں ملاحسن بھی پڑھائی اور آخری دور میں وفات تک پھر حضرت شاہ صاحب اور مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہم کی کتابیں بخاری شریف، ترمذی شریف ہدایہ آخرین پڑھانی نصیب ہوئیں۔

افتا جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی میں مستقل حیثیت سے دارالافتاء نہ تھا۔ یہ حضرت والد محترم نور اللہ مرقدہٗ نے قائم فرمایا۔ مرکزی نظامت جمعیۃ وقیام دہلی کے دوران بھی ملی و مذہبی مسائل فتاویٰ کا کام جاری رہا۔ مباحث فقہیہ کے لئے ایک ادارہ قائم فرمایا۔ پھر عمر کے بالکل آخری حصہ میں مدرسہ امینیہ کے شیخ الحدیث وصدر مفتی رہے۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حافظہ بہت قوی تھا۔ غیر متعلق کتابیں بھی یاد تھیں میں نے ان سے صرف ایک کتاب پڑھی ہے "مقامات حریری، ورنہ ادب کی تعلیم مولانا عبدالحق صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی ہے' لیکن اگر میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے "مقامات" نہ پڑھتا تو لغت میں وقت نظر جو ہمارے ہندوپاک کا خصوصی حصہ چلا آرہا ہے نہ پیدا ہوتی۔

"مقامات" پر والد صاحبؒ کی تعلیقات ہیں جو بیشتر فقہ اللغۃ للثعالبی سے لی گئی ہیں۔ لیکن یہ سب ان کو اتنی یاد تھیں کہ مطالعہ کے لئے صرف ایک نظر ڈالا کرتے تھے اور اثناء درس تمام تفاصیل دہرا دیا کرتے تھے جو از بر تھیں اسی طرح اور بھی درسی کتب پر تعلیقات ہیں جو انہوں نے پڑھائی ہیں۔ ان کے علاوہ کافی ضخیم نوٹ بکیں علیحدہ ہیں۔

دوپہر کے وقت گھر جانے کے بجائے۔ جو محلہ مغل پورہ مرادآباد میں تھا مدرسہ ہی میں وقت گزارتے اور افتاء کا کام انجام دیتے۔ میں گھر سے کھانا لے آتا تھا۔ کھانے کا وقت بھی ڈبل کاموں میں صرف فرماتے تھے کہ ظہر کے بعد کے اسباق کا مطالعہ ساتھ

ساتھ فرماتے۔ انہیں شام کے سبق پڑھانے کے لئے اتنا مطالعہ کافی ہوتا تھا۔
اور صبح کے وقت کے اسباق کا مطالعہ نماز فجر کے بعد تلاوت و ذکر بارہ تسبیح
سے فراغت کے بعد چائے پیتے وقت فرماتے تھے۔ میں نے والد صاحب رحمۃ اللہ
علیہ سے کبھی کبھی مختلف کتابوں کے مقامات بھی حل کئے ہیں۔ جنہیں وہ بلا مطالعہ
ہی زبانی حل کرا دیتے تھے اور وہ استاد کتاب سے بہتر طرح حل ہوتا تھا۔ میں نے
بھی تقریباً تمام ہی کتابیں جامعہ قاسمیہ مراد آباد میں پڑھی ہیں شمس بازغہ۔ شرح چغمینی
شرح عقائد دوانی توضیح تلویح حضرت مولانا عجب نور صاحب رحمۃ اللہ علیہ
سے پڑھنے کا موقع ملا۔ سال سے کچھ زیادہ عرصہ دیوبند میں پڑھنا رہا ہوں۔

آغاز جد وجہد آزادی وسیاست والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ مارچ ۲۸ء میں مدرسہ شاہی
پہونچے۔ ان کی تحریرات میں ہے کہ "مدرسہ شاہی کی فضاء مزاج کے موافق مل گئی کہ
دارالعلوم دیوبند کی طرح یہ مدرسہ بھی سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک
تھا۔ اس مدرسہ کے صدر المدرسین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ
تھے جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر ہوئے
مولانا موصوف شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے خاص شاگرد
اور سیاسی خیالات میں انکے پختہ معتقد تھے۔ اگرچہ حدیث کی کتابیں حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ
سے بھی پڑھی تھیں۔ تحریک خلافت میں اگرچہ جیل نہیں گئے مگر کام بہت کیا تھا زیادہ آپ ہی کی خدمات
تھیں جنکی وجہ سے مدرسہ شاہی نے سیاسی تحریک کے سلسلہ میں خاص امتیاز حاصل کیا۔
یہ وہ زمانہ تھا کہ سائمن کمیشن ہندوستان پہونچکر ناکام واپس ہوا تھا اور تقریباً
سات سال کی خاموشی کے بعد جب ۳۹ء شروع ہوا تو ہندوستان میں مختلف
تحریکوں نے جنم لینا شروع کیا۔ اس وقت دلبھ بھائی پٹیل اور گاندھی نے تحریک شروع
کی تھی۔ لہذا یہ سوال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے جمعیۃ علماء ہند نے اس سوال

---

[1] ۳۸ء ہی میں حضرت اقدس مولانا مدنی قدس سرہٗ دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث
کے عہدہ تدریسی فرائض انجام دینے کے لئے تشریف لاتے۔

پر غور کرنے اور مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کے لئے امروہہ میں اجلاس کیا۔ مولانا معین الدین صاحب اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اس اجلاس کے صدر تھے۔

مسلمانوں میں ایک جماعت وہ تھی جو تحریک آزادی میں شرکت سے پہلے ہندو مسلم معاہدہ کو ضروری سمجھتی تھی، لیکن دوسری جماعت جن کی سربراہ جمعیت علماء ہند تھی اس کا یقین تھا کہ جدوجہد آزادی ایسا فرض ہے جو دوسرے برادرانِ وطن سے زیادہ مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔ برادرانِ وطن اس کو صرف سیاسی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لئے اس کی نوعیت مذہبی مسئلہ کی بھی ہے۔ جس کا مدار کسی معاہدہ پر نہیں ہے۔ اگر کوئی اور معاہدہ نہ بھی کرے تو بھی وجوب رہے گا۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ برطانیہ کے سیاسی اقتدار بلکہ اسکی سیاسی جبروت کے دور میں کسی متفقہ معاہدہ کا تصور ہوئے شیر کے تصور سے کم نہیں ہے، چنانچہ جیسے ہی جمعیۃ علماء ہند نے امروہہ میں اجلاس عام کا اعلان کیا دوسری جماعت جمعیت علماء اسلام کے نام سے کھڑی ہو گئی اور اس نے بھی ان ہی تاریخوں میں امروہہ میں اپنی جمعیت کا اجلاس کیا۔"

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو مدرسہ شاہی مراد آباد میں کام کرتے ہوئے ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ سیاسی فضا میں یہ گرمی پیدا ہو گئی۔ اسی سال جب جمعیۃ علماء مراد آباد کا انتخاب ہوا تو آپ کو نائب ناظم بنا دیا گیا۔

کچھ روز بعد جمعیۃ علماء ہند نے شاردا ایکٹ کی تحریک چلائی تو آپ نے پوری سرگرمی سے اس میں حصہ لیا۔ حتیٰ کہ موٹو وغیرہ اپنے ہاتھ سے تحریر فرمائے۔ ضابطہ کے لحاظ سے جمعیت علماء ہند کے اجلاس میں شرکت نہیں فرما سکتے تھے کیونکہ اس کے رکن نہیں تھے لیکن بہرحال شرکت کا موقع ملا۔ علماء کی بحثیں سنیں۔ کچھ قانون داں وکیل اور ایک بیرسٹر صاحب اور ایک بڑے عالم جو سرکار کے حامی تھے۔ صدر کی اجازت سے وہ بھی اجلاس میں شریک ہوتے۔ اور جناب صدر نے ان کو بھی بحث میں حصہ لینے کی اجازت دی انہوں نے کانگریس کے خلاف تقریریں کیں

لہ ان کا نام والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر نہیں فرمایا۔ ۱۲

اور یہ کہ مسلمانوں کو اس میں حصّہ نہ لینا چاہیئے۔ ان کے پیش کردہ دلائل ان کی نظر میں مضبوط ہونگے" مگر والد صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ مجھے نہایت لچر معلوم ہوتے"۔ نیز تحریر فرمایا ہے کہ:

"جمعیت علماء کے ارکان میں سے حضرت سید سلیمان ندوی اور مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ مدنی کی تقریروں نے مجھے متاثر کیا۔ سید صاحب کی تقریر تاریخی اور سیاسی نوعیت کی تھی۔ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمدؒ مدنی نے مذہبی حیثیت سے روشنی ڈالی تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس تجویز کے محرک تھے آخر میں ان کی تقریر بھی ہوئی مگر وہ اس وقت اتنے اونچے درجہ کے مقرر نہیں تھے۔ رات کو جلسہ عام ہوا جس میں مولانا شاہ عطاء اللہ صاحب بخاریؒ کی تقریر ہوئی۔ غالباً تین گھنٹے تک وہ تقریر جاری رہی معلوم ہوتا تھا کہ آگ کے شعلوں کی بارش ہو رہی ہے۔ چیرز نہیں ہوتے تھے بلکہ مضطربانہ نعرے بلند ہوتے تھے۔ کچھ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی بہر حال میں جذباتی لحاظ سے اس تقریر سے متاثر ہوا۔

اجلاس ختم ہوا تو میں مراد آباد واپس ہوا۔ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمہ اللہ علیہ بھی مراد آباد تشریف لائے۔ میں نے چاہا کہ اجلاس اور جلسہ کی ہماہمی کے علاوہ سکون اور اطمینان کی صورت میں بھی حضرت شیخ سے استصواب کروں۔ چنانچہ احقر نے تنہائی میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ کیا مجھے کانگریس میں شریک ہو جانا چاہیئے اور تحریک میں حصہ لینا چاہیئے۔ مولانا کا جواب لامحالہ اثبات میں تھا زید فرمایا۔ یورپ خصوصاً برٹش نے دنیا کے بہت سے ممالک کو اپنے تسلط اور چیرہ دستی کے شکنجہ میں کس رکھا ہے اور برٹش کی یہ طاقت ہندوستان کی وجہ سے ہے۔ ہندوستان پر برٹش کی گرفت کچھ بھی ڈھیلی پڑتی ہے تو ان کمزور ممالک پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اور انہیں سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔

حضرت شیخ کے اس ارشاد کے بعد احقر کو پوری طرح انشراح ہو گیا۔

چنانچہ حضرت مولانا فخرالدین صاحب کا دست و بازو بن کر تحریک میں کام شروع کر دیا۔ چند روز میں پورے مراد آباد میں تحریک چھاگئی۔ اور صوبہ سرحد کے بعد صرف ضلع مراد آباد کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ یہاں کانگریس پر مسلمان چھائے ہوئے تھے۔

مجاہدانہ کارنامے اور شجاعت

۳۰ء میں مراد آباد کے الیکشن میں جو ٹاؤن ہال میں ہو رہا تھا۔ پولیس نے مجمع پر گولی چلائی۔ لاٹھی چارج کے بعد گھوڑے دوڑا دیئے۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی میدان میں تھے اور آخر تک رہے خدا کی حفاظت تھی کہ عجیب و غریب طرح گھوڑوں کی ٹاپوں اور فائرنگ کی گولیوں سے بچے۔ فائرنگ بند ہوگئی تو زخمیوں کو اٹھوایا۔ عبدالغنی ایسا مجروح ہوا کہ جاں بر نہ ہو سکا۔ دوسرے زخمی اچھے ہوگئے۔ والد صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ پشاور میں قصہ خوانی بازار کے فائرنگ کے بعد یہ یو۔ پی میں پہلا فائرنگ تھا۔ والد صاحب کی صحت نہایت اچھی تھی۔ ورزش کا سلسلہ باقاعدہ جاری رکھتے تھے۔ تسلسل کے ساتھ تدریس و افتاء تصنیف و تالیف، عبادت و ریاضت (ذکر جہر وغیرہ) میں مشغولیت سے کوئی امر مانع نہیں ہوتا تھا۔

قید و بند

۳۲ء میں جیل جانا ہوا۔ رہائی کے بعد مراد آباد میں کرایہ پر مکان لیا اور سب اہل خانہ کو محترم دادا جان اور دادی صاحبہ سمیت دیوبند سے بلا لیا۔ میں نے دیوبند میں جناب مولانا قاری اصغر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے الف با کا قاعدہ شروع کیا تھا۔ مراد آباد آنے پر قرآن کریم شروع کیا۔

۳۹ء میں جرمنی کی جنگ شروع ہوئی۔ اسی زمانہ میں آپ نے مشہور کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" تحریر فرمائی۔ جو ضبط کر لی گئی۔ خانہ تلاشی بھی لی گئی۔ پریس بھی ضبط کر لیا گیا۔ آپ کو گرفتار کر لیا گیا مگر ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ آپ کے پیش نظر شاندار ماضی کی تصنیف کے دو مقصد تھے۔ اول یہ کہ سیاسی تحریک میں علماء کی شرکت کو علماء کی

شان کے خلاف ایک طرح کی بدعت قرار دیا جا رہا تھا۔ اس کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے کہ علماء نے ہر دور میں اسی دور کی سیاست کے مطابق عملی حصہ لیا اور سزائیں بھگتی ہیں۔ لہٰذا اس دور میں اسی دور کے تقاضہ کے مطابق تحریک میں حصہ لینا علماء کی شان کے خلاف نہیں، بلکہ ان کی تاریخی روایات کو زندہ کرنا ہے۔

دوسرا مقصد تحریکِ آزادی کو تقویت دینا تھا۔ اس لئے ان مظالم کی تاریخ بیان کی گئی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے آغاز سے اس وقت تک انگریزوں نے کئے تھے اس مقدمہ کے اختتام پر تا برخاستِ عدالت سزا ہوئی۔ یہ مقدمہ مراد آباد میں ہوا تھا۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تقریباً سولہ سال مراد آباد رہے اور جماعتی کام اور تصانیف اسی دور میں شروع فرمائیں۔ اس لئے عموماً لوگ انہیں مراد آبادی سمجھنے لگے۔ ان سے اہلِ مراد آباد کے تعلق کا یہ حال تھا کہ حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کو "مراد آباد کا بے تاج بادشاہ" فرمایا کرتے تھے۔

معروفیات کے باوجود ہر وقت لکھتے رہنے کی وجہ سے حضرتِ اقدس مدنیؒ نے انہیں ایک دفعہ "حیوانِ کاتب" فرمایا۔ منطق میں۔ انسان کی تعریف میں کہ وہ کیا ہے "حیوانِ ناطق" کہا جاتا ہے۔ آپؒ نے اسے ازراہ تلطف والد صاحبؒ کے لئے بدل کر "حیوانِ کاتب" فرمایا۔

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے بھی اسی دور میں والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ہی سے ادب کی کتابیں اور ترمذی شریف پڑھی ہے۔ حضرت مفتی محمود صاحبؒ والد صاحبؒ کے بکثرت لکھنے کی عادت پر فرماتے تھے کہ النفس لا تتوجہ الی شیئین فی آن واحد کا قاعدہ ان کے یہاں منقوض تھا وہ سبق پڑھاتے پڑھاتے بھی لکھ لیا کرتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شاندار ماضی کی تحریرات میں بھی صاف کر کے رمبیضہ لکھتا رہا ہوں۔

جیل خانے یا عبادت گاہیں: ان حضرات کے مشاغل کی ایک جھلک: ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۴ء تک والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ چار مرتبہ مراد آباد سے ایک مرتبہ دہلی سے گرفتار ہوئے۔ بامشقت سزا بھی دی گئی۔ جیل ہی میں حفظِ قرآن پاک شروع کیا۔ سولہ پارے متعدد جیلوں میں یاد کئے۔

۸ اگست ۱۹۴۲ء کو وہ تحریک شروع ہوئی جس کا نام "کوئیٹ انڈیا" "ہندوستان چھوڑ دو" والی تحریک مشہور ہوا۔ اس میں گرفتار شدگان اکابر سب ہی مراد آباد جیل میں جمع ہو گئے۔

حضرت اقدس مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ حسن پور ضلع مراد آباد میں ایک تقریر کی وجہ سے پہلے ہی گرفتار کر لئے گئے تھے۔ اس دوران جو گرامی نامے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام صادر ہوتے رہے وہ گورنر یا صوبہ دار کے عنوان سے معنون آتے رہے۔ جیسے کہ مکتوبات شیخ الاسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔

حضرت اقدس مدنی "مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مولینا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی (جو جیل ہی کی یا فضوں کے بعد حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی خلافت سے مشرف ہوئے) حضرت مولانا الحافظ القاری المقری محمد عبد اللہ[1] صاحب تھانوی اور حافظ محمد ابراہیم صاحب سب ہی اسی جیل میں تھے۔ چند روز بعد رمضان شریف آگیا تو جیل خانہ کی بارک تراویح گاہ بن

---

[1] آپ کا وطن تھانہ بھون تھا۔ نیکی پارسائی علمی اور سیاسی بصیرت انتہا درجہ کی خدا نے بخشی تھی۔ حضرت اقدس مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے اپنے فتاوٰی میں مسئلہ ضاد پر اشکالات کا ذکر فرماتے ہوئے تحریر فرمایا ہے: "حتیٰ کہ عزیزی قاری عبد اللہ آئے" پھر ان سے گفتگو کے بعد رفع اشکالات کا ذکر فرمایا تھا۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے قرأت عشرہ ان ہی سے پڑھی ہیں۔ جولائی ۱۹۴۴ء میں جیل سے آنے کے بعد وفات پائی۔ آپ کی وفات کے عرصہ بعد قبر بیٹھ گئی جسم مبارک سالم نکلا۔ آپ کی ذات بہت چھوٹی تھی۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ اپنے آپ کو سید، صدیقی، فاروقی اور عثمانی وغیرہ کہلا کر خوش ہو جانے والے حضرات کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے کہ کل قیامت کے دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب وہ ہوں گے یا آپ کا وہ امتی ہوگا جو عمل ورع اور تقویٰ اور اتباع سنت سے مزین تھا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

گئی۔ شیخ الاسلام تراویح پڑھاتے تھے اور مولانا حافظ قاری عبداللہ صاحب سماعت کیا کرتے تھے۔ رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ۔

اکتوبر میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ان میں شامل ہو گئے تھے۔ وہاں شیخ الاسلام سے درسِ قرآن پاک کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ مگر یہ درس[1] ایک ہفتہ ہونے پایا تھا، کہ حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز کو مرادآباد سے نینی جیل (الہ آباد) منتقل کر دیا گیا۔

یہ حضرات جن کے لئے یہ جیل خانہ ایک عبادت گاہ اور درس گاہ بن گئی تھی، حضرت اقدس کی مفارقت پر تڑپتے رہ گئے۔

کچھ عرصہ بعد والد صاحبؒ اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کو بھی بریلی سینٹرل جیل منتقل کر دیا گیا اور دوسرے بقیہ حضرات کو بھی مختلف مقامات پر۔ والد صاحب جیل ہی میں تھے کہ دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی۔ مکتوبات شیخ الاسلام جلد چہارم میں مکتوب ۱۲۰ میں ان کی وفات پر تعزیت فرمائی گئی ہے۔ یہ واقعہ ربیع الاول ۶۳ھ جون یا جولائی ۴۴ء کا ہے۔

۲۶ اگست ۴۴ء ۶ رمضان ۶۳ھ کو شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی رہائی ہوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہو چاہے وہ حضرت قاری صاحب ہوں یا مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب ہوں رحمہما اللہ و رفع درجاتہما۔ آمین۔

حضرت مفتی محمود صاحب مدظلہم ایک بار اس بات پر اظہار افسوس فرما رہے تھے کہ فتاویٰ کے نئے ایڈیشن میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ العزیز کی اس تمہیدی عبارت کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جس میں حضرت مولانا قاری عبداللہ صاحب کا ذکر حضرت نے فرمایا تھا۔ حضرت مفتی صاحب حضرت قاری صاحبؒ کے حالات پر عجیب انداز میں روشنی ڈالتے تھے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ حالات ضبطِ تحریر میں آجاتے۔

[1] والد ماجد نور اللہ مرقدہٗ نے یہ درس تحریر فرما لئے تھے۔ جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

فوری آرڈر دیا گیا کہ وہ نینی جیل سے باہر تشریف لے جائیں۔ والد صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ:

"انگریز کی طاقت بھی جنگ کے اثرات سے مضمحل ہو گئی تھی وہ ہندوستان سے اپنی گرفت ڈھیلی کرنا چاہتا تھا۔"

مرکزی نظامت اور مراد آباد سے دہلی منتقلی

سہارن پور میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس۔ ۱۱، جمادی الاول ۱۳۶۴ھ مئی تا ۷ مئی ۱۹۴۵ء کو رکھا گیا۔ جس میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ناظم اعلیٰ اور والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ناظم جمعیت علماء ہند چنا گیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی عہدہ قبول کرنے کے لئے یہی شرط تھی اور حضرت اقدس مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایسا حکم والد صاحبؒ کے لئے دوسری بار تھا۔ اس لئے رفتہ رفتہ مراد آباد کو خیرباد کہنا پڑا۔ ۱۹۴۸ء سے کرایہ پر مکان لے کر اہل خانہ کو مراد آباد سے دہلی بلا لیا اور مستقل طور پر دہلی رہنے لگے درس و تدریس کا مشغلہ چھوڑنا پڑا لیکن اس وقت ملک میں مسلمانوں کی حالت ناگفتنی تھی۔

موجودہ مرکزی دفتر جمعیۃ علماء ہند

دہلی کے محکمہ آثار قدیمہ ہی کی تحویل میں ایک مسجد مسجد عبد النبی بھی تھی جو نئی دہلی میں ہے اس سے ملحق کافی جگہ تھی وہ آپ کو مرکزی دفتر کے لئے پسند تھی۔ وہ آپ نے محکمہ سے حاصل کی تھیں اب بحمد اللہ مرکزی دفتر بن گیا ہے۔ دہلی ہی میں ایک شاہی دور کی وسیع مسجد جو مسجد فتح پوری کے تقریباً برابر ہو گی سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ لب دریائے جمنا ہے۔ اس کا نام غالباً حسن منظر کے باعث "گھٹا مسجد" مشہور ہے انہیں بہت پسند تھی۔ اس کے گرد مکانات بنے ہوئے تھے۔ جن پر شرنارتھیوں[۱] کا قبضہ تھا۔ وہ مسجد آپ نے واگذار کرائی وہاں ایک سہ ماہی تربیتی کورس فضلاء مدارس کے لئے شروع کیا تھا۔ اور خود ہی پڑھاتے تھے۔

---

[۱] شرنارتھی یعنی غیر مسلم پناہ گزین جو پاکستانی علاقوں سے گئے تھے

تقسیم ہند کے بعد ایک جگہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے:
۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد فرقہ واریت کے وہ ہنگامے شروع ہو گئے جو آج تک ختم نہیں ہوئے۔ ان کی داستان طویل بھی ہے اور دردناک بھی ان ہنگاموں نے خدمات کا ایک نیا باب قائم کیا۔ جس کا عنوان "ریلیف" ہے یعنی کشتگانِ ستم کو دفنانا، مجروحوں کے جسم پر دوا کی پٹیاں باندھنا۔ اور زخمی دلوں پر تسکین اور دلداری کا مرہم لگانا، اجڑے ہوؤں کو بسانا۔

مشرقی پنجاب اور ہماچل میں مسلمان ہندوانہ وضع یا سکھوں کی وضع اختیار کر کے زندگی گذار رہے تھے جہاں تباہ شدہ مسلمانوں کی تعداد ایک فی ہزار رہ گئی تھی۔ جمعیت علماء ہند کے حضرات نے وہاں دورے کئے حوصلے دلاتے۔ شبینہ مکاتب شروع کئے مسلمان جو چھپے ہوئے تھے برآمد ہونے لگے۔"[1]

اس کے لئے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھویں جماعت تک دینیات کا گیارہ رسائل پر مشتمل ایک نصاب تحریر فرمایا مدد کے لئے تعلیمی چارٹ بھی بنوا تے میں نے دیکھا ہے کہ یہ رسائل وہ باوضو تحریر فرمایا کرتے تھے۔

رسائل دینیہ کا یہ نصاب انتہائی مقبول ہوا۔ ازہر شاہ صاحب قیصر مرحوم رسالہ "دار العلوم" کے پہلے تعزیتی نوٹ میں جو دسمبر ۷۵ء کے پرچہ میں آیا تھا۔ تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جمعیت کی سیاسی خدمات سے دنیا کو متعارف کرانے والے مولانا موصوف ہی تھے دسیوں کتابیں آپ نے لکھیں اور بڑی محنت و جانفشانی سے لکھیں۔ سیاسی علماء پر مولانا کے جو احسانات ہیں وہ بھلائے نہیں جا سکتے۔

مجاہد ملت[2] کے دورِ نظامت میں آپ نے دینی تعلیم کا رسالہ سات حصوں

---

[2] مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ؒ کا یہ لقب انڈیا میں معروف ہے

میں چھوٹے بچوں کے لئے لکھا اور اسے اپنے اہتمام میں عمدہ کتابت وطباعت سے شائع کرایا اور بحیثیت مصنف اس پر اپنا نام درج نہیں کیا۔ یہ مولانا کے اخلاص کا نتیجہ تھا کہ دینی تعلیم کا رسالہ پورے ملک میں بہت مقبول ہوا اس سے پہلے آپ نے بچوں کے لئے تاریخ الاسلام نام کا رسالہ تین حصوں میں لکھا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ آج کوئی بچے والا گھران رسالوں سے خالی نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ چھوٹی بڑی کوئی پچاس کتابوں کے آپ مصنف ہیں"۔ (دارالعلوم بابت ماہ دسمبر ۵۷ء)

یہ رسالے اور ان کے معاون عمدہ چارٹ ایک نہایت عمدہ تعلیمی سیٹ ہے اور اب یہ رسالے گیارہ حصوں میں ہیں۔ بچوں کے لئے ابتداء سے آٹھویں جماعت تک کے لئے ان میں آداب واخلاق عقائد وعبادات اور مسائل سب دلچسپ پیرایہ میں ہیں۔

"علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" دو حصوں میں ہیں۔ دوسرا حصہ ضخیم کتاب ہے۔ اس میں ان علماء کے حالات ہیں، جنہوں نے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں یا ان کے معاون رہے۔ یہ کتاب اسی نقطۂ نظر سے شاندار ماضی کی طرح لکھی گئی ہے شاندار ماضی میں، ۱۸۵۷ء تک کے حالات اور علماء حق میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک علماء کرام کی قربانیوں کا تذکرہ ہے

"جمعیۃ علماء ہند کیا ہے؟" اور مختصر تذکرہ خدمات جمعیت علما ہند" دو حصوں میں تحریر فرمائیں یہ بھی اسی طرح کی کتابیں ہیں۔

۴۷ء کے بعد ان کی نظر اس چیز پر منعطف ہو کر رہ گئی تھی کہ مسلمانوں کو اسلام پر کیسے قائم رکھا جائے۔ اسی لئے انہوں نے پارلیمنٹ کی ممبری نہیں قبول کی۔ مجھ سے ایک مرتبہ اس طرح کا ذکر آیا تو فرمایا کہ مجھے دو بار ہندو مسلم لیڈروں نے متفقہ طور پر بلا مقابلہ ممبر منتخب ہو جانے کی پیش کش کی لیکن میں نے اسے پسند

---

[1] انشاء اللہ یہاں بھی ہم طبع کرا رہے ہیں۔ آٹھ حصے طبع کرا لئے ہیں باقی ابھی باقی ہیں۔ حامد میاں

نہیں کیا۔ میں نے عرض کیا کہ ضرور قبول کر لینی چاہیئے تھی۔ بہت سے کام ہو سکتے تھے۔ اس پر ذرا خفگی سے جواب دیا کہ "تم بھی ایسی باتیں کرتے ہو" مطلب یہی تھا کہ ان کا ذہن اس طرف متوجہ تھا کہ ایسی تحریرات سامنے آنی چاہئیں جو مسلمانوں کی بقاء اور ترویج اسلام کا ذریعہ بنیں اور ممبر ہونے کے بعد تو آدمی اور کاموں میں پھنس جاتا ہے۔ تحریری کام ممکن نہیں رہتا۔

چنانچہ انہوں نے رفتہ رفتہ ہر موضوع پہ کتابیں شائع کرنی شروع کیں اس طرز کی کہ گویا وہ مسلمانوں کو علمی مواد فراہم کر کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینا چاہتے ہیں۔

'اسلام کے اقتصادی اور سیاسی مسائل" کے نام سے کتاب تحریر فرمائی۔ ازالۃ الخفاء کا ترجمہ و تشریح کے ارادہ سے کتاب لکھنی شروع فرمائی۔ جس کا نام "عہد زریں" رکھا۔ یہ کتاب علماء میں بہت مقبول ہوئی یہ ازالۃ الخفاء کے ترجمہ کے بجائے ایک مستقل کتاب بن گئی۔ ایک ضخیم کتاب "سیرتِ مبارکہ" کے نام سے سیرتؐ پر لکھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب غیر مسلموں کو دعوت دینے ہی کے لئے لکھی ہے۔ اسی لئے اسے سب سے پہلے "انسان" کے عنوان سے شروع کیا گیا ہے۔

اس کے بارے میں عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں۔

کتاب جس قدر لوازم ظاہر کے لحاظ سے خوشنما اور دلفریب ہے، اسی قدر معنوی حیثیت سے قابلِ داد اور اعلیٰ ہے۔ سیرت مبارک پر بڑی چھوٹی کتابیں اب تک اردو میں بے شمار لکھی جا چکی ہیں۔ اور بعض بڑی بلند پایہ ہیں (مثلاً شبلیؒ و سلیمان کی سیرت النبیؐ) لیکن یہ سب سے نرالی سب سے انوکھی سب سے البیلی ہے فاضلانہ مگر خشک مطلق نہیں۔ مختصر مگر مجمل کہیں سے نہیں، مفصل مگر بار خاطر کہیں سے بھی بننے والی نہیں۔ عام پسند مگر عامیانہ ہونے سے بھی پاک، ندرت سے لبریز مگر غرابت و اجنبیت سے سراپا پرہیز و گریز۔ اسلوب بیان ایسا کہ بغیر دیکھے اور

پڑھے اس کا ذہن میں آنا دشوار ہے۔ کتاب تمام تر بیسویں صدی کے ناظرین کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ الخ۔ کیا اچھا ہو کہ اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو جائے"۔

اخلاقیات پر والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث شریف کی ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کا نام "مشکوٰۃ الآثار" ہے۔ انہوں نے اس کا نسخہ بھیجا کہ محمود میاں اور وحید میاں کو یہ پڑھائیں۔ اور تحریر فرمایا:

موطا امام محمد سے آغاز بہت بہتر ہے۔ (میں نے مدرسہ میں شرح وقایہ کے ساتھ موطا امام محمد پڑھوانا شروع کی تھی۔ اس کی اطلاع دی تھی کہ دونوں فلاں فلاں کتابیں پڑھ رہے ہیں) مگر مشکوٰۃ الآثار بھی ضرور پڑھوائیے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس کو حفظ کرایا جائے۔ فقہی مسائل کے متعلق احادیث پر تو بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اخلاقیات کے متعلق صرف مشکوٰۃ کا نصف آخر ہے۔ مگر وہ عموماً نہیں پڑھایا جاتا ہے اور پڑھایا جاتا ہے تو اس کو اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ مشکوٰۃ الآثار میں اسی کوتاہی کی تلافی کی کوشش کی گئی ہے کہ طالب علم ابتداء ہی میں اخلاقیات سے بھی واقف ہو جائے۔ اور شفیق استاد ہو تو ان پر عمل کی تربیت بھی کرتا رہے! الحمد للہ ہندوستان میں اس کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا ہے۔ اب عربی حروف کے ٹائپ سے طباعت کا انتظام ہو رہا ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ مکمل فرمائے"۔ یہ کتاب دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں بھی داخل ہو گئی ہے۔

اور نور الایضاح کا ترجمہ اور شرح بھی ان کی پرانی تصنیف چلی آ رہی ہے۔ تاریخ الاسلام اور ہمارے پیغمبر تو بچوں کے لئے ان کی ابتدائی تصانیف تھیں اور دینی تعلیم کے رسائل آخری دور کی تصانیف میں داخل ہیں۔

اہتمام مدارس کی ذمہ داریاں جولائی ۵۵ء میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب بانی مہتمم جامعہ قاسمیہ مراد آباد کی وفات کے بعد سے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو اہل مراد آباد نے وہاں کا مہتمم مقرر

کیا۔ یہ اہل مراد آباد کی محبت اور تعلق ہی تھا۔ آپ نے آخری وقت تک اسے نباہا بحمد اللہ مدرسہ بھی ترقی کرتا رہا۔ آپ نے وہاں "ادارۃ حفظ الرحمٰن" ایک وسیع جگہ لب دریا[1] لے کر وسیع پیمانہ پر قائم کیا۔ وہاں ہی آجکل[2] مولانا ارشد صاحب۔ ابن حضرت مولانا مدنی قدس سرہٗ تقریباً چار سال سے کام کر رہے ہیں۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ عہدہ نظامت سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ علمی تصنیفی مشاغل زیادہ ہو گئے تھے۔ پھر مراد آباد کے علاوہ دہلی کے چار مدارس کا اہتمام بھی آپ کے سپرد تھا۔ ادارہ المباحث الفقہیہ کے رئیس اور اوقاف جمعیۃ کے چیئرمین تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ اور عاملہ کے رکن تھے۔ وہاں بھی بیشتر شوریٰ وغیرہ کی کارروائیاں ان کے دست مبارک سے لکھی جاتی تھیں۔ مدرسہ امینیہ کے شیخ الحدیث تھے۔ بخاری شریف اور ترمذی شریف کے علاوہ ہدایہ اخیرین بھی پڑھاتے تھے۔ وہاں کے صدر مفتی تھے۔ یہ سب کام آخر وقت تک جاری رہے۔ افتاء کا کام جو مراد آباد میں اور مدرسہ امینیہ میں انجام دیا ہے۔ نیز نظامت جمعیۃ کے دوران بھی جو فتاویٰ تحریر کئے ہیں وہ اگر کبھی جمع کئے گئے تو یہ بھی ان کے علمی کام کا ذخیرہ ہو گا۔

ان کے مکاتیب بھی علمی افادیت سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ مجھے ایک دفعہ تحریر فرمایا کہ ذہن میں آتا ہے کہ ظہر کی نماز سے جو تعلیم صلوٰۃ شروع ہوتی ہے وہ قرآن پاک کی آیت مبارکہ اقم الصلوۃ لدلوک الشمس کے حکم کے مطابق ہوئی ہے۔ یہ آسان توجیہ ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب جب وزارت پر فائز ہوئے تو ان کے نام ایک گرامی نامہ میں چند نصائح اور مبارکباد تحریر فرمائی تھی۔ اس کا پورا مضمون تو

---

[1] مراد آباد سے جو دریا گذرتا ہے اس کا نام رام گنگا ہے یہ بھی بڑے پاٹ کا دریا ہے۔ رام گنگا اور گنگا الگ الگ دو دریا ہیں۔ [2] مگر آجکل مولانا ارشد صاحب دارالعلوم دیوبند میں پڑھا رہے ہیں اور مولانا رشید الدین صاحب جو حضرت اقدس مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے داماد ہیں جامعہ قاسمیہ کے مہتمم ہیں

مجھے یاد نہیں البتہ نصیحت میں ایک آیت بھی تحریر فرمائی تھی "ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا" والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے علمی گرامی نامے بہت لوگوں کے پاس ہوں گے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ مہیا ہو سکیں۔ جناب حاجی عبدالحی خاں صاحب ۴/۳/۵۱ دستگیر کالونی نے ان کا ایک والا نامہ مع ایک کارنامہ کے ارسال فرمایا ہے جو ایک مذہبی خاص معاملہ میں ہے۔ خاں صاحب موصوف اس زمانہ میں مسلم لیگ کے سیکرٹری تھے اور اب عرصہ سے پاکستان میں ہیں[۱]۔

"سیرت مبارکہ" سے پہلے "شواہد تقدس" سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر مودودی صاحب کے اعتراضات کے جوابات میں تحریر فرمائی تھی۔

حضرت اقدس مدنی نور اللہ مرقدہٗ اور دیگر اکابر مجاہدین کی حیات طیبہ پر کتاب لکھی ہے جو ہندوستان میں طبع ہوئی ہے۔ اس کا نام "اسیران مالٹا" رکھا ہے۔

وفات سے ایک سال قبل والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے تحریر فرمایا تھا کہ جب حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے خود نوشت سوانح حیات تحریر فرمائی تو میں نے دیکھ کر عرض کیا کہ "یہ سوانح حیات تو نہیں، نقش حیات ہے"۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اقدسؒ کو یہ جملہ پسند آیا تو آپ نے اس کا نام "نقش حیات" ہی رکھ دیا۔ اسی گرامی نامہ میں یہ اطلاع بھی تھی کہ اب آپ (۵ ۲) میں حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح حیات تحریر فرما رہے ہیں بعد میں چھوٹے بھائی کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ طبع ہونے والی ہے۔

وفات سے ایک سال قبل ہی آپ نے انڈیا آفس لائبریری کی سی آئی ڈی کی رپورٹوں سے "تحریک شیخ الہند"[۲] کے نام سے ایک کتاب مرتب فرمائی۔ جس کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند نے اپنے قصر صدارت میں غالباً ۵ جولائی ۶۵ء کو کیا۔ افتتاحی مقالہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے پڑھا۔ وزیر اعظم، دیگر وزراء، ارکان اسمبلی اور معززین سمیت

---

[۲] شاندار ماضی کی طرح سیرۃ مبارکہ اور شواہد تقدس بحمد اللہ یہاں طبع ہو گئی ہیں۔ تحریک شیخ الہند۔ سیاسی و اقتصادی مسائل اور دینی تعلیم کے رسائل کے آٹھ حصے بحمد اللہ یہاں طبع ہو گئے ہیں۔

[۱] مگر اب خاں صاحب وفات پا چکے ہیں۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

پانچ ہزار اہلِ علم و دانش کو مدعو کیا گیا تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں مسلم مجاہدینِ آزادی کے کارناموں پر پردہ ڈال کر تاریخ کو مسخ کیا جا رہا ہے اور شاید اسی بنا پر جناب فخر الدین علی احمد صاحب نے اس کے افتتاح و نشریات کا اتنے بڑے پیمانے پر اہتمام فرمایا۔ تاکہ جہادِ آزادی شروع سے آخر تک جاری رکھنے والے طبقہ کی تاریخ سامنے لائی جاتے حقیقتاً جدوجہد آزادی شروع کرنے والے اور اسے پروان چڑھانے والے حضرات میں خصوصاً طبقۂ علما ہی تھا نہ کہ نواب، جاگیردار اور سر وغیرہ کے خطابات حاصل کرنے والے لوگ۔ یہ لوگ تو خال خال ہی ہوں گے۔ جنہوں نے جدوجہدِ آزادی میں حصہ لیا ہو۔ اسی طرح غیر مسلم حضرات بھی ان کے پیچھے پیچھے رہے ہیں نہ کہ قائد و مقتدا۔

اعزازات اسی زمانہ میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حکومت ہند کی طرف سے وظیفہ مکان کی سہولتوں وغیرہ کی پیش کش کی گئی۔ تامبر پتر بھی دیا گیا جس پر کارنامے کندہ ہوتے ہیں اور وزیر اعظم کے دستخط ثبت ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ جدوجہد آزادی میں پانچ مرتبہ گرفتار ہوتے تھے۔

تامبر پتر انہوں نے رکھ لیا اور یہ فرما کر رکھا کہ یہ میں اس لیئے لے رہا ہوں کہ جہادِ آزادی میں مسلمانوں کی شمار میں اس سے اضافہ ہو گا۔ باقی چیزیں نہیں قبول کیں۔

اتباع اسلاف حضرت اقدس مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی یہ چیزیں اور سرکاری لقب پیش کیا گیا تھا انہوں نے بھی یہ تختی رکھ لی تھی باقی چیزیں قبول نہیں فرمائی تھیں، اسی طرح والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔

محدثات میں احتیاط اجتناب رشید میاں سلمہٗ نے ان کی خدمت میں آٹو گراف کے لیئے کچھ کارڈ بھیج دیئے۔ اس پر انہوں نے حسب ذیل جواب تحریر فرمایا کہ جس سے ان کی استقامت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں کس درجہ دین پر استقامت اور جذبۂ تبلیغ و اصلاح غالب تھا۔

"آٹوگراف وغیرہ محدثات میں سے ہیں ایاکم والمحدثات اپنے بزرگوں کے طریقے معلوم کرو عضوا علیھا بالنواجذ۔ یہ تقشف وتصلب نہیں بلکہ دین متین کو اصل خدوخال میں باقی رکھنے کی صورت یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اتباعِ سلف کی توفیق بخشے۔ یہی سعادت عظمیٰ ہے اور عالم دین کے لئے یہی حقیقی ترقی" ہمیں یہ والانامہ ان کی وفات کے بعد جمعہ کے دن نماز کے بعد موصول ہوا جو ہم سب کے لئے وصیت کا درجہ رکھتا ہے اور وصیت مسنونہ کے انتہائی قریب ہے' وباللہ التوفیق وھوالمستعان۔ یہ مکتوب انہوں نے ہمشیرہ سے تحریر کرایا ہے۔ کمزوری کی وجہ سے خود نہیں تحریر فرما سکے مگر مذکورہ سطور خط کے آخر میں خود اپنے قلم سے تحریر فرمائی ہیں۔

عبادات جمعیۃ علماء کی نظامت کے فرائض کے دوران بھی کبھی ایسا نہ ہوتا تھا کہ نماز باجماعت میں کوتاہی ہو، سوائے اس کے کہ حضرت مدنی قدس سرہ دفتر میں تشریف فرما ہوں اور وہ مسجد میں نہ جاسکیں تو دفتر ہی میں حضرت کے ساتھ جماعت میں شرکت فرما ہوتے تھے۔

بعد مغرب نوافل میں قرآن پاک یاد رکھنے کے لئے کافی دیر تک تلاوت فرماتے تھے۔ صبح کو نماز فجر کے بعد ٹہلنے جاتے تھے اس وقت بھی تلاوت فرماتے تھے واپس آکر نوافل اشراق پڑھا کرتے تھے۔

۶۴ء میں مجھ سے ارشاد فرمایا تھا کہ خداوند کریم نے حفظ قرآن پاک مکمل کرا دیا ہے گویا محققانہ معیار پر تصنیف وتالیف، درس وتدریس' اہتمام مدارس، اسفار اور مکاتبت اور ملاقاتوں وغیرہ جیسے سب کام جاری رکھتے ہوئے حفظِ قرآن پاک کی تکمیل بھی فرمائی یہ برکت اور توفیق ہی تھی رحمہ اللہ ورفع درجاتہ۔

شدتِ ضعف و علالت رمضان المبارک سے قبل الانامہ صادر ہوا تھا اس میں اپنی کمزوری کا حال تھوڑا سا تحریر فرمایا تھا اور حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شعر کا نامکمل حصہ "ان یشاء یبارک

علی اوصال شتیٰ ممنوع بھی۔ میں نے اس پر تشویش کا اظہار کیا تو تحریر فرمایا، مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان بے حقیقت ہے۔ چند اعضاء کے جوڑ کا نام انسان ہے، خالقِ انسان جب تک چاہے یہ جوڑ باقی رکھے، جب چاہے توڑ دے وہ جبار ہضیم بھی ہے"۔ لیکن وفات کی خبر کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ بقول ابو نواس ؎

دَبَّ فِیَّ الفناء سفلا وعُلوا

وارانی اموت عضوا فعضوا

کی کیفیت محسوس فرما رہے تھے، لیکن توفیق شامل حال تھی ہر وقت مصروف نظر آتے تھے۔ جس سے میرے علاوہ دہلی میں اپنے گھر کے اندر موجود رہنے والوں کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ چند روزہ مہمان ہیں۔ رمضان المبارک میں جو والا نامہ صادر ہوا اس میں اس بات پر بہت اظہار قلق فرمایا تھا کہ میں کمزوری کے باعث مسجد تک بیس منٹ میں راستہ طے کر پاتا ہوں! اس بناء پر ظہر اور عشاء کے علاوہ جماعتوں میں شرکت نہیں کر سکتا۔ آخر وقت تک عزیمت ہی پر عمل چاہتے رہے۔

خونی بواسیر سب سے بڑا عارضہ تھا۔ جس کا دورہ اس سال ۱۵ رمضان سے شروع ہوا۔ اس میں اس قدر شدت ہوتی تھی کہ بدن کا جیسے سارا خون نکل گیا ہو لیکن اس کے باوجود میرے پھوپھا صاحب کی وفات پر ۱۹ رمضان کو سفر مراد آباد کیا اور روزہ سے رہے۔ صرف تین روزے قضا ہوئے اور تین دن تراویح نہیں پڑھ سکے اس حالت میں جتنے کام وہ کرتے تھے وہ بغیر توفیق مبدأ فیاض کے ناممکن ہیں۔

حقوق العباد رشتہ داروں سے حسنِ سلوک اور شفقتِ عامہ

حسن اخلاق اور حقوق العباد پر خاص طور پر زور دیتے تھے۔ تمام ہی رشتہ داران کے رہینِ منت رہے ہیں وہ سب کے لئے باپ کی سی شفقت رکھتے تھے اور ان کی امداد کی وجہ سے ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ اس قدر مشغولیت کے باوجود ہر رشتہ دار کے یہاں کبھی نہ کبھی جاتے رہنے

کا وقت نکال لیتے تھے چاہے دس ہی منٹ بیٹھیں۔ میرے چچا سید احمد میاں عرصہ سے علیل ہیں صبح کو ٹہلنے کے بعد واپسی پر ان کے یہاں روزانہ تشریف لے جاتے تھے اور صرف پانچ چھ منٹ بیٹھ کر تشریف لے آتے تھے۔ انلٹ لتصل الرحم وتحمل الکل وغیرہ پر عمل فرماتے تھے۔ جو رفتہ رفتہ طبیعت بن گیا تھا اور نہایت ہی عجیب بات یہ تھی کہ وہ صرف یہ خیال رکھتے تھے کہ دوسرے کا حق ان پر کیا ہے۔ اس لئے اس کی ادائیگی حق کے لئے کوشاں رہتے تھے اور ہمیشہ ممنون اور یہ جانتے ہی نہ تھے کہ ان کا حق دوسرے پر کیا ہے اور وہ ادا کرتا ہے یا نہیں ؟

ان کی شفقت بڑھتے بڑھتے شفقت عامہ کے درجہ میں داخل ہوگئی تھی۔ ایک روز شام کے وقت پکانے کے لئے سبزی لے آئے۔ حالانکہ ہمیشہ میرے بھائی سودا لاتے ہیں۔ والدہ نے دیکھا تو وہ تقریباً نصف خراب تھی۔ انہوں نے عرض کیا کہ یہ آپ کیا لے آئے ہیں آدھی تو خراب ہی ہے۔ فرمایا اس سبزی والے کے پاس یہی رہ گئی تھی۔ اور اب اس سے کون خریدتا اور صبح تک اس کی ساری ہی سبزی خراب ہو جاتی اس لئے میں لے آیا۔

سلوک (تصوف)

حضرت اقدس مدنی قدس سرہٗ نے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم سلوک ۶۳ء کے قریب قریب مکمل فرما دی تھی۔ سلوک کا آخری سبق ان تعبد اللہ کانک تراہ ہے جسے احسان سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اور اہلِ طریقت اس مراقبہ کا نام مراقبۂ ذات مقدسہ؛ مراقبۂ ذاتِ بحت او رلاتعین وغیرہ رکھتے ہیں۔ جیسے کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے "التکشف" میں تحریر فرمایا ہے۔

مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ص۳۴۲ مکتوب ۱۳۱ سے جو مولانا مظفر صاحب دیوبندی کے نام مکاتیب ہیں۔ وہ ۴۴ھ میں نینی جیل سے تحریر فرمائے گئے! اسی

مضمون کے ہیں۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا تاریخی اسم مبارک مظفر میاںؒ تھا۔ اور میرے چچا مدظلہم کا نام مظفر علی ہے۔ یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کی طبیعت میں اخفار حال ودیعت رکھا گیا تھا۔ اس لئے اپنا مشہور نام طبع نہیں کرایا۔

بہر حال حضرت اقدس تحریر فرماتے ہیں:

اما ما ذکرتم من الذکر ومشاهدة القلب فمبارک زاد الله هذه المساعی والمشاهدات۔	بہر حال ذکر قلبی اور مشاہدہ جیسا کہ تذکرہ آپ نے کیا ہے تو وہ مبارک ہے اللہ تعالیٰ ان مساعی اور مشاہدات میں ترقی دے۔

اسی مکتوب میں آگے چل کر تحریر ہے:

فعلیك یا اخی بتوجیه القلب الی الذات البحت مهما امکن۔ فان ذکر اللسان لقلقة وذکر القلب وسوسة وذکر الروح هو المذکر۔	لہذا برادر من تم پر لازم ہے جہاں تک ہو سکے ذات بحتہ مقدسہ کی طرف دل کو متوجہ رکھو۔ (مکتوب میں آگے صوفیہ کرام کا مقولہ تحریر فرمایا ہے) زبان سے ذکر لقلقہ ہے اور دل سے ذکر وسوسہ ہے اور ذکر روح ہی حقیقی ذکر ہے۔

یہ مکتوب گرامی ۱۹ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ کا ہے۔

پھر مکتوب گرامی ۱۱۳ میں اس کی مزید تشریح فرما کر بتلا دیا ہے:

اما الذکر الروحی فذلك التوجه بالقلب الی الذات البحتة التی منزهة عن الکم والکیف وسائر الاعراض۔ الخ	ذکر روحی قلب کی توجہ کا نام ہے حضرت حق جل مجدہٗ کی ذات خاص کی طرف جو کم اور کیف اور جملہ اعراض سے منزہ ہے یہ مکتوب گرامی ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ کا ہے

اسلام میں سب سے بڑی نعمت اسی مراقبہ کا حصول ہے اسی کا نام معرفت ہے۔ یہی وصول الی اللہ ہے۔ یہی سلوک کا آخری سبق ہے۔ یہیں سے سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے۔ خداوند کریم نے ان کو اس نعمت عظمیٰ سے نوازا تھا۔ خدا کرے

اب عالم آخرت میں بھی اس "صلاۃ" کا سلسلہ جاری ہو۔

وفات

رمضان علالت میں گذرا۔ رمضان کے بعد ڈاکٹروں نے تجویز کیا کہ خون چڑھانا ضروری ہے۔ جسے انہوں نے پسند نہ فرمایا۔ اس کا بدل جوس وغیرہ تھے۔ لیکن اتنی غذا کی اشتہا ختم ہو چکی تھی کہ وہ بھی نہیں پیا جاتا تھا۔ بالآخر کمزوری بڑھتی گئی۔

ایک عزیز حافظ طاہر صاحب وفات سے دو دن پہلے مزاج پرسی کے لئے آئے تو فرمانے لگے بھائی میں تو یہ آیت تلاوت کر رہا ہوں فاطر السمٰوٰت والارض انت ولیی فی الدنیا والاخرۃ توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین اور انتظار میں ہوں کہ کب روح پرواز کر جائے۔

آخری شب عشاء کی نماز اذان ہوتے ہی پڑھی۔ پھر سانس میں دقت محسوس ہونے لگی ڈاکٹروں اور حکیم اجمل خان کے پوتے ڈاکٹر علیم صاحب کے مشورہ سے ہسپتال میں اوکسیجن کے لئے لے جانا ضروری سمجھا گیا تو گیارہ ساڑھے گیارہ بجے وہاں داخلہ ہوا اگلے روز صبح سے وقفہ وقفہ سے "سبحان اللہ" وغیرہ کلمات فرماتے رہے کوئی بات کرتا تھا تو اس کا جواب عنایت فرماتے رہے، لیکن کمزوری کے باعث آواز بہت ہلکی تھی۔ شام کو سب کا خیال ہوا کہ گھر لے جایا جائے۔ خود والد صاحب نے بھی یہی فرمایا۔ لیکن خون کی تین الٹیاں آئیں۔ اس کے بعد طبیعت جیسے پُرسکون ہو گئی۔ ساڑھے پانچ بجے ڈاکٹر راؤنڈ پر آئے۔ ان سے گھر لانے کی اجازت لے لی گئی۔ ڈاکٹر کی اجازت ملتے ہی گلوکوز کی بوتل الگ کر دی گئی۔ اس سے ان کے چہرہ پر مزید سکون ظاہر ہوا لیکن گھر لے جانے نہ پائے تھے کہ حالت اور طرح کی محسوس ہونے لگی۔ خطوط میں تحریر ہے کہ:

ہر سانس پر اللہ اللہ کا ذکر جاری تھا۔ عزیزوں میں سے دو حضرات نے زیر لب تلاوت شروع کر دی اسی اثناء میں ایک اور عزیز حافظ طاہر صاحب پہنچے انہوں نے سورہ یٰسین کی تلاوت شروع کر دی پڑھ کر دم کرتے رہے۔ اور چمچہ سے پانی دیتے رہے۔ اسی دوران تھوڑے تھوڑے وقفہ سے سبحان اللہ بآواز بلند کہا۔ سب ہی

نے سُنا تیسری بار آنکھیں بھی کھلیں اور جیسے چاروں طرف نظریں گھومتی ہوئی آہستگی سے جھک گئیں اس وقت طاہر صاحب سے فرمایا کہ "اب ادھر دیکھو" اللہ اللہ کی آواز اب اور آہستہ ہوتی چلی گئی۔ اور اسی کے ساتھ آنکھیں بند ہوتی گئیں۔ نہ کوئی جھٹکا نہ تشنج نہ گھبراہٹ بے حد سکون چھاتا چلا گیا۔ چہرہ پر ایسی ابدی مسکراہٹ رقصاں تھی کہ دیکھنے والوں کو سکون عطا کر رہی تھی۔ ۱۶ شوال ۱۳۹۵ھ ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء سہ شنبہ ساڑھے چھ بجے وفات ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰھم اغفرلنا ولہٗ وتعمدنا وایاہ برحمتك ورضوانك وادخلہ الفردوس الاعلی من جنانك واجعلنا وایاہ ممن یدخلون الجنۃ بغیر حساب۔

ان کے لئے مفتی عتیق الرحمٰن اور قاضی سجاد صاحب نے حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مبارک کے قریب قبر کا انتظام کیا تھا لیکن والد صاحب کو مسجد عبد النبی کے قریب جو گورِ غریباں ہے وہ بہت پسند تھا۔ وہیں انہوں نے اپنے پھوپی زاد بھائی سید عقیل صاحب کے لئے ۱۲ رمضان ۹۵ھ کو جگہ تجویز کی تھی اور اظہار کیا تھا کہ انہیں اپنے لئے بھی یہ جگہ پسند ہے۔ یہ قبرستان بہت قدیم ہے۔ دہلی میں دہلی دروازہ کے باہر ہے۔

نماز جنازہ شاہ ابوالخیر قدس سرہٗ کے جانشین مولانا زید صاحب نے پڑھائی مولانا اسعد صاحب مدنی غالباً دورۂ مدراس پر تھے البتہ مولانا ارشد صاحب پہونچ گئے تھے۔ جنازہ میں تمام مسلم وزراء اور مسلم ممالک کے سفراء بھی شریک ہوتے۔ (یہ

لہ دہلی سے رشتہ داروں کے سب خطوط میں یہی الفاظ لکھے ہوتے تھے اور یہ بھی ہے کہ انہوں نے جو اشارہ کیا وہ ملائکہ کی طرف تھا۔ جو لوگ وہاں موجود تھے ان سب کے ذہن میں یہی بات آئی ہے۔ جو قرین قیاس ہے۔ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا الآیۃ۔ اور استقامت کا سال ان کے آخری گرامی نامہ سے واضح ہے۔

مجھے حاجی عبدالغنی صاحب کلکتہ والوں نے لکھا ہے وہ نظام الدین تبلیغی جماعت میں آئے ہوتے تھے اور نماز میں شریک ہوتے تھے۔

حضرت شیخ الحدیث قدس سرہٗ اسہال کی شکایت کے باعث بہت کمزور تھے اور سہارن پور میں قیام تھا۔ اس لئے سفر کے قابل نہ تھے مگر وہاں سے سب لوگوں کو دہلی بھیج دیا حتی کہ اپنے خاص خدام کو بھی ارشاد فرمایا کہ ہم سب کو وہاں ہونا چاہیے تھا اور جنازہ میں شریک ہونا چاہیے تھا۔ لیکن میں سفر کے قابل نہیں ہوں۔ مگر آپ لوگ شرکت کریں۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

میں اسی قدر ٹوٹا پھوٹا بے ربط مضمون ہی مرتب کر سکا ہوں انشاء اللہ کسی وقت اس سے زیادہ مرتب کر سکا تو وہ بھی پیش خدمت کروں گا۔